

ادبی دنیا

لاہور

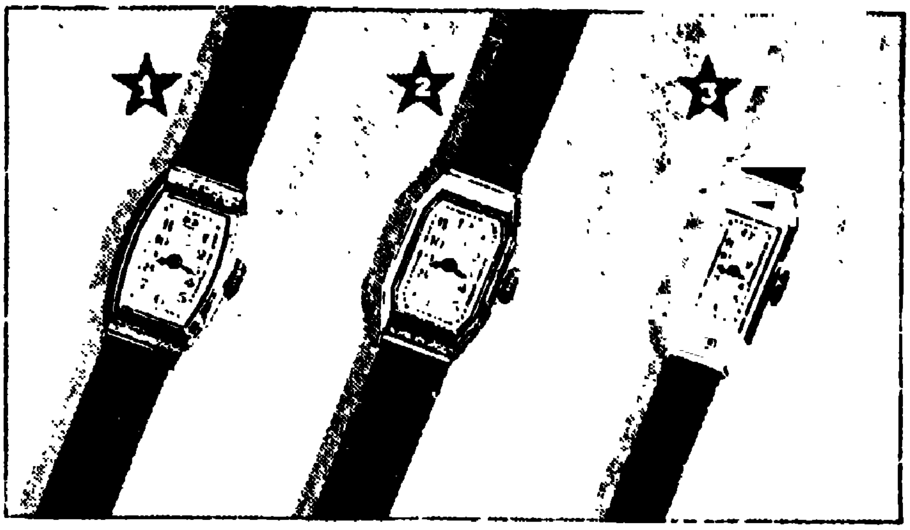
سالنامہ ۱۹۳۸ء

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

1/4.

Beautiful & Accurate

A JOHN BARREL 15-JEWEL WRIST WATCH



The most discreet gift in the world. A compliment both to the giver and the receiver. A thing of beauty which will always serve the owner faithfully and without fuss or adjustments. John Barrel watches have been sold by Favre-Leuba & Co., Ltd. ever since the foundation of the firm 120 years ago. All watches are guaranteed for twelve months.

★1 No. 629. Tonneau shape in rolled gold Rs. 23-8

In chromium with Staybrite back Rs. 19-8

★2 No. 625. Rolled Gold Rs. 22-0

No. 632. Chromium Front Staybrite back Rs. 19-8

★3 No. 631. Baguette shape in 9ct. gold Rs. 37

„ „ „ in 18ct. gold Rs. 48

FOR ALL TIME

All these and many other good watches and clocks are listed in the new Favre-Leuba catalogue which will be sent free on request.

FAVRE-LEUBA

AND COMPANY LIMITED

HORNBY ROAD, BOMBAY. NORTON BLDGS., DALHOUSIE SQUARE, CALCUTTA.

روزِ آغاز سے شاہراہِ اقبال پر

شملہ بنکنگ اینڈ انڈسٹریل کمپنی لمیٹڈ کے اجلاسِ عام منعقدہ ۲۳-۲۔ جولائی ۱۹۳۷ء کے صدر جناب راجہ بھیر سنگھ صاحب او۔بی۔ای کی تقریر کا خلاصہ:-

صاحبان! ۱۹۳۶-۳۷ء کے مالی سال کے دوران میں روپیہ کے لین دین ملک کی تجارت اور کاروبار کی عام حالت پر گذشتہ سال کی بہ نسبت اس سال زیادہ اطمینان بخش اور پرامید طور پر اظہار رائے کیا جا سکتا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب دُنیا کے ہر حصہ میں روپیہ لگانے والے لوگ یاس اور نا امیدی کے سیاہ بادلوں کے کناروں پر کسی نقرئی جھالر کے دیکھنے کی امید میں اپنی بینائی کی پوری قوت صرف کر رہے تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتے تھے کہ اپنے سامعین کو مستقبل بعید میں بھی کچھ بہتر دنوں کی آمد کا یقین دلا سکیں۔ وہ اپنی خوش فہمی کے لئے کسی قسم کے اعداد و شمار یا حقائق پیش نہیں کر سکتے تھے اور روپے کی امداد سے فارغ البالی کا دور واپس لانے کی کوششوں میں وہ بالکل تنہا تھے۔ لیکن انہوں نے روپے کی منڈیوں کے نظم و نسق میں ایسے مناسب اور انقلاب آفریں طریقے اختیار کئے کہ جن سے محض پانچ سال کی مدت میں قوموں کے مالی و تجارتی حالات بے حد متاثر ہوئے۔ اس امر کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو فارغ البالی کی ایک چڑھتی ہوئی لہر پر سوار پاتے ہیں۔

وقت کی کمی کے باعث میں موجودہ صورت حالات کے چند خاص خاص پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالوں گا۔ سب سے پہلے میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ کہ دسمبر ۱۹۳۵ء سے اب تک بنک ریٹ ۳ فیصدی پر قائم رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ پہلے اس ریٹ میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ جن کے خلاف تجارتی حلقے اکثر احتجاج کرتے رہتے تھے۔ اب ملک کے بڑے بڑے قرضہ دینے والے دفاتر موسمی ضروریات کا اس آسانی سے انتظام کر دیتے ہیں کہ بنک ریٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور یہ امید کرنا بالکل بجا ہے۔ کہ بازار صرافہ کے نظم و نسق میں نئے طریق عمل کے کارفرما ہونے سے بنک ریٹ میں فوری کمی بیشی ہونے کا زمانہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ روپے اور پاؤنڈ کی باہمی شرح تبادلہ نے ایسی مستقل صورت اختیار کر لی ہے جو اس سے پہلے معدوم تھی۔ اس دور پنجسالہ کے حصہ اول میں سونے کی برآمد نے اور اب مال تجارت کی برآمد نے شرح تبادلہ کے استقلال میں مدد دی ہے۔ یہ امر ہندوستان کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ ایسے وقت میں جبکہ یورپ کے بہت سے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اپنی غیر ملکی ذمہ داریوں سے بہ آسانی عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ یہ امر بیرونی ممالک کی نگاہوں میں حکومت ہند کے مالی اعتبار کے بڑھانے اور اس کی کفالتوں کی قیمتوں میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

بین الاقوامی منڈیوں میں اجناس خصوصاً اشیائے خوردنی اور صنعتی خام مسالوں اور معدنیات کی قیمتوں میں مستقل اضافہ ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ پچھلے دور انحطاط میں جن لوگوں کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔ اب ان کے ہاتھ میں کافی روپیہ آ رہا ہے۔ اس امر سے اگر ایک طرف عوام کی مالی حالت سدھرے گی تو دوسری جانب ہماری صنعتوں میں نئی زندگی پیدا ہو جائیگی سٹاک ایکسچینج پر اس کے زندگی بخش اثرات نمایاں ہو چکے ہیں۔ نئی کمپنیاں جس سرعت سے بن رہی ہیں۔ وہ بھی گذشتہ سال کی مالی اور صنعتی سرگرمیوں پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ بعض اجناس یا تجارتی اشیاء میں غیر معمولی طور پر زیادہ روپیہ لگایا گیا ہے لیکن پھر حالات نے جلد ہی درستی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اب سال کے آغاز کی بہ نسبت صورت حالات امید افزا اور اطمینان بخش ہے۔ فرانس کے معیار طلائی ترک کرنے سے دنیا کے باہمی تبادلہ زر کی مشکلات میں بہت حد تک کمی ہو گئی ہے اور اب ہم حفاظتی محصول کی ان دیواروں کو بھی مسمار ہوتا دیکھنے کی امید کر رہے ہیں جو بین الاقوامی تجارت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی رہی ہیں ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی سیاسی مشکلات پیش نہ آگئیں تو دنیا بہت جلد فارغ البالی کے ایک نئے دور میں یقیناً داخل ہو جائے گی۔

جہاں تک بنک کے اپنے معاملات کا تعلق ہے۔ آپ پر واضح ہوگا کہ منتظمین نہایت احتیاط سے کاروبار کر رہے ہیں۔ اور کاروبار مستقل طور پر ترقی پذیر ہے۔ اگر آپ بیلنس شیٹ کے ساتھ لگی ہوئی رفتار ترقی کی کیفیت

پڑھیں تو آپ پر منکشف ہو جائے گا کہ ہمارے گاہکوں نے چودہ لاکھ روپیہ سے زیادہ رقم پہلے سے بھی کم شرح سود پر ہمارے پاس امانت رکھوائی ہے۔ ہم نے اس رقم کو نقد ریزرو کو مضبوط کرنے اور بہت جلد وصول ہو جانے والے قرضوں اور اس قسم کے دیگر کاروبار میں استعمال کیا۔ آئندہ بھی اسی پالیسی پر عمل ہوتا رہے گا۔ اور امید کی جاتی ہے کہ نفع بخش سرمایہ میں مزید اضافہ کے باعث منتظمین زیادہ بہتر نتائج دکھا سکیں گے۔ سال زیر نظر کے دوران میں مستقل امانتوں کا میزان ۲۹۴۴۰۰۰ سے بڑھ کر ۰۰۰۴۵۳۳ ہو گیا۔ اور سرکاری کفالتوں کی میزان ۱۲۰۰۰۰ سے ۰۰۰۰۰۱۶ تک پہنچ گئی۔ مجموعی آمدنی دو لاکھ سینتالیس ہزار کے مقابلہ میں دو لاکھ ستتر ہزار ہوئی ہے۔ اور خالص منافعہ ۰۰۸۳۳۳ کے مقابلہ میں ۰۰۶۴۴ ہوا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ نتائج بہت تسلی بخش سمجھے جائیں گے۔

حفاظتی تہ خانے بنانے کا کام ہاتھ میں لے لیا گیا ہے اور ہمارے میر عمارت نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ سال ختم ہونے سے پہلے یہ کام بھی ختم ہو جائے گا۔

آخر میں اپنی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے مسٹر دسانے بنک کا چارج لیا ہے۔ بنک کے حالات میں ایک نہایت خوشگوار اور حیرت انگیز انقلاب آ گیا ہے۔ اور بنک کا مستقبل روشن ہو گیا ہے۔ میں بنک کے صدر مقام کے تمام کارکنوں اور شاخوں کے افسروں کی حسن کارکردگی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دو مفید ادارے

انڈین ریڈ کراس سوسائٹی

انڈین ریڈ کراس سوسائٹی بروئے ایکٹ ۱۵ سنہ ۱۹۲۰ء لیجسلیٹو اسمبلی مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ اور وہ بین الاقوامی لیگ کی ایک ممتاز رکن ہے۔ اس کا سرمائی صدر مقام دہلی اور گرمائی صدر مقام شملہ ہے۔ اس کی شاخیں تمام صوبوں اور بہت سی ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سرگرمیوں کی مختلف کیفیت یہ ہے۔

(۱) بیماروں اور مصیبت زدوں کے دکھ درد کا ازالہ۔

(۲) وبائی امراض کے انسداد کے لئے فوری تدابیر۔

(۳) صحت عامہ کے متعلق واقفیت کی بہم رسانی۔

(۴) زچہ اور بچہ کی حفاظت و خبر گیری۔

(۵) زلزلہ، سیلاب اور قحط کے مصیبت زدوں کی امداد۔

(۶) بین الاقوامی دوستی کے لئے جونیئر ریڈ کراس جماعتوں کی تنظیم و ترتیب۔

(۷) شفاخانوں میں بیماروں کے لئے سامان آسائش کی بہم رسانی۔

(۸) بنی نوع انسان کی سوشل خدمت بلا لحاظ مذہب و ملت و رنگ۔

انڈین ریڈ کراس کے ماتحت ۲۲ صوبجاتی اور ریاستی شاخیں ہیں۔ جن کے ماتحت ۱۵۱۔ اضلاعی شاخیں لوگوں کے دکھ درد کو کم کرنے میں مصروف ہیں۔

انڈین ریڈ کراس کی پنجاب پراونشل شاخ کے ماتحت ۲۸۔ اضلاعی شاخیں ہیں۔ جن کے سینیئر ممبروں کی تعداد سنہ ۱۹۳۶ء کی رپورٹ کے مطابق ۱۲۲۳۷۔ اور جونیئر ممبروں کی تعداد ۲۴۵۲۰۸ ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے دوران میں امرتسر میں ایک بہت بڑا زچہ خانہ سیٹھ چترنج کی یادگار میں قائم کیا گیا جو چترنج لیڈی ایمرسن کے نام سے موسوم ہے اور جسے چترنج فیملی نے ایک لاکھ روپے کی امداد دی ہے۔ مختلف اضلاع میں صحت گاہوں کی تعداد ۵۷ ہے ان کے ماتحت چھوٹی صحت گاہوں کی تعداد ۱۱۴ تک جا پہنچی۔ یہ ایک حوصلہ افزا امر ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ممبری کی مجموعی تعداد سے مقابلہ میں پنجاب کے ریڈ کراس ممبروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس جوش و سرگرمی کا جو ریڈ کراس کے سرکاری اور غیر سرکاری کارکن اس مفید خلق خدمت کے انجام دینے میں دکھا رہے ہیں۔

اس سال راوی اور جہلم کی طغیانیوں کے سیلاب زدہ لوگوں کی امداد اور دیگر امدادی

کانوں میں ۲۳۲۲۷ روپے خرچ کئے گئے۔ دس ہزار سات سو روپے زچگی کے بہتر انتظامات پر خرچ کئے گئے اور دو ہزار ایک سو باون روپے دائیوں کی تربیت پر علاوہ بریں سلور جوبلی فنڈ سے جو چار لاکھ روپیہ ریڈ کراس کو ملا ہے۔ اُسے زچگی کے بہتر انتظامات کے لئے خرچ کیا جائے گا اور ایک معقول رقم ہر ضلعے کو دے دی جائے گی۔ امید ہے کہ یہ رقم اس مفید کام کو بہت تقویت پہنچائے گی۔

ضلع گجرات میں منبع کے لوگوں کی پبلک سپرٹ نے بمقام بھالیہ ایک بڑا زنانہ ہسپتال کے اجراء کا انتظام کر لیا ہے۔

شاہراہ سلطانی پر جگہ جگہ فرسٹ ایڈ سنٹر کھولنے کا انتظام کیا گیا ہے اور یہاں جو آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں ان کے زیر نظر یہ مرکز ہے جو مفید ثابت ہوں گے۔

انسداد امراض خصوصًا اندھاپن سے بچنے کے لئے مختلف مقامات میں جلسوں اور تقریروں کے ذریعہ سے بہت سا مفید کام کیا گیا ہے۔

سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن

سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن کی امتیازی خصوصیت بیماروں زخمیوں کی تیمارداری اور ابتدائی امداد (فسٹ ایڈ) ہے۔ ہز میجسٹی ملک معظم آرڈر آف سینٹ جان کے ساورن ہیڈ (شاہی افسر اعلیٰ) ہیں۔ ریڈ کراس کی مانند ایسوسی ایشن مذکور نے بھی ہندوستان میں اپنے ٹھوس اور خاموش کام کی وجہ سے نمایاں امتیاز حاصل کیا ہے ہندوستان کے وسیع ملک میں جہاں ہر گاؤں میں طب یا دایہ گری کی امداد میسر نہیں آ سکتی۔ ایسوسی ایشن اپنا دست اعانت شوق اور محبت سے بڑھاتی ہے۔ اس نے جابجا ابتدائی امداد کی تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے۔ جس سے مردوں۔ عورتوں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرب چوٹ۔ زخم وغیرہ کے فوری علاج اور گھروں میں بیماروں کی تیمارداری کا ابتدائی طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس مدعا کے لئے جماعتیں ایک مدت سے جاری ہیں۔ اور حال میں لڑکیوں کے لئے بچہ کی نگہداشت اور خبر گیری کا مضمون نصاب میں شامل کیا گیا ہے جو جملہ مراکز میں سکھایا جاتا ہے۔

فسٹ ایڈ اور تیمارداری کے طریقوں کی تعلیم کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے۔ جب خدانخواستہ آپ کے آپ کے کسی عزیز کو کوئی حادثہ پیش آئے یا وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے اور آپ اپنے آپ کو اس کی مدد کے ناقابل پا کر مغموم و بے بس ایک طرف کھڑے ہوں، اس لئے کہ آپ نہیں جانتے کہ اس کی تکلیف کو کیونکر رفع کیا جا سکتا اور اس کی زندگی کو کیونکر بچایا جا سکتا ہے۔ ایمبولنس کی تعلیم آپ کو اس قابل بنا دے گی کہ آپ جسمانی تکالیف کے وقت اپنے بھائیوں کی مدد کر سکیں۔ ان کو دُکھ اور درد سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور بیماری میں اُن کی تیمارداری کر سکیں۔

ایسوسی ایشن اپنے مقرر کردہ مرکزوں کے ذریعہ سکولوں۔ کالجوں۔ ریلوے ملازموں۔ کان کنوں۔ فوجیوں۔ کارخانوں۔ ملوں اور کلبوں وغیرہ غرضیکہ ہر ایسی جماعت کے لئے جو چند افراد کو یکجا جمع کر سکے۔ لیکچروں اور امتحانوں کا انتظام کرتی ہے۔ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ایسوسی ایشن کے کام نے پنجاب میں خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس عرصہ میں صوبہ کے تمام حصّوں میں چھ ہزار ایک سو بیالیس افراد کو جن میں ریلوے۔ پولیس۔ جیل۔ جرائم پیشہ اقوام کے افراد۔ سکول کے لڑکے اور لڑکیاں اور مقامی ایسوسی ایشنوں کے ارکان بھی شامل ہیں۔ ایمبولنس کے کام کی تعلیم دی گئی۔

ایمبولنس کے کام کی تعلیم و تربیت کو فروغ دینے کی غرض سے مردوں اور عورتوں کے لئے صوبجاتی مقابلے لاہور میں ہر سال منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور متعدد مواقع پر آل انڈیا ایمبولنس مقابلوں کا بھی صوبہ ہذا میں انتظام کیا گیا۔

اس سال کا ایک اہم واقعہ کرنل سلیمن صاحب کا معائنہ ہے۔ کرنل صاحب سمندر پار کے تمام ممالک کے سینٹ جان ایمبولنس کے چیف کمشنر ہیں پنجاب کی سینٹ جان ایمبولنس تنظیم کو ملاحظہ کرنے پر کرنل صاحب کی یہ رائے تھی کہ پنجاب کا کام تمام سلطنت برطانیہ میں بہترین ہے۔

سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن کی سرگرمیاں اس قدر مفید اور کارآمد سمجھی گئی ہیں کہ صوبہ کے ہر حصہ میں اس کی تعلیم کی توسیع کی بیش از بیش ضرورت سمجھی جا رہی ہے۔ جس کی تکمیل سرمایہ کے ناکافی ہونے کی وجہ سے صرف جزوی طور پر ہی ہو سکتی ہے۔ اگر آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہو جائے تو ایسوسی ایشن کی پراونشل شاخ اپنی سرگرمیوں کو بہت وسعت دے سکتی ہے۔

دُنیائے عمل

ہندوستانی دَواخانہ دہلی

آج سے چونتیس برس پہلے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم نے اِس بے نظیر ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اپنی اور اپنے خاندان کے تمام بیش قیمت مجرّبات اِسے دے کر اسے ملک کا سب سے قابلِ اعتماد یونانی دواخانہ بنادیا۔ اور اس کا تمام منافع آیورویدک یونانی طبیہ کالج دہلی کے لئے وقف کر دیا۔ مسیح الملک مرحوم کی زندگی میں اس دواخانہ کو جو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ اُس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اُن کے زمانہ میں اس کا سالانہ نفع ایک لاکھ رُوپے تک پہنچ گیا۔ جو تمام و کمال ہندوستان کے سب سے بڑے طبّی کالج پر صرف ہوتا رہا۔ مسیح الملک کے انتقال کے بعد اس کی زمامِ اقتدار اُن کے قابل و نامور فرزند مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں کے ہاتھ میں آئی۔ اور انہوں نے اپنی بے مثال قابلیت اور ایثارِ نفس کی بدولت اس کے انصرام میں ایسی رُوح پھونکی۔ کہ طبیہ کالج کی امداد دو لاکھ روپے سالانہ تک پہنچ گئی۔ اور اس سے طب کی تعلیم کو جو جو ترقیاں نصیب ہوئیں۔ اُن کا اجمال بھی تفصیل طلب ہے۔ اب جب کہ ہندوستانی دواخانہ کو بار ثانی صاحب موصوف کی سیادت نصیب ہوئی ہے۔ اِس کے ذخیرہ میں مسیح الملک ثانی کے تازہ ترین معجز نما ایجادات کا خصوصاً ذیابیطس اور تپِ دق کی حیرت انگیز کامیاب دواؤں کا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستانی دواخانہ برابر فروغ حاصل کر رہا ہے۔ اور اس کی اعانت سے آیورویدک طبیہ کالج بھی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ آج کل طبیہ کالج کو ایک یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچا دینے کا مقصدِ عظیم جناب مسیح الملک ثانی کے پیشِ نظر ہے۔ اور اُن کی بلند ہمتی سے وہ دن دُور نہیں۔ جب ہندوستان کی یہ پہلی طبّی یونیورسٹی معرضِ وجود میں آ کر فنِ قدیم طب کے بیش از پیش فروغ کا باعث ہو۔ اور اقوامِ عالم میں ہندوستان کی سربلندی کا موجب بنے:۔

ویلیس انشورنس کمپنی لمیٹڈ دہلی

اس ترقی پذیر کمپنی نے ۱۹۲۰ء میں ایک پراویڈنٹ کمپنی کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ اور ۱۹۲۵ء میں زندگی کے بیمہ کا کام کرنے لگی۔ ۱۹۲۷ء میں اس کی مینیجنگ ایجنسی میں تبدیلی ہوئی۔ اور تب سے اس کی ترقی کی رفتار زیادہ مستقل اور تیز تر ہو گئی ہے۔ گذشتہ پنجسالہ رپورٹ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس عرصہ کے اختتام پر کمپنی کا ریزرو فنڈ ۷ لاکھ ۱۵ ہزار رُوپے تھا۔ یہ اس سے پہلے پانچ سال کے ریزرو فنڈ سے چار گنا ہے۔ اس دَوران میں کمپنی کی تمام ذمہ واریاں ۶ لاکھ پچاس ہزار رُوپے سے زائد نہیں تھیں۔ پس اس لاکھ زائد رُوپے میں سے بہتر ہزار آئندہ ضروریات کے لئے رکھکر باقی ۲۸ ہزار پالیسی ہولڈروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کمپنی مذکور کا کاروبار نہائت دوراندیشی اور کفایت سے کیا جا رہا ہے۔ اور موجودہ ملکیت کی جانچ کے بعد بارہ رُوپے اور پندرہ روپے فی ہزار پالیسی ہولڈروں کو بونس دیا گیا ہے۔ جو بجائے خود معمولی کامیابی نہیں۔ کمپنی کے مینیجنگ ایجنٹ میسرز کانشی بھائی اینڈ کو نے پچھلے پانچ سال میں اپنی کمیشن کا اڑھائی لاکھ روپیہ کمپنی کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک نہائت قابلِ ستائش بات ہے امید ہے۔ کہ اس پالیسی کے ماتحت کمپنی روز افزوں ترقی کرے گی:۔

نیشنل گرامُوفون ریکارڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ بمبئی

یہ کمپنی قریباً ایک سال ہوا۔ تین لاکھ روپے کے سرمایہ سے بمبئی میں جاری کی گئی تھی۔ اس سال بھر کے عرصہ میں تقریباً تین سو اعلےٰ درجہ کے ریکارڈ تیار کر چکی ہے۔ اس کی رسم افتتاح صدر کانگرس میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے ادا کی تھی۔ اور ینگ انڈیا ریکارڈ پر اپنا پیغام ملک کو دیا تھا۔

کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرز بمبئی کے پانچ سربرآوردہ کاروباری اصحاب پر مشتمل ہے۔ جن میں سے تین ڈائرکٹر مینیجنگ ایجنسی کے حصہ دار ہیں۔ جو ایم۔ ٹی پانڈیا اینڈ کمپنی کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں سے مسٹر منی لال موہن لال جوہری ایک خاموش کانگرسی کارکن ہیں۔ اور اپنی قربانیوں اور ایماندارانہ کاروباری شہرت کے باعث بمبئی کے تمام حلقوں میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔

دوسرے حصہ دار مسٹر تریکم داس مہاسکھ رام۔ تیسرے حصہ دار مسٹر ڈی اے پانڈیا کے ساتھ ریکارڈ بنانے کا کام ہندوستان میں لانے کے لئے جاپان گئے تھے وہ سودیشی صنعت وحرفت سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ تیسرے حصہ دار مسٹر پانڈیا بمبئی کے ایک مشہور تاجر ہیں۔ اور دھرنگدھرا ریاست میں کارخانہ میگنیشا کے مالک ہیں۔ سودیشی صنعت سے خاص دلچسپی کے باعث وہ گراموفون ریکارڈوں کی صنعت میں کود پڑے۔ اور اسے سیکھنے کے لئے ۱۹۳۵ء میں جاپان گئے۔ اور وہاں سے تمام معلومات حاصل کرکے اپنے ساتھ ایک ماہر ریکارڈ ساز مسٹر کوڈاکا کو ان کے تین مددگاروں سمیت ہندوستان لے آئے۔ اور ان سے یہ شرط کی۔ کہ وہ ہندوستانی کاریگروں کو سارا کام سکھا دیں گے ان کی خدمات حاصل کرنے میں مسٹر پانڈیا کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر وہ بمبئی کے مضافات میں وڈالہ کے مقام پر اپنا کارخانہ جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جہاں بیشتر ہندوستانی مسالہ سے ینگ انڈیا گراموفون ریکارڈ تیار کئے جاتے ہیں۔ کمپنی مذکورہ ان کروڑوں روپے میں سے جو یہ حرفت ہر سال ہندوستان سے باہر لے جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ بچانے کے لئے مستحق مبارکباد ہے۔

کیمیکل انڈسٹریل اینڈ فارمیسوٹیکل لیباریٹریز لمیٹڈ بمبئی

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب جو شیخ الجامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کے برادر خورد ہیں۔ اور خود ایک فاضل سائنسدان ہیں۔ ہندوستان کے کاروباری حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مشہور جرمن دوا "اوکاسا" کی مقبولیت و شہرت انہیں کی قابلیت کی شرمندۂ احسان ہے۔ اب انہوں نے وہ انگریزی ادویات جو اتنک یورپ و امریکہ سے آتی تھیں۔ ہندوستان میں بنانے کے لئے بمبئی میں ایک عظیم الشان کارخانہ جاری کیا ہے۔ اور اس میں دواسازی کی بہترین اور جدید ترین مشینیں نصب کی ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین فن کی امداد حاصل کی ہے۔ جو مغربی طریقوں پر ہر قسم کی دوائیں اور سیرم اور غدودوں اور خون کے مرکبات ہندوستان میں تیار کررہے ہیں۔ ہیر ٹسی۔ اے رد تھنیم ایک مشہور جرمن دواساز ہیں۔ انہیں ڈاکٹر حمید اپنے ساتھ جرمن سے لائے ہیں۔ اور وہ تازہ ترین جرمن طریقوں پر ادویات کی تیاری کا انصرام کرتے ہیں۔ کمپنی نے ایک نہایت مفید شعبۂ تحقیقات بھی قائم کیا ہے۔ جہاں نئی نئی دریافتیں ہورہی ہیں۔ جن سے فن کیمیا اور طبابت کو بہت تقویت ملنے کی امید ہے۔

کمپنی نے پورے انہاک سے اپنا کام جاری کردیا ہے۔ اور اس چھ کروڑ روپے کی سالانہ برآمد کو جو ادویات کی قیمت کی صورت میں ہندوستان سے مغربی ممالک کی طرف ہوتی ہے۔ کسی حد تک روکنے کے لئے اپنی کوششیں وقف کردی ہیں۔ اگر وہ دوائیں جو یورپ سے ہندوستان آتی ہیں۔ اسی صفائی۔ مہارت اور واقفیت سے ہندوستان میں بنائی جاسکیں۔ (اور یہ سب کچھ موجودہ کمپنی نے کر دکھایا ہے) تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے اہل ملک یورپی دواؤں کو ہندوستان کی ساختہ ادویات پر ترجیح دیں۔ ہمیں توقع ہے۔ کہ ہندوستانی ڈاکٹر اور ہندوستانی پبلک اس کمپنی کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرے گی۔ اور وہ دن دور نہیں۔ جب یہ کمپنی ایک قومی ادارہ بن جائے گی۔

ایک علمی اور ادبی کارنامہ

ہمارے دوست خانصاحب فضل کریم خان درانی بی اے ایڈیٹر تجدد مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ مشکوٰۃ شریف حدیث کی مشہور کتاب ہے اور اسلامی علوم الہیات کے مدارس میں بطور نصاب کے صدیوں سے رائج ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کیپٹن میتھوز نے ۱۸۰۹-۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا۔ کل ڈھائی سو نسخے شائع ہوئے تھے۔ آج یہ ترجمہ قطعاً نایاب ہے۔ درانی صاحب نے اس ترجمہ کی اصلاح کی ہے۔ کیونکہ اس میں خامیاں بہت تھیں۔ اور ترجمہ کے ساتھ ایک مفصل تفسیر بھی شامل کردی ہے درانی صاحب انگریزی زبان کے مسلم انشاپردازہیں۔ کتاب خریداروں کی سہولیت کے لئے بارہ حصوں میں شائع ہوگی۔ تقطیع $\frac{20 \times 22\frac{1}{2}}{8}$ حجم فی حصہ ۱۰۰ صفحہ اور قیمت فی حصہ ۸؍ - ۶ر بہ پیشگی جمع کرانے پر محصول ڈاک معاف۔

تبلیغ لٹریچر کمپنی۔ ریلوے روڈ۔ بمقابل اسلامیہ کالج۔ لاہور سے متوجہ ہوں۔

فیڈرل بنک آف انڈیا پنجاب لمیٹڈ لاہور

فیڈرل بنک آف انڈیا ایک ایسی انسٹی ٹیوشن ہے۔ جس نے قلیل عرصہ میں قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ اس بنک نے کاروبار صرف ۱۹۳۳ء کے اخیر میں شروع کیا۔ لیکن اعتماد شہرت اور اعتبار کے لحاظ سے یہ پرانی انسٹی ٹیوشنوں کو بھی مات کرتا ہے۔ اس ترقی کا راز یہ ہے۔ کہ اس بنک کو ایسے اصولوں پر چلایا جا رہا ہے جس سے نقصان ہونے کا احتمال نہ ہو۔ جن وجوہات کے باعث چند بڑے بڑے بنکوں کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان باتوں کی پوری احتیاط اس بنک میں شروع سے ہی کر دی ہے۔ اول تو یہ کہ یہ بنک اپنے ڈائرکٹروں کو کوئی قرضہ شخصی ضمانت پر نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ڈائرکٹران بنک بحیثیت ڈائرکٹران و محافظان پبلک روپیہ سے کسی قسم کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ البتہ اگر وہ معقول ضمانت پیش کریں۔ تب بنک کو روپیہ دینے میں دریغ نہیں ہوتا ہے۔ یہ بنک صرف پبلک مفاد و تجارت پیشہ اصحاب کی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ یہ بنک پبلک میں روپیہ نہایت احتیاط اور دور اندیشی سے لگاتا ہے۔ اور یہ بات بنک کی بیلنس شیٹ بتاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے۔ کہ بنک کے ۹۶ فیصدی قرضہ جات ضمانت شدہ ہیں۔ بنک کا کل کاروباری سرمایہ تقریباً آٹھ لاکھ تک پہنچ گیا ہے اور اس سال بنک نے معمولی حصہ داروں کو ۴ فیصدی اور ترجیحی حصہ داروں کو ۶ فیصدی منافع دیا ہے۔ کاروبار کا مندہ ہونے کے باوجود بھی حصہ داران کو منافع دینا بنک کی تیز رفتار ترقی کا زندہ ثبوت ہے۔

اس زمانہ میں جبکہ ہندو مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی بھاری ضرورت ہے اس بنک جیسی انسٹی ٹیوشنوں کی ہستی مبارک ہے۔ جس میں کہ ہر مذہب و ملت کے اصحاب شامل ہیں۔ اور ان سب کا مفاد اس سے وابستہ ہے وہ سب اس کی ترقی اور بہبودی کے لئے اپنی تمام تر سرگرمیاں وقف کئے ہوئے ہیں مرزا سر ظفر علی سابق جج پنجاب ہائیکورٹ جیسے جہاندیدہ بزرگ اس کے ممبرین ہیں۔ اور اس امر کا یقین دلاتے ہیں۔ کہ بنک کا کام نہایت ہی احتیاط اور انصاف سے ہوگا۔ مرزا صاحب کی ذات فرقہ داری سے بالاتر ہے ہندو مسلمان ان پر یکساں اعتماد رکھتے ہیں۔ اور وہ سب کاموں میں ہر دلعزیز ہیں اس کے بورڈ میں رائے بہادر لالہ جودھامل کٹھالیہ جن کا شمار پنجاب کے کاروباری حلقہ کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ شامل ہیں۔ بنک نے فیروزپور اور ہوشیارپور میں برانچیں کھول رکھی ہیں۔ جو نہایت تسلی بخش کام کر رہی ہیں۔ اور امید ہے کہ دیگر بڑے بڑے شہروں میں بھی بنک کی برانچیں رفتہ رفتہ کھل جائینگی۔ کسی بنک کے کاروبار کی ترقی کا دارومدار بنک کے افسروں اور کارندوں پر ہوتا ہے۔ اگر بنک کے چلانے والے خوش خلق۔ ایماندار اور کاروبار کو سمجھنے والے ہوں۔ تو وہ انسٹی ٹیوشن ترقی کر جاتی ہے۔ فیڈرل بنک کے مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر ایچ سی۔ ماتھر ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار صاحب ہیں۔ جن کو بینکنگ لائن میں وسیع تجربہ ہے۔ ان کا سلوک پبلک سے نہایت ہی اچھا ہے۔ یہ ان کی اور ان کے تجربہ کار سٹاف کی دن رات کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ بنک نے موجودہ ترقی حاصل کی ہے۔ ایسے انسٹی ٹیوشن کی سرپرستی کرنا ہر ایک ہندوستانی کا فرض ہے۔ تاکہ ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی میں امداد ملے۔ اور بے روزگاری کے زمانے میں بیکاروں کی روزی کا ذریعہ بن سکے۔

ادارہ ادبی دنیا کو اس بنک کے حسنِ معاملت اور حسنِ سلوک کا ذاتی تجربہ ہے۔ اور وہ پبلک سے پر زور سفارش کرتا ہے۔ کہ وہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھائے۔


AMRUTANJAN
Best Indian
Pain Balm
Amrutanjan Depot
BOMBAY, MADRAS

ناظرین "ادبی دنیا" کیلئے ایک نادر تحفہ — طاقت کا لاثانی فقیری نسخہ

ناظرین آج آپکو ایک ایسا عجیب و غریب مقوی نسخہ بتلا رہا ہوں جو ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیز اپنے فوائد اور خوبیوں میں [illegible] استعمال کریں اور میری محنت کی داد دیں۔ اسکی جتنی بھی تعریف کیجائے تھوڑی ہے صرف سات دن کے استعمال سے جسم میں خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اکیس دن میں چہرہ سرخ سونے کی طرح چمکنے لگتا ہے نیز ۴۰ دن میں پوری طاقت حاصل ہو جاتی ہے کیسی ہی کمزوری وغیرہ ہو اسکے استعمال سے دور ہو جاتی ہے۔ اس سے عورتوں کی ہر قسم کی بیماریاں دور ہو کر ان میں اولاد پیدا کرنے کی قوت آجاتی ہے۔ یہ نسخہ قبض نہیں کرتا۔ بلکہ جگر معدے کو قوت پہنچاتا ہے پرانا قبض بھی اسکے استعمال سے دور ہو جاتا ہے اور بھوک خوب لگتی ہے کف۔ کھانسی۔ نزلہ زکام۔ بدن کا دکھنا خون کا پتلا ہونا۔ جگر اور معدے کی خرابی۔ آنکھوں میں پیلا پن۔ پیٹ کی گھڑگھڑاہٹ۔ بار بار تھوک گرنا۔ بواسیر۔ دمہ نیز ہر قسم کی کمزوری اسکے استعمال سے جلد دور ہو کر لا انتہا قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہر موسم میں ہر مزاج والے کو یکساں فائدہ کرتا ہے۔ ہم ناظرین کرام سے استدعا کرتے ہیں۔ کہ اسال ۴۰ دن ضرور استعمال کریں۔

قلاقی پہاڑی کے رتن گری سادھو نے اس دوا کی پانچ چھ خوراکیں ایک گوالے کو دیدی تھیں جو کہ دودھ وغیرہ سے ہمیشہ باباجی کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بوڑھا گوالہ بوجہ لاعلمی کے ساری خوراکیں ایک ہی بار کھا گیا۔ اس سے اسکی جو حالت ہوئی اس کا ذکر کرنا خلاف تہذیب ہے صرف یہ لکھنا کافی ہوگا۔ کہ بڑھاپے میں باباجی سے علاج کرانے کے بعد اس گوالے نے تین بیاہ کئے تھے۔ اس خبر کو سن کر خلیفہ حاجی حیات محمد خان صاحب نواب بہاولپور کے خسر صاحب نے بہت سا وقت صرف کر کے اور بڑی منت کر کے بہاتما جی سے یہ نسخہ آبحیات حاصل کیا پھر آپ سے یہ نسخہ کوی رتن و دیا بھوشن پوجیہ پاد پنڈت ٹھاکر دت جی شرما کو ملا شرما جی نے اچھی طرح آزمائش کر کے دنیا کے بھلے کی خاطر اسے دیش اپکارک میں چھپا دیا۔ اور اس سے عمدہ نسخہ بتلانیوالے کو اپنے تین نسخوں کیلئے ایکہزار روپیہ انعام اور سرٹیفکیٹ دینے کا وعدہ کیا تھا جسے تقریباً تیرہ سال ہو چکے ہیں جو ابھی تک کسی نے حاصل نہیں کیا پنڈت جی کی کمال مہربانی سے یہ نسخہ ہمیں ملا ہے۔ ہم نے بھی اسے فیض عام کی خاطر اخبارات میں چھپوانے کا فیصلہ کیا ہے نیز آج ہم ادبی دنیا کے معزز ناظرین کی خدمت میں بزور سفارش کرتے ہیں کہ کسی موسم میں چالیس دن ضرور لگاتار اسکا استعمال کرنا چاہیئے پھر ناظرین دیکھیں گے کہ قیمتی خوراکوں کے مقابلہ میں یہ نسخہ کیسا ہے۔ ہمارا دعوی ہے کہ آپ ہمیشہ کیلئے اس کے معتقد بن جائینگے لیکن خیال رہے کہ یہ نسخہ کسی نااہل سے تیار نہ کرائیں اس نسخہ کی تعریف میں کلکتہ کے مشہور وید راج بابو ہری داس [illegible] جکت [illegible] لکھتے ہیں۔ کہ اس دوا ایک آدمی کا ایک ہفتہ میں چار پونڈ وزن بڑھ گیا۔ اور دوسرے کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ بھوپال کے وید پنڈت بال کرشن شرما لکھتے ہیں کہ میں نے ۷۰ لوگوں پر استعمال کیا۔ اور امید سے بڑھ کر مفید پایا۔ رتناکر کے ایڈیٹر آیورویدآچاریہ شری چھوٹے لال جین نے رتناکر میں لکھا ہے کہ اتنا مؤثر اور جلد فائدہ پہنچانیوالا دوسرا نسخہ نہیں ہو سکتا۔ گوتانہ کے مشہور وید ڈاکٹر رامیشور دیال نے بھی الوبھو سہلوک مالا پتر میں چھپوایا ہے۔ کہ یہ نسخہ حقیقت میں انوکھا ہے کبھی خطا نہیں کرتا۔ میں نے اب تک ۸۰ مریض اس نسخے کے ذریعے اچھے کئے ہیں ایسے ہی ہزاروں سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں۔ ناظرین ادبی دنیا یقین کریں اور ضرور چالیس دن اس نسخہ کا استعمال کریں۔ نسخہ یہ ہے:۔

شدھ برادہ فولاد۔ دو تولہ۔ شدھ سنکھیا (سفید سل) ایک تولہ کپور ½ ۱ ماشہ کو لیکر گھنٹہ تک گھی کوار کے رس میں گھونٹ کر مٹی کے کوزے میں بند کر کے ۵ سیر اپلوں کی آگ دیں ٹھنڈا ہونے پر دوبارہ ایک تولہ ہڑتال ورقی شدہ ½ ۱ ماشہ۔ کپور شدہ میں تیسری بار گندھک آملہ سار شدہ ایک تولہ کپور شدہ ½ ۱ ماشہ میں چوتھی بار شدہ سنگارت پارہ ایک تولہ کپور ½ ۱ ماشہ کے ساتھ اوپر کی طرح آگ دیں اسی طرح سولہ بار آگ دیں۔ ۱۶ آنچ کے بعد بھسم نکال کر لوہے کی کڑاہی میں ڈال دیں اور بھسم کے برابر برابر بوٹی ڈال دیں۔ جب سب بربوٹی جل کر خاک ہو جائیں تو پنکھے کی ہوا سے اڑا دیں اور بھسم شیشی میں رکھ لیں بس یہی قوت بخش نسخہ آب حیات ہے۔

طریق استعمال چار چاول کے برابر مکھن یا ملائی میں صبح شام کھائیں اوپر سے دودھ گھی بادام مصری استعمال کریں کھانے میں انار سیب انگور شیریں تقویت دینیوالے پھل کھائیں نیز دال چاول گھی شکر سے کھائیں۔ پوری۔ روٹی کدو کی سبزی استعمال کریں اور بادی چیزوں سے نیز نمک سرخ مرچ اور صحبت سے پرہیز کریں۔ سیندھا نمک۔ کالی مرچ کھا سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ اوپر کا نسخہ پورے طریقہ پر سمجھا کر لکھ دیا گیا ہے بنائیے اور فائدہ اٹھائیے اگر آپ عدیم الفرصت ہیں یا اور کسی وجہ سے خود تیار نہ کر سکیں تو ہم آپکو تیار شدہ دوا لاگت پر مہیا کرنے کو تیار ہیں۔ ۴۰ دن کی خوراک مع ڈاک خرچ ۵ روپیہ میں بھیج دیں گے۔ اگر کوئی صاحب یہ بات ثابت کر دینگے کہ ہماری دوا نسخہ کے مطابق نہیں بنی ہے تو ہم اسکو مبلغ ایکہزار روپیہ انعام دینگے اس سے زیادہ اور کیا سچائی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ایکمرتبہ ضرور آزمائیں (اگر کوئی بات پوچھنا ہو تو جوابی کارڈ بھیج کر دریافت کر سکتے ہیں)

سیوک شیام بہاری لال وید بھوشن آیوروید وشارد شیام چکر کاریالیہ نمبر ۳۲ ۵ شاہجہان پور (یو۔پی)

سالنامہ ادبی دنیا لاہور

سالانہ چندہ پانچ رو

قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ



ادارۂ تحریر

عاشق حسین بٹالوی
بی اے ایل ایل بی

صلاح الدین احمد
بی اے

حفیظ ہوشیارپوری
ایم اے

ادبی دنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔)

تیرا نام

سرودِ عیش و پیامِ قرار تیرا نام　　مری خزاں میں نویدِ بہار تیرا نام
دوائے دردِ دلِ سوگوار تیری یاد　　علاجِ گریۂ بے اختیار تیرا نام
انیسِ حالِ یتیم و سقیم تیرا ذکر　　رفیقِ راہِ غریب الدّیار تیرا نام
فراغِ خاطرِ حرماں نصیب تیری بات　　فروغِ خلوتِ شب ہائے تار تیرا نام
مری امید، مری آرزو، مری تسکیں　　مرا یقین، مرا اعتبار تیرا نام

میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں تیرے نام کی بھیک
ترے جمال کے کوثر سے ایک جام کی بھیک

عرشی امرتسری

بزمِ ادب

"ادبی دنیا" آج رہگذارِ زندگی کے ایک اور سنگِ میل سے گزر کر اپنی نگاہیں منزلِ مقصود کی تلاش میں افق کی طرف اٹھاتا ہے اور ایک نگاہ پیچھے کی طرف بھی ڈالتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اُن ناچیز خدمات کے لئے جو اس نے زبان و ادب کے فروغ و ترقی کی خاطر اب تک انجام دیں۔ اپنے آپ سے شرمندہ نہیں ہے اور خدا کا احسان ہے کہ اُسے آج اپنی منزل پہلے سے زیادہ صاف زیادہ روشن اور زیادہ نمایاں نظر آ رہی ہے۔ ہاں ایک درد ایسا ہے جس کا کوئی درماں نہیں اور ایک زیاں ایسا ہے جس کا کوئی ازالہ نہیں۔ اس درد اور اس زیاں سے میری مراد منصور احمد مرحوم کی ادبی دنیا سے ابدی جدائی ہے۔

ادبی رسالوں کی سال بھر کی زندگی میں سالنامے کی ترتیب و تدوین کا وقت بڑا کٹھن ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی ادارہ کو جن جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن کا تعلق کسی اول درجے کے رسالے سے رہا ہو۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ منصور مرحوم کی زندگی میں ان کے رفیقوں کو محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ سالنامہ کب مرتب ہوا اور کب شائع ہوا۔ مرحوم کی بے پناہ ہمت و سرگرمی اور بے مثال فراست و سلیقہ وری اس عظیم الشان ذمہ داری سے جس خوبی سے عہدہ برآ ہوتی تھی وہ کچھ انہی کا حصہ تھی۔ ہمیں حقیقتاً اس بات کا اعتراف ہے کہ سالنامۂ ادبی دنیا کی پہلی سی آب و تاب برقرار رکھنے میں ہمیں بہت کاوش کرنی پڑی ہے۔ اس بارہ میں ہماری کوششیں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ اس کا فیصلہ ناظرین ہی کر سکتے ہیں۔

سالنامہ آپ کے سامنے ہے اور ہمیں یہ محسوس کر کے بے حد مسرت ہوتی ہے کہ اس سجی ہوئی محفل میں بہت سی وہی صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ جن سے آنکھیں پہلے سے آشنا ہیں۔ ہمارے قلمی معاونین اپنی وضعداریاں اسی طرح نبھا رہے ہیں اور اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا تو یہ صحبت اسی طرح قائم رہے گی اور ادبی دنیا ان مخلصین کی اعانت سے زبان و ادب کی جو خدمت اس سے بن آئے گی انجام دیئے چلا جائے گا۔

آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل آج کل رخصت پر اپنے وطنِ مالوف میں تشریف فرما ہیں۔ شیخ صاحب (دلدادگانِ اردو کو ان کا پرانا خطاب ہی محبوب ہے) کو اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اردو سے ہمیشہ جس قدر شغف رہا ہے اس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے۔ موصوف چند سال سے اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے سلسلہ میں انگلستان میں مقیم ہیں۔ لیکن وہاں بھی انہیں اردو کی لگن برابر لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ نے لندن میں ایک ہندوستانی سپیکنگ یونین (ہندوستانی بولنے والوں کی انجمن) کی بنا ڈالی جو وہاں کے ہندوستانی حلقوں میں بہت مقبول ہو رہی ہے اور غریب الوطن اہلِ ہند کے لئے باہم مل بیٹھنے اور وطن کی یاد تازہ کرنے کا ایک دلکش ذریعہ ہے۔ ہندوستانی زبان کی ہمہ گیری دیکھئے کہ ہندوستان سے باہر جا کر مدراس کا باشندہ بنگالی بابو سے انگریزی کے علاوہ اگر اپنے ملک کی کسی زبان میں گفتگو کرنا چاہے تو اس کی دستگیری اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں کر سکے گی۔ شیخ صاحب نے "لندن میں اردو" کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون سالنامہ کو عنایت کیا ہے۔ اور اس سلسلہ نیازمندی میں جو ادبی دنیا کو آپ کی ذات سے ہے ایک اور حلقہ کا اضافہ فرمایا ہے۔

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی منصور احمد مرحوم کے مشفق ترین بزرگوں میں سے ہیں اور آپ ادبی دنیا کو اب بھی اُسی نگاہِ شفقت سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے مرحوم کی زندگی میں دیکھا کرتے تھے۔ آپ کا مضمون "ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات" وقت کے ایک نہایت اہم مسئلے پر خوش آیند روشنی ڈالتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ روشنی ہمارے ملک کی تاریک فضا میں مشعلِ ہدایت کا کام دے۔

منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی ہمارے خاص کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ "ادیب" اور "العصر" مرحوم کے ایڈیٹر ہونے کے لحاظ سے آپ ملک بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ جن حضرات نے یہ دونوں پرچے دیکھے ہیں۔ اُن سے صاحب موصوف کی علمی فضیلت مخفی نہیں۔ ادبی دنیا میں آپ کے جو علمی مقالے شائع ہوئے ہیں۔

اُن میں مسیحی شعرا کا مسلسل تذکرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے منشی صاحب خود بھی مسیحی ہیں اور آج کل بڑی محنت اور جستجو سے اردو کے مسیحی شعراء کا کلام جمع کر رہے ہیں۔ یہ چیز اگر مکمل ہو گئی تو منشی صاحب کی خوش ذوقی اور قابلیت کے پیشِ نظر ہماری زبان میں ایک بے حد دلچسپ اور قابلِ قدر اضافہ ثابت ہو گی آپ نے سالنامے میں "گارڈنر خاندان کے اردو شعراء" کے عنوان سے جو بیش قیمت مضمون لکھا ہے وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ناظرین دیکھیں گے کہ کس وجہ دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون ہے۔

پروفیسر **بشیر احمد صاحب** ہاشمی ایم اے نے فصیح الملک داغ دہلوی کی شاعری پر ایک سیر حاصل مقالہ سالنامہ کو عنایت فرمایا ہے۔ اگرچہ ہمیں ذاتی طور پر پروفیسر صاحب کے بعض خیالات سے اختلاف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مقالہ صاحبِ مضمون کی دقتِ نظر اور تنقید نگاری کے اصولوں سے صحیح واقفیت کا پتہ دیتا ہے اردو میں تنقید شعری کا یہ اسلوب اُن خوش آیند انقلابات میں سے ہے جو مغربی لٹریچر کے وسیع مطالعہ کے باعث ہمارے بعض ترقی پسند اہلِ قلم کے ذریعہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر پروفیسر صاحب، جہاں انہوں نے داغ کی بعض غزلوں میں ابتذال کے پہلو خوردبین لگا لگا کر دیکھے ہیں وہاں اس کی شوخیِ کلام ندرتِ بیان اور سحرِ الفاظ کے محاسن پر بھی نظر ڈال لیتے۔ بہر حال مضمون نہایت فاضلانہ ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اس کے مطالعہ سے اہلِ ذوق میں ایک ہیجان ضرور پیدا ہو جائے گا۔

ہمارے فاضل دوست پروفیسر **حمید احمد خاں صاحب** ایم اے نے رفیقِ محترم عاشق حسین صاحب بٹالوی کی تصنیف سوز ناتمام پر ایک نہایت عالمانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک دوست کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اردو کے آخری اور موجودہ دور کی افسانہ نگاری کا ایک بے نظیر تجزیہ ہے۔ پروفیسر صاحب اُن گنتی کے افراد میں سے ہیں جنہیں صحیح تنقید نگاری کا فن مبداءِ فیاض سے ارزانی ہوا ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ بہت کم لوگ حمید احمد خاں جیسی جامع۔ دلچسپ۔ بے لاگ۔ اور فاضلانہ تنقید نگاری کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کا موجودہ مضمون ان کے فن کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اسے غایت درجہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

ہمارے دور افتادہ کرمفرما پروفیسر **نور الحسن صاحب** برلاس مقیم ٹوکیو نے "جاپانی طالب علم کے لطفِ زندگی" پر ایک نہایت لطیف اور معلومات سے لبریز مضمون لکھا ہے جسے ہمارے ہاں کے طلبا خاص دلچسپی سے پڑھیں گے۔ طالب علموں کے رجحاناتِ طبع خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ قریباً یکساں ہوتے ہیں۔ وہی زندگی کے روشن پہلو پر نظر۔ وہی بے فکری اور خوش وقتی۔ وہی خرچ کی کمی کا شکوہ۔ وہی ماؤں سے "دستِ غیب" کا سلسلہ۔ غرضکہ یہ اور ایسی بہت سی اور باتیں سب طالب علموں میں مشترک ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں جاپانی طالب علم کی کہانی اُسی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سید **نجم الدین احمد صاحب** جعفری نے ہندوستان میں عورت کی حیثیت پر ایک بہت عمدہ مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے اور اس ملک میں صنفِ نازک کے ماضی و مستقبل پر ایک فاضلانہ نگاہ ڈالی ہے۔ وہ اصحاب جو حقوقِ نسواں کے مسائل میں خاص دلچسپی لیتے ہیں اور وہ خواتین جو اس بارے میں اپنے طبقے کی رہبری کرتی ہیں۔ اس مضمون سے کافی فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہمارے نکتہ سنج دوست جناب **میراجی** نے چینی شاعرِ اعظم لی پو کی شاعری پر ایک نہایت دلاویز مضمون عنایت فرمایا ہے اور اسے چینی نظموں کے منظوم و منثور اردو تراجم سے آراستہ کیا ہے میراجی کا اندازِ بیان، خواہ وہ نثر لکھیں یا نظم، ایک دلکش ندرت اور ایک لطیف شوخی لئے ہوتا ہے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ اس مضمون میں ان کے یہ ادبی محاسن کس قدر نمایاں ہیں۔ چین آج کل ایک قیامت صغرےٰ میں مبتلا ہے اور ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف لگ رہی ہیں۔ ایسے میں چینی شاعرِ اعظم کے نغموں میں کھو جانا کیسا عجیب احساس ہو گا!

پروفیسر قاضی **محمد اسلم صاحب** ہماری بزم میں پہلی بار آئے ہیں لیکن اپنے ساتھ ایک عجیب چیز لائے ہیں۔ انہوں نے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں طالب علمانہ حیثیت سے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن آنجہانی کا کتب خانہ دیکھا تھا اور اب انہوں نے اس کے تاثرات ادبی دنیا کے ناظرین کے سامنے پیش کئے ہیں، مگر ایسے دلچسپ انداز میں کہ وہ فلسفے کے پروفیسر معلوم نہیں ہوتے۔ فلسفی عموماً بہت خشک ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں بھی خشک ہوتی ہیں۔

مگر یہ ہمارے پروفیسر صاحب عجیب فلسفی ہیں کہ ایسی دلچسپ باتیں ایسے دلکش انداز میں سناتے ہیں۔

ادبی دنیا کے پرانے معاون جناب **خلیل** نے بنگال کے شاعرِ اعظم چنڈی داس کو پہلی مرتبہ ادب اردو سے روشناس کرایا ہے اور حق یہ ہے کہ تعارف کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ خلیل صاحب ایک پرزور اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ چنڈی داس اور رامی کی داستانِ محبت اور چنڈی داس کے جذباتِ عشق کے بیان میں ان کے قلم نے وہ وہ رنگینیاں بکھیری ہیں کہ سالنامے کے اوراق دامانِ باغبان ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح رادھا اور کرشن کی محبت کی مختلف کیفیات اور رادھا کے نغمہ ہائے فراق کی ترجمانی ایسے دلکش انداز میں کی ہے کہ جی چاہتا ہے یہ نغمے کبھی ختم نہ ہوں اور ہم رادھا کرشنا کی پریم کہانی میں اپنے آپ کو فراموش کر دیں۔

حضرت تسکین عابدی ہر سال سالنامے کے لئے ایک معرکے کا مضمون لکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سال بھی انہوں نے یہ ریت پوری کر دی۔ "بیگمات اودھ کے خطوط" واجد علی شاہ کے انتزاعِ سلطنت کی تصویریں ہیں۔ یہ خطوط آخری تاجدار اودھ کی جلاوطنی کے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ خطوط کیا ہیں مصیبت زدہ بیگمات کے نالہائے فراق اور افسانہ ہائے مصائب ہیں۔ کہیں کہیں گزری ہوئی دلچسپیوں اور بیتے ہوئے دنوں کی رنگین مرقعے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ نثر اس زمانہ کی طرزِ تحریر کے مطابق عموماً مقفےٰ ہے۔ کئی خطوط منظوم ہیں یا اشعار سے اٹے ہیں۔ ان سب میں زبان کی پاکیزگی اور اشعار کی برجستگی دیکھنے کے قابل ہے۔ تسکین صاحب نے ان خطوط کی تدوین میں کافی محنت اٹھائی ہے اور ایک قابلِ قدر تاریخی چیز اہلِ ذوق کے روبرو پیش کی ہے۔

سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی نے عہدِ مغلیہ کی تاریخ کا ایک بھولا ہوا ورق "فرنگی مبلغ دربارِ مغلیہ میں" عنایت فرمایا ہے۔ مضمون کافی ریسرچ سے لکھا گیا ہے اور اس ضمن میں سید صاحب کی مساعی قابلِ مبارکباد ہیں۔ ہندوستان پر اہلِ فرنگ کا قبضہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے اور اس حیرت انگیز ڈرامے کے مختلف مناظر اپنے اندر چشمِ عبرت کے لئے بے حساب سامانِ بصیرت پنہاں رکھتے ہیں۔ تجارت، تبلیغ، حکمت کس کس ذریعے سے فرنگیوں نے سرزمینِ ہند میں قدم جمائے اور پھر کس طرح اس کے حکمران بن گئے، ایک نہایت غم انگیز داستان ہے اور سید صاحب کا یہ مضمون اس داستان کا ایک دلکش باب۔

مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے ازراہِ قدردانی ادبی دنیا کو ایک چھوٹا سا علمی مضمون عطا فرمایا ہے جس میں اہلِ ہندوستان کے لئے علاج کے دیگر طریقوں کے مقابلے میں طب یونانی کی موزونیت نہایت عمدگی سے ثابت کی ہے۔ ازبسکہ راقم الحروف اس فن سے بے بہرہ ہے اس لئے اپنی ناقص رائے کے اظہار سے قاصر ہے اور حکیم صاحب موصوف کی شخصیت اور علمیت ہی کو اس مضمون کی فضیلت کی سب سے بڑی دلیل قرار دیتا ہے۔

افسانے اور ڈرامے

کرشن چندر صاحب ایم اے نے ایک سراپا لطافت افسانہ لکھا ہے۔ "یرقان"۔ بادی النظر میں یہ ایک افسانے کا کیسا عجیب نام ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ افسانہ پڑھنے کے بعد مجھے اس بیماری سے محبت سی ہو گئی ہے اگرچہ خود کرشن چندر صاحب کو معلوم نہیں کہ یرقان محبت ہے یا محبت یرقان۔ ایسے افسانے روز روز نہیں لکھے جاتے۔ بس پڑھئے اور اس کی فضاؤں میں کھو جائیے۔

رفیقِ گرامی **عاشق صاحب** کا افسانہ "جوانی کا خواب" ان کے آرٹ کی پختگی کی ایک تازہ مثال ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے بعد ان کے افسانوں نے جو رنگ اختیار کیا ہے۔ میری نگاہ میں اس کی بہترین مثال ان کا ایک افسانہ "فریبِ خیال" ہے۔ جو ادبی دنیا کے کسی گزشتہ نمبر میں طبع ہو چکا ہے۔ لیکن فریبِ خیال میں بیان کی شوکت اور الفاظ کے شکوہ نے وہ صورت اختیار نہیں کی جو موجودہ افسانہ میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تو جذبات و حسیات کی ایک بے پناہ رو تیز تر اور رقیق تر الفاظ کی طغیانی میں ہل کر پڑھنے والے پر امڈ آتی ہے اور اسے اضطراب و ہیجان کے ایک سیلابِ رنگیں میں بہا لے جاتی ہے اور افسانہ ختم کرنے پر ایک نامعلوم خوف، ایک بے نام اضطراب روح پر چھا جاتا ہے۔ ممکن ہے آپ کے احساسات کچھ اور ہوں میں نے اپنے تاثرات بیان کر دیئے ہیں۔

حضرت طاہر قریشی نے اردو میں فرانس کے زندۂ جاوید افسانہ نگار موپساں کے افسانے جس قدر اور جس خوبی سے منتقل کئے ہیں کسی اور اہلِ قلم نے نہیں کئے۔ انسان کے نازک ترین اور بسا اوقات ناقابلِ بیان جذبات کو موپساں نے جس قدرتِ بیان سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اور جس لطافت سے ان کی تحلیل کی ہے۔ وہ بہت کم مصنفین کو نصیب ہوئی ہے۔ اس لطیف پیکر کو اردو کا لباس پہنانا اور اس طرح پہنانا کہ شاہدِ معنی اپنے لباسِ نو میں اجنبی نظر نہ آئے۔ کچھ آسان کام نہ تھا لیکن طاہر صاحب نے اس بارے

ہیں قابلِ رشک کامیابی حاصل کی ہے اور اُن کی تازہ ترین کوشش "ہمزاد" جو سالنامہ کے اوراق کی زینت ہے۔ ایک نہایت کامیاب کوشش ہے۔

سالنامہ میں اس دفعہ چار مختصر ڈرامے شائع ہو رہے ہیں۔

عزت اور ماں تا۔ شاعر کی موت۔ دیوی اور برابر کی چوٹ۔ اور ہمیں اس امر پر فخر ہے کہ چاروں ڈرامے اپنی اپنی جگہ ڈرامہ کے آرٹ کی بہترین مثالیں ہیں۔

عزت اور ماں تا ہمارے عزیز دوست **اندر لال داس صاحب قمر** کے نتائجِ فکر میں سے ہے۔ ناظرینِ ادبی دنیا قمر صاحب کے ڈراموں کی فضا سے مانوس ہیں۔ وہ فیشن ایبل سوسائٹی کی بولتی ہوئی تصویریں نہایت خوبی سے اتارتے ہیں اور اپنے کرداروں کی چھوٹی چھوٹی لیکن نتیجہ خیز حرکات کو ایسی چابکدستی سے ٹھیک موقعوں پر بٹھاتے ہیں کہ اگر آپ سارے ڈرامے میں سے ایک خفیف ترین تفصیل ایک چھوٹی سی جنبش علیحدہ کر دیں یا بدل دیں تو آپ کو سارے ڈرامے پر وہی اثر نظر آئے گا جو ایک قدِ آدم آئینہ میں ذرا سا بال آ جانے سے نظر آتا ہے۔

"شاعر کی موت" فنونِ لطیفہ خصوصاً شاعری کی اس قدر قیمت پر ایک دلکش ڈرامائی طنز ہے جس کا اطلاق فن کار اور شاعر کے حقیقی جوہر کی بنا پر نہیں بلکہ فیشن کے طور پر عوام کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ پروفیسر **قاضی فضل حق صاحب** نے اسے جدید فارسی کے واسطہ سے فرانسیسی سے اردو میں منتقل کیا ہے اور صاحبِ موصوف نے جہاں ترجمہ میں اُستادانہ مہارت کا اظہار کیا ہے وہاں جدید فارسی کے چند نہایت مناسب و موزوں الفاظ اردو میں داخل کئے ہیں۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے ادیب ان نووارد مہمانوں کو بہت جلد اپنا لیں گے۔

"دیوی" **جناب فضل حق قریشی** دہلوی کے زودِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی بیوہ صدیوں سے سماج کے مظالم کا تختۂ مشق رہی ہے اور خبر نہیں کب تک رہے گی۔ ان ستم رانیوں کے خلاف ہمارے عہد میں جتنی صدائیں بلند ہوئی ہیں۔ اُن میں "دیوی" ایک نہایت موثر اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ قریشی صاحب نے منورما اور رکمنی کے مکالمہ میں بیوہ کے جذبات کی تپش اندوزیوں اور سہاگن کے دماغی سکون کی جو کیفیت دکھائی ہے وہ اُن کے کمالِ فن کی شاہد ہے۔

"برابر کی چوٹ" صاحبزادہ **محمد عمر** صاحب کی جولانیٔ طبع کی شرمندۂ احسان ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی ذاتِ گرامی دنیائے ڈرامہ میں اس قدر متعارف ہے کہ ہما ساان کے نتیجۂ فکر کی نسبت کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے

بس اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ "برابر کی چوٹ" ایک چھوٹا سا ڈرامائی مزاح ہے جس میں فن کاری کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں۔ مکالمہ نہایت بے ساختہ اور ہر کردار کی علمیت اور درجے کے عین مطابق ہے اور زبان بے حد شگفتہ اور سلیس ہے۔ شبدا دکا "کلائی میکس" سے ذرا پہلے قدرتی طور پر رخصت ہو جانا اور پھر واقعات کے رُخ کا خلافِ توقع یکسر بدل جانا ڈرامہ کی ٹکنیک پر صاحبزادہ صاحب کے کامل عبور کی شہادت ہے۔

پروفیسر **فیاض محمود** صاحب معاشرتی افسانے لکھنے میں جو کمال رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اُن کا مکالمہ "دس سال" ہے۔ عورت کی فطرت کا جن لوگوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ عورت شادی کے بعد اپنے نئے ماحول میں خواہ وہ اس کے فطری رجحانات سے بے حد مختلف ہی کیوں نہ ہو اپنے آپ کو اس طرح جذب کر لیتی ہے کہ بظاہر اس قربانی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کے گذارے ہوئے کے نمایاں تاثرات اس کے نہاں خانۂ دل میں آتشِ بے دود کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ مرد کا حال اس سے بالکل جدا ہے۔ اس کی فطرت خودغرضانہ ہے اور وہ اپنی بیوی سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور اس شخصیت کے ساتھ وابستہ تمام تاثرات یکسر محو کر کے اس کی ذات اور اس کی دلچسپیوں میں فنا ہو جائے۔ فیاض صاحب کا یہ مکالمہ انسانی فطرت کے اس پہلو کی ایک سچی اور دلکش تصویر ہے۔

جناب غلام عباس مولوی اگرچہ مرکزِ اردو سے دور افتادہ صوبہ بمبئی سے تعلق رکھتے ہیں تاہم بامحاورہ اور سلجھی ہوئی زبان لکھتے ہیں۔ "ماؤ ماؤ" مشہور روسی افسانہ نگار ترجنیف کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے اور ترجمہ کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس میں ایک سادہ دل دہقان۔ ایک بے زبان جانور اور ایک دولتمند رئیسہ کے افکار و جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور فطرتِ انسانی کے بعض نہایت لطیف رُخ نمایاں کئے گئے ہیں۔ دولت اور اس کے تصنعات۔ غریبی اور اُس کی آزادیاں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں اور دیکھنے والی آنکھ کو بہت کچھ دکھا جاتی ہیں۔

جناب سیفی نوگانوی اردو کے ایک کہنہ مشق ادیب اور ادبی دنیا کے مستقل معاون ہیں۔ انہوں نے اس دفعہ "بھولا ہوا خواب" کے عنوان سے بابل کی تباہی کی داستان لکھی ہے اور ایک عشرت زدہ قوم کی غفلت اور تباہی کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ سیفی صاحب نے اپنے افسانے میں ایک ایسی حقیقی فضا پیدا کر دی ہے کہ پڑھنے والے کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ

بابل کے شاداب اور رنگ وبو سے معمور معلق باغوں میں اہلِ بابل کے ساتھ دادِ نشاط دے رہا ہے کہ یکایک ایرانی سورماؤں کے فلک شگاف نعرے اُسے اس دلفریب خواب سے چونکا دیتے ہیں۔ افسانہ کیا ہے چشمِ بصیرت کے لئے عبرت کا خزینہ ہے۔

اردو کے مشہور ادیب جناب **لطیف الدین احمد صاحب** اکبرآبادی ادبی دنیا کی بزم میں پہلی مرتبہ شامل ہو رہے ہیں۔ آپ نے ایک چھوٹا سا افسانہ "حقیقتِ افسانہ" کے نام سے لکھا ہے جو درحقیقت دریا بہ حباب اندر ہے اور آرٹ کے لحاظ سے عجیب مزے کی چیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ل۔احمد صاحب آیندہ ادبی دنیا کے لئے اپنے اوقات گرامی میں سے کچھ زیادہ فرصت نکالا کریں گے۔

پنجاب کے ہونہار افسانہ نگار سردار **راجندر سنگھ بیدی** اُن نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں "ادبی دنیا" نے دنیائے ادب میں روشناس کرانے کا فخر حاصل کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی میں ایک کامیاب افسانہ نگار کے تمام لوازم پائے جاتے ہیں۔ پچھلے سالنامہ کا بہترین افسانہ "مہارانی کا تحفہ" آپ ہی نے لکھا تھا اور ہمیں مسرت ہے کہ اس دفعہ بھی ان کا ایک بہترین افسانہ "بھولا" سالنامہ کے صفحات کی زینت بن رہا ہے۔ "بھولا" ایک چھوٹے سے ذہین بچے کے جذبات و تفکرات کی بے نظیر تصویر ہے اور اس معصوم تصویر میں نوجوان مصور نے جس نفاست سے رنگ و روغن بھرے ہیں انہیں دیکھ کر تصویر کی سادگی اور مصور کی پرکاری کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ اگر سردار راجندر سنگھ نے اپنی مشق یوں ہی جاری رکھی تو کسی دن یہ بہت بڑے افسانہ نگار بن جائیں گے۔

حضرتِ **وقار انبالوی** کے نام سے کون آشنا نہیں۔ آپ خود دیہاتی ہیں اور دیہاتی زندگی۔ دیہاتی عقائد، دیہاتی رسم و رواج۔ دیہاتی ادب آداب غرضکہ ہر دیہاتی چیز کے عاشق زار ہیں۔ ادبی دنیا میں وقتاً فوقتاً آپ کے "دیہاتی" افسانے عجیب کرشمہ بینوں سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس دفعہ بھی انہوں نے اسی قسم کا ایک دلچسپ افسانہ "چور" ہمیں عنایت فرمایا ہے جس سے آپ غالباً یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم دیہاتیوں کے چور بھی تم شہریوں کے سادھوؤں سے اچھے ہوتے ہیں۔ اچھا صاحب یونہی سہی۔ آپ بھی اچھے آپ کے چور بھی اچھے۔ ہم ہی مجبور ہیں جنہوں نے اس بات کا شکوہ کیا ہے۔

وقار صاحب نے ایڈیٹر ادبی دنیا کی فرمائش پر سالنامے کے لئے ایک "ترانۂ وطن" بھی لکھا تھا جو ان کی ایک "شبیریں" غلطی کے باعث یا بقول ان کے احباب کی نوازش سے قبل از وقت ایک مقامی روزنامہ میں چھپ گیا اور اس طرح چھپا کہ وقار اب منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ہم نے صحافتی وضعداری کے آئین کے ماتحت اسے سالنامہ میں درج نہیں کیا جس کا ہمیں خود بے حد افسوس ہے۔ خیر ان کی یا ان کے دوستوں کی غلطی کی تلافی جنوری نمبر میں کردی جائے گی۔

"پاربتی" ہمارے مکرم دوست جناب **آسی رام نگری** کا نتیجۂ فکر ہے۔ آسی صاحب ایک کہنہ مشق ادیب ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اُس سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ "پاربتی" میں انہوں نے گاؤں کی سادہ زندگی کا ایک سلسلہ سا واقعہ لکھا ہے۔ مگر اس طرح لکھا ہے کہ ہزار رنگ آمیزیاں اس سادگی کو نہیں پہنچتیں۔ غریب پاربتی کو کیا خبر تھی کہ وہ بچپن میں جس بڑھاپے کا مذاق اڑاتی تھی وہ بڑھاپا دولت کے بل پر اس کی جوانی سے ایسا خوفناک انتقام لے گا۔ آسی صاحب کی زبان میں مشرقی یو پی کے بیسیوں محاورے ملتے ہیں جن سے ناظرین کو پورا فایدہ اٹھانا چاہئے۔

سالنامے کا آخری افسانہ ہمارے دوست "میراجی" کا "تُھا پریم" ہے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آزاد نظموں اور اقوامِ عالم کی شاعری پر دلآویز مضامین کے علاوہ میراجی افسانے بھی لکھتے ہیں۔ مگر جب یہ افسانہ دیکھا تو اسے بھی اُن کے مخصوص رومانی اور شاعرانہ رنگ میں غرق پایا۔ میراجی کا قلم صحیح معنوں میں ایک خامۂ گلریز ہے اور یہ افسانہ تو انہوں نے رنگ و بو کے طوفان میں ڈوب کر لکھا ہے۔ کس قدر دلکش فقرہ ہے "اور وقت کی چیونٹیاں لمحوں کے ذرّے بلوں میں بھرتی رہیں"۔ کیسا نازک استعارہ ——— کیسی دلچسپ حقیقت نگاری ہے۔

"عقل اور عشق کا مجادلہ" ہمارے شعرا کے لئے ایک دل پسند موضوع ہے لیکن اس افسانے میں جس رنگینی سے یہ حقیقت بے نقاب کی گئی ہے اُس کی مثال بہت کم ملے گی۔

حصہ نظم

یہ امر ہمارے لئے بے حد مسرت و امتنان کا موجب ہے کہ موجودہ سالنامہ اپنی نظموں کی ندرت۔ بلندیِ حسن اور فراوانی کے لحاظ سے صحافت اردو میں بے نظیر ہوگا۔ ۱۵ بلند پایہ اور دلآویز نظمیں اور غزلیں سالنامہ کے صفحات کو غیرتِ

مددگار ابنا رہی ہیں۔ شعر کے متعلق بقول منصور احمد مرحوم ہمارا مذہب یہ ہے کہ از بسکہ شعر ایک وجدانی صنفِ ادب ہے جس کی تشریح اسے اور مجمل بنا دیتی ہے اور اس کے حسن و ... تک پہنچنے میں کوئی خاص مدد نہیں کرتی۔ اس لئے مجمل طور پر اس کا ذکر کرنے سے بہتر ہے کہ اس کے راگ، رنگ اور رس کو بدستور اہلِ ذوق کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ مندرجہ ذیل سخنور حضرات نے اپنے تخیلاتِ جمیل سالنامہ کو مرحمت فرما کر ہمیں ممنون فرمایا ہے اور ادبی دنیا کے ناظرین کے لئے ایک ایسے فردوسِ شعر ونغمہ کے دروازے کھول دیئے ہیں جس کے رنگ برنگ سدا بہار پھول رہتی دنیا تک اپنی کیف آور خوشبو سے مشامِ جان کو معطر کرتے رہیں گے۔

جناب جوش ملیح آبادی۔ حضرت ساغر نظامی۔ جناب سیماب اکبر آبادی جناب اختر شیرانی۔ حضرت احسن مارہروی۔ محترمہ ع۔ ب صاحبہ۔ پروفیسر فیض احمد صاحب فیض۔ جناب فراق گورکھپوری۔ مرزا عباس بیگ صاحب محشر پنڈت امرجیت صاحب شرما۔ جناب شہید ابن علی۔ جناب اثر صہبائی۔ جناب ضیا فتح آبادی۔ سعید احمد صاحب اعجاز۔ جانشین داغ وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی۔ جناب اسد ملتانی۔ جناب علی منظور۔ جناب احسان دانش۔ جناب روش نکودری۔ جلال الدین صاحب اکبر۔ نصر اللہ خاں صاحب عزیز۔ جناب اختر انصاری۔ جناب جلیل قدوائی۔ پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر۔ سید عبدالحمید صاحب عدم۔ جناب عبید عرفانی۔ اصغر حسین صاحب نظیر۔ جناب مسعود شاہد۔ احمد ندیم صاحب قاسمی۔ جناب نجم ندوی۔ "میراجی"۔ جناب بہزاد لکھنوی۔ جناب مسعود حفیظ۔ مرزا جلال الدین صاحب۔ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم۔ جناب حرماں خیر آبادی جناب دینا ناتھ کاشمیری۔ جناب قیس شروانی۔ جناب عظیم قریشی۔ جناب قیوم نظر۔ جناب سراج الدین ظفر اور جناب تاجور سامری۔

تصاویر

مندرجہ ذیل سات رنگین تصاویر شاملِ سالنامہ ہیں۔ شامِ ساہ راجستان۔ صبحِ بہار۔ شفق۔ افسانہ خواں۔ عکسِ جمال۔ اور وینس کی جلوہ گاہ۔ ان میں سے اول الذکر دو مشرقی اور آخر الذکر پانچ مغربی مصوری کے شاہ کار ہیں۔ "شام" کے مصور لاہور کے ایک ممتاز آرٹسٹ سید اللہ خاں صاحب ہیں۔ اس تصویر کی سب سے بڑی خوبی اس کی رنگ آمیزی اور اس کی فضا ہے۔ وقت کی شام کے ساتھ زندگی کی شام کی ہم آہنگی ایک عجیب غم انگیز کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ بے برگ درخت اور قدیم عمارات کا منظر اس کیفیت کو پائندہ تر کر دیتا ہے۔ یہ تصویر ہمیں اپنے کرم دوست جناب خورشید احمد بی ایس سی کی وساطت سے حاصل ہوئی۔ دیگر تصاویر کا انتخاب ہمارے مستقل مشیرِ فن سید سرفراز کے قیمتی مشوروں کا رہینِ منت ہے۔ تصاویر بھی اشعار کی طرح اپنے اندر ایک وجدانی کیفیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی تشریح کی کوششیں چنداں سود مند نہیں ہوتیں۔

ناظرین خود ہی ان جنت نگاہ مرقعوں سے اپنے ذوقِ سلیم کی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیں۔

سہ رنگی تصاویر کے علاوہ مندرجہ ذیل یک رنگ تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہیں

"ننھی گڑیا تم بھی دعا مانگو"۔ نخلستان۔ جامِ فیض۔ رمراکش۔ ننھی۔ انجامِ سطوت ٹھنڈی چھاؤں۔ کنول کلیاں۔ ان میں سے ہر ایک تصویر مصوری اور فوٹوگرافی کے آرٹ کی ایک بہترین مثال ہے۔ فصیح الملک داغ دہلوی۔ سر عبدالقادر اور منصور احمد مرحوم کی تصاویر کے علاوہ ادبی دنیا کے قلمی معاونین میں سے متعدد اصحاب کی تصاویر زینتِ اوراق ہیں مگر گذشتہ سال جس گیدڑی کا افتتاح کیا گیا تھا۔ اس میں یہ اضافے ہمارے لئے مسرت کا باعث ہیں۔

سالنامہ کے مضامین کی طباعت حسبِ معمول گیلانی پریس میں ہوئی اور تصاویر وکٹوریہ پریس نے چھاپیں۔ بلاک مدن ہاف ٹون کمپنی نے بنائے اور کتابت کا بیشتر حصہ ہمارے مستقل خوشنویس مولوی محمد شریف صاحب کے قلم اعجاز رقم کا ممنون ہے ہم ان سب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے سالنامہ کی تیاری میں محنت اور شوق سے حصہ لیا۔

ہمیں اُن اصحاب سے بے حد ندامت ہے جن کے گرامی قدر مضامین سالنامہ کی زینت نہ بن سکے اس کا باعث یہ ہرگز نہیں کہ ان کے مضامین کسی لحاظ سے کم درجہ رکھتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ترتیب و طباعت کی گوناگوں مشکلات اور اس پر مضامین کا تنوع اور توازن برقرار رکھنے کا لزوم۔ نیز مضامین کی موصولی میں تاخیر یہ سب مل کر ایسی روح فرسا حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ بعض نہایت بیش قیمت مضامین شاملِ اشاعت ہونے سے رہ جاتے ہیں اور یہ بات ہمارے لئے بے حد ناخوشگوار اور رنج دہ ہوتی ہے۔

آخر میں راقم الحروف اپنی اور اپنے محترم رفقائے کار جناب عاشق حسین بٹالوی اور جناب حفیظ ہوشیارپوری کی جانب سے اُن تمام دوستوں اور کرمفرماؤں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنے بیش قیمت مضامینِ نظم و نثر عنایت فرما کر سالنامہ کو ادبِ اردو کی ایک گراں قدر تالیف کے درجے پر پہنچایا۔ ہماری ناچیز کوششیں انہیں کی حوصلہ افزائی سے فروغ پاتی ہیں اور ہم انہیں کی اعانت کے بھروسے پر اس دشوار گزار راستے پر قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔

اے کشورِ ہندوستاں

اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے خُلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن!
کوثر ہے جن میں موجزن ان آبشاروں کے وطن!
نازاں ہے جن پر ایشیا، ان کوہساروں کے وطن!
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

ہمدوشِ شیخ و برہمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمعِ وطن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
فخرِ دلیرانِ زمن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

تھا، زندگی کے نور سے معمور، کاشانہ ترا
اے شمعِ تہذیبِ کہن، عالم تھا پروانہ ترا
خورشید و انجم کو ابھی ہے یاد افسانہ ترا
وہ عہدِ زرّیں آج تک بھولا نہیں ہے آسماں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

حُبِّ وطن کی لہر ہے بیگانۂ زنجیر پھر!
ہلنے لگی ہے ظلم و استبداد کی تعمیر پھر!
آزادیوں کے خواب ہیں دامن کشِ تعبیر پھر!
پھر انقلابِ دہر نے بدلا ہے اندازِ جہاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

پھر شعلہ افشاں زمزمے، آتش زنِ مضراب ہیں
پھر ولولوں کی تیز موجیں، عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوانِ ہند کی ہر سانس میں بے تاب ہیں
بیداریوں کے قافلے، آزادیوں کے کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

باطل کبھی تنویرِ حق کی تاب لا سکتا نہیں!
شمعِ جلالِ حرّیت کوئی بجھا سکتا نہیں!
کوئی بھی اب تجھ کو غلامستاں بنا سکتا نہیں!
ہے ذرّے ذرّے کی رگوں میں روحِ آزادی رواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

ہے زیبِ دامانِ شفق، خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن ہیں، نوجوانانِ وطن!
افتان و خیبر ان بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

جنت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا!
آزادیٔ افکار کا مژدہ سنایا جائے گا!
انسانیت کا تجھ کو گہوارہ بنایا جائے گا!
وہ دن بہت نزدیک ہے از فضلِ ربِّ دو جہاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں!

روش صدّیقی

فغاں

اس نظم کا خیال جمشید جہاں کے ایک شذرۂ نثر سے ماخوذ ہے

ناراض تم اس وقت ہوئے مجھ سے مری جاں
ناراض نہ ہونے کا تھا جو وقت مری جاں

پھر پا نہ سکی آہ تمہیں کھو کے مری جاں
پھر لا نہ سکی پہلا سا وہ وقت مری جاں

اس وقت مجھے بھول گئے تم مرے پیارے
جس وقت کہ تھے ہوش مرے گم مرے پیارے

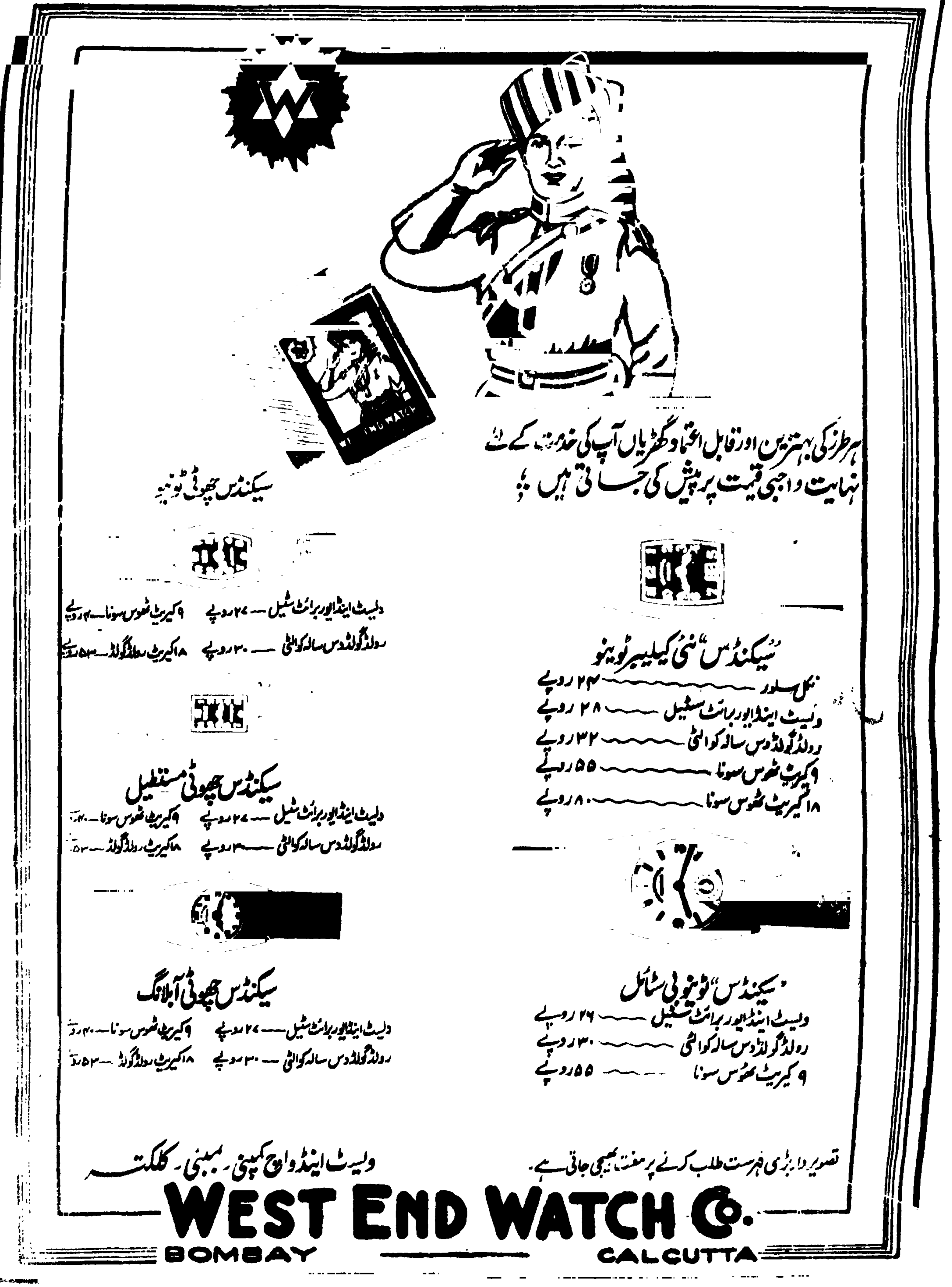
اس وقت مجھے چھوڑ دیا تم نے مری جاں
جس وقت گھلا دی تھی تالم نے مری جاں

جب پہلے پہل آئے تھے تم یاد ہے مجھ کو
ہاں یاد وہی لمحۂ ناشاد ہے مجھ کو

اے آہ میں اس وقت کو زندہ ہی نہ ہوتی
زندہ ہی نہ ہوتی تو نہ یوں آج میں روتی

ناراض تم اس وقت ہوئے مجھ سے مری جاں
ناراض نہ ہونے کا تھا جو وقت مری جاں

منصور احمد مرحوم


ہر طرز کی بہترین اور قابل اعتماد گھڑیاں آپ کی خدمت کے لئے
نہایت واجبی قیمت پر پیش کی جاتی ہیں۔
سیکنڈس چھوٹی ٹونیو
ولیسٹ اینڈ اور برائٹ سٹیل ـــ ۲۷ روپے ۹ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۴۰ روپے
رولڈ گولڈ دس سالہ کوالٹی ـــ ۳۰ روپے ۱۸ کیریٹ رولڈ گولڈ ـــ ۵۲ روپے
سیکنڈس چھوٹی مستطیل
ولیسٹ اینڈ اور برائٹ سٹیل ـــ ۲۷ روپے ۹ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۴۰ روپے
رولڈ گولڈ دس سالہ کوالٹی ـــ ۳۰ روپے ۱۸ کیریٹ رولڈ گولڈ ـــ ۵۲ روپے
سیکنڈس چھوٹی آبلانگ
ولیسٹ اینڈ اور برائٹ سٹیل ـــ ۲۷ روپے ۹ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۴۰ روپے
رولڈ گولڈ دس سالہ کوالٹی ـــ ۳۰ روپے ۱۸ کیریٹ رولڈ گولڈ ـــ ۵۲ روپے
سیکنڈس "نئی کیلیبر ٹونیو
نکل سلور ـــ ۲۴ روپے
ویسٹ اینڈ اور برائٹ سٹیل ـــ ۲۸ روپے
رولڈ گولڈ دس سالہ کوالٹی ـــ ۳۲ روپے
۹ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۵۵ روپے
۱۸ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۸۰ روپے
سیکنڈس "ٹونیو بی سٹائل
ویسٹ اینڈ اور برائٹ سٹیل ـــ ۲۶ روپے
رولڈ گولڈ دس سالہ کوالٹی ـــ ۳۰ روپے
۹ کیریٹ ٹھوس سونا ـــ ۵۵ روپے
تصویر دار بڑی فہرست طلب کرنے پر مفت بھیجی جاتی ہے۔
ولیسٹ اینڈ واچ کمپنی ۔ بمبئی ۔ کلکتہ
WEST END WATCH Co.
BOMBAY
CALCUTTA

یرقان

"یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں"، یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے۔ سائنسدانوں کے اُس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذاتِ خود روشن نہیں۔ دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنسداں عامیوں سے الگ پہچانے جاسکتے ہیں ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کرسکے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نسیاں پر دھر دیا جائے۔

بہرحال آپ کو باور کرلینا چاہئے کہ یرقان ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند، بصورتِ دیگر آپ کو اس کہانی کے پڑھنے یا سننے سے کوئی فایدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا، جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح یرقان میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی زردی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہوا اور بس۔ اس کے بعد مرض کا ایک اور درجہ ہے زندگی کی ایک اور منزل ہے جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھ ایسا شریف کنوار ازدوان حاصل کرلیتا ہے۔

بس یہی ہماری اس مختصر سے قصے کی ابتدا تھی، نہ میں بیمار پڑتا نہ شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ ہے۔ یعنی میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے۔ بیس روپے تنخواہ پاتا ہے، اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں، شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے۔ اُس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہوجاتا ہے۔ بیچاری ان پڑھ ہے نا اور رجب میں سیف الملوک ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی ہے، لجاتی ہے اور بیاری معلوم ہوتی ہے، گل عارض پر چمک اور آنکھوں میں : نمک آجاتی ہے، لب کلبلتے ہیں اور پھر مجھے یکایک اس کی مہین شیریں آواز سنائی دیتی ہے "آگے کیوں نہیں پڑھتے"! اور . . . میں بھلا خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے تک گیا تھا، محبت! نہیں یرقانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان؟

ایک دن . . . وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے . . . میں بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے، وہ اُن کے کوئے بیچتا تھا، بڑی اچھی تجارت ہے، پچھلے سال اُس نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے، میرا چھوٹا بھائی اُس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا اُن کویوں میں سے پانچ پھوٹ گئے تھے اور ان میں سے ریشم کے کیڑے نکل آئے تھے، سفید اور زردی مائل کیڑے جو کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، صرف سات دن زندہ رہتے ہیں، اس عرصے میں نر و مادہ آپس میں جنسی تعلقات قایم کرتے ہیں اس کے بعد نر مر جاتا ہے پھر مادہ انڈے دیتی ہے، زرد، باریک اور گول گول، خشخاش کے دانوں جیسے، اس کے بعد مادہ بھی مرجاتی ہے۔ اُن کی حیات معاشقہ بس سات دن ہے۔

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ان میں چار نر تھے اور ایک مادہ، بڑے بڑے زرد پروں والی، جو خاموش بیٹھی نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہی تھی، وہ کسے پسند کرے گی۔ کس پر اس کی نظر انتخاب پڑے گی، وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا، آپ سچ جانئے مقابلہ واقعی سخت تھا۔ نر کیڑے دیوانہ وار بھونروں کی طرح، اس کی طرف اڑ اڑ کر جاتے تھے۔ وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے، کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اس طرح کہ مجھے ان میں

سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا، پھر میں جلدی سے انہیں الگ الگ کر دیتا، وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش بے حس و حرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسّما انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا اور وہ پھر بے اختیار پھڑپھڑانے لگتے کبھی ایک کبھی دوسرا اُڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اس کے منہ کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کے اظہار کرتا، وہ کافرادا کبھی مسکراتی کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی، بیچارا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا . . . عورت کی فطرت دوزخی کیوں ہے، ایک ہی نظر سے گھاؤ بھی کرتی ہے اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے، دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے، ستم بھی اس کو پھبتا ہے کرم بھی اس کے شایاں ہے . . .

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں، کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور کوئی میرے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا، "ماں . . . دلیہ لائی ہو!"

"نہیں، میں ہوں شاما"

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل یکلخت پھٹ جاتی تو بھی مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے سے ہوا، جب سے میں بیمار ہوا تھا اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ ایک دفعہ بھول کر بھی مجھے پوچھنے نہ آئی تھی، کیا اُس کے خاوند کا چکوال سے کوئی خط نہ آیا تھا۔

"شاما، تم!" میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ہاں، میں!" اُس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا، "یہ لو، تمہارے لئے چند ایک خوبانیاں لائی ہوں، خوب پکی ہیں اور میٹھی"، یہ کہہ کر اُس نے رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر بکھیر دیں۔

یرقان میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق ہیں۔ ایک خوبانی دوسری شاما، اور پھر جب دونوں اکٹھی مل جائیں تو میری خوش قسمتی کے کیا کہنے، آج میں واقعی خوش قسمت تھا، میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور اخبار کا وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے۔ آہستہ سے پرے رکھ کر کہا، آؤ بیٹھو۔

وہ پائنتی پر بیٹھ کر بولی، "کیا حال ہے"۔

"اچھا ہے"۔

کچھ دیر ہم دونوں "صمٌ بکمٌ" بیٹھے رہے، میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔ دل میں جذبات کا طوفان اُمڈ آیا تھا، اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر یکایک زبان گنگ ہو گئی۔ دل میں شکایتوں کا طومار تھا۔ مگر لب جیسے کسی نے سی دئیے تھے، دل میں بے چینی کا طوفان تھا۔ مگر آنکھیں اُس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں . . . آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا۔ "چکوال سے کوئی خط آیا؟"

"نہیں تو، تم تو بہت ہی نحیف ہو گئے ہو، تمہاری آنکھیں اس قدر زرد کیوں ہیں، مجھے ازحد افسوس ہے میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آ سکی۔ ماں کی طبیعت علیل تھی۔ خوبانی کیوں نہیں کھاتے، کھاؤ!"

میں نے مشکور نگاہوں سے اُسے دیکھا، ایک خوبانی اٹھائی اور منہ میں ڈال کر دل کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ ارے میاں کچھ تو کہو، اگر شکایت کی جرات نہیں تو اظہار محبت ہی سہی، ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے۔ کھل کر بات کرنا سیکھو، گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

"شاما، تم . . ." میں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا، یہ ریشم کے کیڑے ہیں!" شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا، "کس قدر خوب صورت ہیں، تم نے کہاں سے پائے! اچھا یہ مادہ ہے، یہ نر ہیں، کیا خوب، اور اب اس نر و مادہ کا آپس میں ایجاب و قبول ہو گیا، دیکھو یہ کیڑا اتنا انسان ہے، نہ نہیں اس سے کیا میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں، ہے نا، یہ جوڑا تو الگ ہوا۔"

"اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے، بیچارے کس طرح سسک رہے ہیں، دیکھو"۔

میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی، لب تھوڑے سے کھلے تھے اور طلائے احمر کی طرح دمک رہے تھے۔

"تم کس قدر خوب صورت ہو، شاما" میں نے سینمائی انداز میں کہا، اس سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو، میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے درمیان ایک زرد پردہ حائل ہے۔ مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو، اور اگر یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے تو پھر کیا یہ تابناک حسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گا . . . اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں، صاف اور پاکیزہ۔ نیلوفر کی طرح کھلی ہوئیں"۔

ماں دلیہ لے کر اندر آئیں، کہنے لگیں، بیٹا یہ نیلوفر کی بابت

کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اماں۔ یہی . . . یہی . . . کہ . . . سنا ہے کہ عرق نیلو فر یرقان میں بہت مفید ہے"۔

"ہاں میں ابھی ابھی ان سے یہ ذکر کر رہی تھی" شاما نے سر جھکا کر کہا، "پتہ نہیں، انہیں موافق آئے نہ آئے"۔

"نہیں بیٹی، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں، بعض حکیم تو . . ."

اماں شاما سے باتیں کرنے لگیں، میں چپ چاپ دلیہ کھانے لگا۔

. . . .

شاما بہت حسین تھی اس لئے چاہنے والے بھی بہت تھے، وہ بیاہی ہوئی تھی اور یہاں میکے آئی تھی عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کی والدہ اس رنڈاپے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب کو قائم رکھے ہوئے تھی، اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا، اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا، اس کے شریف اور باعصمت ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم، تین ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں، سوڈا واٹر کی صرف ایک دکان ہے، ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں، اور وہ ایک نوجوان ہے اور منچلا اور شاما کا چاہنے والا، شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے، صرف دو درزی ہیں، ایک بچارہ ہے سیدھا سادا آدمی، وہ قمیض کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے، دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی "ٹیلرنگ شاپ" میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو، ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے، پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی، مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب نووارد ہیں، خوبصورت خوش طبع جوان ہیں، سکول کو اپنے کالج کا بدل بنانا چاہتے ہیں، گاتے خوب ہیں، دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی گراموفون بج رہا ہو، پیارو قوال کا "من تو شدم تو من شدی" انہیں بہت مرغوب ہے، شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں یہ اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا ہے، شاما بھی کبھی دریچے میں بیٹھے کر سن لیتی ہے اس کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب مسکراہٹ ہوتی ہے، جوش رقابت میں، میں اسے محبت سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے، وہ مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی، ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بڑا بھاری سبب یہی ہے، فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں، شاما کو خالص فنی نکتہ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں، اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں، گویا شاما، شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لدگیو کا ایک مرمریں مجسمہ ہے یا باطلی سیلی کی ایک پرکیف تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا دتھمن گر کا استھان بہت مشہور ہے، عقیدت مندوں میں جو اکثر طبقۂ اناث سے تعلق رکھتی ہیں انہیں صرف "باوا جی" کہہ کر پکارتی ہیں، باوا جی کی جوانی ڈھل چکی ہے مگر ہر بات میں جوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں، "فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے موج پانی پر"، چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، اور شاما سے فلاطونی محبت رکھتے ہیں، قد لانبا، جسم اکہرا اور رنگ بگلے کی طرح سپید ہے۔

. . . .

ساون!

ساون برسات کا مہینہ ہے، ساون میں جھولے پڑتے ہیں، شاعر اور ندی نالے طغیانی پر آ جاتے ہیں، دل میں امنگیں اٹھتی ہیں، شاید خون کچا ہوتا ہے جوش مارتا ہے، میں نے بھی اپنی کوٹھڑی چھوڑی اور باہر باغ میں آ رہا، سرول کے ایک گھنے چھتنارے کے نیچے میرا بستر تھا اور اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوایا تھا، قصبہ بھر کی لڑکیاں، دوشیزائیں اور نویلی بہوئیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں، بڑا دلکش منظر ہوتا تھا، جب شاما پینگ بڑھاتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دور اوپر چنار کی ٹہنیوں کے سبز سبز پتوں میں ایک لمحے کے لئے گم ہو جاتی، تو میرا دل اچک کر گلے میں آ رہتا کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔

ایک دن جب شاما جھولا جھول رہی تھی اور میرا نوکر رالی میرے پاؤں داب رہا تھا میں نے اس سے پوچھا، رالی، اگر وہ گر پڑے تو پھر کیا ہو۔

رالی بولا، کون بابو جی۔

شاما۔

رالی بچارا حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اُسے میری بات سمجھ میں نہ آئی، اُسے کیا پتہ تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

رالی بچارا سیدھا سادھا نوکر ہے۔ کبھی کبھی ہکلا کر بات کرتا ہے باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے اور بڑے بھائی کے پیار اور ماں باپ کے لاڈ چاؤ نے عالم شباب ہی میں اُس کے بال کھچڑی کر دیئے ہیں۔

رالی میں نے اُسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا، تم میری بات نہیں سمجھے، اتنے میں شاما کی ماں دوڑتی ہوئی آئی۔ کہنے لگی، بابو جی، ذرا رالی کو اجازت دینا، پن چکی سے آٹا پسا کر لے آئے، بڑی مہربانی ہوگی۔ (آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر) آج ضرور بارش ہوگی اور اگر رالی ابھی ابھی آٹا نہ لے آیا تو پھر ندی زوروں پر ہو جائے گی، دیکھئے بادل پہاڑوں پر کیسے چھائے ہوئے ہیں۔

رالی بولا، میں ابھی جاتا ہوں

میں نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے"۔ رالی یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

رالی بچارا بہت سیدھا سادہ ہے۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، چاروں طرف بادل چھا رہے تھے اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی تھیں، میں نے دل میں سوچا آج ندی میں خوب طغیانی آئے گی، پہاڑی نالہ کمزور آدمی کے غصے کی طرح ہے جلد چڑھتا ہے اور جلد ہی اتر جاتا ہے، ساون کے دنوں میں ندی کئی جانیں لے لیتی ہے۔ ایک دم نالہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں سے اچھل کر میلوں اطراف میں پھیل جاتا ہے، گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، ڈھور ڈنگر اور اناج اور مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں،

اماں میرے قریب آکر کہنے لگیں "اندر چلو، آج بارش ہوگی، گھٹا تُلی کھڑی ہے، رالی کہاں ہے۔؟

شاما کی ماں نے پن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا، ادھر ہی گیا ہوگا، چلو اندر چلتا ہوں، لڑکیوں کے جھولا جھولتے جھولتے بارش شروع ہوگئی۔ پل میں جل تھل ہوگیا، ندی کی پرشور روانی میری خواب گاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے۔ رالی نہ آیا، اماں اسی فکر میں کھوئی ہوئی میرے پاس بیٹھی رہیں "کمبخت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی، انکار کر دیتا، اماں نے کہا۔

"میں نے ہی اجازت دے دی تھی"، میں نے آہستہ سے جواب دیا

"تم بھی نادان ہو، وہ بھلا اس موسلادھار بارش میں کیسے آئے گا۔ ذرا ندی کا شور تو سنو۔ ندی ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا، پن چکی بھی تو بہت دور نہیں ہے یہی چار میل کے قریب ہوگی، اُسے اس وقت تک آ جانا چاہئے تھا، کہیں اس پار ہی نہ رہ گیا ہو"۔

"اور اماں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "اگر اُس نے ندی کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو، یوں تو اچھا خاصا تیراک ــــــ"

"چپ بیٹا۔ یوں نہیں کہا کرتے، رام سب کا بھلا کرتے ہیں"۔

بارہ بج گئے مگر مجھے نیند نہ آئی، شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو میں میں نے دیکھا کہ اماں وہیں بیٹھے بیٹھے سوگئی ہیں، اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی۔ کسی نے دیوار کے ساتھ اپنا سونٹا ٹیک دیا اور لمبی سانس لی۔

میں نے کہا، رالی ہے

جی ہاں

آٹا لے آئے

"دے آیا بابو جی، وہاں اُن کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے وہ ہوا کو جگایا اور اس کے حوالے کرکے ابھی آ رہا ہوں"،

"کمبخت، میں پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے۔؟

"کھال میں بابو جی، بالکل نہیں بھیگنے دیا، ندی بڑے زوروں پہ تھی، پرمیشر نے ہی جان سلامت رکھی"۔

"بے وقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی، ندی کے پار ہی رہ جاتے"۔

"میں نے سوچا شاما بھوکی رہے گی . . . "

جواب سن کر میں بھونچکا رہ گیا، یہ بینگن کے پودے میں انگور کے خوشے کیسے، تلخ لہجے میں میں نے اُس سے پوچھا "اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو ــــــ"

رالی تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر ہکلانے لگا۔ میرا . . . را۔ کیا

ہے بابوجی، یہ زندگی کت . . . کت . . . کسی کے کام آجاتی۔ میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا۔"

"کمبخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا۔"

"کیا کہا بابوجی"

"کچھ نہیں جاؤ، سو رہو۔"

اب شمع زرد پڑ چکی تھی، زرد اور بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم رہا تھا، میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، پروانہ . . . شمع . . . رالی . . . پروانہ . . . رالی . . . شمع . . . رالی . . . شاما . . .

. . . .

باوا وشمن گر کا "استھان" ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے اس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا باغیچہ اور اس کے ساتھ کپڑے دھونے کا گھاٹ، باواجی اور اُن کا چیلا سومناتھ وہیں دیوی کے قدموں میں آسن جماتے ہیں اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں، ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے مگر مندر ہمیشہ محفوظ و مامون رہتا ہے پچھلے سال تو گھاٹ بھی بہ گیا تھا مگر مندر جُوں کا تُوں کھڑا رہا، یہ سب باواجی کی دعا کا اثر ہے اور اُن کے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت شاما کی ماں دودھ باواجی کو ہر روز پرنام کرنے جاتی ہے اور شاما بھی کبھی کبھار اُس کے ساتھ جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اُسے باواجی کے باغیچے ہی میں دیکھا تھا، اُس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا اور دوپٹہ میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی آہ، وہ جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہوگئی اُس اولیں ملاقات کو، مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے رہ رہ کر یاد آرہے تھے، گھڑی کی سوئیوں کو الٹ پلٹ کر سکتے ہو، مگر زمانے کی سوئی کو الٹا پھیر دینے کی کس میں ہمت ہے کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں، کاش میں انہیں پھر اک بار دیکھ لیتا وہ نگاہیں جنہوں نے مرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا جنہوں نے محبت کی سوئی ہوئی ندی کو اپنے نازک پتواروں سے متلاطم کر دیا تھا، مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے، شفق کی طرح رنگین، قوسِ قزح کی طرح دور . . .

رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں نے اُسے آہستہ سے کہا "رالی، مندر سے جوہی کے پھول لاؤگے؟"

رالی بولا "بابوجی بارش ہو رہی ہے" پھر یہ کہہ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا، "اچھا جاتا ہوں"۔

رالی اُسی موسلا دھار بارش میں اٹھ کر چلا گیا، آج اُس نگاہ اولین کی یاد نے دل کی دبی ہوئی امنگوں میں اک ہیجانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی، میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنی خیالی دنیا میں گم ہوگیا، اس دنیا کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا اس خیال سے مجھے یک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ یہ دنیا میری ہے اور اس جسدِ خاکی کے آخری سانس، زندگی کے آخری لمحہ اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دنیا میری ہوگی، شاید اب یہ دنیا ہی میرا مایۂ حیات ہے اس دنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک ناؤ بن گیا ہوں ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں سے گھری ہوئی ہے۔ لہریں کھیلتی ہیں، مسکراتی ہیں، ڈوبتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنوں کو ہمک ہمک کر پیار کرتی ہیں۔ یکایک میں اپنے بادبان پھیلا دیتا ہوں، اور لہریں اپنے شانوں پر لئے ہوئے مجھے دُور دُور بہا لے جاتی ہیں، پتہ نہیں کس طرف؟ نجانے کیوں؟ مجھے صرف اک خاموش موسیقی اور اک جانفزا سرور کا احساس ہوتا ہے، کیف آور اور شیریں۔

پتہ نہیں میں کتنا عرصہ اسی خیالی دنیا میں گم رہا یا کتنا عرصہ اور اسی خیالی دنیا میں گم رہتا اگر اماں بیاشانہ جھنجھوڑ کر مجھے جگا نہ دیتیں "بیٹا، اٹھو، اٹھو تو سہی، وہ دیکھو رالی . . ."

میں نے آہستہ سے کہا "کیا بات ہے ماں، رالی پھول لے آیا؟"

"اچھا تو کیا تم نے اُسے مندر بھیج دیا تھا؟" اماں نے کہا "آہ بچارا رالی، اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے اور اس کے سر پر کئی چوٹیں آئی ہیں، برآمدے میں پڑا ہے"۔

میں جلدی سے اٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دائیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں، میں نے پوچھا "بے وقوف کیا مندر میں باواجی سے لڑ پڑے، اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو واپس چلے آتے، جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی سومناتھ نے بھی پیٹا ہوگا تمہیں، جیسا گورو ویسا چیلا"۔

"وہ مندر کہاں رہا بیٹا، یہ جو تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ اس کمبخت جھڑی کو کچھ لے کر ہی ٹلنا تھا، آج ندی میں اس قدر طغیانی آئی ہے کہ تو بہ ہی بھلی، ذرا شور تو سنو، اور جب رالی مندر کی طرف

پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ رہا تھا اور گھاٹ بہ رہا تھا۔

"تو ـــ میں نے تو اسے یوں ہی بھیج دیا تھا۔ اگر پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا، ایسی بھی بھلا . . . " میں نے فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔

"کیسے نہ جاتا بیٹا، وہاں شاما ـــ۔

کیا کہا، شاما؟

اماں میری بات ان سنی کر کے بولیں "اور دیکھو یہ باوا اور اس کا چیلا ان دلوں کتنے کمینے نکلے، ان کو اتنا بھی نہ خیال آیا کہ ـــ

"مگر شاما کیا؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو رہی ہوں بیٹا، اماں جلدی سے بولیں" کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی اور دیوی جی کو پرنام کر کے باغیچہ میں جوہی کے پھول چن رہی تھی کہ بارش نے آگھیرا، وہیں مندر میں ٹھہر گئی، سوچا ہوگا کہ بارش تھمے تو جاؤں، آن کی آن میں جل تھل ہو گیا، مندر کے چاروں طرف پانی لہریں مارنے لگا اور جب نیا گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رخ مندر کی طرف مڑا تو باوا جی بڑے گھبرائے، چیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے"

تو رشاما کو وہیں چھوڑ دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو، جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ جب رالی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا، شاما سیڑھیوں پر کھڑی چیخیں مار رہی تھی اور باوا جی اور ان کا چیلا تیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے۔

"کمینے!" میں نے تیز تر لہجے میں کہا

اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، اماں اندر چلی گئیں، نائب تحصیلدار صاحب، تھے برآمدے میں آ کر رالی کے سرہانے بیٹھ گئے کہنے لگے، "آپ کے نوکر نے آج بڑی جوانمردی دکھائی، مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے آیا، چوٹیں تو بہت لگی ہیں بچارے کو، میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا، آج شام کو ڈاکٹر پھر آئے گا، . . . رالی بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رالی کی طرف دیکھنے لگے، رالی خاموش لیٹا ہوا تھا، میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

"کیوں روتے ہو رالی" میں نے پوچھا،

رالی نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا، بابو جی سر میں بہت درد ہے

تحصیلدار صاحب چارپائی سے اٹھ کر بولے، اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر کو ابھی آپ کے ہاں بھیجتا ہوں۔ چوٹیں تو معمولی ہیں، میرے خیال میں، ایک دو دن میں اچھا ہو جائے گا، فکر نہ کریں، شاما کا خاوند سنا ہے کل یہاں پہنچے گا۔

وہ چلے گئے، میں چپ چاپ رالی کے پاس بیٹھا رہا، شاما کا خاوند کل یہاں پہنچے گا، . . . کل . . . فکر نہ کریں . . . چوٹیں معمولی ہیں . . . چوٹ" . . . کاش تحصیلدار صاحب کو پتہ ہوتا کہ یہ چوٹیں معمولی نہیں ہوا کرتیں . . .

اماں رالی کے لئے گرم دودھ لے آئیں، میں چمچہ سے اسے پلانے لگا، اماں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

اس واقعے کے پانچ روز بعد شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔

جانے سے قبل وہ مجھے ملنے کے لئے آئی

"میں آج جا رہی ہوں بھیا۔"

اس کا چہرہ زرد تھا، اور لب انار کی کلی کی طرح سرخ تھے۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور چپ ہو رہا، اماں نے ہاتھ پھیلا کر اسے دعا دی، "پرمیشر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔"

"رالی کدھر ہے۔ بھیا، میں اسے ملے بغیر نہ جاؤں گی۔"

اماں نے جواب دیا، رالی چشمے سے پانی بھرنے گیا ہے، اب آتا ہی ہوگا۔

گھنٹہ پون گھنٹہ گزر گیا، مگر رالی نہ آیا۔

میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا، "شاید وہ نہ آئے گا، شاما!"

جیسے اس نے میری بات سمجھ لی ہو، وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، آہستہ سے بولی، تم اچھے ہو جاؤ گے بھیا، پھر اس نے سر جھکا کر ماں کو پرنام کیا اور وہ چلی گئی، چپ چاپ، خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔

کائنات کا ہر ذرہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بیسود

یہ انسان کتنا حقیر ہے اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر تر، یہ عقدۂ لاینحل کیا ہے! اور کس لئے؟ اور پھر اگر اس تمام نظام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے ختم کر دیا جائے اس طرح کہ اس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں، اور کوئی ان کی ہوا تک بھی نہ پا سکے، تو پھر — تو پھر کیا ہو — کس لئے! — کیوں کر:؟

دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود

بہت دیر کے بعد رالی آیا، پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے، اس کا چہرا اُترا ہوا تھا اور ہونٹ نیلے، تھوڑی دیر ٹھہر کر جب وہ میرے پاؤں دابنے بیٹھا تو میں نے اُس سے پوچھا۔ "رالی آج کہاں غائب رہا"

"ال مجھے دیر ہو گئی، بابوجی، معاف کر دو" اس نے جواب میں کہا

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے، پھر رالی بولا۔ اُس دن آپ نے جوہی کے پھول مانگے تھے۔ آپ یہ گچھا رکھ سکتے ہیں، یہ کہہ کر اُس نے جیب سے پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔

پھول باسی تھے اور پتیاں زرد، مگر ان میں خوشبو تھی۔

مجھے تحصیلدار صاحب کی بات یاد آ گئی، میں نے کہا، رالی، اسے تم رکھ لو، یہ لو سے تمہیں اپنے پاس رکھو۔

نہیں بابوجی، میں اسے نہیں لے سکتا۔

کیوں؟

رالی چپ ہو رہا

میں نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "رالی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے جذباتی اور رشاعر مزاج ہو"،

رالی چپ چاپ بیٹھا رہا، بے جان، بے حس و حرکت مٹی کی مورت، پھر سر جھکا کر آہستہ سے میرے پاؤں دابنے لگا، گرم گرم آنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔

زندگی کس قدر عجیب ہے!

شاما . . . ودھوا . . . باواجی . . . کالو . . . سوہنا تھ . . . ریشم کے کیڑے . . .

زندگی کس قدر عجیب ہے!

کرشن چندر ایم اے

غزل

کچھ اس طرح نگاہ سے اظہار کر گئے
جیسے وہ مجھ کو واقفِ اسرار کر گئے

اقرار کر دیا، کبھی انکار کر گئے
بے خود بنا دیا، کبھی ہشیار کر گئے

یکتائی جمال کی حیرت نہ پوچھئے
ہر ماسوا کے وہم سے بیزار کر گئے

کچھ اس ادا سے جلوۂ معنی کی شرح کی
میرے خیال و فکر کو بیکار کر گئے

اب دل ہے اور اُن کی جفاؤں کا شکریہ!
ہر خطرۂ حیات سے ہُشیار کر گئے

اللہ رے! اُن کے جلوۂ رنگیں کی خیریں
سارے جہاں کو نقش بدیوار کر گئے

وعدے کا اُن سے ذکر ہی ماہر فضول ہے،
تم کیا کرو گے، وہ اگر انکار کر گئے

ماہر القادری

چاندنی رات اور آبشار

(۱)

نکھری ہوئی چاندنی فضا نورانی ہر شئے پہ پھرا ہوا سنہرا پانی
جنگل کے درختوں کی وہ گہری سبزی اب نور کی بارش سے ہے دھلکر دھانی

(۲)

چھائی ہوئی ہے فضا میں خاموشی سی پھیلی ہوئی ہے ہوا میں بیہوشی سی
فطرت کی روح عالمِ وجد میں ہے طاری ہے ایک خود فراموشی سی

(۳)

شبنم کی شراب سے ہوا ہے سرشار صدقے ہوتے ہیں ہوش ایسی رفتار
جب پاؤں صبا کے لڑکھڑا جاتے ہیں ہنستے ہیں تالیاں بجا کر اشجار

(۴)

جنگل کے نوا فروش خاموش ہوئے دوشیزۂ خواب سے ہم آغوش ہوئے
کرتے تھے ہمیں جو زمزموں سے بیہوش فطرت کے زمزموں سے بیہوش ہوئے

(۵)

جنگل کے سکوت کو گھٹا دیتی ہے فطرت کے سرور کو بڑھا دیتی ہے
بہتے ہوئے جھرنوں کی مسلسل آواز اس عالمِ ہُو میں کیا مزا دیتی ہے

(۶)

بہتے ہیں آبشار ہو کر بے تاب یا دامنِ کوہ میں رواں ہے سیماب

آئینۂ سیّال ہے یا آبِ رواں　　ہر موج لئے ہے ایک لرزاں مہتاب

(۷)

چوٹی سے پہاڑ کی اترتے آئے　　ہموار زمین پر بکھرتے آئے
شبنم آلود چاند کی کرنوں سے　　ہو کر سرشار رقص کرتے آئے

(۸)

پیہم یہ صدا جو آبشاروں کی ہے　　یہ جنبشِ نبض مرغزاروں کی ہے
فطرت کی نفیرِ خواب کہیئے اس کو　　یا حرکتِ قلب کوہساروں کی ہے

(۹)

بکھرے وہ آبدار موتی بکھرے　　بکھرے وہ زرنگار موتی بکھرے
ٹکرائیں وہ پتھروں سے موجیں ٹکرائیں　　بکھرے وہ بے شمار موتی بکھرے

(۱۰)

یہ چادرِ آب جو چلی آتی ہے　　گرنے میں کچھ اس طرح سے بل کھاتی ہے
جیسے اک ماہوش کی زرّیں ساری　　جھونکے کھا کر ہوا کے لہراتی ہے

(۱۱)

عشّاق کے داغ تیرتے جاتے ہیں　　سونے کے ایاغ تیرتے جاتے ہیں
موجوں میں نہیں ہے عکس سیّاروں کا　　پانی پہ چراغ تیرتے جاتے ہیں

(۱۲)

ایامِ شباب کی کہانی تم ہو　　روتا ہوں جسے وہ زندگانی تم ہو
اے دامنِ کوہ کے غزل خواں جھرنو　　میری گذری ہوئی جوانی تم ہو

عبّاس بیگ محشر

گارڈنر خاندان کے اُردو شعراء

ایک زمانہ تھا کہ گارڈنر خاندان ضلع ایٹہ کا نہایت ممتاز اور زمینداروں کا سب سے بڑا خاندان تھا۔ ضلع کا بیشتر حصہ اسی خاندان کی زمینداری میں شامل تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں دو تین بھائی ہندوستان آئے تھے اور یہاں آکر فوجی ملازمت اختیار کی تھی۔ ان بھائیوں میں کرنل گارڈنر (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۳۵ء) نے بڑی ناموری اور شہرت حاصل کی۔ انہوں نے جنگ برہما، جنگ کمھات، اور جنگ بھوٹان میں شرکت کی۔ اور کامیاب و بامرام واپس آئے ؛

کرنل گارڈنر کے والد کا نام میجر ولینٹائن گارڈنر (پیدائش ۱۷۳۹ء) تھا۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے کرنل ولیم لینوکس گارڈنر پیدا ہوئے تھے۔ اور دوسری سے ولینٹائن گارڈنر۔ کرنل گارڈنر کے ساتھ اُن کے یہ چھوٹے بھائی بھی ہندوستان آئے تھے۔ ویسے تو یہ خاندان کافی پرانا ہے۔ لیکن میجر ولینٹائن گارڈنر کے دادا ولیم گارڈنر کے زمانہ سے اس نے خاص عروج حاصل کیا ؛

ولیم گارڈنر صاحب نے محاصرۂ ڈیری کے وقت ایک دستہ فوج کی کمان کی تھی۔ ان کے صاحبزادے فوج میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ نام ان کا بھی ولیم گارڈنر (۱۷۸۳ء۔ ۱۶۹۱ء) تھا۔ میجر ولینٹائن گارڈنر انہیں کے صاحبزادے تھے۔ ان کے ایک اور بھائی تھے۔ جن کا نام ایلن گارڈنر (پیدائش ۱۷۴۲ء) تھا۔ انہوں نے بحری فوج میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اور ایسی ترقی کی کہ پہلے تو ۱۷۹۴ء میں برطانیہ کلاں کے بیرن بنائے گئے۔ اور بعد ازاں ۱۸۰۰ء میں آئرلینڈ کے۔ پھر ۱۸۰۶ء (۲۷ نومبر) میں سلطنت متحدہ کے پئیر بنائے گئے۔ ۱۸۰۸ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے صاحبزادے آنریبل ایلن ہائڈ گارڈنر اُن کے جانشین ہوئے۔ بحری فوج میں انہوں نے بھی خوب نام پیدا کیا تھا۔ اور ترقی کرتے کرتے ایڈمرل کے درجہ پر پہنچ گئے تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۱۵ء کے گزٹ میں اعلان ہوا کہ آپ کو وائیکونٹ کا اعزاز عطا کیا گیا ہے۔ لیکن ضابطہ کی کارروائیاں ہنوز ختم نہ ہوئی تھیں۔ کہ ۲۷ دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ آنریبل ایلن لیگ گارڈنر ان کے اکلوتے بیٹے تھے، وہی جانشین ہوئے۔ آپ شاہ ولیم چہارم کے دربار سے منسلک تھے۔ اور بعد ازاں ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی حاضر رہے۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ اولاد میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ ۱۸۸۳ء میں جب ان کا انتقال ہوا۔ تو وراثت کے دو دعویدار کھڑے ہوئے۔ ایک ہندوستان میں اور ایک ولایت میں ؛

گارڈنر خاندان کے تینوں لارڈوں میں کسی کو ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن کرنل گارڈنر کے زمانۂ عروج میں ان کے چچازاد بھائی کی اولاد سے ایک جوان لڑکا ہندوستان آیا تھا۔ جس کی اولاد کو وراثت کا حق پہنچتا تھا۔ لیکن انگریزی قانون نے اس حق کو تسلیم نہیں کیا۔ بیرن گارڈنر اوّل کے فرزند دوم کا نام فرانسس فرنگٹن گارڈنر (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۲۱ء) تھا۔ وہ بحری فوج میں ریئر ایڈمرل تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ ان میں سے بڑا یعنی اسٹوارٹ ولیم گارڈنر (۱۸۹۲ء۔ ۱۸۱۲ء) کرنل گارڈنر کے پاس ہندوستان آگیا۔ اور یہاں آکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک فوج میں انساین بنا ۱۸۳۴ء میں جبکہ اس کی عمر صرف ۲۲ برس کی تھی، اس نے کرنل گارڈنر کی پوتی جینن عرف ہرمزی بیگم (دختر ایلن گارڈنر) سے شادی کی۔ اسٹوارٹ ولیم گارڈنر کی زمینداری مٹورٹہ (نزد کاسگنج) میں تھی۔ انہیں کے بیٹے ایلن ہائڈ گارڈنر (۱۸۳۶ء۔ ۱۸۹۹ء) نے ۱۸۸۳ء میں بیرن کے اعزاز پر اپنا استحقاق جتایا تھا۔ ایلن ہائڈ گارڈنر کاسگنج میں مقیم تھا۔ اور اس کی زبوں حالی کی یہ کیفیت تھی۔ کہ ضلع ایٹہ کے گزیٹیر کے بیان کے مطابق یکّہ چلا کر گذر اوقات کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ایلن لیگ گارڈنر (پیدائش ۱۸۸۱ء) نے وہی مطالبہ کیا۔ یہ صاحب صوبجات متحدہ کے سکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ اب پنشن پاتے ہیں۔ ان کا بھی ایک بیٹا موجود ہے۔ جس کا نام ایلن ولیم گارڈنر (پیدائش ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء) ہے۔ چونکہ ان کے اجداد کے بیاہ شادی کی "بے قاعدگیاں" انگریزی قانون کی نظر میں قابل اعتراض

تھیں۔ لہذا یہ لوگ اس اعزاز سے محروم ہیں۔ ۲ر نومبر ۱۸۸۳ء سے گارڈنر خاندان کی پیرتی خالی ہے۔ اور ایک چھوڑ دو دو وارث موجود ہونے کے باوجود کسی کا حق ہنوز تسلیم نہیں کیا گیا۔

ہندوستان کے گارڈنر خاندان میں اگرچہ لارڈ فنبیلہ کی شاخ بھی موجود ہے۔ لیکن ایک معنی میں اسٹیفرڈ شائر کے گارڈنر خاندان سے اس کو کچھ نسبت باقی نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اب اس خاندان کو نام کے سوا کوئی اور تعلق آئرلینڈ سے نہیں رہ گیا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کا گارڈنر خاندان اب گویا جداگانہ خاندان ہے۔ ان کی زمینداری زیادہ تر اضلاع ایٹہ و بلند شہر میں ہے۔ زمینداریاں بھی حصے بخرے ہوتے ہوتے برائے نام رہ گئی ہیں۔ تاہم ایک زمانہ تھا۔ کہ اس خاندان نے ہندوستان میں بڑی عزت اور ناموری حاصل کی تھی۔ اور اگر اس خاندان کے شجرہ کو غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ اس خاندان کی بیاہ شادیاں انگلستان کے بہترین خاندان کے علاوہ شاہان دہلی، شاہان اودھ اور نواب کھمبات کے خاندانوں نیز فرخ آباد کے بنگش خاندان میں ہوتی رہی ہیں۔ ہندوستان میں گارڈنر خاندان کی ترقی و عروج نتیجہ تھا کرنل ولیم لینیوس گارڈنر کی داد و دہش کا۔

کرنل ولیم لینیوس گارڈنر ابتدائً فوج میں کپتان تھے۔ اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث ترقی کرتے کرتے کرنل کے عہدہ پر پہنچ گئے۔ آپ نے اپنے نام پر ایک ہندوستانی رسالہ "گارڈنر ہارس" کے نام سے بھرتی کیا تھا۔ جو اب تک اسی نام سے ہندوستانی فوج میں شامل ہے۔

کرنل گارڈنر جب برہما سے جنگ فتح کرکے ہندوستان واپس آئے تو آپ کو دریائے کالندری کے کنارے ایک مقام اس قدر پسند آیا۔ کہ آپ نے وہیں قیام کیا۔ اس مقام کا نام اب تک چھاونی مشہور ہے۔ اور ضلع ایٹہ میں واقع ہے۔ جہاں کرنل گارڈنر کی اولاد اب تک آباد ہے۔ آپ کے رسالہ میں پنڈت بھیم سین رسالدار تھے۔ پنڈت جی برہما کے بودھ مندر سے ایک گھنٹہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ چھاؤنی کے نزدیک مدری نامی ایک گاؤں ہے۔ جہاں پنڈت بھیم سین نے سکونت اختیار کی۔ وہ گھنٹہ جس کو ۴۸ من وزنی بتایا جاتا ہے۔ اب تک اس مکان میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے پاس ایک قدآدم مجسمہ ہے۔ جو کسی تنومند شخص کا معلوم ہوتا ہے۔ اس بت کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ پنڈت جی کا بت ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ اس کو بھی پنڈت جی برہما کے کسی مندر سے لائے تھے۔

کرنل گارڈنر نے کھمبات کے فرمانروا خاندان میں شادی کی تھی یہ شادی کیسے ہوئی؟ اس کی کیفیت انہوں نے ایک فرانسیسی خاتون "مسز فنی پارکس[1]" سے بدیں الفاظ بیان کی تھی۔

"جوانی کے دنوں میں مجھے کھمبات کے فرمانروا خاندان سے معاہدہ کرنے کے لئے جانا پڑا۔ کبھی دربار ہوتا تھا۔ کبھی مشاورت۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ میں مشاورت کے لئے محل میں گیا۔ اتفاق سے میرے قریب کا پردہ اٹھ گیا۔ میری نگاہیں دو نہایت خوبصورت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے دوچار ہوئیں۔ اس کے بعد ناممکن تھا۔ کہ میری تمامتر توجہ معاہدہ کے مسئلہ پر مرکوز رہتی۔ ان جھکدار تیکھی نظروں نے میرے دل و جگر کو برباد کیا تھا۔ مجھ پر ان خوبصورت سیاہ آنکھوں کا جادو چل گیا تھا۔ میں اپنے دل میں خوش تھا کہ دنیا میں خوبصورت ترین آنکھیں مجھ پر پڑیں۔ آہ، اگر وہ پردہ کہیں بالکل اٹھ جاتا تو نہیں معلوم ان لوگوں کا کیا حشر ہوتا۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ بات چیت کے خاتمہ پر مجھے معلوم ہوا کہ ان خوبصورت آنکھوں کی مالک اسی نواب کی بیٹی ہے۔ جس میں شرائط معاہدہ طے کر رہا تھا۔ دوسرے روز پھر وہی کیفیت ہوئی۔ میں پھر انہی آنکھوں سے دوچار ہوا۔ جو میرے خیالات پر چھائی ہوئی تھیں۔ میں نے طے کرلیا کہ اسی شہزادی سے شادی کروں گا۔ میں نے شادی کی درخواست کی تو اس کے گھر والوں نے بالکل نامنظور کردی۔ لیکن بہت کہنے سننے اور معاملات کی اہمیت اور نشیب و فراز سمجھانے پر وہ لوگ رضامند ہوگئے۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں نے علی الاعلان کہہ دیا کہ مجھے دھوکا دینا یا کسی قسم کی چال چلنا بالکل بیہود ہوگا۔ ان آنکھوں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ کسی اور شہزادی سے مجھے شادی کرنا منظور نہیں۔ شادی کے بعد رونمائی کے وقت جب وہی خوبصورت آنکھیں آئینہ میں نظر آئیں۔ تو میں مسکرا دیا اور شہزادی نے بھی میری تقلید کی۔"

شادی کے وقت شہزادی مونس النساء بیگم دہلی[2] کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی۔ چالیس برس تک دونوں کا ساتھ رہا۔ کرنل گارڈنر کی وفات کے بعد ایک ماہ کے اندر ہی اندر بیگم گارڈنر بھی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے اولاد میں ہوئیں۔ لڑکی کا نام ایلن گارڈنر

[1] مسز فنی پارکس ایک فرانسیسی خاتون تھی۔ جو ۱۸۳۰ء میں بہ سلسلۂ سیاحت ہندوستان آئی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں اس کی کتاب شائع ہوئی۔ اس نے اپنی کتاب میں ایک شجرہ بھی دیا ہے۔ جس میں سلطانہ بہو بیگم اور مرزا انجم شکوہ کو اکبر ثانی کی اولادوں میں کہا ہے۔ [2] بیگم گارڈنر کی ایک اور بہن تھی۔ جس کا نام ظہور النساء بیگم دہلی تھا۔ ان کی شادی ہیری ہیرسی ینگ سے ہوئی تھی۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے مغربی تبت کے حالات کی تحقیقات میں مورکرافٹ کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی زمینداری کرپی میں تھی۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد بیگم ہیرسے بیس برس تک زندہ رہیں۔ اپنے علاقہ میں وہ بہت ہر دلعزیز تھیں۔

اور جیمس گارڈنر تھا۔ ایلن گارڈنر نے تو اپنے ہی خاندان میں شادی کی۔ اور جیمس گارڈنر نے اپنے نامور باپ کی تقلید کی۔ اور مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی کی بیپالک بیٹی قمر چہرہ بیگم سے شادی کی۔ اس شادی کی کیفیت نہایت دلچسپ ہے :-

شاہ عالم ([illegible]) کے فرزند دوم مرزا سلیمان شکوہ کی ایک بیگم (مہر افراز محل) نے امان خاں کلاونت کی ایک لڑکی لے کر بطور اپنی بیٹی کے ناز و نعم سے پالی تھی۔ اس کا نام قمر چہرہ تھا۔ اس کا مکھڑا واقعی چاند کا ٹکڑا تھا۔ مرزا سلیمان شکوہ کی لاڈلی بیٹی نواب سلطان بیگم کی شادی نصیر الدین حیدر ولیعہد اودھ سے ہوئی تھی۔ مرزا سلیمان شکوہ کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت پر جلوہ گر ہوئے اور ایک سال کے اندر ہی اندر (جون ۱۸۲۸ء) خسر داماد میں چشمک ہوگئی۔ اس چشمک کی وجہ وہی قمر چہرہ تھی۔

قمر چہرہ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال کا شہرہ سن کر نصیر الدین حیدر تاجدار اودھ اس کے عاشق زار ہوگئے۔ اور اپنے وزیر اعظم اعتماد الدولہ میر فیض علی خاں کو شہزادے کے پاس بھیجا کہ آپ اس کا نکاح مجھ سے کر دیں۔ شہزادہ نے باعثِ بدنامی سمجھ کر کہ گھر گھر چرچا ہوگا۔ کہ اپنی بیٹی پر خود سوت مسلط کر دی۔ قبول نہ کیا۔ اس پر نصیر الدین حیدر بہت چراغ پا ہوئے۔ اور ایک روز جب شاہزادے کے محلات اپنے باغ کو جا رہے تھے تو شاہِ اودھ نے ایک کشتی کے ذریعہ سے قمر چہرہ کی سواری نواب سلطان بیگم (الملقب سلطان بہو صاحبہ) کے محل میں اتروا دی۔ شہزادہ نے خبر پاتے ہی اس امر کی فریاد ریزیڈنٹ سے کی۔ انہوں نے نصیر الدین حیدر سے کہلا بھیجا کہ اس معاملہ میں آپ کی بڑی رسوائی ہوگی اور ہنگامہ عظیم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس لڑکی کو فوراً واپس کر دیں۔ نصیر الدین حیدر نے سوار کر کے قمر چہرہ کو بھیجدیا۔ اور ریزیڈنٹ سے یہ کہکر بات بنادی کہ وہ اپنی ہمشیرہ نواب سلطان بہو کی ملاقات کو محل میں گئی تھی۔ مجھ پر تہمت تراشی گئی ہے۔ اس کے ساتھ نصیر الدین حیدر نے مرزا سلیمان شکوہ کے مصارف باورچی خانہ میں سے پانچ ہزار ماہوار کم کر دئے۔ جب قمر چہرہ شہزادہ کے یہاں واپس آئی۔ تو انہوں نے اس کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کو لکھنؤ میں رہنا وبالِ جان ہو گیا۔ انہوں نے اپنے سمدھی کرنل گارڈنر کو جن کی پوتی یعنی ایلن گارڈنر کی صاحبزادی (سوسن گارڈنر) شہزادہ کے ایک بیٹے مرزا انجم شکوہ سے منسوب تھیں بلا بھیجا۔ کرنل گارڈنر لکھنؤ آکر شہزادہ کو کاسگنج لے گئے۔ اور قمر چہرہ کو بیگم گارڈنر (مونس النساء بیگم) کی نگرانی میں دے دیا۔ یہاں کرنل گارڈنر کے چھوٹے بیٹے جیمس گارڈنر پر قمر چہرہ کے حُسن فسوں ساز کا ایسا جادو چل گیا کہ وہ اُسے لے اُڑے اور خفیہ طور پر الور جا پہنچے۔

کرنل گارڈنر نہایت ہی شریف النفس انگریز تھے۔ اس حرکتِ نازیبا کی وجہ سے اپنے بیٹے کی صورت سے بیزار ہوگئے۔ اُن کے خطوط کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ جیمس گارڈنر اور قمر چہرہ دو سال تک متواتر جنگلوں میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔ ایک روز جیمس گارڈنر نے اپنے باپ کو کشتی میں سوار دیکھ کر تہیہ کر لیا کہ یا تو آج عفوِ تقصیر کراؤں گا یا جان پر کھیل جاؤں گا۔ چنانچہ وہ کشتی کے ساتھ مسلسل تیرتے رہے۔ مگر کرنل گارڈنر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار جب انہوں نے دیکھا کہ جیمس گارڈنر بالکل شل ہوگئے ہیں۔ اور عنقریب غرق ہوا چاہتے ہیں۔ تو محبت پدری قوتِ ارادی پر غالب آئی۔ انہوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کشتی میں بٹھالیا۔ اور خطا بھی معاف کر دی۔ اس کے بعد جیمس گارڈنر کی شادی باقاعدہ قمر چہرہ کے ساتھ ہوگئی۔ چار لڑکے اور دو لڑکیاں اولاد میں ہوئیں۔ ان میں بڑے بیٹے کا نام سلیمان شکوہ گارڈنر تھا۔ جن سے گارڈنر خاندان میں اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر عرف مُنّا صاحب المتخلص بہ فنا

مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر عام طور پر مُنّا صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ فنا تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں بعمر ۷ سال انتقال کیا۔ ان کا طرزِ معاشرت بالکل ہندوستانی تھا۔ اور ہندوستانی امرار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی کبھی انگریزی لباس بھی زیبِ تن کرتے تھے۔ بڑے علم دوست، فیاض اور قابل شخص تھے۔ ان کے جود و سخا کی داستانیں اضلاع ایٹہ، بدایوں، فرخ آباد، مین پوری علی گڑھ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہایت مشہور ہیں۔ خطاطی اور فن خوشنویسی میں خوب مہارت پیدا کی تھی۔ اگرچہ کسی کی شاگردی نہیں اختیار کی۔ لیکن اساتذہ لکھنؤ کے کلام سے خاص اُنس تھا۔ لکھنؤ، دہلی، آگرہ کے اکثر شعراء اُردو نے آپ کی مہمان نوازی اور فیاضی سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ مرزا عنایت علی بیگ ماہ اکبر آبادی بھی کچھ عرصہ آپ کے دامن دولت سے

۵ جیمس گارڈنر کی وفات ۱۴ جون ۱۸۴۵ء کو ہوئی۔ اور چھاؤنی میں اپنے باپ کے برابر دفن ہوئے۔

وابستہ رہے۔ لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب بھی آخری عمر میں چھاؤنی پہنچے اور وہیں اُن کا انتقال بھی ہوا۔ ان کی قبر اب تک وہاں موجود ہے:۔

مُنّا صاحب صوفی مشرب تھے۔ تصوف میں اکثر اشعار کہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک برس کی مسلسل کوشش و تلاش کے باوجود بہت تھوڑا کلام دستیاب ہوا۔ جو کچھ مل گیا ہے۔ بلا اظہار رائے ہدیۂ ناظرین ہے:۔

خواب سے وہ بت بے پیر جو منہ کھول اُٹھا
شمع خاموش ہوئی مرغ سحر بول اُٹھا

ہوا حصول نہ کچھ عرضِ مدعا کر کے　　ہماری بات گئی اور التجا کر کے

پوچھا جب دِل سے کہ کب وصل کا ساماں ہوگا
بولا جس روز کفن میں تن عریاں ہوگا
آج تو شوق سے پی خونِ جگر اے غمِ یار
ناشتہ کل کو کبابِ دلِ بریاں ہوگا

اے فنا کیا کہوں کہ کیا ہے دِل　　خاص اک صورتِ خدا ہے دِل
منزلِ دِل ظہورِ نامِ خدا　　ظرفِ انوارِ لا الہ ہے دِل
دِل کی بے صورتی جو صورت ہو　　معنیٔ محض تو بجا ہے دِل
کیا ہے صورت وہی نمودِ وجود　　دو جہاں جو دکھا رہا ہے دِل
معنیٔ محض کیا وہ خاص وجود　　صورت و معنی ایک سا ہے دِل
جزو ہے اور کل و جزو کا جامع کلُ　　مظہرِ کل ہے کبریا ہے دِل
نطق اس کا وہ جبرئیل امیں　　آپ پیغمبرِ خدا ہے دِل
دِل کی صورت میں تھا خدا جو فنا
تو خدا میں فنا ہوا ہے دِل

مدعی دیدہ بنا مدعا علیہ دِل لے گیا　　روبکاری ہے مقدم عقل دیوانی کرے

نشہ جب عشق کا آیا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو　　مزا ہستی نے دکھلایا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو
محیطِ بادۂ عرفاں کا چکر تہ میں جب پہنچا　　دُرِ مقصود ہاتھ آیا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو
غبارِ آئینۂ دل کا جو دھویا دیدۂ تر نے　　پری چہرہ نظر آیا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو
ادھر بیخود ہوئے خود سے اُدھر ہوش آ گیا خود کا　　خودی خود مدعا پایا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو
فنا عشقِ بتاں میں جو ہوا مردِ دو عالم یاں
اسے مقبولِ حق پایا اہا ہا ہا، اہو ہو ہو

مرزا اقبال سفر طیبین نقیّانی ایل گارڈنر متخلص شکر

مُنّا صاحب کے بڑے صاحبزادے مرزا اقبال سفر طیبین نقیّانی ایل گارڈنر بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ اور شکر تخلص کرتے تھے۔ مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی سے تلمذ تھا۔ اُس زمانہ کے گلدستوں میں آپ کا کلام بالعموم شایع ہوتا رہتا تھا۔ نہایت قابل اور ہوشیار آدمی تھے۔ زبان پر کافی عبور تھا۔ ہر صنف پر قادر تھے۔ ۵۵ سال کی عمر تھی کہ ۱۹۰۷ء میں دنیا سے کوچ کیا۔ آپ کے کلام کا انتخاب حسب ذیل ہے:۔

جلوۂ عارض اگر زیرِ نقاب آیا تو کیا
مُنہ پہ لے کر چاند دامانِ سحاب آیا تو کیا

گل نہ ہو جائے کہیں شمس و قمر کی بتّی　　دیکھو سر کی مرے ناسورِ جگر کی بتّی
ہمدمو ہو کے لہو دل مرا بہ جائے گا　　ہٹ گئی گر مرے ناسورِ جگر کی بتّی
آتشِ عشق سے تن پھک کے ہوا خاک کا ڈھیر　　مشتعل ہو رگِ جاں جیسے اگر کی بتّی
صبح سے شام تلک شام سے روشن تا صبح　　ہجر کے سینے میں ہے اک آٹھ پہر کی بتّی
شعلے ہر دم ہیں بھڑکتے مرے داغِ دل سے　　آگ عالم میں لگائے گی یہ گھر کی بتّی
کیوں نہ ہو خلق کو خورشیدِ قیامت کا گماں　　جل اُٹھی ہے مرے ناسورِ جگر کی بتّی
عرصۂ حشر میں دامن ترا اور ہاتھ مرا　　چارہ گر کیوں نہ لہو سے مرے تر کی بتّی
آشنائی کا کیا شکرا ادا حق اس نے
تا بہ چہلم مرے بالیں سے نہ سرکی بتّی

سبق لے آسماں پھرنے کا کچھ روز دل مرے سر سے
بدلنا رنگ کا سیکھے زمانہ اُن کے تیور سے
چلے آئے خبر مرنے کی سن کر غیر کے گھر میں
مری تدبیر جا کر لڑ گئی میرے مقدر سے
جوابِ نامہ ہے یا موت کا پیغام لایا ہے
کہ نیند آتی ہے مجھ کو جنبشِ بالِ کبوتر سے

زمیں ہے اس جگہ نے آسماں ہے　　تعال اللہ کہاں اپنا مکاں ہے

زمین و آسماں کے درمیاں ہے   معلق مرغ دل کا آشیاں ہے
اٹھالوں کوہ غم مثل پر کاہ   مگر سر دوش پر بار گراں ہے
ہوا گردش سے ثابت بعد تحقیق   زمیں کہتے ہیں جس کو آسماں ہے
لحد میں کیوں ٹھکتے جینے والو   عدم کی راہ میں منزل کہاں ہے

دعائیں ہوئیں کارگر رفتہ رفتہ   ہوا نالوں میں اثر رفتہ رفتہ
تڑپنے تڑپتے شب غم کٹی ہے   ہوئی روز خوشی کی سحر رفتہ رفتہ
بلا آنہ جائے نہیں میرے سر پر   چلی زلف پھرتا کمر رفتہ رفتہ
نہیں سرخ آنسو یہ رگ رگ کے تن   نکلنے ہیں لخت جگر رفتہ رفتہ

کیا خوف ل کو ہو مرے روز شمار کا   ہوں معتقد میں رحمت پروردگار کا
مضمون آتشیں سے کبوتر کے پر جلیں   لے جائے نامہ کون ترے بیقرار کا
مہندی شب وصال لگائی ہو یار نے   گل ہو گیا چراغ شب انتظار کا
تم بھی اسی طرح سے جگر میں ہو جاگزیں   جیسے نہاں انار میں دانہ انار کا
پہنچا ہے بعد مرگ فلک پر مرا غبار   رتبہ بلند فلک میں ہے خاکسار کا
بس آہ آتشیں نہ دکھا اپنی گرمیاں   پہنچا لپک کے عرش پہ نالا شرار کا
چشم غزال نے مجھے وحشی بنایا شکر
نقشہ جو یاد آیا مجھے چشم یار کا

بجز دی تھی نہ ہوش تھا تن کا   ہائے کیا وقت تھا لڑکپن کا
سامنا کرتے تھے نہ تن کا   ہائے کیا وقت تھا لڑکپن کا
رونا ہنسنا ہمیں برابر تھا   ہائے کیا وقت تھا لڑکپن کا
دل سنبھل جائے ہاتھ آئے اگر   ایک تعویذ تیرے جوشن کا
نہیں زلفیں یہ ڈسنے کو میرے   جوڑا پالا ہے اس نے ناگن کا

تیرے شنکر جی اٹھیں مردے
سم جو لگ جائے اسکے توسن کا

معلوم ہوتا ہے کہ شنکر صاحب کسی قدر مذاق پسند بھی واقع ہوئے تھے۔ کسی لالہ کی بھینس زینہ سے ٹکرا کر مر گئی۔ آپ نے مرثیہ کہا ہے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

بڑھے دل کی کیونکر نہ اب بیقراری   جو مر جائے یوں بھینس لالہ تمہاری
وہ عمر اپنی لائی تھی اتنی بچاری   ستم کر گئی جو عدم کو سدھاری
کہوں کیا جو مجھ کو ہوا رنج و غم ہے
یہ سچ ہے کہ تم سے زیادہ الم ہے
تعجب ہے کس واسطے مر گئی وہ   یہی سوچتا ہوں کہ کیا کر گئی وہ
خفا ہو گئی دل میں یا ڈر گئی وہ   جو اس طرح سر پھوڑ کر مر گئی وہ
مرے تن پہ دہشت سے آیا پسینہ
سنا جبکہ ٹکر سے توڑا ہے زینہ

زمیندار اور پٹواری کی باہمی لاگ ڈانٹ مشہور ہے۔ تعجب نہیں کہ اپنے ہاں کے پٹواری سے شنکر صاحب کو کچھ رنجش ہو۔ بہرحال آپ نے پٹواری کی مادہ کی تاریخ کہی ہے:۔

"تاریخ گھوڑیہ راجہ ڈنکھہ رائے پٹواری یعنی مادہ اُن کی گئی"

آکے دجال نے ایک روز یہ لالہ سے کہا   کیوں جی خچر کو مرے گھاس کیوں تم نے دی
پر لو بیٹے کو سب خچر مرا مجھ کو دے دو   اپنی گھوڑیا وہ منگا لو جی بڑھیا جو بھی
آزمائش کا ہیں ایمان ہر اک کا جا کر   تیرھویں ختم ہوئی چودھویں صدی یہ بھی
سن کے تقریر یہ لالہ نے کہی مانگ ہے   آج دجال ہے اور مجھ سے بڑی بحث بھی
کہا مالک نے صحیح ہے نہ بڑا مانو تم   کوئی ٹٹوانی حزبہ واجی خچر نہ سہی
کہا جب تک کہ سواری ہی مرے گھر سے آوے   تم سواری مجھے دے دو کوئی سستی سی نئی
میری تحصیل کی اطراف کی طلبی آئی   لاد کر کس پہ میں لے جاؤں یہ خسرہ بہی
میری سواری تو منگالوں یہ تردد یہ ہے   کمبخت بتلا دو کوئی جس میں کہ اڑالوں جی
وہاں یہ تقریر یہی بیان کری گھوڑی کو ہوئی   دبلی تھی پتلی تھی اس صدمہ سے وہ اینٹھ گئی
روح جب نکلی تو ہاتف نے کہی یہ تاریخ
یار و پٹواری کی گھوڑیا بھی وہ دوزخ میں گئی (۱۸۵۱ء)

خود پٹواری صاحب بھی نہیں بچے۔ ان کو بھی دوزخ کا پٹواری بنا کر بھیجا چھوڑا۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

"تاریخ راجہ ڈنکھہ رائے بہادر پٹواری"

راجہ ڈنکھہ رائے کے مرنے کے بعد   ہر زباں پر لفظ یہ جاری ہوئے
سنتے ہیں ڈرتے خوف جانے کیا ہوا   حاکم اعراف یا ناری ہوئے
اُن کے مرنے کی لکھوں تاریخ کیا   اس تردد میں بہت عاری ہوئے
ملہم غیبی نے شب کو ناگہاں   دی صدا دوزخ کے پٹواری ہوئے
(۱۲۸۰ف)

مرزا اسلیمان شکوہ گارڈنر فنا کی چھوٹی بہن ایلین کر سچانہ عرف رقیہ سلطان بیگم بھی شاعرہ تھیں۔ اُن کا صرف ایک شعر دستیاب ہوا ہے :-

حشر کے روز جو خورشید نمایاں ہوگا
ہے یقیں دل کو وہ عکسِ رُخِ جاناں ہوگا

ہم نے شروع میں بتایا ہے کہ کرنل ولیم لینیوس گارڈنر کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی ولینٹائن گارڈنر بھی ہندوستان آئے تھے۔ ان کا تعلق بحری فوج سے تھا۔ انہوں نے یورپین خاندان میں شادی کی تھی۔ اُن کے ایک صاحبزادے ہیری فرنگٹن گارڈنر تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ یعنی برتھا لمیو گارڈنر اور رابرٹ گارڈنر۔ برتھا لمیو گارڈنر صبر تخلص کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ رابرٹ گارڈنر بفضلہ حیات ہیں اور اسبق تخلص کرتے ہیں۔ برتھا لمیو گارڈنر کے فرزند پیٹرک گارڈنر بھی شاعر ہیں۔ اور شوقی تخلص کرتے ہیں۔ گارڈنر خاندان کی اس شاخ میں یہی تین اردو شاعر ہیں۔

گارڈنر خاندان کی مذکورہ بالا دو شاخوں کے علاوہ اور بھی دو ایک شاخیں ہیں۔ اُردو شعرا سے وہ بھی خالی نہیں۔ ان شاخوں میں دو نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک فلیکس گارڈنر، اور دوسرے ولیم گارڈنر۔ موخر الذکر ادریس صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بہت اچھا کہتے ہیں۔ فیلکس گارڈنر بھی اچھے شاعر تھے۔ وہ فلی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ اور نابینا تھے۔ فلک تخلص کرتے تھے۔

ان حضرات کے حالات اور کلام کا انتخاب کسی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین ہوں گے۔ تاہم چلتے چلتے فلی صاحب کا ایک شعر سن لیجیے :-

نیارئے خاک تک چھانتے ہیں گلیوں کی
اس قدر ہے طمعِ زر کہ جیسے کہتے ہیں

(حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر میرٹھی

غزل

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پُوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

پروفیسر فیض احمد

آدیکھ انساں!

(۱)

انساں! انساں!
آدیکھ انساں!
فطرت کے منظر ہیں پیارے پیارے
یہ کوہ و دریا یہ چاند تارے
دنیا کے داتا جگ کے سہارے
درس خفیقت دیتے ہیں سارے
سیکھ ان سے ناداں!
آدیکھ انساں!

(۲)

انسان انساں
آدیکھ انساں
کیا کیا نمونے پیش نظر ہیں
چشمے ضیا کے شمس و قمر ہیں
راحت کے پردے شام و سحر ہیں
منظر خوشی کے فرحت کے گھر ہیں
دکھیوں کے درماں
آدیکھ انساں

(۳)

انسان انساں
آدیکھ انساں
ایک ایک جنگل پھولا پھلا ہے
غنچے کھلے ہیں سبزہ اُگا ہے
بخشش کا بادل چھایا ہوا ہے
باب سخاوت سب پر کھلا ہے
رحمت کے داماں
آدیکھ انساں

(۴)

انسان انساں
آدیکھ انساں
ارض و سما کے جتنے ہیں منظر
ہے فیض اُن کا سب پر برابر
ان کی نظر ہے یکساں جہاں پر
پابندِ فطرت ہیں تیرے رہبر
مغرور و نازاں
آدیکھ انساں

اندرجیت شرما



منی



کم بخت

جوانی کا خواب

آصف کو ہر لمحہ یہ احساس ہو رہا تھا۔ کہ وہ بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کی طبیعت پر مردنی سی چھا رہی تھی۔ اُس کا دل زندگی کے ہنگاموں کی طرف پہلی سی شدت کے ساتھ راغب نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے حواس اپنے گرد وپیش کی دلچسپیوں سے اُس بے تابی سے متمتع نہیں ہوتے تھے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اُس کا شیوہ خصوصی تھا۔ اُس کا اضطراب آہستہ آہستہ سکون کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہو رہا تھا۔ کہ اُس کا سن تیس سے متجاوز نہ ہوا تھا، اُس کا پچیس ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا، اُس کی جائداد کے چند قیمتی ٹکڑے موجود تھے اور اس کا مکان عیش و مسرت کے اُن تمام اسباب سے لبریز تھا جو دورِ حاضر کی کاوش نے فنونِ لطیفہ اور سائنس کے امتزاج سے وضع کئے ہیں۔ اُسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ یہ بے دلی یہ اضمحلال یہ تکدر کس حادثے کا نتیجہ ہے؟ کیا جوانی اُسے جواب دے رہی تھی؟ کیا وہ آگ جس سے اُس کے اعصاب مشتعل رہتے تھے۔ بجھ رہی تھی؟ کیا وہ طوفان جس کی لہریں اُسے مشرق و مغرب کی پہنائیوں میں اُڑائے پھرتی تھیں اُتر رہا تھا؟ زندگی کا درشت پہلو اگر ابھی سے آنکھیں دکھانے لگا تو مستقبل کا کیا حشر ہوگا

وہ وقت کو گھر کا غلام اور روپے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھ کر زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ دنیا کی رائے کو اس نے ہمیشہ ٹھکرا دیا تھا طعنِ خلق کی اس نے کبھی پروا نہ کی تھی۔ اور تحسین و مذمت سے متاثر ہونا وہ جانتا ہی نہ تھا۔ پھر آج وہ کیوں اس قدر مضمحل و دل گرفتہ نظر آتا تھا؟ اس کا دماغ نامعلوم خدشات پیدا کر کے کیوں اُسکے اعصاب پر لرزہ طاری کر رہا تھا؟ اس کی آنکھیں کیوں خلا میں بھیانک تصویریں دیکھ کر آپ ہی آپ بند ہو رہی تھیں؟ کیا یہ سب کچھ اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ انسان کا ہر فعل، خواہ وہ سات پردوں میں چھپ کر کیا جائے اپنے پیچھے طبعی نتائج کی ایک زنجیر چھوڑ جاتا ہے؟

کیا یہ اس بات کی شہادت تھی کہ جسم کی ہر حرکت خواہ وہ کیسی ہی خفیف ہو نفس کی دنیا میں اپنا ردِ عمل پیدا کرنے سے رُک نہیں سکتی؟ وہ اب تک اس بات سے واقف نہ تھا کہ نفس کی ملامت یا ضمیر کی سرزنش بھی کوئی چیز ہے۔ اُسے اب تک اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ جسمانی لذتوں سے سرشار ہونے کے بعد کبھی کبھی یہی سرشاری طبیعت کے لئے بارِ گراں اور روح کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ آج کہ وہ پہلی مرتبہ اس احساس سے آشنا ہو رہا تھا آج کہ اس کی سوئی ہوئی روح پہلی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی اُس پر حزن و ملال اور رنج و بیکسی کی گھٹا چھا گئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ وہی چیزیں جو اس کے قلب کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ آج کیوں انہیں متحرک کرنے سے عاجز ہیں، وہ باتیں جو اس کے مزاج میں شگفتگی اس کے دماغ میں سرور اور اس کے خیالات میں تازگی لے آیا کرتی تھیں آج کیوں اپنا اثر نہیں دکھاتیں۔ اُسے رہ رہ کر محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی لذتیں ختم ہو چکی ہیں۔ عیش و تنعم کا ذخیرہ خالی ہو گیا ہے۔ عشرت کی راہیں پامال کی جا چکی ہیں اور اب اُسے جس سرزمین سے گذرنا ہے۔ وہاں لٹے ہوئے قافلے کے نشانات مرے ہوئے انسانوں کے ڈھانچے اور بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نہیں۔

اس کی جوانی نے جب آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک متمول کنبے کا تنہا نورِ نظر ہے۔ ایک دولت مند ذی ثروت خاندان کی محبت و شفقت کا واحد مرکز ہے۔ اُس کے والد کا سایہ بچپن ہی میں اُس کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے اُس کی تعلیم و تربیت ابتدا سے اس کی ماں کی توجہ کی محتاج رہی تھی۔ اُس نے ایک سعادت مند بچے کی طرح ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ جہاں پچھلے وقتوں کی وضعداری اور تہذیب قدیم کی روایات کا اثر شدت سے موجود تھا۔ وہ عمر میں جوں جوں بڑھتا گیا۔

اس کے اندر یہ خیال راسخ ہوتا گیا۔ کہ وہ ایک رئیس زادہ ہے۔ اُسے عام لوگوں سے ملنے جُلنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے نشست و برخاست میں ایسا سلیقہ پیدا کرنا لازم ہے جو صرف اُمرا کے لئے مخصوص ہے۔ گھر بار پر حکومت کرنا اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے خدام کو جو دست بستہ حاضر رہنے کے عادی تھے، زجر و توبیخ کرنا اس کا پیدائشی حق ہے۔

ان حالات کے اندر اُس کے ذہن کی ساخت اور اس کے دل و دماغ کی کیفیت وہی صورت اختیار کر گئی جو ایک خود مختار ریاست کے ولی عہد کی ہوتی ہے۔ سترہ سال کی عمر میں وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخل ہوگیا۔ یہاں اُس نے دیکھا کہ اس کے گرد و پیش بہت سے نوجوان ہیں جو فارغ البال زندگی بسر کرنے اور دنیا کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اُس سے بڑھ چڑھ کر حیثیت کے مالک ہیں۔ اس چیز نے اُس کی خود پرستی کو جس کے اندر وہ اب تک مخمور چلا آرہا تھا ٹھیس لگائی۔ اُس نے اس کی تلافی روپے سے کرنا چاہی۔ چنانچہ اس کے اخراجات میں اسراف کا پہلو نمایاں نظر آنے لگا۔ اُس نے سواری کے لئے موٹر کار خرید لی اور بعض ایسے کم استطاعت طلبہ جو دوسروں کی دولت سے فائدہ اٹھانے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کے گرد طواف کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ اس راہ پر چل نکلا جہاں ذمہ داری کے احساس سے معرّا اور دنیا کی رنگا رنگ دلآویزیوں کے شوقین چلنے کے عادی ہیں۔ لیکن اب تک اُس کا شوق صرف خوبصورت لباس پہننے، بہترین درزی سے انگریزی طرز کے کپڑے سلوانے، عالیشان مکان میں رہنے، سواری کے لئے اعلیٰ درجے کی موٹر رکھنے، مکان کو زرنگار پردوں، بیش قیمت قالینوں اور جاذبِ نظر تصویروں سے سجانے اور کمروں کو آبنوس اور ہاتھی دانت کے ولایتی فرنیچر سے آراستہ کرنے تک محدود تھا۔

یکایک اُس کی زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا۔ اُس کے مرحوم والد کے ایک دوست کا کنبہ جو موسمِ گرما کشمیر میں بسر کرنے کے بعد واپس وطن کو جا رہا تھا آصف اور اس کی والدہ سے ملنے کے لئے چند روز اُن کے ہاں ٹھہر گیا۔ آصف نے اپنی والدہ سے ان لوگوں کا حال کئی مرتبہ سُنا تھا کہ اُس کے باپ کی زندگی میں یہ دونوں خاندان کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے تھے۔ آپس کا ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا اور وہ کس پیار سے ایک دوسرے کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ پھر اُس کے باپ کا یہ دوست جو سرکاری ملازمت کی وجہ سے پنجاب میں مقیم تھا یو۔پی تبدیل ہوگیا۔ وہیں اُن کا وطن تھا۔ اس لئے گھر کے باقی لوگ بھی پنجاب کو الوداع کہہ کر یو۔پی میں جا بسے۔ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ کہ اس دوران میں اُس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور طرفین کا یہ تعلق خاطر مدھم پڑ گیا۔ اُس کے باپ کی موت کے بعد اُن کا یہ دوست تعزیت کے لئے صرف ایک مرتبہ پنجاب آیا تھا لیکن آصف اُس وقت بچہ تھا۔ اس لئے اُس کے دماغ میں اِس کنبے کے افراد کا کوئی نقش باقی نہ تھا۔ اب اُس نے سنا کہ وہی بھولے ہوئے لوگ اس کے ہاں مہمان آرہے ہیں تو اُسے رہ رہ کر اپنا باپ یاد آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے مختلف نقشے بن بن کر بگڑ رہے تھے۔ اُس نے ارادہ کیا کہ وہ اس کنبے کی خاطر مدارات میں کوئی کسر باقی نہ رکھے گا۔ اُن کے آرام و آسائش کا انتظام کرنے میں پوری مستعدی سے کام لے گا۔ اور انہیں احساس کرا دے گا کہ وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہے۔

جب وہ لوگ آئے تو آصف پورے ساز و سامان سے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس کے باپ کا دوست ایک دوہرے بدن کا وجیہ آدمی تھا جس کے چہرے سے خشونت آمیز متانت کے آثار ٹپک رہے تھے۔ ساتھ دو برقع پوش عورتیں اور دو نوعمر لڑکے تھے۔ عورتوں میں ایک اُن کی بیوی اور دوسری صاحبزادی تھی۔ نوعمر لڑکے اُن کے بیٹے تھے۔ جب یہ مہمان گھر پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی اس کی والدہ کے زار و قطار آنسو بہنے لگ گئے۔ اُسے وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب اُس کا مرحوم شوہر صاحبِ خانہ کی حیثیت سے ان کی پذیرائی میں دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ ایک ہفتہ آصف کے ہاں ٹھہرے۔ گذری ہوئی باتیں دہرائی گئیں۔ کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی کے قصے بیان کئے گئے۔ ماضی کے غم و مسرت اور مستقبل کے عزائم کا ذکر ہوا۔ غرضکہ ہفتہ بھر اچھی رونق رہی۔ آصف اپنے مہمان کو چچا اور اُن کی بیوی کو چچی کہکر پکارتا تھا۔ اُن کی صاحبزادی جس کا نام جمیلہ تھا، سترہ اٹھارہ برس کی بہت قبول صورت اور شائستہ مزاج لڑکی تھی۔ روانگی کے وقت آصف نے جمیلہ کو قسم قسم کے بیش قیمت تحائف سے گویا لاد دیا۔ تحائف میں طلائی زیور، ساڑھیاں، عطر دان، ولایتی غازے، ریشمی پارچات، سنگار کی چیزیں اور تصویروں کے البم شامل تھے۔ جمیلہ نے انکار کرتی رہی اُس کی والدہ نے بھی بہت کچھ تامل کا اظہار کیا۔ لیکن آصف نے ایک نہ سُنی اور سب اشیاء ان کے ہمراہ کر دیں۔

یہ لوگ چلے گئے تو آصف ملول و افسردہ سا رہنے لگا۔ اُسے اپنی دلچسپیاں پھیکی پھیکی سی نظر آنے لگیں۔ موٹر کی سواری، مکان کی آرائش، خدم و حشم کی کثرت، لباس ہائے فاخرہ کی جدت، یہ چیزیں تھیں جن

کے وسیلے سے اس کا تموّل وقتاً فوقتاً اپنا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اب امارت کے یہ تمام مظاہر بے جان سے ہو کر رہ گئے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس کے مکان کی ساری زیبائش سے، جو اس کے مذاقِ سلیم اور اس کی شبانہ روز کاوش کی شرمندہ تھی، کسی پُر اسرار طریقے سے حسن و لطافت کی روح کھینچ لی گئی ہے۔ یہ تبدیلی کیونکر ہوئی اور آصف کی اس غمگینی کی تہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا؟ اُسے رہ رہ کر جمیلہ یاد آتی تھی۔ وہ بار بار سوچتا اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتا تھا کہ اُس نے جمیلہ کو جس قدر تحفے دیئے تھے اُن میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو اُس سے اُس پرستارانہ نیائش، اُس جذبۂ مفتونیت اور اس شوقِ گلوگیر کی ترجمانی کرسکے جس کی خلش آصف کو ہر گھڑی بے چین کر رہی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹ جاتا اور بغیر آنکھ جھپکے چھت کی طرف دیکھتا رہتا۔ ساڑھیاں طلائی زیور، ریشمی پارچات، عطردان، ولایتی غازے، سنگار کا سامان ایک ایک کرکے یہ سب چیزیں اس کے تخیل کی آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔ پھر وہ خیال ہی خیال میں دیکھتا کہ جمیلہ کا مرمریں جسم اُس کی ساڑھی میں جس سے عطر کی خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہیں ملبوس ہے۔ اُس کے گلگوں رخسار اُس کے غازے سے کندن کی طرح دمک رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کے سرمے کا دنبالہ ہے۔ اُس کے بالوں میں اُس کے عنبر کی مہک ہے۔ اُس کے کانوں میں اس کے آویزے ہیں۔ اُس کے ہاتھوں میں اُس کی پتلی پتلی چوڑیاں ہیں۔ اور وہ بت خانے کی دیوی کی طرح بنی ٹھنی، دلہن کی طرح سجی سجائی، شرما شرما کے لجا لجا کے قدآدم آیئنے میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ آصف کے دبے ہوئے ہونٹوں سے ایک آہ نکل جاتی۔ وہ سوچتا "کیا یہ ممکن ہے کہ عطر اور غازے کی مہک کے ساتھ میری آہوں کی گرمی بھی اُس کے دل تک پہنچ جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا جسم ساڑھی کے لمس کے ساتھ اس سوزِ ناتمام کی حدّت کو بھی محسوس کرے جس سے میں خود آتش بجاں ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اُس کی سرمگیں آنکھیں اُس شوقِ دید کی بے پناہی کو بھی دیکھ لیں جس سے میری جانِ نزار آتشکدہ بن گئی ہے؟"

آصف بے قرار رہنے لگا۔ اُسے اپنے محبوب مشاغل بے رونق نظر آنے تھے۔ وہ خوبصورت تصویروں، پتھر کے دلآویز مجسموں اور عہدِ عتیق کے تاریخی نوادر سے اپنا مکان سجانے کا شوقین تھا۔ لیکن اب اُسے ان چیزوں سے کوئی رغبت نہ رہی تھی۔ اُس نے صانعِ ازل کا وہ جیتا جاگتا شاہکار دیکھ لیا تھا جس کی آب و تاب کے سامنے مصوّری کے نقوش بیجان و بے کیف ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس کے دل کے مندر میں ایک ایسی سندر مورتی آبیٹھی تھی کہ سنگتراشی کے نمونے اور پتھر کے حسین و جمیل مجسمے اُس کے سحرِ جمال کے سامنے اپنا جادو کھو بیٹھے تھے۔ آصف جذبات کے اس بحران میں مبتلا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنا کھویا ہوا سکونِ قلب کیونکر حاصل کرے کہ ایک روز جمیلہ کے والد کا خط آگیا۔ انہوں نے خیریت سے منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ آصف اور اس کی والدہ کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ اور اخیر میں شفقتِ پدری سے کام لے کر آصف کو یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے اپنے بچوں کی طرح عزیز سمجھتے ہیں۔ آصف کو خط کے مطالعہ سے مایوسی ہوئی۔ اس میں جمیلہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ صرف ایک جگہ آصف کی والدہ کے نام جمیلہ کا سلام درج تھا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ کیا دل کو دل سے راہ نہیں ہوتی؟ کیا محبت کا دیوتا ایک ہی تیر سے دو دلوں کو مجروح نہیں کرتا؟ کیا جمیلہ اس راز سے بے خبر تھی کہ اس کی یاد کسی کی جان کا روگ بن کر رہ گئی ہے؟ آخر اُس نے ڈرتے ڈرتے کانپتے کانپتے جمیلہ کے والد کو جواب لکھا۔ بہت ادب سے اُن کی بزرگانہ شفقت کا شکریہ ادا کیا۔ جمیلہ اور اس کی والدہ کو اپنا خلوص بھرا سلام بھجوایا۔ خط ختم کرنے کے بعد آصف نے کئی بار اُسے پڑھا۔ بہت معمولی رسمی سی تحریر تھی۔ لیکن اُسے رہ رہ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ خط ضرور جمیلہ کی نظروں سے گذرے گا۔ کاش وہ جادو نگاری کے کسی ایسے راز سے واقف ہوتا، سحر طرازی کے کسی ایسے انداز سے آگاہ ہوتا کہ اس معمولی، رسمی، بے کیف سے مکتوب کے بین السطور اپنے اضطراب کو اس ہنرمندی سے منکشف کر دیتا کہ صرف جمیلہ ہی اُس سے باخبر ہوسکتی۔

آصف جس قدر جمیلہ کو بھول جانے کی کوشش کرتا۔ اُسی شدت سے اُس کا خیال دل و دماغ پر حاوی ہوا جاتا تھا۔ اس کی بے قراری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ براہِ راست جمیلہ کو خط لکھے۔ اس کو اپنی موجودہ کیفیت سے آگاہ کرے۔ اُس سے بے تکلفی سے التفات کی بھیک مانگے۔ لیکن پھر فوراً ہی جمیلہ کے والد کی خشونت آمیز متانت اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی اور وہ خوف سے گھبرا جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مسلمان شرفاء کے گھروں میں بالعموم یہ قاعدہ ہے کہ ناکتخدا لڑکیوں کے نام جتنے خطوط آتے ہیں ان کے والدین کی تجسس آمیز نگاہوں کی تشفی کئے بغیر اندر نہیں جانے پاتے۔ اگر اس کا خط جمیلہ

کے والد کے ہاتھ آگیا تو کیا بنے گا۔ اور اگر وہ خط سیدھا جمیلہ کے پاس پہنچ بھی گیا، تو اس کا کیا اعتبار ہے کہ وہ آصف کی جسارت سے ناراض ہو کر اس کا ذکر اپنے والد سے نہ کر دے۔ آخر ایک روز آصف جذبات کی اس کشمکش سے مغلوب ہو گیا۔ وہ اپنی والدہ کے پاس بیٹھا تھا کہ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کی والدہ نے حیران و پریشان ہو کر اسے گود میں لے لیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اس کا منہ چومتے ہوئے بڑے اضطراب سے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔ آصف جس کی ہچکیاں اب تک نہ رکی تھیں، ٹھہر ٹھہر کر، ٹوٹے ہوئے الفاظ میں، اپنے دل کا درد اپنی شفیق غمگسار ماں کے سامنے بیان کر دیا۔ پہلے تو اس ستم خاتون کے دل میں اس قتالہ کے خلاف جس نے اس کے لخت جگر کا آرام اور چین تباہ کر دیا تھا غیظ و غضب کا ایک شعلہ بلند ہوا۔ لیکن جب آصف نے جس کے آنسو ساون کے مینہ کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، رو رو کر اپنی ماں کے سامنے اپنے زخموں کو بے نقاب کیا تو اس کی ماں نے بھی، جو زمانے کا سرد و گرم اچھی طرح دیکھے ہوئے تھی اپنے نور نظر کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "میں کل ہی جمیلہ کی والدہ کو خط لکھ کر تمہاری بات پکی کرتی ہوں۔"

دوسرے روز آصف کی والدہ نے جمیلہ کی والدہ کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔ اور اپنے اکلوتے بیٹے کو ان کی غلامی کے لئے پیش کیا۔ ہفتے عشرے کے بعد ایک روکھا پھیکا جواب آیا کہ جمیلہ کی نسبت اپنے خاندان میں ایک عزیز سے طے ہو چکی ہے اس لئے آصف کی درخواست کو شرف قبول حاصل نہیں ہو سکتا۔ آصف کو یوں محسوس ہوا کہ اسے گویا ایک تاریک اور عمیق غار میں اوندھے منہ دھکا دے دیا گیا ہے۔ جہاں سے اب وہ کبھی باہر نہ آ سکے گا۔ اس مایوسی، اس حزن و ملال اور اس رنج و بیکسی میں آصف کو اپنے آپ سے نفرت پیدا ہو چلی تھی۔ کیا وہ ایسا ہی حقیر و ناچیز، ایسا ہی بے وقار و ذلیل انسان تھا؟ کیا اس کا تمول، اس کی ذاتی لیاقت اور اس کی خاندانی وجاہت اس قابل نہ تھی کہ وہ ایک متوسط درجے کے خاندان کی شریف زادی کے لائق تصور کیا جاتا؟ اسے اپنی توہین اور بے عزتی کا ہر گھڑی احساس ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت بلند، بہت ارفع اور بہت معزز سمجھتا رہا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ فریب خیال میں مبتلا تھا۔ اس کے غرور کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ وہ اس شکست پندار کی تلافی کرنے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ حیران تھا کہ اس ذلت کا انتقام کیونکر لے، اپنی مجروح شدہ عزت نفس کی بحالی کے لئے کون سے وسائل اختیار کرے۔ اس الجھن اور ادھیڑ بن میں وہ اپنی تعلیم سے بھی غافل سا ہو گیا تھا۔ اس کے دوست شاکی تھے کہ وہ اب مجلس احباب میں شریک نہیں ہوتا، کھیل کود اور تفریح کے مشاغل میں ان کے ساتھ حصہ نہیں لیتا۔ آصف نے بھی غیر شعوری طور پر اس درد کا مداوا تلاش کرنے کے لئے دوستوں کی طرف توجہ کی۔ اس کا ایک دوست رحمٰن بہت زندہ دل اور خوش مزاج ہونے کے ساتھ رمز شناس اور معاملہ فہم بھی تھا۔ آصف نے اسی کو اپنا رازدار بنانا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ جب وہ اپنے دکھ درد کی ساری داستان رحمٰن کے گوش گذار کر چکا تو رحمٰن نے جو بظاہر نہایت درد مندانہ طریقے سے ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا آصف کی کمر پر آہستہ سے تھپکی دیتے ہوئے کہا، "کوئی بات نہیں۔ میں ایسا اچھا علاج تجویز کروں گا کہ تم سب رنج و غم بھول جاؤ گے۔"

آصف نے حیران ہو کر پوچھا "کیسا علاج؟"

رحمٰن نے وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا "جب تمہاری حیثیت کے ایک معزز آدمی کی توہین ایک عورت کے ہاتھوں ہو تو اس کا انتقام ساری نسوانی دنیا سے لیا جائے گا۔"

آصف نے پہلے سے بھی زیادہ حیرت کے ساتھ پوچھا "کیوں کر؟"

اور رحمٰن نے پہلے سے بھی زیادہ وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا "یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

ایک روز شام کے وقت رحمٰن آصف کے ہاں آیا۔ آصف یونہی آرام کرسی پر دراز سگریٹ کے کش لگا کر ہوا میں دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔ رحمٰن نے کہا "میں سیر جا رہا ہوں چلتے ہو؟"

آصف نے پوچھا "کس طرف جاؤ گے؟"

رحمٰن نے آصف کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اٹھو تو سہی۔ جس طرف کہو گے چلیں گے"

دونوں دوست ایک بارونق، فراخ اور مصفا سڑک سے گذرتے ہوئے شہر کے ایک گنجان علاقے میں داخل ہو گئے۔ آصف نے رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر کبیدہ خاطر ہو کر کہا "اس طرف کہاں جا رہے ہو؟ چلو واپس چلیں"

رحمٰن نے آصف کا ہاتھ تھام لیا اور بہت نرمی سے کہنے لگا "یہاں میرے ایک نہایت دلچسپ دوست رہتے ہیں۔ جن کی ملاقات تمہاری تفریح کا باعث ہو گی

انہی کے ہاں جا رہا ہوں"۔

آصف جو روزمرہ زندگی کے رنجیدہ تسلسل سے بے حد اُکتا گیا تھا اس خیال سے کہ چلو کسی دلچسپ آدمی سے ملاقات ہوگی، خاموشی سے رحمٰن کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا۔ بازار کا کسی قدر گنجان حصہ طے کرکے بائیں ہاتھ کو ایک بے رونق سی گلی میں گھوم کر ایک معمولی حیثیت کے مکان میں رحمٰن داخل ہو گیا۔ آصف اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ زینے پر سے ہوتے ہوئے دونوں اوپر پہنچ گئے۔ رحمٰن نے دستک دی تو ایک ملازم آیا۔ رحمٰن کو دیکھتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اور بہت ادب سے دونوں کو ایک صاف ستھرے، خوبصورت اور آراستہ کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ آصف نے دیکھا کہ مکان باہر سے جس قدر چھوٹا اور گندہ نظر آ رہا تھا اسی قدر اندر سے فراخ صاف اور خوش وضع تھا۔ کمرے میں ہر چیز نہایت قرینے سے رکھی تھی۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ وسط میں ایک نازک سی تپائی پر خوشبودار پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ دروازوں پر کشمیر کے منقش پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر حسین وجمیل تصویریں آویزاں تھیں مخمل سے ڈھکے ہوئے آرام دہ صوفے پڑے تھے۔ ایک کونے میں پیانو پڑا تھا جس کے قریب ہی میز پر ہارمونیم بھی رکھا تھا۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا پردہ اُٹھا اور ایک خوبصورت، نوجوان، طرحدار عورت مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ رحمٰن نے تکلفاً اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ عورت نے آصف پر ایک متجسسانہ نگاہ ڈالی تو رحمٰن نے تعارف کرانے کی غرض سے صرف اتنا کہا "یہ میرے عزیز دوست آصف علی صاحب ہیں"۔ آصف نے اس عورت کو جی بھر کے دیکھا۔ کس قدر من موہنی شکل تھی۔ بھرا بھرا گداز جسم تھا۔ سرخ وسپید رنگت پر پوڈر کی ہلکی سی تہہ جمی تھی۔ جس سے چہرا زیادہ دمک اٹھا تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ موٹی موٹی بادامی آنکھوں سے جن پر لمبی لمبی پلکوں کا سایہ پڑتا تھا کبھی کبھی کیف وسرور کی ایک لہر سی نکل جاتی تھی۔ اُس نے سرخ رنگ کے ریشم کی ڈھیلی ڈھیلی، کھلے پائنچوں کی شلوار پہن رکھی تھی۔ گھٹنوں تک لمبی سفید ریشمی قمیص تھی اور سر پر، سر پر کیا شانوں پر، پیازی رنگ کا دوپٹہ تھا جس میں سفید مقیش ٹنکی ہوئی تھی۔ آصف کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ عورت کے جسم میں جتنی رعنائی شلوار اور قمیص سے پیدا ہوتی ہے اور کسی لباس سے ممکن نہیں آج اس نے محسوس کیا کہ وہ دلآویزی جس کا وجود اس کے تخیل میں سالہا سال سے موجود تھا مجسم ہو کر اس عورت میں نمودار ہوئی ہے۔

رحمٰن سے چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد جب اُس عورت نے آصف کی طرف غور سے دیکھا تو آصف کو پہلی بار اُن آنکھوں کی کشش اور دلفریبی کا اندازہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں مقناطیسی قوت کے ساتھ اُسے آہستہ آہستہ اپنی جانب کھینچ رہی ہیں۔ کسی پر اسرار طریقے سے اُسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ آصف نے گھبرا کر مُنہ موڑ لیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ اُن آنکھوں سے نظریں نہ ہٹائے چنانچہ وہ چوری چوری اُس عورت کی طرف دیکھتا رہا۔ رحمٰن نے کہا "میرے دوست آصف صاحب موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں - کیا آپ انہیں کچھ گا کر سُنائیں گی؟

اُس عورت نے پھر آصف کی طرف دیکھا۔ اور بظاہر بہت شرما کے جواب دیا "اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

وہ پیانو کے قریب آ بیٹھی اور پندرہ بیس منٹ تک گاتی رہی۔ آواز بہت ہی پیاری تھی۔ آصف کو تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاموش جادو جو پہلے اس کی آنکھوں میں جلوہ فگن تھا اب متحرک ہو کر اس کی آواز میں لہریں لے رہا ہے۔ گانا ختم ہوا تو رحمٰن کسی بہانے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ آصف نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کی آواز بہت ہی دلکش ہے" اور پھر دبے الفاظ میں، گویا وہ خود نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے" "آپ کی صورت آپ کی آواز سے بھی زیادہ پیاری ہے"۔

اُس عورت نے آصف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس ملتجیانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ اِس تحریص ہلاکت کے سامنے بالکل بے بس ہو گیا۔ بیہوشی کی سی حالت میں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اُس عورت کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی تمام اشیاء اس کی نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ بیرونی دنیا کا شور مدھم ہوتا ہوتا اب بالکل بند ہو گیا تھا۔ اس کے قلب کی حرکت اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ تڑپتا ہوا دل شاید ابھی اس کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس کے اعصاب پر اس کا ضبط و اختیار ختم ہو رہا تھا صرف ایک سُرخ و صبیح، معطر و محبوب، حسین و دلآویز چہرہ، جس پر دو موٹی موٹی سیاہ تابناک نشیلی آنکھیں دعوتِ ہلاکت دینے کے لئے روشن تھیں اُس کی نظروں کے سامنے چمک رہا تھا۔ اُس نے اُس عورت کی کمر میں اپنا دایاں بازو ڈال دیا۔ دوسرے لمحے میں اُس کا بایاں ہاتھ بھی اُس کی گردن میں حمائل ہو گیا۔ اور پھر اُس کے لرزتے ہوئے بے تاب ہونٹ

اُس عورت کے رنگین و شیریں ہونٹوں سے اپنی جوانی کے پورے التہاب کے ساتھ پیوست ہو گئے۔

دوسرے دن علی الصبح سورج نمودار ہُوا۔ تو آصف حسن و موسیقی کی اُس جنّت سے نکلا۔ رُمن کا کچھ پتہ نہ تھا کہ اُسے چھوڑ کر کدھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ جب اپنے مکان پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اس کی والدہ اس کے رات بھر گھر سے باہر رہنے سے سخت متفکر و پریشان ہو رہی ہے۔ آصف نے جھوٹ بول کر اس کی تسلّی کر دی کہ اُس کو ایک دوست کی برات کے ہمراہ جانا پڑ گیا تھا۔ اپنی ماں کے سامنے ایسا قبیح جھوٹ بولتے ہوئے اُسے شرم تو ضرور آئی لیکن اس نے سوچا کہ حقیقت کا اظہار اس دروغ مصلحت آمیز سے زیادہ تلخ ہوگا۔ شام کو اس نے اپنی والدہ سے پھر جھوٹ بولا کہ جس دوست کی برات کے ساتھ وہ باہر گیا تھا آج اُسی دوست کے ہاں دعوت ہے اور شاید وہ بہ دیر سے گھر آئے۔ اس کی والدہ نے شک و شبہ اور فکر سے ملی ہوئی نگاہیں اپنے لختِ جگر پر ڈالیں اور با دلِ نخواستہ اجازت دے دی۔ وہ سیدھا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ شبِ گذشتہ کے واقعات کی یاد اُس کے دماغ میں تازہ ہو رہی تھی۔ اُس کے خون میں جوش اور اُس کے جذبات میں ہیجان بپا تھا۔ یہ رات ایسی دلفریب ایسی کامگار ایسی روشن و زریں رات، اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اُس مسافر کی طرح جو ریگستان میں پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کر گر پڑے اور عین اُس وقت کہ جان اس کے لبوں پر آ چکی ہو اسے کہیں سے آبِ حیات کے چند گھونٹ نصیب ہو جائیں۔ آصف بھی اپنی زندگی کے لق و دق صحرا میں بادِ سموم کے تھپیڑوں سے نیم جاں ہو چکا تھا۔ کہ اچانک اسے ایک چشمۂ حیواں مل گیا اور اس کی مرجھائی ہوئی روح پھر ترو تازہ ہو گئی۔ آصف نے اپنی جوانی اُبلتی مچلتی اور پھٹتی ہوئی جوانی کی اوّلیں محبت اس عورت پر نثار کر دی۔ اُس نے جس بے پناہ تندی اور جس طوفان خیز گرمجوشی کے ساتھ اس عورت سے محبت کی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں بجلی کا پیکر ہے اس کی رگوں میں خون نہیں بلکہ آگ کے شعلے ہیں۔ خود وہ عورت بعض اوقات گھبرا جاتی تھی کہ یہ مرد جو حُسنِ سیرت و صورت میں اُس کے باقی ملنے والوں سے کہیں زیادہ پاکیزہ تھا اپنی محبت کے اظہار میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہولناک ہے۔

دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو کر گذر گئے۔ آصف نے جس دلدل میں پاؤں رکھا تھا اس کے اندر دھنستا چلا گیا۔ روپیہ اُس نے پانی کی طرح بہانے میں تامّل نہیں کیا تھا۔ اپنی منظورِ نظر کی بڑی سے بڑی فرمائش کو اُس نے اس کھلے دل سے پورا کیا۔ کہ شاید کوئی والیٔ ریاست بھی اُس کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ آصف کی والدہ کو ہر بات کا علم تھا۔ اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو یوں ڈوبتے دیکھا تو بیقرار ہو کر اس کو بچانے دوڑی۔ اپنے مرحوم شوہر کے دوستوں کے پاس جا جا کر مدد طلب کی۔ جمیلہ کے والد کو خط لکھا کہ "میرے بیٹے کی تباہی کا باعث آپ کا طرزِ عمل ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اب اُس کو موت کے مُنہ سے بچانے کے لئے میری دستگیری کریں"۔ جمیلہ کے والد کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ ایک عورت کی آواز پر لبیک کہنے سے گریز کریں۔ چنانچہ خط کا جواب دینے کی بجائے وہ خود وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آصف تعیّش کے راستے پر سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑ رہا ہے۔ انہوں نے چاہا کہ اُسے زمانے کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن آصف جس کی ہر حرکت سے تمسخر و استہزا کا اظہار ہوتا تھا، زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ "اگر میں تباہ ہو رہا ہوں تو میری تباہی کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر میں موت کے مُنہ میں جا رہا ہوں تو میری ہلاکت کا سبب تم ہو۔ اور اگر میں گھر پھونک کر تماشا دیکھ رہا ہوں تو میری دیوانگی کی وجہ تم ہو۔ تم نے میری پاکیزہ جوانی کے خواب کو حقیقت سے ہمدوش نہ ہونے دیا۔ تم نے میری فرشتوں کی سی پاک و صاف محبت کی قدر نہ کی تم نے اُس معصوم و بے عیب جذبے کو، جو ہر قسم کی آلائش سے مبرّا تھا، عزّت کی نگاہ سے نہ دیکھا اور اب کہ میں نامراد و مایوس انسان کی طرح اپنا غم غلط کرنے کے لئے ہوس کا رَن چکا ہوں، اپنی ذلت کی تلافی کرنے کی غرض سے اُس دنیا میں داخل ہو چکا ہوں۔ جہاں ایک عورت کے اعمال کی سزا ساری صنفِ نازک کو دے کر اپنے نفس کی آگ کو ٹھنڈا کروں گا، تم ناصح مشفق بن کر میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کیوں آئے ہو؟

آصف اس بھنورے کی طرح جو کلی کلی کا رس چوستا پھرتا ہے اپنی تشنگی کو سیراب کرنے کے لئے جگہ جگہ چکر لگا رہا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا شوقِ راہ نوردی تیز اور تیز ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آخری منزل کہاں ہے، لیکن منزل کہیں ہو یا نہ ہو راستے کی جلوہ گاہیں قدم قدم پر اس کے دامن کو کھینچ کر اُسے ٹھہرنے پر مجبور کر لیتی تھیں۔ اس کی راتیں ایسے شبستانوں میں بسر ہوتی تھیں جہاں چاند کے نور، پھول کی مہک اور شاخِ گل کی لچک نے انسان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاں رقص و سرود کی محفلیں آتشِ سیّال کے دور کے ساتھ مل کر غمِ دنیا و فکرِ عاقبت کو فنا کر دیتی

تھیں اور جہاں کام و دہن کی تواضع کے لئے جام و مینا اور چشم نظارہ جُو کی مدارات کے لئے ساقیٔ ماہ وش کا جلوہ موجود تھا۔

آصف کی تنوع پسند اور جدّت طلب طبیعت نے عشق و ہوس کی دنیا میں فنونِ لطیفہ کے ماہر کی طرح وہ وہ رنگینیاں اور لطافتیں پیدا کیں کہ اُس کے گرد و پیش بیٹھنے والے کور ذوق، پست خیال لیکن زر پرست لوگ اُس کی ان حرکات کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ بازار کی عورتوں کے ساتھ جو سہل الحصول ہونے کے علاوہ محبّت کی حسِ لطیف سے معرّا تھیں، اس رقت آمیز شیفتگی اور نزاکت آمیز فریفتگی کا سلوک کرتا تھا کہ گویا وہ اس غلیظ دنیا کی رہنے والی ہستیاں نہیں بلکہ زہرہ اور ناہید کی طرح عالمِ بالا کی دیویاں ہیں۔ باغوں اور سبزہ زاروں میں جا جا کر آبِ رواں کے کنارے اور گل و گلزار کے درمیان راگ رنگ کی محفلیں جما جما کر مئے کہنہ و معشوقِ جواں کی صحبت میں جی کھول کر داد عشرت دے دے کر وہ شہر بھر کے تماشبینوں میں اپنے آپ کو یوں نمایاں کر رہا تھا جیسے باغ کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان سرو کا بوٹا تقابل و تضاد کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ دولت دونوں ہاتھوں سے لٹانے میں اُسے کوئی رنج نہ ہوتا تھا۔ بعض ادنیٰ درجے کے کم ظرف، گندہ دہن لوگ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ ان فرومایہ انسانوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اُسے عیاشی کی زیادہ سے زیادہ چاٹ لگا کر اور بدچلنی کے نئے سے نئے طریقے سکھا کر روپیہ اکٹھا کریں۔ شراب وہ کثرت سے پینے لگ گیا تھا اور کوکین کے استعمال سے بھی اُسے عار نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اُس نے ایسے خطرناک ذرایع اختیار کر لئے کہ اس کی رسائی بازار کے بالا خانوں سے نکل کر شریف گھرانوں تک ہو گئی۔ اُس نے لوگوں کی بہو بیٹیوں کو خراب کرنا شروع کیا۔ شہر کے اندر اس کے خلاف نفرت اور عناد کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ عبرت مند لوگوں نے دیکھا کہ وہ عوام کے افلاس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سرعت کے ساتھ نفس پرستی کی وبا پھیلا رہا ہے۔ نوجوانوں کے لئے اس کی صحبت طاعون کے جراثیم سے بھی زیادہ ہلاک تصوّر کی جانے لگی۔ لوگ اپنے بچوں کو اُس سے دور رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اور شرفا اپنے مکانوں پر اُس کا سایہ پڑ جانے کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اس نے محسوس کیا کہ اُس کے خلاف ایسا خوفناک مواد تیار ہو رہا ہے کہ اگر وہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح کبھی پھٹا تو اس کی زندگی معرضِ خطر میں آ جائے گی۔ اُس کے اندر سود و زیاں کا احساس تو مر چکا تھا البتہ تنقید اور تناسب کی حس موجود تھی

اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ عرصے کے لئے باہر چلا جائے۔ یوں بھی اس کا ماحول اب ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح متعفن ہو گیا تھا۔ وہ اپنے جذبات کی چنگاری کو روشن رکھنے کے لئے تیز و تند ہوا کا محتاج تھا۔ اُس نے دیکھا کہ تیز و تند ہوا کے جھونکے اس کے ہاں ختم ہو چکے ہیں۔ وہ آندھی کی تلاش میں گھر سے نکل کر سیدھا دہلی گیا۔ دہلی سے لکھنؤ لکھنؤ سے بنارس، بنارس سے کلکتے، اور کلکتے سے بمبئی اِس طرح وہ دو سال تک ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھانتا رہا۔ جب واپس گھر آیا۔ تو اس کا دِل بجھا ہوا، دماغ تھکا ہوا، اور جسم کچلا ہوا تھا۔

چھ مہینے وہ اپنے مکان سے باہر نہ نکلا۔ جب جسم میں سکون پیدا ہوا تو دماغ میں حرکت شروع ہو گئی۔ جب خمار اتر گیا تو حقیقت کی تلخیاں ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ صبح سے شام تک اب اُس کا یہ کام تھا۔ کہ خود تو چارپائی یا کرسی پر دراز ہے اور دماغ ماضی کے محاسبے، حال کے تجزیے اور مستقبل کے اندیشے میں مصروف ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ زندگی کی دلچسپیاں ایک ایک کر کے ختم ہو چکی تھیں۔ دنیا کی رنگینیوں سے وہ جی بھر کر لطف اندوز ہو چکا تھا اب اُس کے لئے باقی رہ کیا گیا تھا۔ اس ہر گھڑی بدلتے رہنے والی کائنات میں اُس کے لئے کوئی چیز نئی نہ تھی۔ کوئی تغیّر ایسا نہ تھا۔ جو اس کے دماغ میں تفحص یا اس کی نظر میں جستجو کی تحریک پیدا کرے وہ بے رونق، تھکی ہوئی پژمردہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور اُسے ہر جگہ حزن و ملال اور رنج و بیکسی کی ڈراؤنی تصویریں نظر آتی تھیں۔ وہ اپنا زمانۂ تعیش ختم کر چکا تھا۔ اور اب اُسے یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ دنیا نے سوگ کا لباس پہن لیا ہے۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس مسلسل تکلیف دہ اور ہر لحظہ دل کے زخموں کو ہرا کرنے والی تنہائی سے اگر وہ اُکتا بھی جاتا تو اس کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ خاموشی سے قدرت کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دے۔ اس کا شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ بعض اوقات خود ہی اپنے آپ سے سوال کرتا "کیا میں شادی کر لوں؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ ایک پاکدامن، بے لوث اور عصمت مآب دوشیزہ کے روبرو اپنی گناہوں سے آلودہ روح اور اپنا سیاہ کاریوں سے ملوّث دِل ہدیۃً پیش کر سکوں؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ ایک بھولی بھالی، انجان، ناتجربہ کار، معصوم لڑکی کو اپنی شریکِ زندگی بنا لوں درحالیکہ میرا جسم خوفناک اور مکروہ امراض سے جذام کے

مریض کی طرح گھناؤنا ہو چکا ہے؟ کیا میں ایسی بیوی کے سامنے جس کی پاکیزگی اور جس کے تقدس کو دیکھ کر حوریں بھی شرما جائیں، سربلند و مطمئن رہ سکوں گا؟ کیا یہ فعل میری بداعمالیوں، فریب کاریوں اور ہوسناکیوں کی طویل فہرست میں ایک قابلِ نفرت اضافہ نہ کرے گا؟

ایک شام جب وہ معمول سے زیادہ افسردہ و غمناک اپنے پرتکلف آراستہ کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ اُس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے قدِ آدم آئینے پر پڑ گئی۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے رُکا پھر جیسے خود ہی اس کی طرف کھنچتا چلا جائے وہ آئینے کی جانب بڑھتا گیا۔ اس نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر جا بجا چھوٹے چھوٹے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ اُس کی سُرخ وحشت ناک آنکھیں جن کے گرد حلقے موجود ہیں باہر کی طرف اُبلی پڑتی ہیں۔ اس کی رنگت سیاہ ہو گئی ہے۔ اس کی پیشانی پر اور ناک کی دونوں طرف جھریاں اور شکن نمایاں ہو رہے ہیں۔ اُس کے گال اندر کی طرف پچکے ہوئے ہیں۔ اور مجموعی طور پر اُس کی شکل و صورت سے خباثت ٹپک رہی ہے۔ وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ دفعتہً غیرارادی طور پر اُس کی نظریں سامنے ہی دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر پر جم گئیں۔ یہ تصویر خود اُسی کے عنفوانِ شباب کی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اس تصویر میں وہ ایک بھولا بھالا، خوبصورت، دلکش نوجوان ہے جس کے چہرے پر معصومیت کا نور برس رہا ہے۔ آنکھوں میں حیا کی چمک روشن ہے اور پیشانی سے بلند اقبالی کا ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے اس تندہ تضاد کو دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ اور پھر اسی آئینے میں، اُسی ایک لمحے کے اندر اُس نے مستقبل کی اس سے بھی زیادہ قبیح، اس سے بھی زیادہ شرمناک اور اِس سے بھی زیادہ مکروہ جھلک دیکھ لی کہ اُس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، دانت گر گئے ہیں۔ کمر جھک گئی ہے۔ اور وہ ایک قدم اٹھانے کے لئے دوسروں کی امداد کا محتاج ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی وہ ایک ناتوان بےجان پیکر کی طرح دھڑام سے ایک صوفے پر گر گیا۔ پریشان، جاں گداز، روح فرسا خیالات کی بے پناہ یورش سے اُس کا دماغ تھرتھرانے لگا۔ "کیا وہ بوڑھا ہو جائے گا؟ کیا وہ اپاہج انسانوں کی طرح جھکی ہوئی کمر، رعشے سے کانپتی ہوئی ٹانگوں اور ضعف سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہاتھ میں لاٹھی لے کر چلے گا؟ کیا بچے اُسے دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے اور جوان اُس سے نفرت کریں گے؟ کیا عورتیں اس کی طرف اشارے کر کر کے اُس کی گذشتہ زندگی کی داستانیں بیان کریں گی؟ نہیں نہیں۔ وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ وہ ہمیشہ جوان رہے گا۔ وہ پیری کی مصیبت اور بڑھاپے کی لعنت کو کبھی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے وجود کو اپنے لئے اس قدر بوجھل، اس قدر تلخ اور اس قدر گرانبار نہیں بننے دے گا۔ وہ زندگی بھر جوان رہا۔ اور جوان ہی دنیا سے رخصت ہو گا۔"

دوسرے دن علی الصبح جب ملازم ناشتہ لے کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا آقا اوندھے مُنہ پلنگ پر پڑا ہے بستر خون سے لت پت ہو رہا ہے۔ اُس کی شہ رگ کٹی ہوئی ہے۔ اور قریب ہی بڑا سا تیز خنجر رکھا ہے۔

عاشق حسین بٹالوی

راز و نیاز

نقش طرازِ دہر تو، روح روانِ دہر میں
میرے بغیر اے خدا تیرا کمال ناتمام

تیرا جہان بے فروغ، میرے لہو سے لالہ پوش
میری نگاہ سے جہاں رشکِ سوادِ صبح و شام

میرے ضعیف دوش پر ڈال دیا یہ بار کیوں؟
ہو نہ سکا تھا تجھ سے کیا اپنے جہاں کا اہتمام؟

سچ نہ کہوں میں اے خدا! عالمِ ہست و بود یہ
تیرے بغیر ناتمام۔ میرے بغیر ناتمام

شہید ابن علی

تجلّیات

اگر نہ سوزِ محبت کا آسرا ہوتا　　چراغِ زیست مرا کب کا بجھ گیا ہوتا

خدا کو دیر و کلیسا میں ڈھونڈنے والے!　　تو کاش اپنی حقیقت سے آشنا ہوتا

پرے تھی سدرہ و طوبیٰ سے بھی مری پرواز　　اگر نہ دامِ ہوس میں تو پھنس گیا ہوتا

تمام تفرقے محفل کے مٹ گئے ہوتے　　اگر تو سامنے محفل کے آگیا ہوتا

ہر ایک درد کے بدلے دل و جگر کو مرے　　الٰہی! دردِ محبت ہی دے دیا ہوتا

ترے تغافلِ بے جا پہ مر مٹے ہیں ہم　　تو مسکرا کے اگر دیکھتا تو کیا ہوتا

تمام عمر اثرؔ کو تمہاری آس رہی
جو پوچھتے کبھی تم بھی تو کیا برا ہوتا؟

آثر صہبائی

۱۲۹۸۰

کون سُنے

(گیت)

اُن بن کون سنے، میرے من کا گیت

پھولوں پر بھونرا منڈلائے
جھرنا اپنی دُھن میں گائے
بدری جگ کا جی للچائے

میرے من کا گیت
اُن بن کون سنے، میرے من کا گیت

تارے چمکیں، چلیں ہوائیں
سکھیوں کا سُکھ چین بڑھائیں
دُکھ میں یہ بھی آگ لگائیں

جھوٹی جگ کی پریت
اُن بن کون سنے، میرے من کا گیت

چندرماں ہے مُرجھایا سا
دھرتی کا دل بھی ہے پیاسا
من کو کیا ہو دھیرج، آسا

گئی بسنت بھی بیت
اُن بن کون سنے، میرے من کا گیت

ضیا فتح آبادی ایم اے

داغ

آج اردو جاننے والوں میں ایسا کون ہے جس نے داغ کا کلام نہیں پڑھا اور اس سے لطف نہیں اٹھایا۔ ادیب اور نقاد سے لے کر عام زبان داں تک ایسا کون ہے جو داغ کے شعر او رترنم کو مترادف الفاظ نہیں سمجھتا پڑھے لکھے کو چھوڑیئے۔ ناخواندہ عامی کی لہک سنئے وہ سر راہ گاتا چلا جا رہا ہے اور وہ بھی داغ کی غزل ہی سے مست ہے یہ ہے داغ کی شاعری کی ہمہ گیر دل پسندی۔ آئیے ہم بھی تو دیکھیں اس میں کیا کچھ ہے۔

دیکھو۔ مذاق سلیم چین بر جبیں ہے۔ کہتا ہے کہ داغ کے کلام کا مطالعہ تضیع اوقات ہے۔ اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ابتذال ہی ابتذال ہے۔ داغ کے شیدائی کہتے ہیں کہ حضرت آپ نے دیکھا ہی نہیں۔ داغ کے برابر جوش کلام۔ روانی، بے تابی بیان اور کہاں میسر ہے۔ کبھی فریاد داغ بھی پڑھی ہے۔ یہ فریاد داغ وہی مثنوی ہے جس میں عاشق اپنے محبوب سے بے نظیر کے میلے میں دو چار ہوتا ہے۔ جس کے ؎

رخ سے ظاہر تھا نور کا عالم ٭ اور اس پر غرور کا عالم
چشم خوں ریز وہ فساد انگیز — جس کا شاگرد فتنۂ چنگیز
نگہہ مست ہوشیاری سے — لڑنے والی چھری کٹاری سے
گات بانکی بدن سڈول تمام — فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
ایسے سیتھر وہ دونوں قبۂ نور — شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور

مذاق سلیم کہتا ہے۔ بس ختم کیجئے۔ میرے مشرب میں یہ بے حیایاں ابتذال ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ اس مثنوی میں زبان کے چٹخارے لیا کیا ہیں۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ درد انگیز ماجرائے غم اور نشاط افزا اختلاط و وصال کے نقشے کیونکر کھینچے گئے ہیں۔ میرے لئے یہ کافی ہے کہ ایک انسان نے اپنے حیوانی جذبات حیوان سے زیادہ عریانی سے کام لے کر بیان کئے ہیں۔ یہ بات تو نہ دار پر کہنے کی ہے نہ منبر پر۔

داغ کا شیدائی کہتا ہے کہ حضرت واعظ اس میں داغ کا کیا قصور ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس زمانے میں تھا آپ کو معلوم ہے کہ جب دنیا روتی رہی وہ ہنستا رہا۔ یہ بھی خبر ہے کہ غدر کے بعد شاہ جہاں آباد کی افسردہ محفل میں ہنسنے ہنسانے والا داغ ہی تھا۔ سنئے ۱۸۳۱ء میں جب سلطنت مغلیہ کا چراغ بجھنے والا ہی تھا۔ اس وقت مغلئی تہذیب کے ضامن و حامی خاندان یعنی نواب ضیاالدین والی لوہارو کے بھائی نواب شمس الدین خاں کو یہ گوہر شب چراغ عطا ہوا۔ چھ سال بعد باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو قسمت نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر ولی عہد شاہان مغلیہ سا باپ دیا۔ یوں صغیر سن نواب مرزا نے جب چشم شعور کھولی تو لال قلعہ کے ہنگامے دیکھے ابو ظفر بہادر شاہ جیسا دادا۔ مرزا فخرو جیسا باپ اور شعر و سخن کے چرچے گرد و پیش تھے۔ یہ مانا کہ سلطنت مغلیہ کے جانشین سلطنت ہاتھ سے کھو بیٹھے تھے۔ مگر تھے تو جہانگیر اور شاہجہاں کی اولاد۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی، مگر ساغر و مینا تو ہاتھ میں تھے۔ بات میں شاہی وقار جو بات کو فرمان بنا دیتا ہے باقی نہ تھا لیکن شعر کے پھول تو منہ سے برستے تھے۔ اس تباہی اور بے بسی کے دور میں خود فراموشی شرط حیات تھی اور اس دور کے لال قلعے پر ہی کیا منحصر ہے۔ یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے جو قید مکان و زماں سے آزاد ہے۔ دیکھو۔ جب چار سال کے قتل و خونریزی کے بعد ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا تو یورپ نے اسٹیج کی صورت کیا سے کیا بدل ڈالی۔ ڈراموں کے بدلے راگ لیلا کا رواج عام ہو گیا۔ لاکھوں روپیہ ان کی تیاری میں صرف کیا جانے لگا اور یورپ کی مہذب مخلوق نے وہ قدردانی کی کہ لاکھوں کے عوض کروڑوں روپیہ دیا۔ جب پیرس اور لندن آج یہ کچھ کر رہے ہیں تو غدر سے پہلے شاہجہاں آباد نے اگر غم کی تلخی کو بہلانے کے لئے تعطل اور جمود کے خود فراموش کرنے والے ساغر پیاپے چڑھائے تو کیا عیب کیا۔ اسی فضا میں نواب مرزا داغ بھی پلے اور بڑھے۔ انہوں نے

ساکہ شاعری

بھی استاد ابراہیم ذوق کی شاگردی کی۔ شاعری کو مشرب بنایا اور اس دور کے لوازماتِ حیات کو اپنا مسلک قرار دیا۔

مصائب کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا فتنہ برپا ہوا۔ خود فراموش کے ہاتھ سے بلوریں ابریق چھٹ کر زمین پر گری اور پاش پاش ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تو مبہوت رہا۔ پھر نئی ابریق کی تلاش میں جانِ عزیز کے ہمراہ مارا مارا پھرا۔ لیکن نئی ابریق میسر نہ آئی وہ مہ وش ساقی نہ ملے میخانے عنقا ہو گئے ناچار خود فراموش ایک بھٹی کے دروازے پر جا ٹپا اور دُرد کشی شروع کر دی۔

خال خال ایسے افراد بھی تھے جن کی اس صدمے سے آنکھیں کھل گئیں انہوں نے روتے ہی روتے عمر گزار دی مگر دار کے غازی بن نہ سکتے تھے۔ گفتار کے غزوے برپا کرنے لگے۔ اپنے معنوی جانشین چھوڑ گئے۔ غالب کے فرزندانِ معنوی یعنی حالی اور اقبال اسی صدمے کے چیدہ مظاہرے ہیں۔ لیکن بیشتر خود فراموش ہی رہے۔ شاید ظرف عالی نہ تھا عوام کے طنز سے ڈر گئے اور وہ کھسیانی ہنسی ہنستے رہے جو داغ کے تغزل کی جان ہے۔

عزیزو سنو۔ شاعری نام ہے ایک بے تاب گریے کا یا ایک بیتاب خندہ کا۔ شاعر ہنستا ہے اور روتا ہے۔ آپ اور میں اس رونے اور ہنسنے کو شعر کہتے ہیں۔ لیکن شاعر کا یہ ہنسنا اور رونا کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ

گہ گریۂ او چو ابرِ بہارے ٭ گہ خندۂ او چو تیغِ اصیلے

اب اس رونے کی دو قسمیں ہیں۔ عام طور پر کرب و بے چینی کا رونا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ ابرِ بہار بھی ہوتا ہے۔ وہ رونا جو ابرِ بہار ہے۔ شعر ہے۔ اسی طرح خندہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جیسے خندۂ کبک کہ محض بناوٹی اور کھوکھلا ہے اور دوسرا وہ کہ جس میں جھنکار ہے۔ نغمہ ہے۔ دعوت ہے جہدِ عمل کی۔ امیدیں ہیں کامیاب فردا کی۔ یہ موخر الذکر بھی شعر ہے اور مکمل شعر۔

اردو شاعروں میں میر تقی روتے رہے۔ میر درد روتے رہے۔ اور کس طفلانہ سادگی سے کہ سننے والوں کا دل ماں کے دل کی طرح بے تاب ہو ہو گیا۔ ہنسنے والے ہنستے رہے۔ اکبر الہ آبادی ہنستا رہا۔ لیکن اس کی زیرِ لب ہنسی نے ہمیں ہنسایا بھی اور رلایا بھی۔ داغ بھی ہنسنے والا شاعر ہے اور صرف یہی نہیں ہنسوڑا ہے۔ اس کی آوازِ خندہ یعنی زبانِ شعر۔ شیریں ہے۔ رسیلی ہے۔ مگر اس کی جھنکار میں کرختگی ہے۔ سکۂ زر کی چھنک نہ کہ اونچے دہات کی ٹھنک ہے۔ خواہشات کی عریانیاں۔ اس کی ہنسی کو دلآویزی سے محروم کر دیتی ہیں۔ البتہ بے تابانہ قہقہے کی کرختگی کو عیاں کر دیتی ہیں۔ اس کی ہنسی مینا سے ڈھلنے والی مے ناب نہیں۔ اسے شراب ساقی کے ہوش ربا مگر درسِ ضبط دینے والے ہاتھوں سے نہیں ملتی۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ دور دور کی زبان جدا جدا ہے۔ آج ایک طریقہ اظہار مطلب ہے اور کل وہی مردود ہو سکتا ہے۔ آج زبان چند اخلاقی قیود کی پابند ہے کل ان قیود سے آزاد ہو سکتی ہے۔ آج محاورہ اشارے اور کنائے پر اکتفا کرتا ہے کل ممکن ہے کہ اس کا مایۂ ناز وضاحت ہو۔ لیکن یہ تبدیلیاں جذبات کو اعلیٰ یا اسفل نہیں بنا دیتیں۔ جذبات کی نزاکت۔ زبان کی چیرہ دستیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ یعنی پرستش پرستش ہی ہے۔ طلب۔ طلب ہی ہے۔ خواہش۔ خواہش ہی ہے۔ ان میں تمیز کرنا مشکل نہیں۔ ہاں دوسری طرف اس کا بھی علاج نہیں۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

اس تمام گفتگو کے بعد اب صورتِ تحقیق یہ ہے۔ کیا داغ فطرتاً مبتذل تھا اور کیا اس کے کوزۂ طبع سے وہی جنس مبتذل قطرہ قطرہ ٹپکا کی جو اس کو نبے کا سرمایہ تھی یا داغ نے ارادتاً مذاقِ عامہ کی مطابقت میں۔ خراجِ تحسین کے حصول۔ وسیلہ معاش کے فروغ اور ملکِ سخن پر استیلا پانے کے لئے ایسا کیا۔ ان سوالات کا مزید تجزیہ کیجے تو اس بحث کی نظریاتی صورت یہ ہو جائے گی کہ کیا آرٹ کا مدعا صرف آرٹ ہے یعنی شعر کو لیجے تو کیا شعر کی تخلیق کا مقصد صرف تحصیل اور تکمیلِ حُسن ہے۔

حسن کمل کی تعریف ممکن نہیں قطعی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حسن کیا ہے۔ کوئی کسوٹی ایسی نہیں جس پر حسن کی پرکھ کی جا سکے۔ فانی تو کہتا ہے۔ سہ حسن کمالِ حُسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے۔ مگر اکثر غازہ کی بوقلمونیاں دھوکے میں ڈال دیتی ہیں اور یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی حسن ہے۔ حالانکہ چشمِ بینا غازے کے پردے کے پیچھے روئے زیبا کے بدلے روئے زشت دیکھ لیتی ہے۔ حسن کی پرکھ صرف وہی کر سکتا ہے جو اس جنس سے واقف ہے۔ اس جوہر کا جاننے والا جوہری شاعر خود ہے یعنی شاعر کے مقرر کردہ معیار سے حسن کی پرکھ ہو سکتی ہے لیکن شاعر تو حسن کا طرفدار ہے۔ اس متوالے کا اعتبار کیا۔ مدعا علیہ کو منصف کیسے مقرر کیا جا سکتا ہے؟

اچھا شاعر نہ سہی۔ مذاق عامہ سے فیصلہ طلب کیجے۔ اس کی بات خدا لگتی ہوگی۔ یہ بات شاعر منظور نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اجتماعی مذاق حسن کی پرکھ میں قابل اعتماد نہیں اور نقاد ان کا فیصلہ بے معنی ہے۔

ایسی صورت میں ادبی نقاد کہتا ہے کہ مریض کو ڈاکٹر کے سپرد کرتے ہو۔ مکان انجنیئر سے بنواتے ہو۔ ادبی فیصلے میرے آگے پیش کرو میں تنقید کے اصولوں سے واقف ہوں۔ بے لاگ بات کہوں گا شاعر اور جمہور معترض ہوتے ہیں کہ تم لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہو۔ وکیلوں کی طرح بے اعتبار ہو۔ کل کی بات ہے تم نے غالب کو منہ تک نہیں لگایا تھا۔ آج اس کا کلمہ پڑھتے ہو۔ اسے خدائے سخن کہتے ہو تمہاری بات کا اعتبار کیا۔ مگر نقاد کہتا ہے کہ مجھے وکیل کی طرح جلب منفعت مقصود نہیں۔ اگر غلطی کروں گا تو وہ ارادی نہیں ہوگی۔ نیت میری بُری نہیں۔ میں اپنے اصول تمہارے سامنے پیش کئے دیتا ہوں۔ انہیں پرکھ لو۔ اور تسلی کرلو۔ اس کے بعد میرا ذمہ۔

آئیے۔ اب نقاد کے اصول تنقید پر بھی ایک نگاہ ڈالیں۔

جمالیات اور تنقید کے ماہرین کے ایک گروہ کی رائے ہے کہ شعر اگرچہ شاعر کے ہیجان فطری کا مظاہرہ ہے تاہم اگر شاعر اس ہیجان فطری کے بے کم و کاست اظہار کے لئے موزوں اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو اس کا کلام خوب ہے ورنہ زشت۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت شعر پر تنقید صرف زبان پر تنقید ہے یعنی شعر کا لطف صرف صوتی ہے اور اس کا دائرہ اپنی انتہائی وسعت اور پہنائی میں حواس خمسہ کی حدود کے باہر نہیں جاسکتا جو لطف شعر سے حاصل ہوتا ہے وہ اور چیزوں سے بھی ہوسکتا ہے کبھی گھنگھور اور متوالی گھٹاؤں میں پپیہے کی آواز خندہ انبساط پیدا کرتی ہے اور کبھی جلتی بھنتی گرمیوں میں ریت کے شرارے اڑانے والی لُو طبیعت کو بے حد منغض کردیتی ہے۔ اور اگر شاعری ان دونوں کیفیات میں حواس خمسہ کے خندہ اور گریہ تک محدود ہے۔ اور اگر نقاد مجبور ہے کہ اسی اصول کے ماتحت بھلے بُرے کا حکم لگائے تو یہ ظاہر ہے کہ داغ کو مکمل شاعر تسلیم کیا جائے گا۔ لال قلعہ میں داغ کو ایک عالی مرتبہ حاصل تھا اردو زبان لال قلعہ کی خانہ زاد چھوکری تھی۔ وہ داغ کے آگے بھی ہمیشہ دست بستہ ہی کھڑی رہی۔

مجھے اس اصول سے اتفاق تام نہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ میں اصول تنقید وضع کروں۔ لیکن میرا دعوے ہے کہ صرف لسانی معیار شعر کی جانچ کے لئے کافی نہیں۔ معنی بھی شعر کا ایک نہایت ضروری جزو ہے یعنی حسن الفاظ اور حسن معنی کی دلکش آمیزش سے شعر بنتا ہے۔ شاعر کی زندگی جذبات سے پرورش پاتی ہے۔ شاعر کی قوت تخیل اس کے نفس کا تزکیہ کرتی ہے۔ شاعر کو دلائل اور براہین سے سروکار نہیں۔ وہ لسان الغیب ہے۔ اس کے اخذ کئے ہوئے نتائج منطق کے شرمندۂ احسان نہیں۔ یہ سب سہی۔ مگر شاعر اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کا جمالیاتی ہیجان انہیں تاثرات سے ایک دنیا پیدا کرتا ہے اور ہرچند کہ وہ دنیا شاعر کی دنیا ہے۔ مگر عوام کی دنیا ہی سے اخذ کی گئی ہے اس لئے اگر شاعر شعر صرف اپنے ہی لئے کہتا ہے تو اسے حق حاصل ہے وہ جو کچھ چاہے کہے۔ مگر جب اس کا ترنم دنیا والوں کے کانوں تک پہنچے گا تو اسے یہ حق باقی نہ رہے گا۔ پھر اس کی یہ مجال نہیں کہ وہ آزادانہ کہے کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔

اگر کوئی شاعر کہتا ہے کہ مجھے عوام کے اعتنا کی حاجت نہیں۔ میں صرف لذت سخن کے لئے شعر کہتا ہوں۔ مجھے سامعین سے واسطہ نہیں تو اس سے کہو کہ میاں شاعر تمہارے جذبات بے شک تمہارے ہیں۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ان کا اظہار بے شک آپ کے لئے طمانیت بخش ہوگا۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ شعر شاہ مدرسہ کہ پرد اور اب جبکہ یہ مدرسہ میں پہنچ چکا ہے تو ہمیں بھی حق ہے کہ ہم لطف زبان کے ساتھ ساتھ حسن معنی کو بھی پرکھیں اور اس سے لطف اٹھائیں۔ اس پر اسے قایم کریں۔ اچھا ہو تو اسے پڑھیں اور سر دُھنیں۔ برا ہو تو اس پر ہنس دیں کہ شاید ہماری ہنسی سے تمہیں رنج پہنچے اور شاید آیندہ تم شعر گوئی سے باز رہو۔ سنو شعر کا مقصد تخاطب ہے۔ اپنے طریقہ خطاب میں جتنی چاہو شخصی جھلک بھر دو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ کہو کہ ثقہ ہو یا عامی۔ کسی کے آگے سر جھکانا اور شرمندہ ہونا پڑے۔ اور میاں نواب مرزا داغ آپ کے لئے کسب شعر۔ وسیلہ معاش بھی تھا۔ آپ کساد بازاری کے باعث ایک زمانے میں پریشان بھی رہے۔ پھر آپ پر نقاد کا بھی زور ہے۔ آپ اس کے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اگر ایک گروہ آپ کے لذت بیان کا قائل ہے تو دوسرا گروہ آپ سے گنجینہ معنی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے یہی تو شعر کے دو جز ہیں۔ یعنی لذت بیان اور حسن معنی۔

حسن معنی۔ میں اس سے قبل کہیں عرض کرچکا ہوں کہ شاعر کی

دنیا تاثرات کی دنیا ہے۔ ایک راہ گزر پر عام مخلوق کے ہمراہ شاعر بھی گامزن ہے۔ ایک ہی منظر کو دیکھتے ہوئے دونوں گزر جاتے ہیں۔ شاعر بھی دیکھتا ہے اور شخص غیر معروف بھی۔ موخر الذکر دیکھتا ہے اور شاید بہت ہی سطحی نگاہ سے۔ اگر کچھ دیکھ بھی لیتا ہے تو سمجھتا نہیں۔ اگر سمجھ بھی لیتا ہے تو نتائج مرتب نہیں کرتا اور اگر یہ سب مدارج طے بھی کر لیتا ہے تو نتائج کا اعلان نہیں کر سکتا۔ برخلاف اس کے شاعر منظر کو دیکھتا ہے سمجھتا ہے۔ نتائج مرتب کرتا ہے اور ایسے نتائج کہ جن تک عام نگاہ پہنچ ہی نہیں سکتی۔ مزید براں ان نتائج کا اعلان کرتا ہے اور اس انداز سے کہ اس کا اعلان کان میں آواز بن کر جاتا ہے مگر اثر بن کر دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ایک نہایت ہی عام مثال لیجئے۔ انگلستان سے ہندوستان کا سمندری سفر ہزارہا مخلوق ہر ماہ کرتی ہے۔ جزیرہ سسلی راہ میں پڑتا ہے کسی جہاز پر بھی ایسا فرد بشر نہیں ہوتا جو اس جزیرے کا نام نہ پوچھے یا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ جزیرہ سسلی ہے اس راہ سے سینکڑوں گزر جانے والے چپ گئے اور چپ آئے مگر جو کچھ اقبال کے دل پر گزری اور پھر اس کی زبان پر آئی وہ یہ ہے:۔

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار ؎ وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی ؎ بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ؎ تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں ؎ جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے ؎ قصۂ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا ؎ خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

آپ میں اکثر حضرات ایسے ہوں گے کہ جنہیں بھولے بسرے کھنڈرات اور قبرستان میں ہڈیاں نظر آئی ہوں گی یہ خیال بھی گزرا ہو گا کہ یہ ہمارے جیسے ہی انسان کی ہڈیاں ہیں کہ جن پر چلتے پھرتے پاؤں پڑ جاتا ہے۔ لیکن یہ سودا ہی کی نظرِ تخاطب اثر تھی کہ جس کے پڑتے ہی کاسۂ سر یوں بول اٹھا۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ پڑا ؎ یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ؎ میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

اسی قسم کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک بے حد قدیم قصبے کے کسی غریب محلے میں ایک کمہار چرخ پر مٹی چڑھائے برتن ڈھال رہا ہے آتے جاتے سب ہی دیکھتے ہیں کوئی کوئی اپنے مطلوبہ ظروف کا نرخ پوچھتا ہے مول تول کرتا ہے اور بس خیام بھی اسی راہ سے گزرتا ہے۔ اس کی آنکھ کچھ اور ہی دیکھتی ہے۔ مشاہیر کی خواری اس سے نہیں دیکھی جاتی اور وہ کوزہ گر کو تادیب کئے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہوشیاری ؎ تا چند کنی بر گلِ آدم خواری
انگشتِ فریدون و کفِ کیخسرو ؎ بر چرخ نہادۂ چہ می پنداری

اس قسم کی بے شمار مثالیں فارسی اور اردو کی شاعری میں موجود ہیں یعنی تاثراتِ قلبی اور جذبات الفاظ بن کر منہ سے نکل گئے ہیں اور شاعری ان پر نازاں ہے یہی مایۂ ناز جنس "حسن معنی" ہے اور یہی شعر کا بہت بڑا جز ہے اور یہی اشخاص و اقوام کی زندگی پر نامعلوم مگر وقیع اثرات ڈالتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسان کے لئے ماحول کی تمیز شرطِ حیات ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ہر وہ شے جو حیات شخصی و ملی کی تنومندی میں نقص پیدا کرنے منشائے حیات نہیں ہو سکتی۔ شگفتگی نیچے کی عافیت اور صحت کی ضامن ہے۔ شادابی پھول کے حسن کی کفیل ہے۔ ربیع کی نرم گام ہوا صبا کہلاتی ہے اور فرحت بخش ہے مگر چڑچڑا اور زرد بچہ عموماً بیمار ہوتا ہے پژمردہ پھول حسین نہیں ہوتا سرد و [illegible] ہوا خوش آیند نہیں قصہ مختصر ہر شے جو ممد حیات ہے دل کش ہے حسین اور ہر چیز جو قاطع حیات ہے وہ بھیانک ہے اور [illegible] قاعدہ عام ہے اس میں مستثنیات نہیں اور اسی لئے وہ شعر جو اشخاص اور اقوام کو آرام طلب اور سست رگ بنا دے بھیانک اور [illegible] ہے دیکھو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے قبل کی دہلی میں مومن خاں تھے ان کے سوانح حیات بتاتے ہیں کہ وہ غیور تھے اور حساس و تباہی کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور جانتے تھے آئی بلا ٹلنے والی نہیں۔ جائے پناہ کی انہیں تلاش تھی۔ ساتھ ہی اپنی بے چارگی کا احساس بھی تھا اپنا حالِ دل اور اسلوب زندگی ایک شعر میں بیان کرتے ہیں ؎

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
ہے بیمِ برقِ بلا روز آشیاں کے لئے

انحطاطِ ملی کا شکار ہو گئے تھے اور اسی لئے اپنے دل کو یہ متشائم تسلیاں دیتے رہے۔ مگر اسی دور میں ایک اور شخص بھی تھی اس کا جسم سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود" تھا لیکن [illegible]

آزاد تھی اس آزاد روح کا ترانہ بھی سنو؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیرودار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
بجنگ باج ستانان شاخساری را — تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

دیکھو اور غور کرو۔ دو ہم عصر اشخاص کے جمالیاتی ہیجان نے اپنے ماحول کے تاثرات کی کس قدر مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ ان دونوں ہستیوں سے بہت نیچے کے طبقے میں ایک اور شخص بھی تھا جو انحطاط ملی کے لازمی نتیجے یعنی ابتذال شخصی کا مقابلہ نہ کرسکا شخصی زندگی کی تلخیوں اور ملی زندگی کی پرخطر بے چینیوں سے ڈرا ہوا تھا۔ اس کی تحت الادراک حس شکستہ مرے مناظر سے ابھی خائف تھی اس لئے وہ کشاکش حیات کو بھول جانے اور بھلا دینے کے لئے مزاج انسانی کے ایک لاینفک مگر اسفل جز کی طرف رخ کر بیٹھا اور اپنی تمام عمر اسی طلب خود فراموشی میں کھو دی۔ ساحل کی سلامتی میں دریا کے منافع اس کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ یہ شخص داغ تھا میں اس دعوے کی دلیل میں داغ کا تمام کلام پیش کرتا ہوں کیونکہ اس دفتر کی ہوسناکی کا بیشتر حصہ مدہوشی اور ابتذال کے نمونوں سے بھرا پڑا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے شخص کی شاعری اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آسودگی اور فراغ کی تلاش جو تمادم خویشتن زابرق ساں زن کے متضاد ہے اعتماد نفس غائب کر دیتی ہے اور جو شے شخصی زندگی سے سوز بے باکی اور اعتماد نفس کو نیست و نابود کر دے وہ اس شخص کے جمالیاتی ہیجان میں ان چیزوں کا نشان کیوں چھوڑنے لگی۔

ہماری شاعری کی ایک صنف یعنی غزل خود فراموشی اور ابتذال کے لئے بوجوہ چند موزوں ہے۔ داغ نے کم و بیش بالکلیہ اسی صنف کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اس کی غزلیات میں بیشتر ہوسناکی جلوہ گر ہے۔ اس کی مثالیں آپ جتنی چاہیں میں دے سکتا ہوں مگر مذاق سلیم پر گراں گزرنے کے خیال سے درگزر کرتا ہوں۔

داغ کے کلام میں حسن معنی کی تشنگی کے اعلان کے بعد میں حسن بیان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا چاہتا ہوں۔

ہر مضمون کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ زبان مضمون کے ماحول کا خیال رکھے اور اس کی مطابقت میں ہو۔ رزم کے لئے پرشکوہ الفاظ اور وقیع تشبیہ و استعارے ضروری ہیں۔ بزم کے لئے طرب انگیز ترکیبوں کا استعمال موزوں ہوتا ہے۔

استعارہ اور تشبیہ کا وضع کرنا ہی حسن بیان ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں "حسن بیان" کا گنج گرانمایہ بکھرا پڑا ہے۔

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اس تیغ کی چمک — بھاگے شعاع مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک — چمکی عجب تو کانپ گئے چرخ پر ملک

ہر شے تھی خوف جاں سے خضوع و خشوع میں
سجدے میں تھی زمین تو فلک تھا رکوع میں

پُرخم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب — آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر نہاں کی تاب — تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب

جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

داغ کے کلام میں میر انیس کی بے مثل قوت اختراع یعنی نئے نئے استعارہ اور تشبیہ کی توضیع کا تو البتہ فقدان ہے مگر داغ بھی مروجہ زبان کا سرمایہ دار ہے۔ روانی۔ برجستگی۔ ترنم۔ سلاست۔ لوچ رس کیا ہے جو داغ کے کلام میں موجود نہیں۔ پری وش حجاب کا ذکر اور داغ کا زور بیان راز داں کو رقیب بنانے میں بے لاگ کارگر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن دوستو۔ غور سے دیکھو ان الفاظ کے پردوں میں بھی داغ عریاں ہے مثلاً

؎ تم کو ہے وصل غیر سے انکار — اور اگر ہم نے آ کے دیکھ لیا
؎ آپ کے گھر میں فرشتے تو نہیں تھے نازل — جیسی بد ہو کے بیٹھے تھے جو مہمان و ہاں
؎ پہلے گالی دی سوال وصل پر — پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی

کہاں تک ایسے اشعار سنئے گا۔ چھوڑیئے اس بے گناہ پر پردہ پڑا رہنے دیجئے۔ حسن بیان پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ دنیا اس راز سے واقف ہے کہ ہر ہر لفظ کا مزاج ہوتا ہے کوئی سخت و تند و تلخ ہے تو کوئی شیریں اور ہلکا پھلکا۔ شاعر الفاظ کے حسن سے خوب خوب آگاہ ہوتا ہے۔ وہ ہر لفظ کا مزاج بھی جانتا ہے اس کا رنگ بھی اس کا نغمہ بھی کیونکہ وہ اپنے کلام میں لفظوں ہی سے وہ باتیں بیان کرتا ہے جو عام نگاہیں دیکھتی ہیں مگر بیان نہیں کرسکتیں۔

اس کے علاوہ حسن بیان کا ایک اور پہلو بھی ہے جو حقیقتاً شعر کی جان ہے۔ شعر کے اس جزو اعظم کو کنایہ (Suggestion)

کہتے ہیں۔ تم بات کہہ جاؤ میں سمجھ لوں اور پردہ درمیان رہے۔ مست ضرور ہو جاؤ۔ لغزشیں ضرور ہوں اور ایسی کہ گرو تو ساقی کے پاؤں پر۔ مگر ذوق سلیم محتسب گرفت نہ کر سکے۔ سنو شیفتہ کے عشق کا چرچا ہوا۔ معشوق کے حسن و جمال کا شہرہ بھی ساتھ ساتھ عام ہو گیا۔ بدزبان بدنام کرنے لگے۔ عاشق کو یہ بات گراں گزری۔ اس حسن کو جو رقیبوں کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں طعن سے بچانے کے لئے شیفتہ نے یہ بات بنائی کہ میاں۔ میں تو ازلی شورش مزاج آدمی ہوں۔ ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہوں کسی کے بھلے اور برے نام کی پروا نہیں کرتا اور وہ تو ابھی کم سن ہے اس کا قصور کیا۔ تم ناحق اسے مطعون اور بدنام کر رہے ہو۔ بھلا اس نے میرا دل لینے کی خواہش یا کوشش تھوڑا ہی کی تھی ؎

تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش مزاج میں ٭ اس نوبہار حسن کو بدنام مت کرو

دیکھو۔ معشوق کے حسن و جمال کا ذکر بے الفاظ کے کر گیا۔ اس کی کمسنی کا بھی اعلان کیا۔ اپنے عشق کا بھی دعوے کیا۔ اپنی خوش نصیبی پر بھی ناز کیا۔ لیکن سب کچھ کس لطف کے ساتھ۔

شعر کو ایک بار پھر سنئے اور لطف اندوز ہوجئے۔ ؎

تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش مزاج میں ٭ اس نوبہار حسن کو بدنام مت کرو

برخلاف اس کے داغ کو لو میرا یہ مطلب نہیں کہ داغ کنایہ کے لطف سے ناآشنا ہے لیکن کنایہ کنایہ میں فرق ہوتا ہے جس کا معیار تہذیب نفس ہے۔ بھلا داغ کے کلام میں سے اس مضمون کا کوئی شعر نکالو اور پھر دیکھو۔ جوانی۔ جوبن۔ ہرجائی۔ گات۔ کیا ہے جو وہاں موجود نہیں۔ صاحبو۔ آرٹ کے ارفع ہونے کا راز ضبط ہے۔ حجاب سکوت میں چھپے ہوئے خیالات۔ جب ضبط کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ آسمان شاعری پر درخشندہ ہوتے ہیں تو ان کی موسیقی عریاں تکلم کے بے باک قہقہوں سے کہیں زیادہ روح افزا ہوتی ہے۔ صاحبو۔ داغ اس راز سے ناآشنا ہے۔ وہ زبان اور بیان کا مالک ہے۔ لیکن ان کی عصمت کا قائل نہیں۔ وہ تو بے باکانہ قہقہہ کا متوالا ہے۔ اسے خندہ زیرلب سے کیا۔

آپ کہتے ہوں گے کہ غزل میں غزل کا طور چاہیئے۔ ہر ساز اپنی اپنی جگہ ہے طبلے کا خندۂ بے باک اور ستار کا ترنم زیرلب بالترتیب ہر دو کا مایہ ناز ہیں۔ داغ نے غزل کہی ہے اور دیکھ لو کہ غزل کے عناصر اور لوازمات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں آئیے داغ کی غزل کو صرف غزل کی حیثیت سے دیکھیں اور اس کے کلام کی داد دیں۔

غزل عشق کی داستان ہے۔ عشق ایک جذبہ ہے جو انسانی دل پر جب پیدا ہو جاتا ہے تو عاشق کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ اسے ہر طرف اپنا محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے اور خواہ محبوب کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو دل قریب تر ہونے کی خواہش رکھتا ہے اور ھل من مزید کہے جاتا ہے اس کو وصل و ہجر دونوں میں سے کسی کی تاب نہیں۔ ہجر میں یوں روتا ہے کہ وہ پاس نہیں اور وصل میں بقول حافظ

بلبلے برگ گل خوش رنگ در منقار داشت ٭ واندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ٭ گفت مارا جلوۂ معشوق بریں کار داشت

عاشق ہجر میں تو روتا ہی ہے۔ لیکن وہ ہجوم تابش حسن کی وجہ سے بھی روتا ہے۔ پھر عاشق کا رونا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کا دل روتا ہے جسم کا روں رواں روتا ہے اور اس کو روتا دیکھ کر دیوار و در اور گرد و پیش کی ہر شے رونے لگتی ہے۔ عشق کی بے خودی میں اسے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ فراوانی شوق اور انتہائے شیفتگی۔ بے تابی خواہش جمال میں نارہ نالے اس کی زندگی کو سوز و گداز کا مجسمہ بنا دیتے ہیں۔

گریہ وزاری اس کا شغل حیات ہے۔ وہ رنج کی لذتوں سے مانوس ہے اس لئے جادۂ عشق پر اور چلنے والے بھی اسے عزیز ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ حضرت عشق کے الطاف حسب توفیق و باندازہ ہمت سب پر یکساں ہیں۔ وہ اپنی داستان عشق ہر ایک کو نہیں سناتا۔ اپنے ہمنوا عشاق کو اپنا راز داں بنا لیتا ہے۔ کوئی اور سنے تو پند و نصیحت کرنے لگے لیکن یہ دونوں ماجرائے عشق سن کر لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری است ٭ کہ ما دو عاشق زاریم کار ما زاری است

عاشق ہے اور اس بات پر فخر ہے کہ اس سا عاشق دوسرا کوئی شاید ہی ہو۔ اپنے ظرف پر فخر کرتا ہے۔ رقیب کم مایہ کی پروا نہیں کرتا بلکہ اسے تو یہ شبہ ہے کہ بلبل جیسی عاشق بھی گریۂ عشق میں اس کا ساتھ شاید ہی دے سکے۔ عاشق کا رتبہ بہت بلند ہے۔ قتل کے بعد جب خاک و خوں میں لتھڑا پڑا تھا اس وقت بھی اس شہید عشق کے خونچکاں کفن میں اس قدر بناؤ تھا کہ پڑتی تھی آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی یہ سب ہے۔ مگر خارجی دنیا کے ساتھ۔ اپنے معشوق کے ساتھ سراپا عجز ہے تعلی تو کیا ہمسری بھی نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اپنی وفا پر ناز ہے۔ مگر یہ وفا بھی نتیجہ ہے اس حسن کے جلوے کا جس کا حریف اور ثانی پیدا



افسانہ خواں

نہیں۔ جب یہ حال ہو تو معشوق کا ہر کام اس کے محاسبہ سے بلند تر ہے۔ جب بہت ہی مایوس ہوتا ہے تو طعنہ دے دیتا ہے کہ جاؤ تم محبت کیا کیا نبھاؤ گے۔ بے مہر ہو۔ مگر خود ہی نادم ہو جاتا ہے کہ میں نے یہ کیا کہا۔ مجھے معشوق کا احترام ضروری ہے وہ کوئی عام ہستی نہیں۔ یہ میرا نصیبہ تھا کہ اس تک پہنچ گیا۔ ورنہ اس پیکرِ عفت و عصمت تک تو ہوس پرست جو ہر وقت نئے نئے معشوقوں کی تلاش میں رہتے ہیں اپنے طائرِ خیال کو بھی نہیں پہنچا سکتے اور بس ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔

مگر عشق کرتے مدت گزر گئی۔ صورتِ التفات نظر نہیں آتی کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سادہ لوح پر کسی اور کا نقش جم گیا ہو۔ عشق ہے اور بدگمانی ہے۔ بدگمانی ہے اور رازداری کی تمنا ہے یہ نفسیاتِ عشق کی تفسیر ہے۔ لیکن باوجود بدگمانی کے ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ؛ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

جب آرزوئیں اس درجہ معصوم ہیں تو بس اسے تو معشوق کے جمال و حسن اور رنگ و بو سے سروکار ہے یعنی محبوب کی شخصیت بحیثیت مجموعی پیشِ نظر ہے۔ اس کی تشریحِ اعضاء (ANATOMY) سے واقفیت ضروری نہیں۔ یہ بے حیائی ہے اور اس کا مسلک یہ ہے کہ حیا ایمان ہے اور عشق اس کے نزدیک رازداری یعنی حیا کا دوسرا نام ہے۔

یہ ہے داستانِ عشق یعنی غزل۔ اس لئے اب استنباط کیجیے تو غزل کے عناصر و اجزا اسی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں اور وہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ غزل میں

(۱) ماجرائے عشق بیان ہو (۲) ہجر و وصل کا ماجرا۔ درد و الم سوز و گداز کے ساتھ بیان کیا جائے (۳) کیفیاتِ عشق کی ہمہ گیری اور عامۃ الورود ہونے کا ذکر ہو (۴) معشوق کے سامنے عجز و انکساری سے رہنے کا حال ہو (۵) . . . نفسیاتِ عشق کی تحلیل و تجزیہ ہو (۶) محبوب کے حسن و جمال کی ثناخوانی ہو۔ مگر سراپا بیان نہ کیا جائے دامنِ عصمت ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ عریانی کا قدم بیچ میں نہ آئے۔

آئیے۔ ہم اور آپ دیکھیں کہ داغ کے گنجینۂ غزل میں کیا کیا ہے اور جو کچھ ہے اس کی حیثیت کیا ہے۔

ماجرائے عشق۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو شاید عشق میں ہوس کا بھی ایک شائبہ نظر آئے گا۔ لیکن یہ عنصر غالب نہیں۔ ایسی حالت میں غزل میں زیادہ سے زیادہ عشق و ہوس کا یہی تناسب ہونا چاہئے۔ اگر ہوسناکی کا عنصر اشارہ یا کنایہ سے ظاہر ہو کر ماجرائے عشق پر غلبہ پا جائے تو غزل میں الوہیت باقی نہیں رہتی۔ داغ کے کلام میں یہ عنصرِ الوہیت مفقود تو نہیں لیکن نادر الوجود ضرور ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

میں گناہ گار اگر عشقِ مجازی ہے گناہ
میں خطاوار اگر اس کو خطا کہتے ہیں

درد و الم و سوز و گداز۔ حصولِ مدعا خلشِ طلب کو زائل کر دیتا ہے ؎ یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے۔ اس لئے آرزو کا ختم ہونا ہی عشق کی موت ہے۔ اب اگر معشوق ایسا ہے کہ عمر اس کی طلب میں صرف ہو جائے اور عرفی کی طرح یہ آرزو کہ

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

باقی رہے تو یقین جانئے کہ درد و الم و سوز و گداز میں ایک لذت پیدا ہو جائے گی اور بات میں بناوٹ باقی نہ رہے گی۔ میر تقی اور میر درد نے عمریں روتے گزار دیں اور شاعر اسی طرح روتے روتے عمر گزار سکتا ہے۔ داغ کے ساتھ صورتِ واقعات مختلف ہے۔ وہ حجاب کے عاشق ہیں۔ حجاب بلائے سے آ جاتی ہے۔ کبھی ستر پردہ ہٹا دیتی ہے۔ انہیں بھی اپنے مسکن یعنی کلکتہ بلاتی ہے اس کی حالت یہ ہے ؎

وہ اٹکتی ہوئی نظر آنا ؛ وہ لچکتی ہوئی کمر آنا
نشۂ حسن کی ترنگ غضب ؛ نوجوانی کی تھی امنگ غضب
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی ؛ لن ترانی جواب میں کیسی
کبھی کچھ تیوری میں بل دینا ؛ کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

جب معشوق کا یہ طور ہو اور عاشق ایسے ہی معشوق کو انتخاب کرے تو جلوے کے بعد وصل ضروری ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں ؎

جلوے کے بعد وصل کی خواہش ضرور تھی۔
وہ کیا رہا جو عاشقِ دیدار ہی رہا

حصولِ مدعا میں مرزا داغ کو کوئی مشکل درپیش نہیں۔ طلب اور حصولِ مدعا آرزو اور وصال صرف تعینِ اوقات کے تقدیم و تاخیر

کا نام ہے اس میں وہ لمحات نہیں کہ جب رونے کی فرصت ہو اور اگر دو ایک گھڑی رونے بھی تو اتنے قلیل وقت میں گداز کیا معنی زیادہ سے زیادہ اتنا کہنے کی نوبت آتی ہے ؎

امتحاں نالہ دل کا تو دکھا دوں لیکن ؏ یہ تو سمجھو کہ فلک ٹوٹ پڑے گا کس پر

~~~

؎ اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ ؏ ہیں پائے شوق دست تمنا بریدہ ہوں

؎ روز جا کر اس کے کوچے سے پلٹ آتے ہیں ہم ؏ دیدۂ حسرت سے پہروں جانب در دیکھ کر

؎ برسوں سے لگ رہی تھی لب بام کشتی ؏ تھک تھک کے گر پڑی نگہ انتظار آج

؎ برے حال سے یا بھلے حال سے ؏ تمہیں کیا ہماری بسر ہو گئی

بڑی کاوش سے یہ اشعار میسر آئے ہیں۔ اور شرط انصاف یہ ہے کہ بے دریغ داد دی جائے۔ مگر اسی شیون کو میر تقی کے اشعار کے پہلو بہ پہلو رکھئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے کہ اصل کیا ہے اور نقل کیا۔

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یا ؎

غنچہ سمٹے تو سمٹے ممکن ہے ؏ دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے

؎ مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر ؏ اس گفتگو سے فائدہ پیارے گزر گئی

داغ کا آخری شعر میر کے اس شعر سے اخذ ہوا معلوم ہوتا ہے داغ کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے ؏ تمہیں کیا ہماری بسر ہو گئی تمہیں کیا میں غصہ بھی ہے رنج بھی اور یہ بھی ہے کہ میں اب آیندہ را احتیاط برخلاف اس کے میر تقی کا دوسرا مصرعہ اس گفتگو سے فائدہ پیارے گزر گئی۔ سوز و گداز کی وہ مثال پیش کرتا ہے جو اس لاجواب فارسی مصرعہ اے حسرت گردم۔ چہ می پرسی مد شماری گزشت میں بھی موجود نہیں۔ سچ ہے دل کو لگی ہو تو کہے بھی ورنہ رسا تو گستاخ شعرا تصوف کی آڑ میں رب العزت کو بھی کیا کیا کہہ جاتے ہیں نعوذ باللہ

کیفیات عشق کی ہمہ گیری۔ داغ اس میدان کے مرد ہیں۔ بڑے بڑے پر لطف شعر نکالے ہیں۔ مثلاً ؎

بہر نظارہ چلا ہے کوچۂ قاتل کو داغ
کس بلا کا ہے کلیجہ کس غضب کا دیدہ ہے

کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے ؏ تماشا دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا

آتی ہے بات بات مجھے بار بار یاد ؏ کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کبھی غش میں رہا شب وعدہ ؏ کبھی گردن اٹھا کے دیکھ لیا۔

کیا کہوں گا جو کہا اس نے کہ اچھا کہیئے ؏ بات اے داغ محبت کے سوا کونسی ہے

یہ امر اعادہ طلب ہے کہ اس قسم کے اشعار میں بھی نصف سے زیادہ اشعار عشق کی عامۃ الورود کیفیات کے علاوہ ہوسناکی کے معاملات پر ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ ان جواہر پاروں کے بعد وہ سنگ ریزے پیش کروں۔

معشوق کے حضور میں عجز و انکسار محبت کی غرض محبت ہے۔ محبت کی ابتدا اور انتہا ایک ہے جلب منفعت مقصود نہیں ہوتی۔ محبوب عشق کا محتاج نہیں۔ اس کی خوشنودی عاشق کی زندگانی ہے۔ اس کا رنج عاشق کی موت۔ ایک صبح پھول سے بلبل نے کہا اس باغ میں تجھ سے اور بھی ہیں۔ میرا عشق تشنہ ضرور ہے لیکن تیرے حسن شاداب کا محتاج نہیں۔ پھول نے جواباً اس سچی بات کو تسلیم کیا لیکن بلبل سے یہ بھی کہہ دیا کہ آداب عاشقی کے خلاف ہے۔ خواجہ حافظ گلگشت چمن میں مصروف تھے انہوں نے بات سن لی اور رمز عشق دنیا بھر کو بتلا دی۔

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت ؏ ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے ؏ ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت

یہ تو قصہ ہے گل و بلبل کے عشق کا۔ سنئے کہ نواب مرزا داغ اور ان کے معشوق میں کیا کیا گفتگو ہوتی ہے۔

مری ان کی بھری محفل میں ہوگی ؏ زباں پر آئے گی جو دل میں ہوگی

ابکے کچھ منہ سے نکالا تو تمہیں جانوگے ؏ داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برا بھلا کہوں

لیکن یہ کیفیت اترتی چڑھتی پہاڑی ندی کی سی ہے۔ دو بدو سن کر حجاب سا معشوق یا تو قصہ تمام کر دیتا ہے۔ یا پھر نرم پڑ جاتا ہے۔ داغ باتوں باتوں میں راہ پر لگا لیتے ہیں اور حال دل کہنے کی وہ ترکیب نکالتے ہیں جو ہوسناکی کو ابتذال میں تبدیل کر دیتی ہے۔ مثلاً

؎ جو مرے دل میں ہے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے
گدگدا لوں تو کہوں پاؤں دبا لوں تو کہوں

پاؤں دبانے اور گدگدانے کی تاثیر کسے معلوم نہیں اور داغ تو اس فن کے ماہر تھے ؎

لے لئے ہم نے لپٹ کر بوسے
وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا

اس بحث کو میں طول دینا نہیں چاہتا۔ جتنی مثالیں آپ چاہیں
~~~

داغ کے چاروں دیوان اور ان کی نہایت مختصر مثنوی ہیں دیکھیے۔ نتائج کا اعادہ پھر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ معشوق کی شخصیت آداب عشق کی ضامن ہے اس لئے داغ کو اظہار عجز و نیاز کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور اگر یہ ضرورت لاحق بھی ہوئی تو پاؤں دبانے اور گڑگڑانے سے پوری ہو گئی یہ تو بدنصیب غالب کا مقسوم تھا کہ جب دل کڑا کر کے پاؤں چومنے کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی یہ خیال آگیا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ۔ مگر
ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا

اور اگر کوئی من چلا عاشق یہ کر بھی گزرا تو اس نے یہ واقعہ معشوق کے گوش گزار کر دیا اور یہ بھی تبلادیا کہ اس حال سے کوئی اور واقف نہیں حسن کے وقار میں نقصان کا خدشہ نہیں۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تو آپ کے زیر پا افتادہ غلام نے۔ خسرو کہتے ہیں۔

تو بخواب ناز بودی کہ من از رقیب پنہاں
کف پا تو بوسہ دادم ز حنا شنیدہ باشی

نفسیات عشق کی تحلیل و تجزیہ۔ داغ کی شاعری میں عشق و ہوسنا کی کم و بیش ایک ہی شے ہیں۔ اس امر کو تسلیم کر لینے کے بعد جب داغ کی غزل میں نفسیات عشق کے موضوع پر اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام میدان شعر میں داغ کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ مثالاً چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

حُسن رقیب سے آج برہم ہے اور آمادہ تادیب۔ داغ کے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ آج بد آموز عدو کی بے باکیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ دل کش حسین جس کا حُسن برہمی اور غصے میں اور بھی چمک اٹھا ہے انکا ہو جائے گا۔ کہتے ہیں ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

معشوق کا اپنے عاشق اور پھر رقیب سے ہوس پرست عاشق کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔ اس میں آبرو کا نقصان ہے۔ داغ عام طور پر گفتگو میں ذکر کرتا ہے۔ شاید وہ سمجھ جائیں۔

سبک ہو جائیں گے۔ گر جائیں گے وہ بزم دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں وہ لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

داغ کو تنہائی میں کچھ عرض کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اپنی داستان وفا بیان کرتا ہے معشوق کے انداز جفا کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بات خدا لگتی ہے۔ اس ستم کوش کو کچھ کچھ اعتبار آچلا ہے۔ وعدہ وفا ایک دم نہیں کرنا چاہتا کہ کساد بازاری کا باعث نہ ہو۔ مگر آنکھوں سے ملال مترشح ہے۔ یوں امید وفا بندھ چلی ہے شعر ملاحظہ ہو

عرض وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا

کسی مسخرے نے سر منڈوا دیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ یہ سب کچھ اس امید پر کیا کہ مخلوق خدا رسیدہ سمجھے گی۔ مگر جاننے والے جان گئے اور ایک بول اٹھا۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔

آغاز جوانی ہے۔ خط سبزہ ہے۔ ہونٹ لال ہیں ان دو باتوں کے احساس نے مغبچے کو اپنے حسن کے فریب میں ڈال دیا اور وہ خود کو شاہد دلبر سمجھنے لگا۔ اسی میکدہ میں آنے والا رمز شناس سمجھ گیا کہ یہ مغبچہ جہل مرکب میں گرفتار ہے۔ پیاپے دو چار جام چڑھائے اور یوں بنکار اٹھا ؎

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل
شاہد آنست کہ ایں دارد و آنے دارد

داغ کا معشوق بھی آج "تلوریا" لگائے بیٹھا ہے کہ کمر میں تلوار ہے اور دل میں یہ امید کہ آج سے ہم بھی عشاق کے قاتل مان لئے جائیں گے۔ داغ اس فریب میں کیوں آئے۔ غزل خواں ہوا اور کہا ؎

غمزہ بھی ہو سناک، نگاہیں بھی ہوں خوں ریز ؛ تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا

عاشق کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ دنیا ساتھ ساتھ ہے۔ معشوق بھی فرض کفایہ سمجھ کر میت کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اگر نہ آیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ عمر بھر جفا کی۔ بے چارے کو جان سے کھویا اور جنازے میں بھی شریک نہ ہوا کس قدر شرم و حیا کا مقام ہے۔ یہ سوچ کر جنازے کے ساتھ ساتھ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایسے عشاق تو روز مرتے رہتے ہیں۔ یہ میرے شایان شان نہیں کہ ہر ایک کے جنازے کے ساتھ میں بھی جاؤں۔ داغ سانحہ رس سمجھ گیا اور جریدہ عشق کے لئے یہ واقعہ یوں لکھا ؎

ادھر حیا کسے آئی ادھر غرور آیا ؛ مرے جنازے کے ہمراہ دور دور آیا

کسی عاشق کے سپرد اس کے محبوب کی بزم کا انتظام کر دیجئے وہ اس سے زیادہ اور کیا کرے گا ؎

گر بے ہاتھ تری بزم کا ساماں ہوتا ❊ میزباں میں کبھی ہوتا کبھی مہماں ہوتا

معشوق دعوے کر بیٹھا ہے کہ میرے حسن کا جواب اس دنیا میں نہیں ہے۔ عاشق کو اس سے انکار نہیں لیکن تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ بیک وقت دونوں رخ پیش نظر ہیں ؎

میرے ہی دم سے مہر و وفا کا نشاں ہے اب
تجھ سا اگر نہیں ہے تو مجھ سا کہاں ہے اب

عاشق تو ہر جگہہ اپنا دونا روتا رہتا ہے۔ معشوق کو حیا مانع ہے۔ یہ عشق کا حسن پر انتقام ہے۔ مگر عاشق اس دل کی لگی کو جانتا ہے ؎

ہے قیس کا تو عشق زمانے پہ آشکار ❊ کیا جانے کوئی صاحب محمل کی آرزو

ظلم و ستم سہتے سہتے داغ کا برا حال ہے۔ یہ مریض عشق اب بے اب نہیں ہے۔ معشوق جفا کار ستم کیش۔ اور عاشق کُش مشہور ہو چکا ہے اس لئے خائف ہے اگر خدا نخواستہ داغ مر گیا تو کیا ہوگا مریض کو دیکھنے خود آتا ہے۔ حال پوچھتا ہے تو داغ کہتا ہے ؎

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں ❊ آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

ایک دو نہیں سینکڑوں اشعار داغ کے کلام میں تفسیر عشق پر نکلیں گے۔ دل تو چاہتا ہے کہ خود پڑھوں اور آپ کو سنا دوں اور ہم لطف اندوز ہوں مگر خوف طوالت مانع ہے۔

معشوق کے حسن و جمال کی تعریف۔ یہ موضوع تغزل کی جان ہے ؎ ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ❊ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن لطف یہ ہے کہ دامن حیا ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ محبوب کا ذکر ہو لیکن اس طرح نہیں کہ ہوس برانگیختہ ہو۔ بلکہ عاشق خود بھی تصویر حیرت بن جائے۔ مثلاً ؎

نہ برق میں یہ کرشمہ نہ شعلہ میں یہ ادا ❊ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود ❊ رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

معشوق کے اعضا اور ہاتھ پاؤں کا ذکر سراپا کی تحت میں آجاتا ہے اور سراپا واسوخت کے ضمن میں۔ اس لئے غزل میں سراپا یا اعضائے جسم کا بیان جائز نہیں۔ البتہ اگر یہ توفیق ہو جو غالب کو تھی تو مضائقہ نہیں اگرچہ یہاں بھی غالب نے طلب کو ہوس کا کارنامہ بتایا ہے نہ کہ عشق کا

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس ❊ زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ❊ سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ❊ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اور جب طلب ہو تو خواہشات کی حد یہ ہے ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ❊ سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

داغ کو اس ضبط اور رکھ رکھاؤ سے سروکار نہیں، وہ تو حجاب کو بے حجاب چاہتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی جب اس کا دماغ عرش الوہیت پر ہوتا ہے تو اسے بھی عریانیوں کا شوق نہیں رہتا ؎

کافر خدا کرے کہ غلط ہو مرا گماں ❊ جو میں سمجھ رہا ہوں وہ اے کاش تو نہ ہو

بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں ❊ ہم بھی دیکھیں تو اسے دیکھ کے کیا کہتے ہیں

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ❊ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

رشک و بدگمانی عشق کا جز ہیں لیکن ان کا مقصد اور مدعا محبوب کی عصمت پر حملہ کرنا نہیں۔ غرض اتنی ہے کہ من باشم و دوے باشد و دوے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو رشک آتا ہے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غالب ؎

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک
آغوش خم حلقۂ زنار میں آوے

؎ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

داغ نے رشک و بدگمانی کو غیرت و ناموس کا محتاج نہیں رکھا۔ وہ اس سلسلے میں مہذب سے مہذب اشعار میں بھی اشارتاً عصمت پر حملہ کر بیٹھتا ہے۔ مثلاً ؎

گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے ❊ چلے آتے ہوئے گھبرائے کہاں سے

وہ تو اپنے معشوق کے اس وطیرے کا عادی ہے ؎

کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

باوجود کوشش اختصار کے قصے میں قصہ نکلتا گیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی۔ داغ کے کلام کی داد بھی دی اور اس کے ابتذال کا بھی رونا رویا۔ اتنی اجازت اور دیجئے کہ ابتذال کی مختصراً تعریف کر دوں۔ نیز تغزل اور ہوسناکی کے تعلق کو واضح کر دوں۔

سخن فہم دوستو۔ جذبات پر شاعری کا دارومدار ہے اور جذبات

ہماری زندگی کا وہ حصہ ہیں کہ جس میں تزویر اور ریا۔ مکر اور فریب صاف نظر آجاتے ہیں۔ اس لئے جذبات کا ارتقا ہی دراصل زندگی کا ارتقا ہے مہذب اور شائستہ زندگی کا معیار صرف ہمارے افعال ہی نہیں ہیں بلکہ وہ خیالات بھی ہیں کہ جن سے ابتدا میں تو صرف ہم ہی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن جو رفتہ رفتہ ہمارے دل و دماغ پر اس درجہ تسلط پا جاتے ہیں کہ پھر ہمارے افعال ہمارے جذبات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ انسانی جذبات ارفع بھی ہو سکتے ہیں اور مبتذل بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔

کسی علاقے میں زلزلہ آتا ہے۔ آپ وہاں کی مخلوق کی تباہی اور بربادی کی تصاویر اخباروں میں ملاحظہ کرتے ہیں۔ ہمدردی کے جذبات آپ کے دلوں میں جوش مارنے لگتے ہیں۔ اپنی اپنی توفیق کے مطابق آپ ان جذبات کا عملی اعلان بھی کر دیتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی کریں تو دل تو ضرور ہی دکھتا رہتا ہے اسی اخبار کے کسی دوسرے صفحے پر اس دور کی مہذب مخلوق کے غیر مہذب تفریحی مشاغل کی تصاویر بھی نظر سے گزرتی ہیں۔ برہنہ۔ صبر آزما اور ہر چند کہ لوازماتِ عیش کا فقدان کسی ناشائستگی کا باعث نہیں ہوتا تاہم انسانی تخیل کیسے کیسے نقشے نہیں کھینچ لیتا۔ تخیل کی یہ کارفرمائی ہی ابتذالِ جذبات ہے۔ مشہور شعر ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ؎ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وقت کی کوئی قید نہیں۔ شب و روز کا کوئی تعین نہیں۔ زندگی کا ایک ہی لمحہ جو ہمہ گیر ہے یہ کوئی ایسی تصویر پیش نہیں کرتا۔ جسے چھونے اور سونگھنے کی آرزو ہو۔ یہ عشق ہے اور محض عشق۔ صاحبو۔ وہ کونسا مشرب ہے جو مانعِ عشق ہے۔ اب داغ کا ایک مہذب شعر ملاحظہ فرمائیے۔

حوروں کی آرزو میں یہ کیفیتیں کہاں ؎ اللہ رکھے اس کی تمنا ہی اور ہے

کیا اس تمنا کے تجزیہ نفسی کے بعد آپ کے فہم میں معشوق کی وہی تصویر آتی ہے جو پہلے شعر میں پیش نظر تھی۔ اسی مابہ الامتیاز کیفیت سے الوہیت مبدل بہ ابتذال ہو گئی۔ داغ کا لفظوں کا انتخاب۔ داغ کی تشبیہات میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ داغ کے استعارات بنفسِ خود مکمل اور قابلِ ستائش ہیں لیکن پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے کے مصداق ہیں

حج کے بعد داغ مدینے سے رام پور آیا تو کہا کہ عجب ملا ہیں دلِ ناصبور ہم آئے۔"روضۃ الحمید کی زیارت کے تصرف نے یہ بھی داغ سے کہلوا دیا ؎

(ا) سبق ایسا پڑھا دیا تو نے ؎ مجھ کو سب کچھ بھلا دیا تو نے

(ب) لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ؎ دلِ بے مدعا دیا تو نے

(ج) مجھ گنہگار کو جو بخش دیا ؎ پھر جہنم کو کیا دیا تو نے

لیکن ان دو غزلوں کے علاوہ جو ایک سفر کے روزنامچے کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ چند رسمی غزلیں حمد و نعت منقبت و مناجات میں ہیں تو اس سے داغ کی شاعری پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ داغ نے غزل کے اس طور کو جو اودھ کے تعیش اور انحطاط کا نتیجہ تھا۔ اختیار کیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس طرزِ خاص کو انتہا تک نہ پہنچا دیا۔ اودھ کا نواب نائب السلطنت تھا۔ دہلی کا بادشاہ بادشاہ تھا۔ اگرچہ ہر دو کا عدم اور وجود یکساں تھا تاہم مراتب اور مدارج کی ترتیب زوال اور انحطاط پر منطبق ہو سکتی ہے۔ جب اودھ کے شعرائے غزل کے میدان کو تنگ پا کر واسوخت اور ریختی کے وسیلہ دل کا بخار نکالا تو پایہ تخت دہلی کے شاعروں نے غزل ہی میں وہ کچھ کہہ سنایا کہ ریختی اور واسوخت گو شرما گئے۔

تغزل اور ہوسناکی کا یہ تعلق زبان اردو کی تاریخ کا نہایت ہی المناک سانحہ ہے متقدمین غزل کہتے آئے تھے۔ لیکن اس طرز سے محترز رہے اور اگر کسی انشاء اللہ خاں انشا نے اس سے اعتنا بھی کیا تو استادوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور خود کو بری الذمہ جانا۔ داغ کے بعد شعرا نے اس روش سے وہ بیزاری دکھائی ہے کہ آج ایسے اشعار سننے میں نہیں آتے۔ داغ کی شاعری اس انحطاط کے دور کی یادگار ہے۔ انحطاط اور ابتذال ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگرچہ اقبال کو تو آج بھی یہی شکایت ہے کہ

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ؎ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی او را دہم ؎ تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد ز من ؎ آب و رنگِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابی جانم ندید ؎ آشکارم دید و پنہانم ندید

الحمد للہ کہ یہ اب واقعات کے خلاف ہے۔ ہوسناکی باقی ہے۔ لیکن اب اس کے اعلان کے طریقے مختلف ہیں اور اردو غزل اس سے بہت حد تک پاک ہو چلی ہے۔

ایک جماعت کا دعوےٰ ہے کہ زبان کو بھونڈے اور غیر شاعرانہ الفاظ اور تراکیب سے پاک کرنے والا داغ ہی ہے۔ مجھے اس امر کے مان لینے میں تامل نہیں لیکن میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اردو غزل کے دامن پر ہوسناکی کا بدنما داغ بھی حضرت داغ ہی کا کارنامہ ہے۔

شبیر ہاشمی ایم اے

پیارے

عشق خود ترجمان ہے پیارے — ہر نظر اک زبان ہے پیارے
موت سے کیا ڈروں کہ ہستی کی — موت خود پاسبان ہے پیارے
جس زمیں پر ہے نقشِ پا تیرا — وہ زمین آسمان ہے پیارے
ریشے ریشے میں دل دھڑکتا ہے — ذرّے ذرّے میں جان ہے پیارے
ہر گماں اک یقیں کا پرتو ہے — ہر یقیں اک گمان ہے پیارے
میرے ماتھے کی میرے بستر کی — ہر شکن داستان ہے پیارے
سانس نرمی سے لے کہ یہ دنیا — شیشہ گر کی دکان ہے پیارے
میری جانب سے بدگماں ہے اگر — خود سے تو بدگمان ہے پیارے
تیرے پہلو میں بیٹھ جانے سے — رات کتنی جوان ہے پیارے
یہ جہاں اک نفس تو ہے لیکن — ہر نفس اک جہان ہے پیارے

جوشؔ کی قدر کر کہ یہ میخوار
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

جوشؔ ملیح آبادی

واپس لوٹ آئی ہے بہار!

(اپریل ۱۹۳۷ء)

جاگ اٹھی ہیں نیند سے کلیاں واپس لوٹ آئی ہے بہار
پودے سنورے سبزہ لہکا دشت بھی ہے گلزار
ڈھل گئے پھولوں کے سنگھار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

مرجھائے ہوئے انسانوں کے چہروں پہ غم کی گرد وہی
ظلم و ستم ویسے کے ویسے صدیوں کے دکھ درد وہی
اور وہی برسوں کے آزار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

دکھ کے تپتے صحراؤں میں دور ہے یوں راحت کی چمک
جیسے خواب میں دیکھے کوئی اک سمٹے ہوئے آنچل کی جھلک
یا سیم و زر کے انبار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

پروفیسر فیض احمد

ہمزاد

۸ رمئی ——

کیا ہی خوشگوار دن ہے، میں نے صبح کا وقت مکان کے سامنے
ال کے ایک دیو قامت درخت کے نیچے جس کی گھنی چھاؤں دور تک پھیلی
ہے، گھاس پہ لیٹے گذارا۔

مجھے اس شہر سے اُنس ہے اور یہیں میں رہنا پسند کرتا ہوں کیونکہ
ی شہر میں میں نے جنم لیا اور اسی جگہ میرے آباؤ اجداد نے اپنی زندگیاں بسر
یں۔ مجھے اس جگہ کی مخصوص رسوم، مخصوص خوراکیں، مخصوص انداز گفتگو،
صوص لہجۂ بیان، زمین کی مخصوص سوندھی سوندھی خوشبو، اور عنبر بیز ہوا
ت پسند ہے۔

مجھے اپنے اس مکان سے بہت محبت ہے جہاں میں نے پرورش
ئی۔ کھڑکیوں سے میں اپنے باغ کے ساتھ ساتھ دریائے سین کو بہتا دیکھتا ہوں۔
سبق اور تیز رو دریا میرے قریب سڑک کے اس پار بہتا ہے اور اس کی
طح پر بہت سی کشتیاں دکھائی دیتی ہیں۔

دور بائیں جانب شہر راؤن واقع ہے جس کے نیلی نیلی چھتوں والے
مانات اور اونچے اونچے گھنٹہ گھر نہایت دل کش معلوم ہوتے ہیں مگر جوں کی
ن پوش چوٹیوں سے ٹن ٹن کی مسحور کن آوازیں صبح کی خوشگوار ہوا کے
اتھ مل کر میرے کانوں تک پہنچتی ہیں کبھی یہ دلفریب آوازیں اونچی ہو جاتی ہیں
ی نیچی، اور بالآخر دور فضائے آسمانی میں گم ہو جاتی ہیں۔

آہا یہ صبح کس درجہ فرحت افزا ہے!

گیارہ بجے کے قریب بہت سی کشتیوں کا ایک لمبا بیڑہ میرے دروازے
سامنے سے گزرا۔ اس کے پیچھے پیچھے بیڑے کو کھینچنے والی ایک چھوٹی سی مضبوط
تی، دھوئیں کے بادل اڑاتی دردانگیز آواز میں سائیں سائیں کرتی چلی
آ رہی تھی،

دو انگریزی بجروں کے بعد جن کے ارغوانی جھنڈے فضائے آسمانی
میں لہرا رہے تھے، برازیل کا ایک سفید چمکدار جہاز گذرا۔ اسے دیکھتے ہی میرا
دل اس قدر مسرت سے بھر گیا کہ میں نے بے اختیارانہ —— نہ جانے
کیوں —— اس جہاز کو جھک کر سلام کیا۔

۱۱ رمئی ——

چند دنوں سے مجھے خفیف سا بخار ہو جاتا ہے۔ ناسازیٔ طبع کے
باعث میں کچھ فکر مند سا رہتا ہوں،

نہ جانے وہ پر اسرار تبدیلی ہم میں کیسے واقع ہو جاتی ہے جو ہماری
خوشی کو غم سے اور استقلال کو بے حوصلگی سے بدل دیتی ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ اس فضا، اس غیر مرئی فضا میں، بہت سی بعید از فہم طاقتیں پوشیدہ
ہیں جن کی طرف ہم از خود کھنچے چلے جاتے ہیں میں خوش خوش بستر سے
اٹھتا ہوں۔ اس وقت میرا دل گانے کو چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ میں
دریا کے کنارے چلا جاتا ہوں اور تھوڑی سی سیر کے بعد یکایک اس
طرح غمزدہ ہو کر گھر کو لوٹتا ہوں، جیسے کوئی بڑی مصیبت وہاں میرا انتظار
کر رہی ہے۔ یہ کیوں؟ کیا برودت میرے جسم سے مس کرتے ہوئے
میرے اعصاب کو مفلوج کر دیتی ہے اور مجھ پر غم کی تاریکی مسلط کر دیتی
ہے؟ کیا بادلوں کی مختلف شکلیں اور اس متلون دنیا کے بوقلموں نظارے
جو میری آنکھوں کے سامنے سے گذرتے رہتے ہیں، میرے دماغ کو
پریشان کئے رکھتے ہیں؟ کسے معلوم ہے کہ یہ ساری کائنات جو ہمارا احاطہ
کئے ہوئے ہے، ہر وہ چیز جسے ہم بے مقصد دیکھ لیتے ہیں، ہر وہ چیز
جس کے قریب سے ہم بے ارادہ گذر جاتے ہیں، ہر وہ چیز جسے ہم غیر
محسوسانہ انداز میں چھو لیتے ہیں، اور ہر وہ چیز جس سے ہم بن دیکھے دوچار
ہو جاتے ہیں، ہمارے اعضا پر، اور ان کے ذریعے سے ہمارے خیالات
اور ہمارے دل پر ایک حیرت انگیز اور ناقابل بیان اثر ڈالتی رہتی ہے!

ان مخفی طاقتوں کا راز کتنا عمیق ہے۔ ہم اپنے خام حواس اور ان
آنکھوں کے ساتھ، جو نہ دور کی اور نہ نزدیک کی چیزیں، نہ ستاروں
کے باشندے اور نہ قطرۂ آب کے جراثیم دیکھ سکتی ہیں، اس راز کی گہرائی

تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ان کانوں کی مدد سے، جو ہوا کے تموّج سے پیدا شدہ آوازیں ہم تک پہنچاتے ہیں، اس کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں!

۱۶ مئی —

میں یقینی طور پر بیمار ہوں۔ گذشتہ ماہ میں بالکل تندرست تھا۔ نہ معلوم یہ بخار ہے، کوئی خوفناک بخار؟ یا محض اعضا شکنی ہی میرے جسم اور میرے دماغ کو مغلوب کر رہی ہے۔ ہر روز اور ہر لمحہ میں کسی آنے والے شدید ابتلا اور قوت کے خوف سے کانپتا رہتا ہوں، اور کسی گھات میں لگی ہوئی بیماری کا ہراس انگیز خیال میرے رگ و پے میں سرایت کرتا رہتا ہے۔

۱۸ مئی —

مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا تمہاری نبض کی رفتار تیز ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ اعصاب ذکی الحس ہو چکے ہیں۔ مگر کسی قسم کا خطرہ نہیں۔

۲۵ مئی —

ابھی تک کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

میری حالت بھی بڑی عجیب ہے۔ جب رات آتی ہے تو مجھ پر ناقابلِ بیان بے چینی مسلط ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے رات میرے لئے بہت سے خطرے لئے بیٹھی ہے۔ میں کھانا کھا کر فوراً ہی مطالعے کے لئے بیٹھ جاتا ہوں۔ بہتیری کوشش کرتا ہوں مگر الفاظ نہیں سمجھ سکتا بلکہ حروف کو بھی بمشکل تمام پڑھتا ہوں۔ میں اٹھ کر اپنے ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگ جاتا ہوں۔ اس وقت مجھ پر مبہم سا خوف طاری ہو جاتا ہے اور بستر اور نیند کا خیال مجھے کھانے کو دوڑتا ہے۔

دس بجے کے قریب میں پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ داخل ہوتے ہی دروازے پر دو قفل ڈال دیتا ہوں۔ نہ جانے اب کس چیز سے مجھے خوف آتا ہے، پہلے تو مجھے کسی چیز سے وحشت نہ تھی۔ میں الماریوں کو کھول کر دیکھتا ہوں اور اپنے بستر کے نیچے نگاہ دوڑاتا ہوں۔ میرے کانوں میں کوئی آواز آتی معلوم ہوتی ہے مگر کہاں سے؟ یہ بتانے سے میں قاصر ہوں! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کوئی جسمانی بیماری یا خون کی کوئی خرابی عصبی کمزوری یا سوء ہضمی، غرضکہ ہمارے اس جسم، اس ناقص، اس کمزور جسم کی مشین میں ذرا سا فتور بھی ایک مسرور ترین آدمی کو مغموم اور بہادر کو بزدل بنا سکتا ہے!

تو پھر میں لیٹ جاتا ہوں، اور نیند کا انتظار کرنے لگتا ہوں، اس طرح، جیسے کوئی قتل کے وقت کا انتظار کر رہا ہو۔ میں جتنی شدت سے نیند کا انتظار کرتا ہوں، اتنا ہی اس کے مسلط ہو جانے سے خائف بھی رہتا ہوں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، میری ٹانگیں لرزنے لگتی ہیں، اور میرا تمام جسم بستر کی گرمی کے باوجود کانپنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ یکایک مجھے نیند آجاتی ہے۔ میری حالت اس وقت اس شخص کی سی ہوتی ہے، جو خاموش پانیوں میں غرق ہو رہا ہو۔ اس سے پہلے میں نیند کو آتے — یہی خوفناک نیند جو میرے قریب ہی چھپی، میری تاک میں رہتی ہے، جو پہلے میرے سر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اور پھر میری آنکھیں بند کر کے میری ساری قوت کھینچ لیتی ہے — محسوس کیا کرتا تھا، مگر اب یہ کسی پُراسرار طریقے سے مجھ پر وارد ہو جاتی ہے!

میں سویا رہتا ہوں، بہت دیر تک، ایک، دو، تین گھنٹے بیت جاتے ہیں پھر ایک خوفناک خواب کابوس کی شکل میں مجھے آ دباتا ہے۔ میں سوتے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں گہری نیند میں ہوں، کوئی شخص میرے قریب آرہا ہے میری طرف دیکھتا ہے، مجھے چھوتا ہے، میرے بستر پر چڑھ آتا ہے، میری چھاتی پر جھک جاتا ہے اور میری گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ بھینچتا ہے،

میں دیوانہ وار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں، جیسے کوئی شخص کسی ہیبت ناک خواب کی گرفت میں پڑا تلملا رہا ہو۔ میں چیختا ہوں مگر میری آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی، میں جنبش کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں کر سکتا میں ہزار کوششوں کے بعد ہانپتا کانپتا ہوا اپنا پہلو بدلنا چاہتا ہوں اور اس شخص کو دور پھینکنا چاہتا ہوں جو اپنی مضبوط گرفت سے مجھے کچلنا چاہتا ہے، مگر میں ایسا نہیں کر سکتا اور یکایک میں خوف زدہ ہو کر جاگ اٹھتا ہوں میں اس وقت پسینے میں شرابور ہوتا ہوں۔

میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں!

اس مصیبت کے بعد، جس سے ہر روز رات کے وقت مجھے دوچار ہونا پڑتا ہے، میں صبح تک آرام کی نیند سو جاتا ہوں۔

۲۔ جون —

میری حالت پہلے سے زیادہ خراب ہے، نہ جانے کیا بات ہے! ڈاکٹر کی سب دوائیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پچھلے دنوں، یوں سمجھئے کہ اس تھکے ماندے جسم کو زیادہ کمزور کرنے کے لئے، میں رومیئر کے جنگل میں سیر کی غرض سے چلا گیا۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تازہ، شفاف اور درختوں

کوئی خوشگوار چیز نہ تھی۔ وہ ندامت سے کانپ رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑی امیر ہے۔ میں نے کہا: "تو کیا تمہارا شوہر پانچ ہزار فرانک کا انتظام نہیں کرسکتا؟ آؤ۔ ذرا پھر سوچو۔ تمہیں یقین ہے کہ کیا اس نے مجھ ہی سے یہ رقم طلب کرنے کے لئے تمہیں کہا تھا؟"

اس نے چند منٹ تامل کیا گویا وہ اپنے حافظے پر زور ڈال رہی تھی۔ وہ بولی: "ہاں ہاں۔ مجھے بالکل یقین ہے!"

"کیا اس نے تمہیں لکھ بھیجا ہے؟"

وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے اس کے دماغ کی پریشانی سے اندازہ لگایا کہ صحیح طور پر اسے کسی بات کا پتہ نہیں۔ وہ صرف یہی جانتی تھی کہ اسے اپنے شوہر کے لئے پانچ ہزار فرانک مجھ سے ادھار لینے ہیں۔

اس نے کہا۔ "ہاں اس نے مجھے لکھا ہے!"

"مگر کب؟ کل تو تم نے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"مجھے آج ہی اس کا خط ملا ہے۔"

"تم وہ خط مجھے دکھا سکتی ہو؟"

"نہیں . . . نہیں . . . وہ پرائیویٹ خط ہے اور قطعی طور پر ذاتی ہے۔ میں . . . میں نے اسے جلا دیا ہے!"

"تو پھر تمہارا شوہر قرضدار ہوگا۔"

اس نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی!"

میں نے اسی وقت اس سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں اسی وقت پانچ ہزار فرانک کا انتظام نہیں کرسکتا!"

اس نے ایک درد انگیز آواز میں کہا: "میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ کسی طرح ضرور اس رقم کا انتظام کر دو۔" یہ کہہ کر وہ سخت مضطرب نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے گویا وہ مجھ سے التماس کر رہی ہے۔ میں نے غور سے سنا۔ اس کی آواز کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ اس تعمیلِ حکم کے خوفناک احساس سے جس کا اس نے اپنے اوپر ذمہ لیا ہوا تھا، رک رک کر رونے لگی۔ "تم سے میری یہ التجا ہے کہ ضرور انتظام کر دو مجھے آج ہی اتنی رقم چاہیئے۔"

میں نے اس پر رحم کھایا اور کہا: "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو ابھی ساری رقم مل جائے گی۔"

اس نے چلا کر کہا: "تمہارا شکریہ! تم کس قدر مہربان ہو!"

میں نے کہا: "تمہیں یاد ہے کہ کل شام تمہارے گھر کیا طرفہ ماجرا در پیش آیا؟"

"ہاں۔"

"تمہیں یاد ہے کہ ڈاکٹر پیرن نے تم کو سلایا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو اس نے تمہیں حکم دیا تھا کہ تم اس کی خاطر مجھ سے پانچ ہزار فرانک ادھار طلب کرو۔ اور اب تم اس کے حکم کی تعمیل کر رہی ہو۔"

اس نے کچھ لمحے سوچا پھر بولی: "ہاں تو میرے شوہر کو ضرورت ہوگی۔"

میں نے اُسے سمجھانے بجھانے میں دو گھنٹے صرف کر دئیے۔ مگر اس پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ جب وہ چلی گئی تو میں اس وقت ڈاکٹر موصوف کے مکان پر پہنچا۔ وہ باہر جانے کے بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اس نے میری باتوں کو غور سے سنا اور مسکرانے لگا پھر بولا: "کیا اب بھی ان باتوں کے تسلیم کرنے میں تمہیں کوئی شبہ ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں!"

وہ بولا: "چلو اب تمہاری بہن کے پاس چلیں۔"

وہ ابھی تک پریشانی کی حالت میں دن کے بستر پر پڑی تھی ڈاکٹر نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کچھ وقت غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ مادام کی ان آنکھوں کے سامنے اٹھایا جو سحر کی تاب نہ لاتے ہوئے آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔

جب وہ سو گئی تو اس نے کہا: "تمہارے شوہر کو اب پانچ ہزار فرانک کی ضرورت نہیں رہی۔ اس بات کو اب دل سے نکال دو کہ تم نے اپنے چچیرے بھائی سے مذکورہ رقم ادھار لینے کی کبھی درخواست کی اور اگر تمہارا بھائی تم سے اس بات کا ذکر کرے تو اسے کہہ دو کہ میں نہیں سمجھتی تم کیا کہہ رہے ہو۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے اسے جگا دیا۔ میں نے اپنی جیب سے نوٹوں کا ایک بٹوا نکال کر کہا: "یہ لو مادام۔ کل صبح تم مجھ سے یہ رقم مانگ رہی تھیں نا؟"

یہ سن کر وہ اس قدر مبہوت ہو گئی کہ میں نے اس معاملے پر زیادہ زور ڈالنے کی جرأت نہ کی۔ صرف ایک دو دفعہ اسے یاد دلانے کی کوشش کی مگر اس نے قطعی انکار کر دیا اور یہ خیال کرنے لگی، گویا میں اس کا تمسخر اڑا رہا ہوں اور قریب تھا کہ وہ ناراض ہو جاتی۔

میں یہ دیکھ کر ہوٹل واپس آگیا۔ مجھے اس بات نے اس قدر

پریشان کر رکھا تھا کہ میں دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکا۔

۱۹ رجولائی —

میں نے اس واقعہ کا کئی آدمیوں سے ذکر کیا۔ مگر انہوں نے میرا مذاق اڑا دیا۔

۲۱ رجولائی —

میں نے کھانا کھا کر محفلِ رقص میں شام کا وقت گزارا۔ دوسرے ہفتے میں گھر جا رہا ہوں۔

۳۰ رجولائی —

کل سے میں اپنے گھر میں مقیم ہوں اور بالکل خیریت سے ہوں

۲ راگست —

کوئی نئی بات نہیں۔ موسم خوشگوار ہے۔ میرا وقت دریائے سین کو بہتا دیکھتے کٹ جاتا ہے۔

۴ راگست —

خادم ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں کسی نے الماری میں سے شیشے کے گلاس نکال کر توڑ دئے ہیں۔ ایک نوکر باورچی پر الزام لگاتا ہے۔ باورچی نوکرانی کے سر سب کچھ تھوپتا ہے اور یہ، نوکر اور باورچی دونوں کو کوستی ہے! نہ جانے مجرم کون ہے۔ کوئی دانشمند آدمی ہی سمجھے!

۶ راگست —

اس دفعہ تو میں ہوش میں تھا۔ میں نے اُسے دیکھ لیا ہے . . . میں نے اُسے دیکھ لیا ہے مجھے اب کسی پر شک نہیں رہا۔ میں نے خود دیکھ لیا ہے . . . خوف سے میری ہڈیاں خشک ہیں اور میرا خون منجمد ہو رہا ہے۔

دن کے دو بجے میں اپنے گلاب کے باغ میں سیر کر رہا تھا میرے گرد و پیش خزاں میں کھلنے والے گلاب کے پھول تھے۔ میں ایک پودے کے قریب ٹھہر گیا۔ اس پر تین خوشنما پھول کھلے تھے۔ عین اپنے سامنے میں نے دیکھا کہ ایک شاخ جھک گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے جھٹکا کر توڑ دیا ہے اور ایک پھول ٹہنی سے جدا ہو کر ہوا میں چکر لگاتا ہوا وہیں آویزاں ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ میری انگلیاں بند ہو گئیں۔ مگر ان کی گرفت میں کوئی چیز نہ تھی۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آنے لگا میرا خیال تھا کہ ایک عقلمند آدمی کو ایسے عجیب و غریب واقعات سے سابقہ نہیں پڑ سکتا۔

کیا مجھے واقعی دھوکا نہیں ہوا! میں نے مڑ کر دیکھا۔ پھول ٹوٹ کر پودے کے نیچے پڑا تھا۔

میں گھر واپس آگیا۔ میرے حواس بجا نہ تھے۔ مجھے اب اتنا یقین تھا جتنا کہ رات کے بعد دن کی آمد کا، کہ میرے جسم میں کوئی نادیدہ وجود جاگزیں ہے، جو پانی اور دودھ پر گزارا کرتا ہے جو چیزوں کو چھو سکتا ہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جا سکتا ہے اس کا جسم بھی گویا ہمارے جسموں کی طرح کثیف ہے۔ مگر وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ وہ میرے پہلو میں رہتا ہے، میری طرح، میرے کمرے کی چھت کے نیچے!

۷ راگست —

میں آرام سے سویا۔ وہ میری صراحی سے پانی پی گیا۔ مگر اس نے میری نیند کو خراب نہیں کیا۔

میں حیران ہوں کہ میں دیوانہ تو نہیں ہوں۔ اکثر جب میں جلا دینے والی دھوپ میں دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوں تو مجھے اپنی عقل کی صحت کے متعلق شبہ ہونے لگتا ہے — ایسا قطعی شبہ جس میں وہم کا شائبہ تک نہ ہو۔ میں نے دیوانے دیکھے ہیں میں ایسے نیم دیوانے آدمیوں سے دوچار ہو چکا ہوں جو بعض اوقات نہایت شستہ اور جامع گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن یکایک ان کا دماغ پھر دیوانگی کی طرف مائل ہو جاتا ہے ان کے حواس دیوانگی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور وہ پھر جنون کے ایسے خوفناک سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں جس میں جھاگ پیدا کرنے والی لہریں اٹھ رہی ہوں جو دھند میں ہر وقت ملفوف رہتا ہو اور جہاں ہوا کے طوفان سے ایک محشر برپا رہتا ہو۔

میں یقیناً دیوانہ ہوں۔ اگر میں صحیح العقل انسان ہوتا تو مجھے اپنی دماغی حالت کے متعلق پورا پورا علم ہوتا۔ اور میں صاف طور پر اس کا تجزیہ بھی کر سکتا۔ میرے دماغ میں کوئی نامعلوم سا فتور ہے — ایسا فتور جس کے معلوم کرنے کی بہت سے فلسفی کوشش کر رہے ہیں۔ اس فتور نے میرے دماغی توازن اور میرے خیالات کی صحت میں نقائص کی ایک گہری خلیج حائل کر دی ہے۔ نیند میں بھی مجھے اکثر ایسی ہی حالت سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس وقت عقل کا دامن میرے ہاتھ

۶ر جولائی

میں دیوانہ ہو چلا ہوں! میری صراحی پھر گزشتہ رات خالی ہو گئی۔ شاید میں نے خود خالی کر لی ہو گی! کیا میں نے ہی! میں نے؟ اور کون سکتا ہے؟ اے خدا، اب میں دیوانہ ہو گیا ہوں، دیوانہ! مجھے دیوانگی سے کون بچا سکتا ہے!

۱۰ر جولائی

ابھی مجھے ایک حیرت انگیز ثبوت مل گیا ہے غور سے سنئے ۔ ۲ جولائی کو بستر پر جانے سے پہلے میں نے میز پر شراب، دودھ، پانی اور سٹرابیری (STRAW BERRY) رکھی تھیں۔ کوئی سارا پانی اور دودھ کی مقدار پی گیا۔ شاید میں نے ہی پی لیا ہو گا۔ شراب، روٹی، اور سٹرابیری کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا تھا۔

۷ر جولائی کو بھی میں نے تجربہ کیا اور یہی نتائج برآمد ہوئے۔

۸ر جولائی کو میں نے پانی اور دودھ کے علاوہ سب چیزیں میز پر ... کسی ایک کو انگلی تک نہیں لگائی گئی تھی۔

بالآخر ۹ر جولائی کو میں نے دودھ اور پانی ہی میز پر رکھا اور ... احتیاط کے ساتھ صراحی کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر اس کا ڈھکنا اچھی طرح بند کر دیا اور اپنے ہونٹوں، داڑھی، اور ہاتھوں کو لکڑی کے کوئلے سے آلودہ کر کے لیٹ گیا۔ وہی خوف ناک نیند مجھ پر مسلط ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں خوف زدہ ہو کر جاگ پڑا اور جلدی سے میز کی طرف گیا ... صراحی پر لپٹا ہوا سفید کپڑا بے داغ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ڈھکنا اٹھایا۔ سارا پانی غائب تھا اور دودھ کا ایک قطرہ تک باقی نہ تھا۔ اے میرے خدا ——!

میں ابھی پیرس کو جا رہا ہوں!

۱۳ر جولائی

پچھلے چند دن میرے دماغ کا توازن بگڑا رہا۔ یہ شاید میرے خیالات کے انتشار کا نتیجہ ہے کیا میں واقعی نیند میں بیدار رہنے والا شخص ہوں؟ یا یہ سب باتیں ایسی ہیں جنہیں توہمات سے تعبیر کیا جاتا ہے ... بھی ہو میری پریشانی اب دیوانگی کے بہت قریب پہنچ گئی ہے۔ ورنہ پیرس میں چوبیس گھنٹے گزار لینے کے بعد میرے دماغی توازن کے درست ہو جانے کا بہت امکان تھا۔

کل چند امور انجام دینے اور ملاقاتیں کرنے کے بعد میں نے فرانسیسی تھیٹر میں شام کا وقت گذارا۔ وہاں ڈوما کا ایک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ جس کی حسن ادائیگی نے میری بیماری کو بہت حد تک زائل کر دیا۔

اس میں قطعاً شک نہیں کہ تنہائی سریع الاثر دماغوں کے لئے خوفناک طور پر نقصان دہ ہے۔ ہمارے گرد و پیش ایسے آدمی ہونے چاہئیں جو سوچیں اور باتیں کریں۔ جب ہم دیر تک اکیلے رہیں تو ہم خلا کو خیالی وجودوں سے بھر دیتے ہیں۔

میں خوشی خوشی ہوٹل میں پہنچا۔ رونق والی جگہوں سے گزرتے ہوئے جب گزشتہ ہفتے والے خوف ناک تصورات جن کے ذریعے سے میں کوئی اجنبی وجود اپنے جسم میں پاتا تھا، اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا تو اپنی لغزشوں پر دل کھول کر ہنستا۔ ہمارے دماغ کتنے کمزور ہیں اور جب وہ کسی خفیف سے بعید از فہم واقعے سے متاثر ہوتے ہیں تو کتنی جلدی اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ ہمیں سبب کا پتہ نہیں چلا اس لئے ہم واقعے کو نہیں سمجھ سکے، ہم ہر واقعے کو کسی پراسرار فوق العادت طاقت پر منطبق کرنے لگ جاتے ہیں۔

۱۶ر جولائی

کل مجھے ایسی باتوں سے دوچار ہونا پڑا جن سے میں بے حد پریشان ہوا۔ میں نے اپنی چچیری بہن مادام سابل کے ساتھ کھانا کھایا۔ مادام مذکور کا شوہر فوج میں ملازم ہے۔ اس کے گھر میں دو عورتوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر پیرن سے بیاہی ہوئی ہیں۔ یہ ڈاکٹر زیادہ تر اعصابی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ایسی غیر معمولی تحقیقات سے آگاہ کیا جو نینسی سکول کے ڈاکٹروں اور سائنسدانوں نے دریافت کی تھیں۔

ڈاکٹر پیرن نے جو حقائق مجھ سے بیان کئے وہ اتنے موثر تھے کہ ان کو سن کر مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہونے لگا۔ انہوں نے کہا "جب سے انسان کو قوتِ ادراک ملی اور جب سے اس نے اپنے تخیلات کو ضبطِ تحریر میں لانا سیکھا۔ اس نے اپنے تاثرات سے ایسے رازوں کو احساسات کے احاطے میں لانا شروع کر دیا ہے جن تک اس کے خام اور نا تراشیدہ حواس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ انسان اب اپنی ناقص مادی قوتوں اور اپنی نارسا ذہانت کے ساتھ اجنبی وجودوں کی ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے چونکہ اس کے ناقص تخیل کی پرواز محدود ہے اس لئے ان فوق العادت وجودوں کے نادر قصے اور عجیب و غریب مصنوعی

کہانیاں وجود میں آئیں۔ خدا کے متعلق بھی اسی طرح بودے اور بے سروپا قصے تراشے گئے۔ والٹیئر کے اس قول سے کوئی بات زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ خدا نے انسان کو اپنے عکس سے بنایا مگر انسان یہ دعویٰ کر بیٹھا کہ میں خدا کی ذات سے پیدا ہوا ہوں اور اسی زعم میں وہ اپنی عقل کے گھوڑے دور دور تک دوڑانے لگا ہے۔

ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ ایک جدید علم ظہور میں آیا ہے۔ مسمریزم کرنے والے اور دوسرے عامل ہمیں جدید راہوں پر لے جارہے ہیں۔ بالخصوص گزشتہ چار پانچ سال سے ہم حیرت انگیز نتائج سے دوچار ہو رہے ہیں"۔

میری چچیری بہن جو میری طرح ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی ہنسنے لگی ـــــ ڈاکٹر پیرن نے اس سے کہا۔ "مادام، میں تمہیں سُلانے کی کوشش کرتا ہوں!"

"ہاں، ضرور!" یہ کہہ کر وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر ٹکٹکی باندھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ گویا وہ اسے مسحور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں یکایک بے چین ہونے لگا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ مادام سابل کی آنکھیں نیند کی آمد آمد سے بھاری ہونے لگیں۔ اس کا منہ سکڑنے لگا اور اس کا سینہ سانس کی جلد جلد آمد و رفت سے جنبش کرنے لگا۔

دس منٹ کے اندر وہ سو گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "مادام کی پچھلی طرف کھڑے ہو جاؤ"۔ میں اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ملاقاتی کارڈ مادام کے ہاتھ پر رکھا اور کہنے لگا۔ "یہ لو آئینہ تمہیں اس میں کیا نظر آتا ہے"۔

اس نے جواب دیا "میں اپنا چچیرا بھائی دیکھ رہی ہوں"۔

"وہ کیا کر رہا ہے؟"

"وہ اپنی ایک مونچھ کو تاؤ دے رہا ہے"۔

"اور اب!"

"وہ اپنی جیب سے ایک فوٹو باہر نکال رہا ہے"۔

"یہ کس کا فوٹو ہے؟"

"اس کا اپنا ہے"۔

وہ صحیح کہہ رہی تھی مجھے یہ فوٹو آج ہی شام کو ہوٹل میں ملا تھا۔

"اور فوٹو کے اندر وہ کیسی حالت میں کھڑا ہے؟"

"وہ کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ہیٹ ہے"۔

بلاشبہ وہ اس سفید سے کارڈ میں اس طرح سب کچھ دیکھ رہی تھی جیسے کوئی آئینے میں دیکھ رہا ہو۔ مادام یکایک خوف زدہ ہو کر چلانے لگی "بس، بس، بس!" مگر ڈاکٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "تم کل صبح آٹھ بجے اٹھو گی۔ پھر تم اپنے چچیرے بھائی سے ہوٹل میں ملاقات کرو گی اور اپنے شوہر کے ایما پر اس سے پانچ ہزار فرانک ادھار مانگو گی"۔

اس کے بعد اس نے مادام کو بیدار کر دیا۔

ہوٹل لوٹتے وقت راستے میں میں اس عجیب معاملے پر غور کرنے لگا۔ میرے دل میں بہت سے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ مجھے اپنی چچیری بہن کی راست گوئی پر قطعاً کوئی شبہ نہ تھا بلکہ مجھے شبہ تھا تو اس بات کا کہ کیا ایسی شعبدہ بازی ڈاکٹر کے امکان میں ہے؟ کیا اس نے کوئی ایسا آئینہ تو اپنے ہاتھ میں نہیں چھپا رکھا تھا جس کو ملاقاتی کارڈ کے ساتھ وہ اس نوجوان لڑکی کو دکھا رہا تھا۔ شعبدہ بازی میں ایسی نادر اور حیرت انگیز حرکات لوگ اکثر کرتے رہتے ہیں۔

میں ہوٹل پہنچ کر سو گیا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے میرے نوکر نے مجھے جگا دیا اور کہنے لگا جناب! کوئی مادام سابل آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

میں نے جلدی سے کپڑے پہن لئے اور مادام کو اندر بلا لیا۔ وہ آکر بیٹھ گئی۔ وہ سخت مضطرب نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں نیچے کو جھکی تھیں۔ نقاب اٹھائے بغیر وہ کہنے لگی "مجھے تم سے ایک درخواست کرنی ہے"۔

"کہو کیا بات ہے؟"

"مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے ابھی پانچ ہزار فرانک کی ضرورت ہے"۔

"تمہیں؟"

"ہاں مجھے ہی یا یوں سمجھو کہ میرے شوہر کو"!

یہ سن کر میں اس قدر حیران ہوا کہ جواب دیتے وقت میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ مجھے شبہ تھا کہ ڈاکٹر پیرن اور مادام سابل کہیں اس مختصر سی کامیڈی کے ذریعے سے، جسے انہوں نے پہلے سے تیار کر رکھا ہے، مجھے بنا تو نہیں رہے۔ مگر جب میں نے غور سے مادام کی طرف دیکھا تو میرے شکوک جاتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اس کے لئے

اور گھاس کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہوا سے میری رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا ہے اور میرا دل از سر نو تقویت حاصل کر رہا ہے۔ میں ایک کشادہ وادی میں داخل ہوا اور ایک تنگ راستے سے جس کے دونوں طرف اونچے اونچے دیو قامت درخت استادہ تھے اور جو میرے اور آسمان کے درمیان ایک تاریک چھت بنائے کھڑے تھے، گذر رہا ہوا تو دل پہنچا یکایک مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ یہ ایک عجیب سی خوفناک کپکپی تھی جو یقیناً سردی کا نتیجہ نہ تھی۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں اس جنگل میں تنہا ہونے کے باعث سخت بے چین ہو رہا تھا اور میرا دل بے وجہ اس سنسان جگہ سے گھبرا رہا تھا۔ یکایک مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی متنفس میرا تعاقب کر رہا ہے اور میرے بالکل قریب آ کر مجھے پکڑنا چاہتا ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ میرے پیچھے ایک سنسان، خوفناک اور بلند راستہ جا رہا تھا اور میرے آگے بھی، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، یہی ہیبت ناک رستہ چلا گیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ معلوم کیوں؟ اور اپنی ایڑی پر لٹو کی طرح بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ درخت مجھے رقص کرتے معلوم ہوتے تھے اور زمیں گھومتی نظر آتی تھی۔ میں مجبوراً بیٹھ گیا۔ اب مجھے اتنا معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف کو جانا ہے۔ عجب معاملہ تھا کہ مجھے اس وقت یاد نہ پڑتا تھا۔ میں دائیں جانب کو مڑا۔ یہ وہی راستہ تھا جو پہلے مجھے کشادہ وادی میں لے گیا تھا۔

۳ر جون ——

آج رات پھر وہی خوفناک حادثہ پیش آیا، جس سے قبل ازیں میں دوچار ہوا کرتا ہوں،

میں چند ہفتوں کے لئے کہیں باہر جا رہا ہوں۔ شاید سفر میری صحت کو درست کر دے!

۲ر جولائی ——

میں واپس آ گیا ہوں اور اب بالکل اچھا ہوں۔ سفر میں وقت خوب گزرا۔ مجھے شہر سینٹ مچل پہلی دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اس شہر کی شام کیسی دل کش ہوتی ہے۔ یہ شہر ایک ڈھلوان پر واقع ہے۔ میں اس کے آخری سرے پر ایک باغ میں پہنچ گیا مگر یکایک خوف کے مارے میری چیخیں نکل گئیں . . . ایک وسیع و عریض خلیج میرے سامنے موجیں مار رہی تھی۔ اس کے دونوں ساحلوں کے درمیان جو دور فاصلے پر دھند میں غائب ہو جاتے تھے، ایک چھوٹی بے برگ و گیاہ پہاڑی کھڑی تھی اور اس کی چوٹی پہ ایک عمارت بنی تھی۔

صبح ہوتے ہی میں وہاں پہنچا۔ کل شام کی طرح پانی اترا ہوا تھا۔ ایک عجیب و غریب گرجا میری نظر پڑا اور کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا اور ایک تنگ ڈھلوان گلی میں سے گزرتا ہوا ایک بڑی کشادہ حویلی کا رخ کیا۔ اس حویلی کا رقبہ تمام گاؤں کے رقبے کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بے شمار کمروں کی محراب دار چھتیں نازک ستونوں پر سہارا لئے کھڑی تھیں۔ اس جگہ گاؤں کا دیوتا رہتا تھا۔ میں اس میں داخل ہوا۔ اندر بہت سے مینار کھڑے تھے۔ جن کی چوٹیوں پہ ہوا سے بجنے والے گھنٹے لگے تھے۔

میں نے راہب سے پوچھا۔ "باپ! تمہاری یہ جگہ کتنی پُر فضا ہے!"

"یہاں بہت تیز ہوائیں چلتی ہیں"۔ اس نے کہا اور ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔ سمندر کا پانی ریتلی خشک جگہ کو سیراب کرتا آ رہا تھا اور ہم اس نظارے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

راہب نے مجھے اس جگہ کے متعلق بہت سے قصے اور روایتیں سنائیں۔ ان میں سے ایک نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ کہنے لگا۔ "اہل سینٹ مچل نے ایک دفعہ بڑا شور مچایا۔ کہتے تھے کہ ہم نے کل رات اس سامنے والی ریتلی جگہ پر دو بکریوں کو مَیں مَیں کرتے سنا ہے۔ ان میں سے ایک کی آواز بلند تھی اور ایک کی صدا دھیمی۔ بعض کہتے تھے کہ یہ بکریوں کی آوازیں نہیں ہیں بلکہ بحری پرندوں کی ہیں، جو بعض اوقات بکریوں کی طرح ممیانے لگتے ہیں اور بعض اوقات انسانوں کی طرح بَین کرنے لگتے ہیں۔ ماہی گیر وثوق کے ساتھ کہتے تھے کہ ہم نے ایک بوڑھے گڈریے کو خشک ریت پر بے مقصد پھرتے دیکھا ہے اس کے ساتھ ایک بکرا اور ایک بکری تھی۔ ان دونوں کے لمبے لمبے بال تھے اور کسی نامعلوم زبان میں جلدی جلدی باتیں کرتی تھیں اور کبھی یکایک ممیانے لگتی تھیں۔

میں نے راہب سے پوچھا۔ "باپ، تمہیں ان باتوں پر یقین ہے؟"

اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ "مجھے ان کے متعلق کچھ علم نہیں!"

میں نے کہا۔ "اگر ہم انسانوں کے علاوہ سطح زمین پر کوئی پوشیدہ مخلوق ہوتی تو ہم اب تک اس سے آشنا ہو چکے ہوتے اور باپ! تم نے بھی انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوتا۔"

اس نے جواب دیا "ہم کائنات کی ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتے ہوا ہی کو لے لو۔ یہ فطرت کی ایک بڑی زبردست طاقت ہے، جو انسانوں کو کہیں سے کہیں اڑا لے جاتی ہے، عمارتوں کو مسمار کر دیتی ہے، درختوں کو جڑوں سے اکھیڑ ڈالتی ہے۔ سمندر کے پانیوں کو بلند جھالوں میں تقسیم کر دیتی ہے، ساحلی پہاڑیوں کی جھکی ہوئی چوٹیوں کو گرا دیتی ہے، اور بڑے بڑے جہازوں کو ساحلوں کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش کر دیتی ہے۔ ہاں ہاں یہی ہوا سرسراہٹ پیدا کرتی ہے۔ یہی کراہتی ہے اور یہی خوف ناک آوازیں نکالتی ہے۔ مگر کیا تم اتنی زبردست چیز کو دیکھ سکتے ہو؟ کیا تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ یقیناً اس کا وجود ہے!"

راہب کی اس سادہ مگر پرمعنی گفتگو سے میں ساکت سا ہو کر رہ گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ راہب یا تو کوئی غیب دان ہے یا کوئی بے شعور انسانی پتلا مگر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ میں ان دونوں اوصاف میں سے کسی ایک کا اس پر اطلاق کروں۔ میں خاموش رہا۔

اس کی باتیں اکثر میرے دل میں جاگزیں رہتی ہیں!

۳ر جولائی ——

رات بُری حالت میں گزری۔ آج کل بخار کا موسم ہے۔ میرے کوچبان کو بھی شاید میری طرح کچھ حرارت ہو جاتی ہے۔ میں کل یہاں پہنچا اور کل ہی سے اس کا چہرہ زرد دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا "جین! کیا بات ہے؟" کہنے لگا "یہ چند دن بڑی بے چینی سے گزرے ہیں۔ ابھی تک افاقہ نہیں ہوا۔"

باقی سب خادم اچھے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں پھر بیمار نہ پڑ جاؤں،

۴ر جولائی ——

میں پھر بیمار ہو گیا ہوں۔ رات کے ہیبت ناک خواب پھر نمودار ہو رہے ہیں۔ کل رات میں نے محسوس کیا کہ کوئی متنفس مجھ پر جھک کر میری روح کو اوپر کھینچ رہا ہے اور میری جان کو اس طرح مجھ سے سلب کر رہا ہے جیسے کوئی ایک ہی کش میں لیچی کا رس چوس لے۔ جب میں صبح کے وقت اٹھا، میں تار تار ہو رہا تھا اور نقاہت اور ضعف سے مجھ میں جنبش کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اگر یہی حالت بہت دنوں تک رہی تو میں پھر پہلی حالت کی طرف پلٹ آؤں گا۔

۵ر جولائی ——

کیا میں قوتِ ادراک کو کھو چکا ہوں! کل رات اتنا عجیب واقعہ درپیش آیا کہ جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو میرا دماغ پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں نے حسبِ معمول شام کے وقت اپنا دروازہ مقفل کر لیا تھا۔ مجھے پیاس لگی اور میں نے پانی کا آدھا گلاس پی لیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ شیشے کی صراحی ابھی تک پانی سے لبالب بھری ہے۔ اس کے بعد میں خوفناک نیند کی آغوش میں سو گیا۔ دو گھنٹے کے بعد کسی آہٹ نے پھر مجھے جگا دیا۔ ذرا اس آدمی کی حالت کو تصور میں لائیے جس کے سینے میں چاقو گھونپ دیا گیا ہو۔ جس پر نزع کا وقت ہو، جو خون میں لت پت ہو رہا ہو، جس کو ایک سانس تک لینا مشکل ہو، اور جو چند ہی لمحوں میں موت سے ہمکنار ہونے والا ہو۔ بس یہی میری حالت تھی!

بالآخر میرے حواس بجا ہوئے۔ مجھے پیاس لگی۔ میں نے شمع روشن کی اور اس میز کی طرف چلا جس پر صراحی پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر آہستہ آہستہ گلاس پر اوندھا کر دیا مگر پانی کا ایک قطرہ تک نہ نکلا۔ وہ خالی پڑی تھی — بالکل خالی! میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر یکایک ایک خوفناک جذبے نے اس درجہ مجھ پر قابو پا لیا کہ میں اٹھ کر کرسی پر دراز ہو گیا تاکہ اس عقدے کو حل کر سکوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیا کوئی آ کر پانی پی گیا ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟ کیا میں ہی تو نہیں؟ یقیناً میں ہی ہوں گا۔ میرے سوا اور ہو بھی کون سکتا ہے؟ تو پھر میں سوتے میں اسی طرح چلتا پھرتا رہتا ہوں، جس طرح بیداری میں! میں شاید پراسرار زندگی بسر کر رہا ہوں اور مجھے اس بات کی خبر تک بھی نہیں۔ شاید ایک انسان میں دو پُراسرار وجود کارفرما رہتے ہیں اور جب ہماری روح "بے خبر" ہو کر سو جاتی ہے تو کوئی نادیدہ اجنبی وجود ہمارے اندر داخل ہو جاتا اور ہمارا جسم ہماری روح سے بڑھ کر اس کی اطاعت کرتا ہے۔

آہ میری خوف ناک مصیبت کو کون سمجھ سکتا ہے؟ ایک سلیم العقل، تعلیم یافتہ، شائستہ انسان کے احساسات کی گہرائی تک کون پہنچ سکتا ہے، جو اپنی صراحی سے پانی غائب ہو جانے پر خوف زدہ ہو جاتا ہو!

میں صبح نمودار ہونے تک کرسی پر پڑا رہا اور بستر تک جانے کی جرأت نہ کر سکا۔

سے چھوٹ جاتا ہے اور کوئی نامعلوم طاقت مجھے خیالی اور غیر حقیقی دنیا میں لے جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تار جو ہماری دماغی مشین کو چلاتا ہے میرے دماغ میں اس کا عمل ناپید ہو چکا ہے۔

اں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حادثے کے گزر جانے کے بعد آدمی صحیح نام یا اعداد و شمار یا تاریخیں بھول جاتا ہے تو پھر میرے لئے یہ بات کیونکر تعجب خیز ہے کہ حقیقی اور غیر حقیقی واقعات میں تمیز کرنے والی عقل نے میرے دماغ میں اپنا عمل چھوڑ دیا ہے۔

میں نے دریا کے کنارے چلتے چلتے ان تمام باتوں پر غور کیا۔ سورج کی روشنی سیلاب کی مانند سطح دریا پر پڑ رہی تھی۔ زمین پر عجب بہار تھی۔ میرے خیالات میں زندگی کی دلفریبیاں موجیں لے رہی تھیں۔ ممولوں کی سُبک پروازیں میری آنکھوں کو حقیقی مسرت کا پیغام دے رہی تھی اور کناروں پر اُگی ہوئی گھاس کی سرسراہٹ میرے کانوں میں نغمے بھر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ مجھ پر ناقابلِ بیان از خود رفتگی مسلط ہونے لگی۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی مخفی طاقت میری حرکات کو سست کر رہی ہے اور مجھے آگے جانے سے روک رہی ہے اور پیچھے کی طرف بلا رہی ہے۔ میرے دل میں اس وقت اس شخص کی طرح ایک خوفناک کشاکش برپا تھی جس کا معشوق کسی دور افتادہ جگہ بیمار پڑا ہو۔

میں پیچھے کو مڑ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ضرور کوئی بُری خبر — کوئی خط یا تار — میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ مکان پر پہنچا تو کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ میں اتنا پریشان تھا کہ کسی ہیبت ناک خواب دیکھنے پر بھی میری یہ حالت نہ ہوتی!

۸ر اگست —

کل میں نے بڑی بے چینی سے رات گذاری۔ نادیدہ وجود گو مادی جسم کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے نزدیک ہی میری تاک میں بیٹھا ہے۔ میرے جسم میں داخل ہو رہا ہے اور میرے دل پر حکمرانی کر رہا ہے۔ جب وہ مافوق العادت واقعات کے ذریعے سے اپنی غیر مرئی موجودگی کا اظہار کرتا ہے تو اتنا خوفناک معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ پوشیدہ ہی پوشیدہ میرے پہلو میں موجود رہتا ہے تو کہیں زیادہ خوف کا باعث ہوتا ہے۔ بہرصورت میں نے رات گزار لی!

۹ر اگست —

کوئی خاص بات نہیں۔ مگر مجھے خوف ضرور ہے۔

۱۰ر اگست —

کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ نہ جانے کل کیا کچھ پیش آنے والا ہے!

۱۱ر اگست —

کوئی بات نہیں۔ میں ہراس انگیز خیالات کے باعث اس گھر میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ اب یہاں سے چلا جاؤں گا۔

۱۲ر اگست —

رات کے دس بج چکے ہیں۔ میں سارا دن باہر نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر میرا کچھ بس نہ چلا۔ باہر نکل کر گاڑی لینا اور اس میں بیٹھ کر راؤن تک چلے جانا۔ میں یہ آسان کام نہیں کر سکا۔ نہ جانے کیوں —؟

۱۳ر اگست —

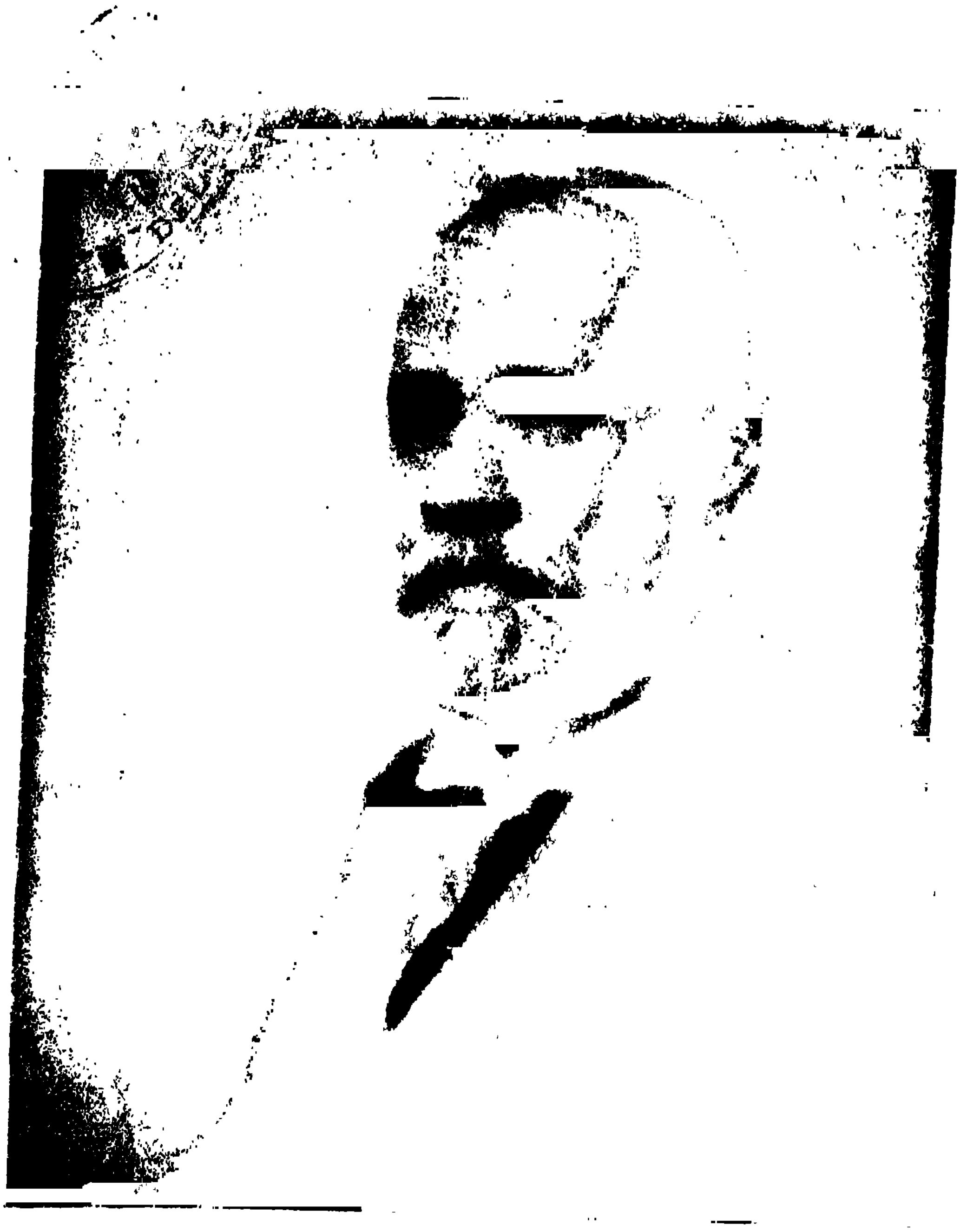
بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں مبتلا ہو کر آدمی اپنی ساری جسمانی قوت فوراً ہی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے اعصاب کمزور پڑ جاتے ہیں اس کی ہڈیاں گوشت کی طرح نرم ہو جاتی ہیں اور اس کا گوشت تحلیل ہو جاتا ہے۔ میں روحانی طور پر یہ سب تکالیف برداشت کر رہا ہوں۔ مجھ میں طاقت نہیں، مجھ میں حوصلہ نہیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں اور میں استقلال کے ساتھ اپنے ارادے کے مطابق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میرے ارادے کو میرے کسی کام میں دخل نہیں . . . کوئی دوسرا شخص ارادہ کرتا ہے اور میں اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں!

۱۴ر اگست —

میں تباہ ہو گیا۔ کسی غیر وجود نے میری روح پر قبضہ جما لیا اور اس پر حکمرانی کرنے لگا۔ میرے تمام افعال، میری تمام حرکات، اور میرے تمام خیالات کسی نادیدہ وجود کے حکم کے ماتحت ہیں۔ میں بذاتِ خود اپنے وجود میں کوئی چیز نہیں۔ میں تو بحیثیت ایک مقید تماشائی کے ہوں جو ہر چیز سے خائف ہو۔ مجھے خود اٹھ بیٹھنے اور خود کھڑا ہونے کے سوا اور کسی چیز کی تمنا نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنے ارادے کے مطابق اٹھ کر اپنے نابود شدہ وجود کو ہستی میں لے آؤں۔ مگر افسوس میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں۔ گویا میں اپنی نشست پر جم گیا ہوں۔ میری نشست زمین کے ساتھ اس طرح پیوست کر دی گئی ہے گویا کوئی طاقت ہم دونوں کو — مجھے اور میری نشست کو — وہاں سے اوپر نہیں اٹھا سکتی



ننھی گڑیا تم بھی دُعا مانگو



آنریبل سر عبدالقادر

اے خدا! اے میرے خدا — کیا میرا کوئی خدا ہے؟ اے میرے خدا! مجھے بچائیو! مجھے معاف کیجیو، مجھ پر رحم کھائیو، مجھے اپنے کرم سے نوازیو۔ آہ میں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں، میں کتنی تکلیف میں مبتلا ہوں، میری تکلیف اور میری بیماری کتنی خوفناک ہے۔ اے میرے خدا — !

۱۵ اگست —

ذرا خیال فرمائیے، میری چچیری بہن کس مخفی طاقت کے زیر اثر مجھ سے پانچ ہزار فرانک قرض لینے آئی۔ اس نے اپنے آپ کو کسی اجنبی وجود کے ارادے کے سپرد کر دیا۔ یہی اجنبی وجود میری روح کا ہمسایہ ہے، مجھے کمزور کرنے والا، مجھے تکلیف دینے والا — آہ کیا دنیا ختم ہو رہی ہے — ؟

نہ جانے یہ وجود، یہ نادیدہ، نامعلوم وجود، جو مجھ پر مسلط ہے، کون ہے؟

اس چھت کے نیچے جو واقعات مجھے پیش آ رہے ہیں، میں نے کسی کتاب میں ان کے متعلق نہیں پڑھا۔ اگر میں اس مکان کو چھوڑ دوں، کسی دور دراز جگہ چلا جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں تو میں اپنی جان بچا سکتا ہوں۔

۱۶ اگست —

آج مجھے دو گھنٹے مل گئے۔ میں اس قیدی کی طرح باہر نکل بھاگا جس کے قید خانے کا دروازہ اتفاقاً کھلا رہ گیا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے اب نادیدہ وجود سے نجات مل گئی ہے۔ میں نے گاڑی پر گھوڑے جوتنے کا حکم دیا اور جتنی جلدی ممکن ہو سکا راؤن پہنچ گیا۔ مجھے وہاں جا کر کتنی مسرت ہوئی، میں یہ بتانے سے قاصر ہوں۔

میں ایک لائبریری میں ٹھہرا اور وہاں سے میں نے ڈاکٹر ہرمن کا وہ رسالہ جو جدید و قدیم دنیا کے نادیدہ وجودوں سے متعلق ہے، مستعار لیا۔

میں اپنی گاڑی پر واپس آ گیا اور سٹیشن کی طرف، یہ الفاظ میرے ہونٹوں ہی پر تھے کہ میں "گھر، گھر" کہہ کر چلانے لگا اور راستے زور سے چلایا کہ لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ گھر کے جانکاہ لفظ نے مجھے اس درجہ پریشان کر دیا کہ میں نشست کے گدیلوں ہی پر گھر سے کافی دور، بے چین ہونے لگا۔

۱۷ اگست —

کیا ہی خوشگوار رات ہے۔

میں ایک بجے تک ڈاکٹر ہرمن کی کتاب پڑھتا رہا۔ ڈاکٹر ہرمن فلسفے اور دیوتاؤں کے علم میں بڑے محقق ہیں۔ انہوں نے تمام ایسے پوشیدہ وجودوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جو انسانوں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں مگر یہ بیان اس وجود سے بالکل مختلف ہے جو میرے ساتھ رہتا ہے۔

ہاں تو میں ایک بجے رات تک پڑھتا رہا۔ پھر اپنے دماغ اور اپنے خیالات کو رات کی خوشگوار ہوا میں تازہ کرنے کے لئے ایک کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کسی زمانے میں ایسی راتیں مجھے حد درجہ محبوب تھیں!

چاند غائب تھا۔ آسمان کی تاریک گہرائیوں میں ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ نہ جانے اس وقت کن انسانوں، کن حیوانوں کی دنیا پر حکمرانی تھی؟ ہم انسانوں، ہم دل رکھنے والے انسانوں کو کیا معلوم؟ شاید ان نادیدہ حکمرانوں میں سے کوئی حکمران کسی روز، فاصلے کی خلیج کو طے کر کے ہماری زمین پر نمودار ہو جائے اور اس طرح اس پر مسلط ہو جائے جس طرح نارمن سمندر کو عبور کر کے دوسری کمزور قوموں پر چھا گئے تھے۔

ہم انسان، اس محدود زمین پر، جو گھومتی رہتی ہے، کتنے غیر محفوظ ہیں، کتنے بے خبر ہیں اور تعداد میں کتنے کم ہیں — !

تو میں کچھ اس طرح کے خواب دیکھتا دیکھتا سو گیا۔

میں چالیس منٹ تک نہ سویا ہونگا کہ کسی عجیب سے مخفی جذبے نے مجھے پھر جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میز پر کھلی ہوئی کتاب کا ایک ورق از خود الٹ گیا ہے۔ کھڑکی میں سے ہوا کی قلیل ترین مقدار بھی اندر نہیں داخل ہو رہی تھی۔ چار منٹ تک میں حیرانی کے عالم میں بیٹھا کسی چیز کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا — ہاں ہاں میری ان آنکھوں نے دیکھا کہ کتاب کا دوسرا ورق اس طرح پہلے ورق پر جا پڑا ہے جیسے کسی نے اپنی انگلی سے اسے الٹا دیا ہو۔ میری بازوؤں والی کرسی خالی پڑی تھی۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ، وہی نادیدہ وجود اس پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے۔ کسی دیوانے وحشی کی طرح، جو یکایک اپنے مالک پر جھپٹ پڑے، میں ایک ہی جست میں کمرے کی لمبائی کو طے کرتا ہوا اس پر لپک پڑا تاکہ اسے پکڑ کر کچل ڈالوں مگر میرے

وہاں پہنچتے پہنچتے وہ بھاگ گیا۔ میری میز الٹ گئی۔ لیمپ زمین پر گر کر بجھ گیا اور کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے۔

تو وہ بھاگ گیا ہے۔ مجھ سے خوف زدہ ہو کر، مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ ممکن ہے کل یا پرسوں، یا کسی اور دن میں اسے اپنی گرفت میں لے کر زمین پر دے ماروں اور کچل ڈالوں۔ وہ زبردست ہی سہی مگر کیا بعض اوقات کتا اپنے مالک کے گلے پر نہیں جھپٹ پڑتا!

۱۸ اگست ـــــ

میں سارا دن طرح طرح کی تجاویز سوچتا رہتا ہوں۔ کیا ہوا اگر میں اس کا مطیع ہوں۔ اس کا حکم مانتا ہوں۔ اس کے ارادے پر چلتا ہوں۔ اس کا فرمانبردار اور اس کا خادم ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ قوی ہے۔ مگر ایک روز آئے گا جب . . .

۱۹ اگست ـــــ

میں اب سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے ابھی اخبار میں یہ خبر پڑھی ہے۔ جانیرو(جنوبی امریکا) کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ وہاں ایک ضلعے میں دیوانگی وبائی صورت میں پھیل گئی ہے۔ باشندے پریشان ہو کر اپنے گھروں، کھیتوں، اور گاؤں کو چھوڑ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چند نادیدہ وجود انسانی وجود پر مسلط ہو گئے ہیں ان کا دودھ اور پانی پی جاتے ہیں۔ ایک پروفیسر بہت سے قابل ڈاکٹروں کی معیت میں مرض کے اسباب معلوم کرنے کے لئے اور بادشاہ کو اس بیماری کا علاج بتانے کی غرض سے وہاں جا رہا ہے۔

کل دریائے سین پر اہل برازیل سے لدی ہوئی ایک کشتی جا رہی تھی۔ اس پر ضرور کوئی نادیدہ وجود ہوگا۔ جو ان لوگوں کے ساتھ بھاگ آیا ہوگا اس نے مجھے اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھا دیکھ لیا ہوگا اور میرے مکان پر پہنچ گیا ہوگا . . . اے میرے خدا اب میں سمجھا! معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حکمرانی اب ختم ہو رہی ہے!

گدھ فاختہ کو کھا جاتی ہے۔ بھیڑیا بکری کو کھا جاتا ہے، شیر نیز سینگوں والی بھینس کو کھا جاتا ہے۔ آدمی تیر، نیزے یا بندوق کے ساتھ شیر کو مار ڈالتا ہے اور ہمزاد ـــ یہی نادیدہ وجود ـــ آدمی کو اپنی خوراک بنا لیتا ہے۔

بعض اوقات جانور باغی ہو جاتا ہے اور اپنے مالک کو مار ڈالتا ہے۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے مگر معلوم تو ہو کہ وہ کون ہے؟ میں اسے چھو تو سکوں! اسے دیکھ تو سکوں؟

مجھے سینٹ مچل کے راہب کے الفاظ بار بار یاد آتے ہیں کہ ہم اس کائنات کا لاکھواں حصہ بھی نہیں دیکھ سکتے میں نے اس فلسفے پر کافی غور کیا۔ میری آنکھیں اس قدر کمزور اور ناقص ہیں کہ وہ بے شمار چیزوں کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتیں تو اگر یہ کسی ایسے لطیف نادیدہ وجود کو دیکھنے سے قاصر ہیں جس کے اندر سے سورج کی روشنی بھی گزر سکتی ہے تو کونسی تعجب کی بات ہے۔

میری آنکھیں اس اجنبی وجود کو گرد و پیش کی چیزوں کی طرح کیوں نہیں دیکھ سکتیں؛ اس لئے کہ اس کا وجود ہمارے وجودوں سے زیادہ تکمیل پذیر ہے اور زیادہ نفیس ہے۔ ہمارا وجود کمزور اور بھدا ہے اور ایسے اعضا سے بنایا گیا ہے جو اکثر سست پڑ جاتے ہیں اور پیچیدہ ساخت والی مشین کی طرح اکثر بگڑتے رہتے ہیں۔ انسان کے اس لاغر اور کمزور جسم کو، جو عناصر اربعہ سے متشکل ہے۔ اب چالیس، چار سو۔ نہیں نہیں چار ہزار عناصر کی ضرورت ہے۔ آہ ہماری زندگی کتنی محدود کتنی بے مایہ ہے کتنی ناخواستگی اور بخل سے وہ ہمیں عطا کی جاتی ہے اور کتنے برے انداز میں وہ بسر کی جاتی ہے!

خدایا مجھے کیا ہو گیا ہے! میرا ہمزاد ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ اور میرے دماغ کو ایسے فضول اور بیہودہ تخیلات سے بھرتا رہتا ہے۔ گو وہ میرے لئے اب بمنزلۂ روح کے ہے مگر میں اسے مار ڈالوں گا۔

۱۹ اگست ـــــ

میں اسے مار ڈالوں گا۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ کل شام کے وقت، میں میز کے قریب بیٹھا مطالعے میں منہمک ہونے کی کوشش کر رہا تھا میں جانتا تھا کہ وہ ابھی میرے اتنا قریب آ جائے گا کہ میں اسے پکڑ لوں گا اس کے بعد ہاتھوں، گھٹنوں، سینے، چہرے اور دانتوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں گا اور اسے کچل ڈالوں گا اور چیر کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔

میں نہایت مستعدی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے اپنے دونوں لیمپ اور انگیٹھی پر کی آٹھوں شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ میرے سامنے میرا بستر تھا۔ میری دائیں جانب انگیٹھی تھی اور دائیں طرف کا دروازہ اس کی تحریص کی خاطر کچھ دیر تک کھلا رہنے کے بعد اب بالکل بند تھا۔ میری پچھلی جانب ایک بہت بڑی الماری تھی۔ جس پر ایک بڑا آئینہ نصب تھا۔ میں حجامت بناتے وقت لباس تبدیل کرتے وقت

اور سامنے سے گزرتے وقت، اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک اس میں دیکھ لیا کرتا تھا۔

اسے دھوکا دینے کی خاطر میں نے کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ **کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت میری تاک میں ہے۔ یکایک** مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے کندھوں پر سے نیچے جھک کر کچھ پڑھنے میں مصروف ہے۔ میں اس کے سانس کو اپنے کانوں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔

اپنے ہاتھ پھیلا کر میں ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور اتنی سرعت سے پچھلی جانب کو مڑا کہ میں گر ہی پڑا۔ میرا کمرہ دن کی طرح روشن تھا۔ مگر میں اپنے آپ کو آئینے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آئینے میں روشنی منعکس ہو رہی تھی مگر میرا عکس اس میں قطعاً نہ تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا مبہوت اور پریشان سا ہو رہا تھا۔ میں نہ ہی آگے کی جانب ایک قدم تک اٹھا سکتا تھا اور نہ ہی ذرہ بھر جنبش کر سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے کمرے میں موجود ہے اور اس کا غیر مادی جسم میرے عکس کو نگل چکا ہے۔

میں اس وقت بے حد خائف تھا۔ ایک لمحہ بعد دھندلا سا عکس آئینے میں نمودار ہونے لگا اور لمحہ بہ لمحہ زیادہ صاف ہوتا گیا۔ بالآخر میں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک اسی طرح دیکھ سکتا تھا جیسے کہ میں ہر روز دیکھا کرتا تھا۔

۲۰ راگست

اسے مار ڈالوں؟ مگر کیسے؟ میں اسے چھو تک نہیں سکتا۔ اسے زہر کھلا دوں؟ مگر وہ زہر کو پانی میں ڈالتے دیکھ لے گا۔ اس کے علاوہ ہماری زہر غیر مادی جسم کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے! تو اس طرح نہیں میں اسے اس طرح ہرگز نہیں مار سکتا۔ پھر کس طرح اسے مارا جا سکتا ہے؟

۲۱ راگست

میں نے راؤں سے کسی لوہار کو بلا بھیجا ہے تاکہ میرے کمرے میں آہنی بستے لگا دے جس طرح پیرس کے بعض ہوٹلوں میں لگے ہوتے ہیں۔ ہر ایک شخص مجھے بزدل سمجھتا ہے مگر مجھے اپنی حفاظت کرنا لازم ہے۔

۱۰ رستمبر

کل لوہار نے بستے لگا دیئے۔ میں نے آدھی رات تک سب دروازے کھلے رکھے۔ یکایک مجھے اس کی موجودگی محسوس ہونے لگی اور

میرا دل مسرت سے معمور ہو گیا۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور بڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر میں نے اپنے بوٹ اتار لئے اور لاپروائی سے سلیپر پہن لئے۔ پھر آہنی بستے بند کر دیئے اور دروازے کو دوبارہ مقفل کر دیا اور کھڑکی کو بھی قفل لگا کر کنجی اپنی جیب میں ڈال لی۔

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے چینی سے میرے ارد گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ وہ اب بہت پریشان تھا اور مجھ سے التجا کر رہا تھا کہ میں اس کے لئے دروازہ کھول دوں۔ میں نے اس کی خاطر نہیں، اپنی خاطر دروازے پر جھک کر اسے صرف اس قدر کھول دیا کہ خود اس میں سے گزر کر باہر نکل سکوں۔ میرا سر دروازے کی بالائی چوکھٹ کو چھو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ ہرگز باہر نہیں نکل سکتا اور اس طرح میں نے اسے اندر بند کر دیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔ میں سیڑھیوں پر سے اتر کر اس کمرے میں پہنچا جو میرے اوپر والے کمرے کے عین نیچے ہے۔ میں نے اپنے دونوں لیمپوں کا تیل دری اور فرنیچر پر گرا دیا اور سب کو یک دم آگ لگا دی اور صدر دروازے کو باہر سے تالا لگا کر خود بھاگ نکلا۔

میں باغ میں درختوں کے جھنڈ میں چھپا بیٹھا رہا۔ ہر چیز تاریک تھی۔ فضا خاموش تھی۔ آسمان پر کوئی ستارہ نظر نہ آتا تھا۔ ہوا ساکت تھی۔

میں اپنے مکان کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ میں خیال دوڑا رہا تھا کہ شاید آگ اپنے آپ بجھ گئی ہے یا اس نے بجھا دی ہوگی کہ یکایک ایک نچلی کھڑکی آگ کی لپیٹ میں آ گئی اور ایک سرخ، زرد، لمبا شعلہ بل کھاتا ہوا نمودار ہوا اور چھت سے ہمکنار ہو گیا۔

روشنی کا سیلاب درختوں، ٹہنیوں اور پتوں پر پڑنے لگا۔ پرندے جاگ اٹھے تھے اور ایک کتا بھونک رہا تھا۔ میں نے خیال کیا شاید صبح قریب ہے۔ ایک دو منٹوں میں دو اور کھڑکیاں جلنے لگیں اور مکان کا نچلا حصہ ایک خوفناک بھٹی کی مانند دکھائی دینے لگا۔ یکایک ایک چیخ، ایک ہیبت ناک دلدوز نسوانی چیخ نے رات کے سکوت کو توڑ دیا۔ آخاہ! میں آگ لگانے کے بعد نوکروں کو جگانا بھول گیا تھا۔ ان کے چہرے اور جنبش کرتے ہوئے بازو دکھائی دے رہے تھے۔

پھر فرطِ خوف سے دیوانہ وار "آگ آگ، مدد۔۔۔" چلاتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ لوگ پہلے ہی سے میرے مکان کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔

اب مکان ایک خوفناک شاندار چتا کی طرح جل رہا تھا۔ ایک

اتنی بڑی چتا کی طرح جس کی روشنی سے تمام سطح زمین منور ہو جائے اور جو تمام انسانوں کے ساتھ اس کو، ہاں ہاں اس اجنبی نادیدہ وجود یعنی میرے ہمزاد کو تہس نہس کر دے!

بکایک ساری چھت نیچے گر پڑی اور شعلے آتش فشاں پہاڑ کی آگ کی طرح آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔ تمام کھڑکیوں میں سے آگ کا ایک سیلاب جاری تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگ کی اس بھٹی میں جل کر مر چکا ہوگا۔

مر چکا ہوگا! شاید؟ اس کا جسم، اس کا لطیف جسم جس سے آر پار روشنی گزر سکتی ہے، شاید اس طرح ہلاک نہیں ہو سکتا جس طرح انسانی جسم کو فنا کیا جا سکتا ہے!

فرض کیجئے وہ ابھی تک مرا نہیں تو . . . تو مرد یا زنانہ ہی ایک ایسی اٹل طاقت ہے جو ان نادیدہ جسموں، ان خوفناک مخفی روحوں کو فنا کر سکتی ہے!

آہ انسان ہر روز، ہر گھنٹے، ہر لمحہ، اور ہر قسم کے حادثوں سے مر سکتا ہے مگر ہمزاد، مقررہ دن پر، مقررہ وقت پر ہی، جب کہیں وہ اپنی انتہائے حیات کو پہنچ جائے، مر سکتا ہے۔ نہیں . . . نہیں . . . میں جانتا ہوں . . . مجھے معلوم ہے . . . وہ ابھی ہلاک نہیں ہوا تو . . . تو اب مجھے ہی خودکشی کر لینی چاہیے!!

(موپساں)

طاہر قریشی بی اے

رباعیات

(۱)

آرام نے جو جب یاس میں تسکیں پایا
ہونے ہیں فراموش مصائب سارے
بن جاتا ہے ایسا دلنشیں خواب حیات
بھیگی ہوئی رات میں ہوں جیسے تارے

(۲)

ہیں اور ابھی چھپا رہے ہیں غمِ گزشتہ
ہیں اور کنارہ پا رہے ہیں غمِ گزشتہ
جب تک کہ ابھی شغل سلامت ہے مری
ہیں اور ابھر ہی پا رہے ہیں غمِ گزشتہ

سعید احمد اعجاز

محبت

محبت جاوداں ہے بیکراں ہے نہیں اس میں شب و روز و مہ و سال
پرِ پروازِ شاہینِ ابد سے بہت آگے ہے اس کی جنبشِ بال

سعید احمد اعجاز

غزل

وہ دیکھتے جاتے ہیں کنکھیوں سے اِدھر بھی
چلتا ہوا جادو ہے محبّت کی نظر بھی

اُٹھنے کی نہیں۔ دیکھئے شمشیرِ نظر بھی
پہلے ہی لچکتی ہے کلائی بھی کمر بھی

پھوٹیں مری آنکھیں جو کچھ آتا ہو نظر بھی
دنیا سے الگ چیز ہے فرقت کی سحر بھی

ساقی کبھی مل جائے محبّت کا ثمر بھی
ان آنکھوں کا صدقہ کوئی ساغر تو اِدھر بھی

بیتاب ہوں۔ کیا چیز چُرا لی ہے نظر نے
ہونے کو تو دِل بھی ہے مرے پاس جگر بھی

گھر سمجھا ہوں جس کو کہیں تربت تو نہیں ہے
آتی ہے یہاں شام کی صورت میں سحر بھی

خاموش ہوں میں اور وہ کچھ پوچھ رہے ہیں
ماتھے پہ شکن بھی ہے عنایت کی نظر بھی

اس کے لبِ رنگیں کی نزاکت ہے نہ رنگت
غنچے بھی بہت دیکھ لئے ہیں گُلِ تر بھی

آتی ہے نظر دور ہی سے حُسن کی خوبی
کچھ اَور ہی ہوتی ہے جوانی کی نظر بھی

ہٹتی ہے جو آئینے سے پڑجاتی ہے دل پر
کیا شوخ نظر ہے کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

بیمارِ محبّت کا خدا ہے جو سنبھل جائے
ہے شام بھی مخ وش جدائی کی سحر بھی

میخانۂ عشرت نہ سہی کنجِ غریباں
آنکھوں کے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں اِدھر بھی

مل جائیں اگر مجھ کو تو میں خضر سے پوچھوں
دیکھی ہے کہیں شام جدائی کی سحر بھی

اے شوقِ شہادت کہیں قسمت نہ پلٹ جائے
باندھی تو ہے تلوار بھی قاتل نے کمر بھی

اے دِل تری آہیں تو سنیں کانوں سے ہم نے
اب یہ تو بتا اس پہ کریں گی یہ اثر بھی

اک رشک کا پہلو تو ہے سمجھوں کہ نہ سمجھوں
گردن بھی ہے خم آپ کی نیچی ہے نظر بھی

کچھ کان میں کل آپ نے ارشاد کیا تھا
مشتاق اسی بات کا ہوں بارِ دگر بھی

سوفار بھی رنگین کئے ہاتھ بھی اس نے
آیا ہے بڑے کام مرا خونِ جگر بھی

چھپتی ہے کوئی بات چھپائے سے سرِ بزم
اُڑتے ہو جو تم ہم سے تو اڑتی ہے خبر بھی

یوں ہجر میں برسوں کبھی لگتی ہی نہیں آنکھ
سو جاتا ہوں جب آ کے وہ کہہ دیتے ہیں مر بھی

کھلتا ہی نہیں بیخودِ بدنام کا کچھ حال
کہتے ہیں فرشتہ بھی اسے لوگ بشر بھی

سیّد وحید الدین احمد بیخود

ارتقائے محبت

پھر فصلِ بہار آئی پھر یاد لگے آنے — ایّامِ محبّت کے بھولے ہوئے افسانے
کچھ محو سے رہتے تھے اور دل میں یہ کہتے تھے — آغاز تو اچھّا ہے انجام خدا جانے
آنکھوں میں نہ جچتی تھی ناکامی و مایوسی — وہ رنگ دکھائے تھے نیرنگِ تمنّا نے
تاثیر تھی آہوں میں مستی تھی نگاہوں میں — ہر سُو نظر آتے تھے میخانے ہی میخانے
اُس کیف کے عالم کا باقی ہے اثر اتنا — اب تک نظر آتے ہیں عاقل ہمیں دیوانے
چھائی جو رہی غفلت ہم ایک بڑی مُدّت — ہر گُل کے رہے بلبل ہر شمع کے پروانے
ڈالے تھے حجاب اکثر دنیا کی حقیقت پر — آبادیِ گلشن نے ویرانیِ صحرا نے
حسنِ چمنِ ظاہر نظروں سے گرا آخر — دیکھا جو رُخِ باطن چشمِ دلِ شیدا نے
اک شاہدِ پنہاں کی، اک مایۂ عرفاں کی — تصویر دکھا دی ہے آئینۂ دنیا نے
دیتا ہے مے باقی دن رات وہی ساقی — ہیں شمس و قمر جس کے چلتے ہوئے پیمانے

جو منظرِ فطرت ہے سامانِ عبادت ہے
تارے بھی اسدؔ گویا تسبیح کے ہیں دانے

اسدؔ ملتانی

سوزِ ناتمام پر ایک نظر

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کے مندرجہ بالا شعر میں جس بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس کا اظہار تنقید و ادب کی دنیا نے مختلف پیرایوں میں اس کثرت سے کیا ہے کہ اس کی تکرار بعض لوگوں کو شاید گراں گزرتی ہو۔ لیکن ادبیات بلکہ تمام فنونِ لطیفہ میں یہ نکتہ ایک ایسے بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو اچھی طرح سمجھے بغیر ان فنون کی تخلیقات پر کوئی صحیح تنقید کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہر صنّاع اپنی تخلیقاتِ فن میں "اپنے دل کا معاملہ کھولتا ہے"۔ اسی سے اُن کو زندگی ملتی ہے اور ان کے خال و خد میں دل کشی و رعنائی، حرکت و ارتعاش اور روانی و گفتار پیدا ہوتی ہے۔ جب افلاطون نے اربابِ فن کی تخلیقات کو ان کی اولاد سے تشبیہ دی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ اعلیٰ درجے کی صناعی کبھی صناع کے تجربۂ حیات سے بے نیاز نہیں ہوتی بلکہ یوں کہئے کہ صنّاع کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ اپنی روح اپنی تخلیقات میں ڈال دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی اپنے اظہار کے لئے یا بقولِ غالب اپنے آپ کو "رسوا" کرنے کے لئے، ہر وقت بے تاب رہتی ہے اور جب یہ بے تابی رخصت ہو جائے تو زندگی اپنی میعاد ختم کر کے موت کی صورت میں منقلب ہو جاتی ہے۔ تخلیقِ فن کی تہ میں بھی زندگی کا وہی اصول کارفرما ہے جس سے صبح خوان طیور کے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ادبی تصنیف سے اس کے مصنف کی شخصیت صاف صاف یا بذریعہ اشارہ و تعبیر ضرور آشکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ تصنیف ایک قالب بے جان ہے۔ جب کوئی شخص ایک اچھی کتاب پڑھتا ہے تو وہ اس کتاب کے اوراق ہی سے نہیں بلکہ اس کے مصنف سے بھی دوچار ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا اُس فہم و ذکاوت سے بہرہ ور ہو جس کے بغیر کتاب کا مضمون اور مصنف کی شخصیت دونوں صفحۂ قرطاس سے نہیں اُبھر سکتے۔ غالب نے اس حقیقت کو بھی اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

جب میں نے اپنے دوست جناب عاشق حسین بٹالوی کی کتاب **سوزِ ناتمام** کو پڑھنا شروع کیا تو غالب کا یہ شعر بار بار میرے ذہن میں آیا۔ ہمارے عہد میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب شائع ہوئی ہوگی جس نے مصنف کی شخصیت کو اس شدت سے منکشف کیا ہو۔ یہ افسانے نہیں ہیں مصنف نے ہمیں اپنے دل و جگر سے دعوتِ لختِ لخت دی ہے۔ اس انکشافی پہلو کے اعتبار سے ان افسانوں کے بے پناہ جوش و قوت کی نوعیت ایسی ہے کہ مقابلے کے لئے ہمیں دنیا کی بعض مشہور خود نوشتہ سوانح عمریوں تک جانا پڑتا ہے۔ لیکن مصنف کی شخصیت کا اظہار ہی کسی کتاب کا مبتدا و منتہا نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ جن خیالات و افکار کو وہ قیدِ تحریر میں لایا ہے وہ کیا ہیں، زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق اس کا طرزِ فکر و احساس کیا ہے، اور آخر میں اس کے اندازِ بیان اور اسلوبِ تحریر کو پیشِ نظر رکھ کر اس کا بھی لحاظ کرنا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اُسے کامیابی کے ساتھ کہہ بھی سکا ہے یا نہیں۔ گویا نقاد کا کام یہ ہے کہ زیرِ بحث مصنف کے متعلق یہ وضاحت ان تین

سوالوں کا جواب دے کہ وہ کون ہے۔ کیا کہتا ہے اور کس طرح کہتا ہے

حضرتِ عاشق بٹالوی کون ہیں؟ ان کے حلقۂ احباب میں اس سوال پر شاید ہنسی کی ایک گونج پیدا ہو لیکن درحقیقت یہ استفسار اتنا بے معنی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

حضرتِ عاشق کی شخصیت کی تصویر کھینچنے کے لئے اگر میں ہندوستان کی گزشتہ صدی کی تاریخ اور بالخصوص ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی طرف رجوع کروں تو شاید وہ خود بھی چونک کر میری طرف دیکھیں گے لیکن صحیح یہ ہے کہ دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی حقیقت ایسی نہیں جس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے صرف اس کا حاضر الوقت ہنگامی تجزیہ کافی ہو۔ گھاس کی ایک ایک تھرتھراتی ہوئی پتی درختانِ صحرا کا ایک ایک برگِ سبز لاتعداد اسباب وعلل کی کسی زنجیر کی محض ایک کڑی ہوتا ہے۔ اس مختصر سی تشریح کے بعد اگر میں اپنے اصل دعوے کی طرف عود کروں اور کہوں کہ ان افسانوں کا بیج (معنوی طور پر میں ان افسانوں اور حضرت عاشق میں کوئی تمیز نہیں کرتا) ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بویا گیا تھا تو قارئین کرام شاید زیادہ متعجب نہ ہوں گے۔ یہ افسانے اور ان کے بین السطور کی پنہاں بے قراریاں مغربی اور مشرقی، انگریزی اور ہندوستانی تمدنوں کی آویزش کا ثمر ہیں۔ اس آویزش کا آغاز دراصل اسی دن ہو گیا تھا جس دن آج سے ٹھیک تین سو برس پہلے شہنشاہِ ہند نے اپنی نورِ نظر جہاں آرا بیگم کا علاج ڈاکٹر باٹن سے شروع کرایا۔ اس دن سے لے کر آج کے دن تک ہم اس کشمکش میں قدم بقدم پسپا ہو رہے ہیں۔ تجارت، دولت، حکومت، علم وحکمت، کوئی میدان ایسا نہیں جہاں ہم نے شکست نہ کھائی ہو اور ہماری ہر سیاسی اور تمدنی، عقلی اور مذہبی ہزیمت تپتے لوہے کے داغوں کی طرح ہماری روح میں اپنا جلتا ہوا سراغ نہ چھوڑ گئی ہو۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب ہماری ذہنی اور جسمانی محکومی ایک غیر مشتبہ حقیقت کی طرح ہمارے سامنے آ گئی تو ہماری مشرقیت نے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے منتشر قوا کو مجتمع کر کے ایک آخری کوشش سے ہنگامہ ۱۸۵۷ء برپا کیا۔ اس خونریز جنگ نے ہماری رہی سہی بربادی کا پیمانہ لبریز کر دیا اور انگلستان کے ہاتھوں ہمیں ایک ایسی خوفناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس کی مثال سے ہماری قدیم تاریخ کے اوراق یکسر خالی تھے۔ انگلستان کو ہم پر عظیم الشان فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح عظیم نو فتوحات کا پیش خیمہ تھی ہنگامہ ۱۸۵۷ء سرحد کا ایک خونریز معرکہ تھا جسے ہندوستان کی تسخیر کی تمہید کہہ سکتے ہیں اس کے بعد میدانِ کارزار ہندوستان کے قلب میں برپا ہوا۔ اب مشرق ومغرب کی صحیح آویزش شروع ہوئی۔ لیکن اس آویزش میں ۱۸۵۷ء کے بعد عرصۂ پیکار ہمارے دل تھے نہ کہ ہمارے ملک کے وادی وصحرا۔ ہمارے دلوں کے اندر ایشیا اور یورپ کی جنگ جاری رہی اور یہاں بھی ہمارے عساکر ناگزیر طور پر پسپا ہوتے گئے۔ قوموں کی آویزش کے بعد اب تمدنوں کی آویزش جاری تھی اور فاتح قوم کا تمدن ہمارے دل ودماغ کے گوشے گوشے میں ہمارے قومی تمدن پر غالب آ رہا تھا۔

یہ عظیم تر شکست جو ہندوستان کو اپنی روح سے بیگانہ بنا رہی تھی۔ اس قدر خوفناک ثابت ہوئی کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے نصف صدی بعد تک ہندوستان میں خاکِ مذلت سے سر اٹھانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ ادبیات کا شجر بلند جس کی جڑوں کے ننھے ننھے ریشے اپنے حالات گردوپیش سے غذا حاصل کرتے ہیں اور جس کے پتے صرف اپنی قومی تہذیب کے آفتاب سے زندگی کا رس چوس سکتے ہیں اس زہریلی فضا میں تاراج ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہمارے سب سے بڑے شاعر غالب نے ناگہاں اپنی زبان بند کر لی۔ اب وہ اپنے دوازدہ سالہ دورِ نثر میں داخل ہوا مگر اس کی انشا پردازی دوستوں کے ساتھ اپنا دل بہلانے تک محدود تھی۔ نوجوان نسل کے شعرا میں سے بعض نے دلی کی رام کہانی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی اور بعض نے ہندوستانی ریاستوں کے ظلِ عاطفت کے نیچے سر جا چھپایا جہاں کی فضا ان کی قابلیتوں کے لئے زیادہ سازگار تھی۔

دراصل اچھا ادب صرف ایک پختہ تمدن کا ثمر ہوتا ہے۔ جب تک کوئی مستقل تمدنی روایات پیچھے نہ ہوں، ادب کے لب ولہجہ میں نہ وہ لطافت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ عظمت جس کے بغیر نہ بولنا بولنے سے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب میں ظہورِ اسلام کے بعد جب دورِ جاہلیت کے مخصوص طرزِ تمدن کی بنیادیں ہل گئیں تو اس دور کے شعرا خود بخود خاموش ہو گئے۔ ان شعرا کو ختم کرنے کے لئے اسلام کو قانون کی طاقت سے کام نہ لینا پڑا بلکہ جو معاشرتی وروحانی انقلاب اسلام اپنے ساتھ

لایا تھا اس نے خود بخود جاہلیت کی شاعری سے اس کا آب و رنگ چھین لیا۔

انگریزی عہد کے سیاسی و تمدنی انقلاب نے اردو ادب پر ایک کاری ضرب لگائی۔ اب بھی لوگ شعر کہتے تھے مگر بقول اسماعیل میرٹھی ع

گا ہے ماہے اور وہ بھی جھوٹ موٹ

دہلی کی فرسودہ زندگی میں اب وہ بات ہی نہیں رہی تھی جو شاعری کے مضمون سجھاتی۔ فکر و عمل، علم و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے وہ تمام سرچشمے جو ہندوستانی فنون میں زندگی کی رو دوڑا رہے تھے۔ خشک ہو چلے تھے خواجہ حالی نے یہ فرق محسوس کر کے اسے اپنے بہترین انداز میں ظاہر کر دیا ؎

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

اس صورتِ حال میں ان تمام شعرا کا یک قلم خاموش ہو جانا ناگزیر تھا جن کا کمال ایک خاص سیاسی و عمرانی ماحول کی ترجمانی یا بالفاظ دیگر اس ماحول کے پس منظر پر شخصی جذبات و واردات کا اظہار تھا کہ اسی پر دراصل شاعری کا مدار ہے۔ غالب سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے غزل گو شاعر تک سب اسی اصول کے ماتحت آ جاتے ہیں۔ خواجہ حالی اُن چند شعرا میں سے تھے جو شخصی زندگی کے دائرے سے نکل کر جماعتی زندگی کے تصور تک پہنچ سکے۔ ان کے کلام کا بہتر و بیشتر حصہ قوم کی مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے۔ اپنی قوم کی تاریخی عظمت کا خیال حالی کو اپنے اُن معاصرین سے بہت بلند کر دیتا ہے جو دورِ گزشتہ کے متغزلین کی تقلید میں نظم کو اپنے شخصی جذبات کے اظہار کا مصنوعی ذریعہ بنا رہے تھے۔ اردو شاعری کے بہترین حصے کی یہ روش اب تک قایم ہے اور ہمارے عہد نے جماعتی زندگی کے حقایق کا سب سے جلیل القدر ترجمان پیدا کیا ہے۔ اقبال کسی ہزیمت خوردہ فوج کے اُس سالار کے مانند ہے جو اپنے منہدم شدہ شہر کے کھنڈروں پر کھڑا ہوا فتح کا نقارہ بجاتا اور آنے والی کامیابیوں کی بشارت دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ جہاں حالی نے ہر طرف یورپ کی قوتوں کا غلبہ ہی غلبہ دیکھا تھا وہاں اقبال نے اُن دھندلے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے جو ایک سیلابِ ہلاکت کی طرح خود یورپی تہذیب کو غرق کرنے کے لئے متعد ہو رہے ہیں۔ لیکن اُردو ادب کے جماعتی رنگ نے شخصی رنگ کو ہمیشہ کے لئے دبا نہیں دیا۔ ہمارے وہ ادیب جو قومی زندگی کے تصور سے وابستہ نہ ہو سکے اپنے شخصی جذبات کے اظہار کا کوئی موزوں وسیلہ نہ پا کر پہلے نظم میں اور پھر ناول اور افسانے میں ترجمے کے ذریعے سے اپنے ذوقِ ادب اور احساسِ جمال کو تسکین دینے لگے۔ ترجمہ شدہ یا ترجمہ نما نظموں اور افسانوں کا ایک طوفان رسائل کے ذریعے سے ملک کی ادبی فضا پر چھا گیا۔ ترجمے کے دور کی اس ہمہ گیری سے پہلے آج سے ستر اسی برس قبل پیارے لال نے "من سکھی او رسندر سنگھ" اور "خوشحال چند اور ہیرا" کے قصے لکھے جو صحیح معنوں میں طبعزاد تھے اور اس صنف ادب کے زندہ جاوید شاہکاروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں مگر پیارے لال کا خمیر حالی نذیر احمد اور آزاد کی طرح قدیم دہلی کی خاک سے اٹھا تھا اور قدیم دہلی کی اس آواز کے خاموش ہوتے ہی انگریزی افسانوں کے ترجمے تقریباً نصف صدی تک اردو افسانہ نگاری کا تنہا سرمایہ بنے رہے۔ مگر اس نصف صدی کے عرصے میں زمانہ پھر ایک بار کروٹ لے چکا تھا۔ ہندوستان کے نوجوان ادیبوں نے ایک نئے مکتب میں ایک نئی زبان اور نیا لب و لہجہ سیکھ لیا تھا جس کی مدد سے وہ اپنے دل کی داستان سنا سکتے تھے۔ اب ہمارے شاعر اور فسانہ نگار بولتے ہوئے الفاظ میں اپنی شخصیت کی تصویر دکھانے لگے۔ مگر یہ شخصیت کیا تھی؟ شکستوں، سرگردانیوں اور بےتابیوں کا مرقع! ہماری مشرقی طینت اور ہماری مغربی تربیت کی ناسازگاری ہمارے دلوں کو ایک عرصہ پیکار بنا رہی تھی ۱۸۵۷ء سے لے کر اب تک فکر و احساس علم و اخلاق اور تمدن و معاشرت نے یورپ کی افواج ظفر موج سے جو شکستیں کھائی تھیں اب اُن کی تاریخ شاعری اور افسانے کے خونیں اوراق پر مرتسم ہونے والی تھی۔ ہندوستان کے دل کا سوزِ ناتمام اب دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح بول اٹھا تھا اور چند بےحد ذکی الحس ادیبوں کا ایک گروہ اس کا ترجمان بنا ہوا تھا۔

یہاں تک ہم نے ۱۸۵۷ء سے لے کر اب تک کی ادبی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ ہم مختصر طور پر ان واقعات کو دیکھ چکے ہیں جن کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں سوزِ ناتمام جیسی تصنیف کا ظہور ممکن ہی نہیں بلکہ قرینِ قیاس ہو جاتا ہے۔ یہ ماحول مشرق و مغرب کے تمدن کی آویزش اور اس آویزش میں ہماری شکست کے احساس سے پیدا

ہوا ہے۔ بہت سے حقائق جو ہمارے خالص مشرقی دور میں یقینیات کا درجہ رکھتے تھے مغربی خیالات کی بدولت ظنیات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے مستقل معیار مٹ چکے ہیں اور اس انقلاب نے ہمیں ایک دورِ استفہام، ایک دورِ اضطراب میں لا ڈالا ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے افسانے اس دورِ اضطراب کے بہترین شارح ہیں۔

لیکن سوال پیدا ہوگا کہ مشرق و مغرب کی آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جن کی آویزش نے اس دورِ استفہام و اضطراب کو پیدا کیا ہے!

سب سے پہلے تو اقتصادی کش مکش کا ذکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس میدان میں ہماری شکستِ فاش اس قدر قطعی ہے کہ اس باب میں اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انگلستان کو پہلے پہل تجارت کی ہوس ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ہندوستان لائی تھی اور اس کے موجودہ سیاسی تعلق کا یہ تجارتی پہلو اب تک قائم ہے۔ اس کا اثر ہندوستان میں تاجر، دفتری، ہر فرد بشر پر پڑا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جہاں یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان عسرت کی اس بھیانک منزل میں داخل ہونے پر مجبور ہوں۔ جہاں خودکشی کے سوا زندگی کے عقدے کا کوئی اور حل ممکن ہی نہ ہو۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عالمگیر نے پڑھے لکھے بیکاروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر کے اس مسئلے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ اس صورتِ حال کی جھلک "سوزِ ناتمام" کے صفحات میں ایک دھندلے سے پس منظر کی طرح بار بار نظر آتی ہے اور مجموعے کے پہلے افسانے "زندگی" کا ہیرو اصغر تو اسی قسم کے واقعات کا شکار رہا یوں کہیے کہ شکاری ہے۔

مشرق و مغرب کی جنگ کا ایک خوفناک میدان مذہب ہے۔ اقتصادی پریشانیوں سے تو بعض خوش نصیب بچ بھی گئے لیکن اس روحانی خلفشار سے شاید ہی کوئی محفوظ رہ سکا ہو۔ مغربی سائنس کی ٹکر نے قضا و قدر اور معجزات و خوارقِ عادات کے متعلق اکثر نوجوانوں کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا۔ نیکی اور بدی کے متعلق بھی خیالات میں مختلف قسم کی اہم تبدیلیاں ہونے لگیں۔ یہ کیفیت ہمارے عہد میں آ کر اپنے پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوئی لیکن حالی نے شاید اسی قسم کے کسی ابتدائی احساس سے متاثر ہو کر بہت پہلے کہا تھا کہ زمانے کا انقلاب خود عیب اور ہنر کی صورت کو بھی بدل رہا ہے۔ جمہوری اور اشتراکی خیالات کی رو نے بادشاہ اور حاکم کی حیثیت بلکہ ہر قسم کے اقتدار یہاں تک کہ والدین اور شوہر کے اقتدار کے متعلق بھی طرح طرح کے شبہات اور اعتراضات پیدا کر دیئے۔ اس کا اثر لازماً خدا کے تصور پر بھی پڑا اور جنابِ باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق طرح طرح کے وسوسے دماغوں کو بے چین کرنے لگے۔ صاحبِ فہم و احساس نوجوانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جسے موجودہ عہد کے مضطربانہ استفہام نے زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں اس قسم کے سوالات سے دوچار نہ کیا ہو۔

"کون سمجھدار انسان گھڑی بھر کے لئے بھی باور کر سکتا ہے کہ قدرت کا ہر فعل بہتری پر مبنی ہے! کیا یہ تمام ظلم اور فساد، قحط اور تباہیاں دکھ اور مصیبتیں کسی بہتری کے لئے ہیں! دنیا میں خوشی قطعاً ناپید ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حیف اور پریشانی کا شکار ہو رہا ہے۔ جدھر دیکھو مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ ایک دکھ کا مداوا کرو تو دوسرا تیار ہے اور اس طرح مصیبتوں کے ایک لا انتہا سلسلے کا نام ہم نے زندگی رکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں مرنے کے بعد انسان کو ابدی راحت ملتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر موت ہی راحت کا دروازہ ہے تو پھر قدرت کو تخلیقِ انسانی سے کیا مقصود تھا!"

(سوزِ ناتمام صفحہ ۱۹۹)

سب سے آخر میں، مگر زیرِ بحث افسانوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سب سے بڑھ کر، معاشرتی خیالات کا وہ تصادم ہے جس نے ہماری سوسائٹی کو مختلف النوع عناصر کا ایک عجیب و غریب مرکب بنا دیا ہے۔ میرے خیال میں کسی سوسائٹی کی ہیئتِ ترکیبی کو سمجھنے کے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ اُس سوسائٹی میں پہلے خدا اور پھر عورت کی حیثیت کیا ہے۔ خدا کی اور عورت کا تصور در اصل ایک ہی معاشرتی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ کسی شخص کے لئے یہ ناممکن ہے کہ عورت کی فطرت کے متعلق شبہات کا شکار ہو جائے اور خدا کی ہستی کے متعلق اس کے دل میں شکوک پیدا نہ ہوں۔ شوپنہار کی شہرۂ آفاق عورت دشمنی کے ساتھ اس کی شہرۂ آفاق خدا دشمنی لازماً شامل تھی۔ مغربی تمدن نے جو ہماری روح کے گوشے گوشے کی تسخیر پر تلا بیٹھا تھا خدا کو ٹھکانے لگا کر اب عورت پر وار کیا مگر اس کی حمایت کے رنگ میں۔ اس نے ہمیں اکبر مرحوم کے الفاظ میں بتایا کہ عورت چراغِ خانہ بن کر رہنے کے لئے نہیں بلکہ شمعِ انجمن کی طرح

فروزاں ہونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گزشتہ صدی کے ربع سوم تک شریف عورتیں کم و بیش ایک عضو معطل کی طرح گھروں میں اپنی شرافت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اب وہ اپنی قدیم طرز بود و ماند کے گوشۂ عافیت سے نکل کر زندگی کی محفل میں داخل ہوئیں۔ پردے کے مسئلے اور حقوق نسواں کی تحریک نے ہماری سوسائٹی میں جتنا خلفشار پیدا کیا اتنا مغرب کے لائے ہوئے کسی انقلاب نے شاید نہیں کیا۔ اور یہ خلفشار بجا بھی تھا کیونکہ یورپ کا یہ وار ہماری معاشرتی زندگی کی بنیاد پر پڑ رہا تھا شعرا میں اکبر الٰہ آبادی نے اس انقلاب کو سب سے زیادہ اضطراب کے ساتھ دیکھا۔ حالی نے بھی شروع شروع میں ہندوستان کی "ماؤں بہنوں بیٹیوں" کو ان کی قدیم تہذیب کا واسطہ دے دے کر اس گم شدہ بہشت کی طرف بلانا چاہا جو اب بتدریج بے کیف و بے رنگ ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اکبر کی زمانہ شناس آنکھ نے حقیقت کا بے رحم چہرہ ایک نظر میں دیکھ لیا تھا ؎

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک ؟

اکبر کے بعد دوسری نسل کے ادیبوں میں مولانا ظفر علی خاں نے اس معاشرتی انقلاب کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ؎

کیا ہے ایکا دماغ و دل نے ، نئے نئے گل لگے ہیں کھلنے
کسی نے برقع اتار پھینکا کسی نے چلمن ہی توڑ ڈالی!

مولانائے ممدوح کا یہ انداز خیال آج تک قایم ہے۔ اس صدی کے آغاز میں آپ نے "پردے کا جنازہ" کے عنوان سے ایک افسانہ تحریر فرمایا تھا اس کے بعد غالباً سیاسی مصروفیتوں نے افسانہ نگاری کا موقع نہیں دیا مگر جس نئے "ہنگامی" انداز شاعری کے سب سے بڑے استاد آپ ہیں اس میں آپ نے وقتاً فوقتاً انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ در اصل مولانا ظفر علی خاں ہمارے عہد کی تمام قدامت پسندانہ تحریکوں کے پشتیبان اور ہماری گزشتہ صدی کی زندگی سے بلند ہونے والی ایک زبردست آواز ہیں آپ کی تمام سیاسی و ادبی زندگی ایک پیدائشی جنگجو، ایک بے باک سپاہی کی طرح نئے خیالات اور نئے شعائر و آئین کے خلاف جنگ کرنے میں گزری ہے۔

آزادیٔ نسواں کے متعلق مولانا ظفر علی خاں کا اضطراب ایک طنز آمیز عناد کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اکبر کے اضطراب کے ساتھ طنز شامل ضرور ہے تاہم یہ طنز یار رہا ایک افسردہ تبسم کی یاد دلاتی ہے لیکن ذاتی درد کی جو کسک سوزِ ناتمام کے اوراق میں ملتی ہے وہ اس سے پہلے اردو ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ اکبر اور ظفر علی خاں کی تصانیف میں ایک جماعت کے احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا ہے مگر سوزِ ناتمام کے الفاظ میں ایک بے قرار شخصیت بول رہی ہے۔

گزشتہ صدی میں عورتیں گھروں کی زینت اور بقائے نسل کی ضامن تھیں۔ ان کی دلچسپیاں محدود تھیں اور خانگی زندگی کی ذمہ داریاں انہیں مطمئن رکھتی تھیں ان کو بے حد عزت و آسائش حاصل تھی مگر مردوں کی ذہنی و روحانی رفاقت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ مرد روح و دماغ کی لطیف ترین رفاقت کے لئے اپنے دوستوں کی صحبت ڈھونڈتے تھے۔ مرزا غالب جب کوئی اچھی غزل کہتے تھے تو اس کی داد لینے کے لئے اپنی بیگم صاحبہ سے رجوع نہیں فرماتے تھے۔ اُن کے کلام کی تحسین کا حق میر و شیفتہ اور عارف و حالی جیسے احباب ہی ادا کر سکتے تھے۔ ان حالات و مقتضیات نے دوستی کو ایک مستقل معاشرتی ادارہ بنا دیا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی مجلسیں گرم کرنے کے لئے تعلیم یافتہ و شائستہ طوائفوں کا طبقہ موجود تھا از بسکہ گھروں کی مقدس چاردیواری میں نامحرموں کا بار پانا خارج از بحث تھا۔ مگر جوں ہی زمانے کے انقلاب نے ہندوستان کی زمام حکومت انگریزوں کو سپرد کی، یہ حالات بدلنے لگے مردوں کی باہمی دوستی میں وہ گرمی و ہنگامہ نہ رہا اور طوائفوں کی تعلیم و شائستگی اور اثر و رسوخ بتدریج زائل ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوستوں اور طوائفوں نے جس معاشرتی ضرورت کو پورا کر رکھا تھا، اب اُسے گھروں کی خواتین بوجہ احسن پورا کر رہی تھیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سوزِ ناتمام کے اوراق میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ دوستی کے قدیم تصور کے ساتھ مصنف کی والہانہ وابستگی ہے۔ عجب نہیں کہ ہماری تہذیب اپنے دور آغاز میں کسی حد تک دوستی کے قدیم یونانی نصب العین سے متاثر ہوئی ہو۔ اس خیال میں اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی یہ حقیقت بہرحال قایم ہے کہ پرانے قصص و حکایات میں دوستداری کو زندگی کا مقدس ترین

شہ ... اے ستم پیشو! دنیا میں اب ستم سے ہے

تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور صاحبِ سوزِ ناتمام نے گویا اسی روایت کو جدید ہندوستان کی فضا میں جاری رکھا ہے۔ انگریزی ہندوستان کی عورت کے خلاف اس کے دل میں بے حساب بغض و عناد ہے۔ اس کا تقریباً ہر فسانہ عورت کی طرف ایک کینہ آمیز اشارہ کر کے گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز اور مرد دوستوں کی جگہ نہ لے سکے! عجیب اتفاق ہے کہ "سوزِ ناتمام" کی دنیا میں جو ایک طائفہ ہمیں ملتی ہے وہ بھی بدقسمتی سے اپنا قدیم پیشہ ترک کر کے گھر کی شریفانہ زندگی اختیار کر لیتی ہے اور ہمیں تنہا چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن غنیمت ہے کہ ہمارے دوست ابھی ہاتھ سے نہیں گئے۔ دوستانہ تعلقات کے حسین و جمیل مرقعے ہمیں "سوزِ ناتمام" کے ورق ورق میں ملتے ہیں۔ عورت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کے لب و لہجے سے بے انتہا تلخی ٹپکنے لگتی ہے لیکن جوں ہی وہ ہمیں دوستوں کی کسی محفل میں لے جاتا ہے اس کی زبان میں وہ ملاطفت اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم عام طور پر عشق کے ناز و نیاز سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ "حکایتِ خونچکاں" میں افضال اپنے دوست کو جو خطوط لکھتا ہے اُن کا انداز دیکھئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے جائیے کہ دوستوں کے تعلقات کا نقشہ دکھانے کے لئے واقعیت کا اصلی رنگ اس تحریر میں کس طرح جھلکتا ہے:

(۱) تم بعض دفعہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ بیٹھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس بین سوج کی داد دینا پڑتی ہے۔ گزشتہ خط میں تم نے پوچھا تھا کہ میرے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ تمہاری اس ہمدردانہ توجہ کا بہت شکریہ۔ لیکن تم بے فکر رہو میں ندیا میں بیٹھ کر لاہور سے کھانا نہیں منگواؤں گا۔ . . .

(۲) تم چونکہ ہر روز شام کا وقت ایک تفریحی پروگرام کے ماتحت صرف کرنے کے عادی ہو اسی لئے بار بار پوچھتے ہو کہ میری شام کیوں کر گزرتی ہے۔ میں اگر اس نگارستانِ ہند میں ہوتا ہے جسے عرف عام میں لکھنؤ کہتے ہیں تو شاید اپنے مجروح و درماندہ قلم کی زندگی کی آخری رمق کو کام میں لا کر شامِ اودھ کی لکھی ہوئی بہاروں کا ہلکا سا نقشہ کھینچ دیتا لیکن وائے قسمت کہ ندیا میں ہوں جہاں نہ لاہور کی مال ہے اور نہ لکھنؤ کا چوک۔ بہر ان حالات میں مجھ سے میری شاموں کی تفصیل طلب کر کے میری سوگواریوں میں اضافہ کرنا ہی مقصود نہیں تو کیا ہے؟ . . . .

(۳) تم پوچھتے ہو ندیا کیسی جگہ ہے۔ میرا جواب ہے ندیا خوب جگہ ہے۔ . . . .

(۴) تمہارا خط میرے پیشِ نظر ہے اور میں تمہاری زجر و توبیخ کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ مجھے دیوانہ کہو یا حواس باختہ، گنہگار قرار دو یا مصلحت ناندیش، خدارا میری معصوم جذبات کی تحقیر اور میری پاکیزگیٔ خیال کی تضحیک نہ کرو۔ . . . میں آگ کے شعلوں سے زندہ بچ نکلا تو میرے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن کسے معلوم تھا کہ اب کف آلود موجوں کی طغیانیاں اور بادہ باراں کی تباہ کاریاں منہ کھولے بیٹھی ہیں تم مجھے عقل و خرد کا درس دیتے ہو لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ہوش و حواس کے ماتم کی فرصت بھی نہیں ہیں صبر و شکیب کی طاقت کہاں سے لاؤں جبکہ یہاں دلِ ناصبور کی پذیرائی کے لئے سوائے مجلسوں کے ہے ہی کچھ نہیں . . .

دوستی کا یہ تصور مصنف کے لئے محض ایک ادبی تکلف کی حیثیت نہیں رکھتا یہ اس کے احساس زندگی کا ایک نہایت اہم پہلو ہے جس کے آثار تقریباً ہر افسانے میں نمایاں ہیں۔ خوش قسمتی سے مصنف کا ایک حقیقی خط اپنے دوست سید سلامت اللہ بی اے کے نام اس مجموعے میں شامل ہے جس کا مفہوم قدرتاً اس قدر روشن اور بدیہی ہے کہ اس کے متعلق کسی ادبی تنقید یا نفسیاتی تجزیے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصنف کی چابک دستی کس طرح افسانے کو حقیقت کا رنگ دے سکتی ہے لیکن مندرجہ ذیل خط کے اندازِ بیان کی شعریت سے ہم پر ظاہر ہوگا کہ مصنف کی وہی صناعی حقیقت کو افسانے کے قالب میں ڈھال دینے پر قادر ہے۔ اس خط میں ایک ایسے مکان کے انہدام کا ماتم کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے بعض احباب کے ساتھ کئی مسرت افروز مجلسوں میں شرکت کی تھی۔ اس مکان کو دوستوں نے "النجد" کا نام دے رکھا تھا۔ اور اس میں آزادی اور بے فکری کی بہت سی گھڑیاں گزاری تھیں۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عربی شعرا کا یہ دستور تھا کہ سفر کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے اُس جگہ ضرور رک جاتے تھے جو کبھی محبوب کی فرودگاہ رہ چکی ہوتی یا جہاں کہیں محبوب کے ساتھ چوری چھپے کی ملاقات میں خوشی کی چند ساعتیں گزاری ہوتیں۔ بہت سے عربی قصاید کی تشبیب منزلِ محبوب کی اس قسم کی حسرت آمیز یاد پر مشتمل ہے۔ امرا القیس کا مشہور مطلع ہے سے

قِفَا نَبْكِ مِن ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ

میرے دونوں رفیقو! یہاں تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرو تاکہ محبوب کو یاد کرکے رو لیں، اور اس کی فرودگاہ کو دیکھ کر اشکبار رہوں۔

بِسِقْطِ اللِّوَى بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

جو ریت کے ٹیلے کے کنارے دخول اور حومل کے درمیان نظر آتی ہے۔

اس کے بعد اقتباس ذیل کو پڑھئے:۔

> پیارے سلامت کئی ہفتوں کی پیوستہ تنہائی مسلسل عزلت اور متعمل گوشہ نشینی کے بعد میں کل شام اپنے کلبۂ احزان سے جو ضیائے مسرت و ضیائے آفتاب دونوں سے محروم ہے نکلا، میں نہیں کہہ سکتا میرے پیش نظر کوئی خاص مقام تھا یا نہیں بہرحال گزشتہ سولہ سال سے چونکہ اسی خطے کی خاک چھان رہا ہوں اس لئے پاؤں خودبخود ایک راہ پہ چلنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ میں اس سڑک پر جا رہا تھا جس کو ہم ہیڈن روڈ کہا کرتے تھے اور جسے اب میونسپل کمیٹی کے تصرفات نے دل محمد روڈ کا نام دے رکھا ہے۔ دماغ ہمیشہ کی طرح اُس وقت بھی شگفتگی سے معرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک جم غفیر کدالوں بیلچوں اور پھاوڑوں سے مسلح ایک مکان کو گرا رہا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو مکان گرایا جا رہا ہے وہ یادش بخیر، النجد ہے۔ ع

سَلَامٌ عَلَى نَجْدٍ وَمَنْ حَلَّ بِالنَّجْدِ

> آہ، کچھ نہ پوچھو کہ اس منظر کو دیکھ کر دل حزیں کی کیا کیفیت ہوئی۔ دل جو حوادث روزگار سے پہلے ہی چھلنی ہو چکا ہے اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور میں قدموں میں سرعت پیدا کرکے آگے نکل گیا لیکن تمام راہ یاس و حرماں، کرب و اضطراب اور رنج و الم کے سیاہ بادل قلب و دماغ پر چھائے رہے۔ اگرچہ عرصہ دراز سے النجد بیکانیری مزدوروں، چماروں اور دھوبیوں کا مسکن بن رہا تھا لیکن اس کس مپرسی کے عالم میں بھی وہ ان روایات کا حامل، ان داستانوں کا مرکز اور ان ہنگاموں کا خزینہ تھا جن کی یاد لاہور کی اہل دل آبادی کے ایک قابل قدر حصے کا سرمایۂ نشاط و متاع حیات ہے . . . . لاہور کی آنے والی نسلیں، نہیں نہیں موجودہ نسلیں بھی، کہ آج کون ایسا دیوانہ ہے جو تاج محل کو دیکھ کر ایک غریب کے جھونپڑے کو تصور میں لانا پسند کرے گا، بھول جائیں گی کہ یہاں ایک ایسی چار دیواری بھی تھی جہاں اس زمانے میں، جبکہ تمدن جدید کی برکات پانی کی طرح عام ہو رہی ہیں، بجلی کی روشنی نہ تھی۔ جہاں چند دیوانے علی الرغم مصائب حیات اکٹھے ہو کر زندگی کی الجھنوں کو مسرت و شادمانی کے قہقہوں میں فنا کر ڈالتے تھے، جس کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بٹالہ، سرگودھا، گوجرانوالہ، پسرور، شاہ جہاں پور اور خدا جانے کہاں کہاں کے افراد کھنچے چلے آتے تھے۔ جس کی مٹی کو یہ تاثیر میسر تھی کہ خاک کو سونا بنا دیتی تھی۔
>
> النجد چشم ظاہر بیں کے لئے مٹ گیا لیکن اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے لئے زمین کا یہ ٹکڑا ہمیشہ مقدس و معزز رہے گا . . . . یہ وہ مقام ہے جس کی فضا اب بھی سرمستیوں سے معمور اور نشاط افروزیوں سے مخمور ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں عشق کا سوز اور محبت کی بیکسی رچی ہوئی ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کے در و دیوار میں ہماری آنکھیں لگی ہوئی ہیں . . . .

حقیقت یہ ہے کہ صاحب "سوز ناتمام" کی شخصیت دوستی کے لئے جس قدر موزوں ہے اسی قدر عورت، بالخصوص ہندوستانی عورت، کی رفاقت کے لئے ناسازگار ہے۔ خود اسی کتاب کی ایک عبارت اس مسئلے پہ نہایت فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ موجودہ عہد کے اکثر نوجوان اس احساس سے ناآشنا نہیں ہوں گے اس لئے کہ مغربی اور مشرقی تمدن کا ہماری سوسائٹی میں بیک وقت نافذ ہونا ایک زبردست ذہنی کشمکش کا باعث ہو رہا ہے۔ آج سے پچاس سال قبل مولانا نذیر احمد نے "ابن الوقت" میں ہماری ظاہری وضع و قطع کے انقلاب کے خلاف احتجاج کیا تھا لیکن "کوٹ پتلون کے معرکے" میں انگلستان کا تمدن ہمیں عرصے سے شکست فاش دے چکا ہے اور ہماری سوسائٹی کے قدامت پسند عناصر قدیم لباس کو رو دھو کر اب صبر کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ یورپ کا تمدن لباس سے زیادہ قیمتی چیزوں پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے مشرق و مغرب کی معاشرتی آویزش کا احساس ہندوستان کو کبھی اس شدت سے نہیں ہوا جیسا اب ہو رہا ہے۔ مرزا محمد سعید دہلوی کے ناول "خواب ہستی" اور

یاسمین" جو اس صدی کے آغاز میں لکھے گئے نوجوان ہندوستان کے اسی احساس کا پرتو ہیں۔ تمدنوں کی آویزش میں ہندوستان اب اس حد تک مسخر ہو چکا ہے کہ ہم ایک ہی وقت میں انگریز بھی ہیں اور ہندوستانی بھی۔ ہمارے نوجوان، ٹینی سن کے الفاظ میں "دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں ہیں جن میں سے ایک مر چکی ہے اور دوسری میں اتنی قوت نہیں کہ پیدا ہو سکے"۔

شادی کے بعد عورت کی زندگی کا صرف ازدواجی پہلو ہم پر واضح ہو سکتا ہے اور اس حالت میں بھی وہ ہم سے بے تکلف نہیں ہوتی کیونکہ ماحول و مراسم سے متاثر ہو کر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہم سے کمتر سمجھتی ہے اور جب تک اختلاف مراتب کا یہ احساس قایم ہے اس وقت تک آپس میں گھل مل کر ایک دوسرے کی فطرت سے کما حقہٗ آگاہ ہو جانا ممکن نہیں۔ دوستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات ابتدا میں معمولی ہم جنس ہونے کی حیثیت سے رسمی علیک سلیک تک محدود ہوتے ہیں۔ پھر روزمرہ کی ملاقات اور تبادلۂ خیالات سے وہ تعلقات غیر شعوری طور پر بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر وہ دوستی روح کی ایک اشتہا بن جاتی ہے جس سے علحدگی بعض اوقات ہماری زندگی تلخ کر دیتی ہے تم نے دیکھا ہوگا کہ دوستی پیدا کرنے میں فریقین کی جانب سے کبھی کوشش نہیں ہوتی اور عجیب بات ہے کہ جب کبھی اس معاملے میں قصد و ارادے سے کام لیا گیا ہے حصول مقصد میں ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ جب تک معاشرت میں عورت کے لئے موزوں مقام نہیں بنایا جاتا اور جب تک ہندوستان کی فضا میں یہ خوشگوار تبدیلی نہیں ہوتی کہ عورت سے جائز دوستی، جس کا نتیجہ مناکحت نہ ہو، قائم ہو سکے عورت کی فطرت کو سمجھنا محال کیا ناممکن ہے۔

دوستی اور نسائیت کا یہ تصور در اصل قدیم یونانی دنیا کا تصور ہے۔ اہلِ یونان روشن ضمیر اور با مذاق دوستوں کے ساتھ عقلی مذاکرات کو دنیا کی بہترین مسرتوں میں شمار کرتے تھے۔ اس قسم کی پر لطف گفتگو کے نظارے ہمیں "سوز ناتمام" میں جا بجا نظر آتے ہیں اور ان نظاروں سے خود مصنف کی لطف اندوزی غیر مشتبہ طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

"تم بار بار کہتے ہو کہ خارجی دنیا میرے لئے ختم ہو چکی ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"اس کا مطلب؟ نہایت صاف، واضح اور بیّن"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ خارجی زندگی کے مظاہر اپنے اندر میرے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ سالہا سال کی تیرہ و تند کشمکشِ حیات نے میرے دل و دماغ کو وہ کیفیت بخش دی ہے کہ بیرونی دنیا کا وجود اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا . . ."

سکون یاس اس کیفیت کا نام ہے"۔

"تم اسے سکون یاس کہتے ہو، حالانکہ امید ہے کہ ہو لا انتہا جوشِ مسرت کا احساس مجھے آج ہوا ہے"

"تو کیا تم اشیا کی خارجی حقیقت سے انکار کرتے ہو؟"

"میں اشیا کی خارجی حقیقت سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں لیکن ان کی عظمت و اہمیت کا معیار سراسر مختلف ہے . . ."

مگر دوستی کے یہ درخشاں نظارے صرف اس لئے ہیں کہ انسانیت کا عفریت، وہ تاریک نقطہ جو ان افسانوں کا مرکز ہے، اپنی پوری شان ظلمت آرائی کے ساتھ اس صاف پس منظر پر ہویدا ہو سکے۔ "سوز ناتمام" کا اہم ترین موضوع مسئلہ جنس ہے۔ اس مسئلے پر ہم یہاں اسی رستخیز اضطراب سے دوچار ہوتے ہیں جس نے سویڈن کے شہرۂ آفاق دشمنِ نسواں، اور "تمثیلات جنسی" کے مصنف سٹرنڈ برگ کو انجام کار دیوانہ بنا دیا تھا۔ دوستوں کی نکتہ شناسانہ ملاطفت، ہم آہنگیِ روح و دماغ اور پرلطف نوک جھونک کے یہ دل آرا مناظر جس اولمپیانی سعادت کے عرش پر ہمیں پہنچا دیتے ہیں اس کی بلندی سے ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کہ عورت ایک ظالمہ و جاہل ہستی ہے۔ "تبدیل نظریہ" میں تفضل تپ محرقہ میں مبتلا بتدریج موت کی طرف جا رہا ہے اور اس کی بیوی ایک "بنے ٹھنے" بانکی وضع کے جامہ زیب نوجوان" ہمسائے کے ساتھ نامہ و پیام کی راہ نکال رہی ہے اور اس کا دوست اسحاق؟

یقین کرو میں یہ خبر سن کر پاگل ہو گیا تفضل کی چارپائی پر سر رکھ کر میں پہروں رونا اس لیے نہیں کہ وہ بسترِ مرگ پر اپنی قیمتی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا بلکہ اس لئے کہ دنیا کس قدر بے حیائی بے انصافی اور بد اخلاقی سے لبریز ہے۔

حضرتِ عاشق کی خصوصیاتِ فن میں یہ ایک نمایاں چیز ہے کہ افسانے کا آغاز چند دوستوں کے باہمی تعلقات سے ہوتا ہے۔ پھر ایک

دوست غائب ہو جاتا ہے اور ایک عرصے کے بعد دوسرے دوست سے ملتا ہے۔ اس عرصے میں اس کی زندگی کسی نیک یا بد روحانی انقلاب کے تھپیڑے کھانے کے بعد کسی روشن یا تاریک ساحل تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور پھر جلتے اور جلاتے ہوئے لفظوں میں اس طوفانی سفر کی روئداد افسانے کا مرکز بن جاتی ہے۔ "زندگی" اور "عذرِ گناہ" میں یہی قرینہ ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن بیشتر افسانوں میں یہ انقلاب نہایت شدّ و مدّ اور وضاحت کے ساتھ کسی عورت کی بداخلاقی سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس زہر کا علاج یا موت ہے یا (بشرطِ زندگی) دوستوں کی مروت۔

لیکن صاحبِ "سوزِ ناتمام" کے نزدیک عورت میں ایک خوبی بھی ہے اور وہ اس کا جسمانی حسن ہے۔ وہ شوپنہار کی طرح عورتوں کو "ایک ٹھنگنی، تنگ شانوں، چوڑے کولہوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی مخلوق" نہیں سمجھتا جسے مرد کی کوربینی نے "صنفِ جمیل" کا نام دے رکھا ہے اور جسے انسانی زندگی میں دراصل آج بھی اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہئے کہ اسے "ایک ناگزیر شر" کا مرتبہ دیا جائے۔ عورت کے خلاف "سوزِ ناتمام" کے مصنف کا جنون شوپنہار کے جنون کی طرح پختہ نہیں ہے۔ اُسے یہ تسلیم ہے کہ عورت "زندگی" کے لئے ایک ناگزیر شر ہے۔ وہ عورت کے حسنِ ظاہری سے بے انتہا متاثر ہے اور اس تاثر کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ لیکن جس طرح شوپنہار کا فلسفۂ نسائیت عورت کو تمام عقلی و روحانی صفات سے معرّا قرار دیتا ہے اسی طرح "سوزِ ناتمام" کی عورت بھی اپنے جہاں آشوب حسن و جمال کے باوجود حُسنِ باطن سے بیگانہ محض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "سوزِ ناتمام" میں عورت کا تصور دو مختلف منزلوں میں سے گزرتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی زندگی کے دو تدریجی دور اس اختلاف کی تہ میں ہیں۔ "سوزِ ناتمام" میں کہیں بھی افسانوں کی ترتیبِ زمانی کا اظہار نہیں کیا گیا مگر ان کا مضمون خود اپنی غمازی کر رہا ہے اور تھوڑا سا غور کرنے پر اس میں مطلق شبہ نہیں رہتا کہ کون سے افسانے پہلے دور کے لکھے ہوئے ہیں اور کون سے دوسرے دور کے۔ اس پہلے اور دوسرے دور کے درمیان مصنف کی کسی نامعلوم ذہنی یا واقعی تجربے کی حدِ فاصل قائم ہے جس نے اس کی زندگی کے عناصر کو معنوی یا حقیقی طور پر تہ و بالا کر دیا۔ پہلے دور میں عورت ایک خوب صورت تیتری ہے جس کی چمک دمک سے مرد کے چمنِ حیات کی زینت ہے۔ اس دور میں مصنف اس زرق برق نفاست کی داد دل کھول کر دیتا ہے لیکن یہاں بھی یہ حقیقت بداہتہً ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ باطنی اوصاف جنہیں مغربی تمدن عورت سے منسوب کرتا ہے اور جن کی بنا پر اسے بارہا مرد سے کچھ اونچا مرتبہ دیتا ہے۔ ان کی کوئی جھلک حضرتِ عاشق کے دورِ اول کی عورت میں بھی نظر نہیں آتی۔ زمانۂ حال میں ہمارے بعض ادیب نسائیت کے اس تصور کو بدلے ہوئے حالات اور مغربی مصنفین کے اثر سے بتدریج قبول کر رہے ہیں لیکن صاحبِ "سوزِ ناتمام" کے لئے عورت شیلی کی اصطلاح میں "ایک حیوانِ جمیل" ہے مگر اس سے زیادہ نہیں۔ اس موضوع پر مشرقی اور مغربی نصب العین کی کشاکش دراصل اب تک جاری ہے اور سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے مصنف کا مغربی دماغ رہ رہ کر مردوں اور عورتوں کے زیادہ آزادانہ میل جول کا تقاضا کرتا ہے مگر اس کا مشرقی احساس کبھی نسائیت کے ایشیائی نصب العین سے اوپر پرواز نہیں کرتا۔ عورت اس کے لئے حُسن ہے مگر صداقت نہیں ہے۔ بایں ہمہ جب وہ اس حسن کی تعریف کرنے کے لئے زبان کھولتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ ذیل کی تحریر غالباً دورِ اول کی یادگار ہے:۔

> . . . تو برقِ تبسم سے خرمنِ صبر و شکیب کو جلاتی، آنکھوں کی جلوہ ریزیوں سے متاعِ ہوش و خرد کو تباہ کرتی اور بے پروا قدموں کی ٹھوکروں سے سوتے فتنوں کو جگاتی یوں نمودار ہوئی جیسے کالی بدلی سے چاند نکل آئے۔ پھر دفعتہً . . . تو نے باغی آنچل کو سمیٹا، عرقِ انفعال سے بھیگے ہوئے چہرے کی درخشانی کو . . . نقاب کی آڑ میں چھپا لیا اور سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو ہو گئی۔ آہ . . . تیرے لئے اس چشم زدن میں ختم ہو جانے والے واقعے کی بڑی سے بڑی اہمیت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اجنبی کی گستاخ نظر تیرے حسنِ محجوب پر پڑ گئی . . . مگر میں تمناؤں کے اُس محشرستان، آرزوؤں کے اتھاہ سمندر اور افکار کے قلزمِ بے کراں سے کیوں کر نکلوں جسے تیری ایک نگاہ میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے موجزن کر گئی . . . تیری لانبی لانبی گھنی پلکوں اور زہد شکن ابروؤں کے اندر سے نکلا ہوا تیر اس شدت سے جگر میں پیوست ہو چکا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اُسے نکالنے کی کوشش میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے

ہو کر رہ جائے گا۔

اس قسم کی تحریروں کے بعد عملی یا خیالی طور پر وہ انقلاب پیش آیا جس نے مصنف کو اس کی زندگی کے دورِ ثانی میں لا داخل کیا۔ عورت اب بھی وہی پیکرِ حسن و جمال تھی، لیکن اس کے حسن کے لئے مصنف کی غیر مشروط شیفتگی اب ایک تلخ عناد کی صورت میں بدل چکی تھی۔ عورت اب اس کے لئے ترکیبِ کائنات کے ابدی تضاد کا تاریک عنصر تھی: نور اور ظلمت، یزداں اور اہرمن، مرد اور عورت!

. . . میں کہوں گا کہ حسن و لطافت کی ان تمام رعنائیوں کے ساتھ وہ ایسی ابتلا ہے جس کی تحریص ہلاکت کا دنیا میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ عورت کی محبت میں انسان سے فرشتہ بن گیا! ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے ہیں جن کے لئے ارتکابِ گناہ کی سب سے بڑی محرک عورت ہی ہے۔ انسانی جنگ و جدل کی تاریخ کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ زمین پر نصف سے زیادہ خون عورت کی وجہ سے بہایا گیا۔

زندگی کے اس نیم شبی "نقطۂ نظر" کے بعد استہزائی قنوطیت کی منزل بالکل سامنے آ جاتی ہے چنانچہ چند ہی سطور کے بعد ہم ذیل کے الفاظ سے دوچار ہوتے ہیں جو ہمیں بے اختیار شوپنہار کی یاد دلاتے ہیں:۔

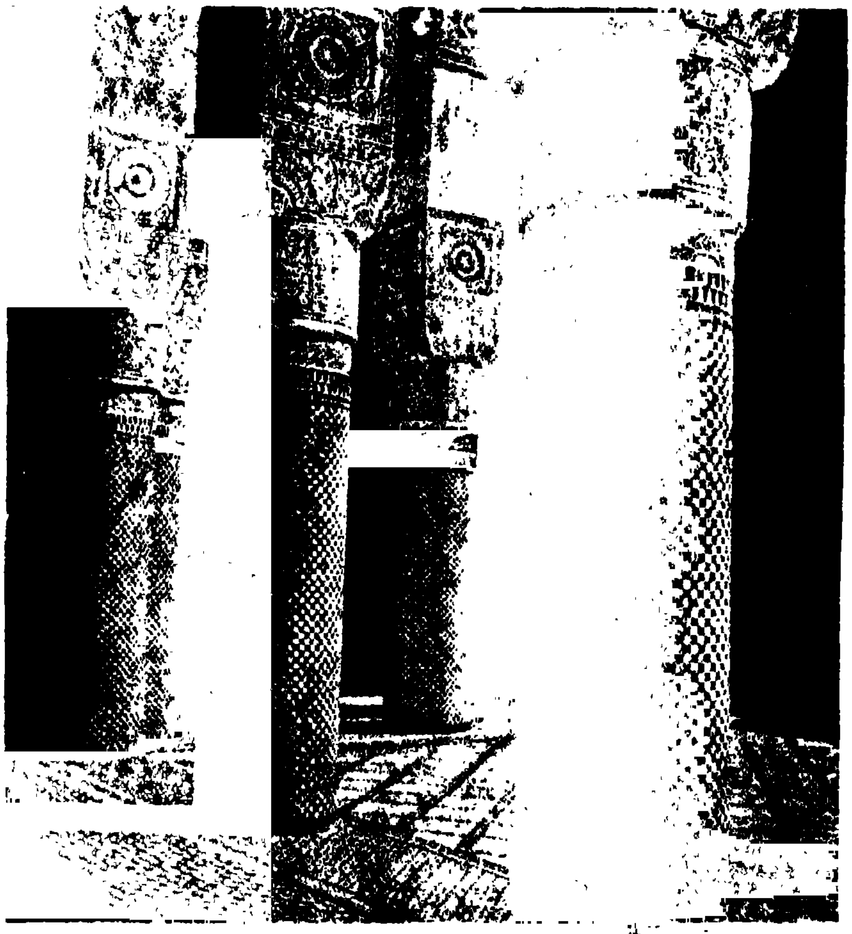
اُس کی ابرو کے اشارے اور لبوں کے تبسم پر ہم اپنی جانیں لکھ دیتے ہیں۔ اس کی سحر کاریِ محبت کے زیرِ اثر ہم ہپناٹزم کے ادنیٰ معمول کی طرح اندھا دھند ایسے خوفناک کاموں میں کود پڑتے ہیں جن کا تصور حالتِ طبعی میں اعصاب میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا اس جنون یا جذبے کو محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ بعض کہتے ہیں محبت سلگتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے اندر داخل ہو کر تپِ دق کی طرح اس کی ہڈیوں کو گھلا دیتی ہے . . . مگر میرا عقیدہ ہے کہ محبت سلگتی ہوئی آگ نہیں، بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جس کی زندگی اگرچہ مختصر مگر ہلاکت آفریں ہوتی ہے۔

یاس و قنوط کی اس منزل میں داخل ہونے کے بعد عورت کے تنہا کمال یعنی اس کے حسنِ جسمانی کا مصنف کے نزدیک تھوڑی دیر کے لئے مشتبہ قرار پانا ہمیں تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتا۔

ہمارے محدود تمدن میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ ہماری شاعرانہ بلند پروازیاں حدِ تکمیل تک پہنچ سکیں یا ہماری جوانی کے محبوب و مرغوب خواب بروئے کار آ جائیں اس لئے مجبوراً ہم اس شعریت کو جو دراصل ہماری ہی طبائع کا جزو ہے جنسِ مقابل میں منعکس دیکھتے اور نادانی سے سمجھتے ہیں کہ عورت سراسر شعریت اور سراپا لطافت ہے۔

ان تمام افسانوں میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے جس کی ہیروئن کمالِ صورت کا بہترین نمونہ نہ ہو مگر صرف دو ایک افسانے ایسے ہیں جن میں ہیروئن کا نقصِ سیرت تباہی اور ہلاکت کا سرچشمہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے "جوانی کی لغزش" میں ممتاز اس مجموعے کی سب سے زیادہ دردناک اور عذاب انگیز ہیروئن ہے۔ اس کے برعکس "فریبِ حسن" میں زلیخا سے اور "دھکی" میں شمسہ سے ہماری توقعات اس قدر کم ہیں کہ ان کی بدروشی ہمیں زیادہ رنج نہیں پہنچاتی اور نہ ان کے جرائم کو فراموش کرنے میں ہمیں زیادہ دقت پیش آتی ہے۔ "حیاتِ تازہ" میں بھی ہم اسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہاں بھی شہید کی بیوی کو مصنف نے اپنے مخصوص نظریہ نسائیت کا تختۂ مشق بنایا ہے لیکن بڑی حد تک وہ ایک دھندلے فتنے کی طرح پردے کے پیچھے حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری دلچسپی کا اصل مرکز افسانے کا ہیرو شہید ہے اور عجب نہیں کہ شہید کی سیرت کشی میں حضرت عاشق نے خود اپنی سیرت کے بہت سے پہلوؤں کا آب و رنگ مستعار لیا ہو۔ "قدرت کا انتقام" عورت کی فطرت پر مصنف کا شاید سب سے تُلا ہوا وار ہے۔ "ڈاکٹر سہیل زہرہ کے مشورے سے اس کے شوہر کامران کو قتل کر دیتا ہے۔ آہ بدنصیب کامران! اُسے اپنی کامرانی کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی"۔ لیکن اس قتل کے بعد مرد اور عورت کی فطرت کا پُراسرار امتیاز عجیب و غریب طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ کامران کا قتل اس کی بیوی کو مضطرب نہیں کرتا بلکہ اس کی بیوی کے عاشق کو! "جب دشمن درمیان سے اٹھ گیا تو خود میرے اندر اس کا ایک دوست پیدا ہو گیا"۔ سہیل کی اس کیفیت کو دیکھ کر سراپا نسوانیت زہرہ نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اس نے وعدہ معاف سرکاری گواہ بن کر کامران کے قتل کی داستان من و عن پولیس سے کہہ دی۔

اس تمام قضیئے میں جو سوال رہ رہ کر مصنف کے سامنے آتا ہے



جامع فیض رئیس کا اندرونی منظر



کسان

وہ دراصل شادی کا سوال ہے۔ اس سوال نے ہمارے عہد میں بے انتہا پیچیدگی اور اہمیت حاصل کرلی ہے۔ موجودہ نسل کے لئے شادی چیستان ابوالہول بن گئی ہے۔ نوجوانوں کے لئے لازم ہے کہ اس چیستان کو حل کریں اور اس کا حل دریافت نہ کرسکنے کی صورت میں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں تاکہ ان کے پرزے اڑا دئے جائیں۔ اس پریشان کن پیچیدگی کی تہ میں ہماری فرنگیشیائی سوسائٹی کی یہ عجیب و غریب کیفیت ہے کہ نوجوان نسل کی عورتیں نہ پوری طرح آزاد ہیں اور نہ پوری طرح پابند۔ وہ بھی ہمارے نوجوانوں کی طرح دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں ہیں۔ مرد ان کے برابر کے رفیق حیات بھی ہیں اور ان کے مجازی خدا بھی۔ اس صورت حال میں ان کی زندگی کی تلخی و نامرادی کا اتنا ہی امکان ہے جتنا مردوں کی دل آزگی بخنی کا۔ "شہید تغافل" میں ریاض انگلستان چلا جاتا ہے اور اس کی بیوی ممتاز اس کے فراق میں گھل گھل کر مرجاتی ہے۔ عورت کی جبلی بدکرداری کے متعلق مصنف نے جو کلیہ قائم کیا ہے یہاں ہم اگرچہ اس کے ناگزیر استثنا سے دوچار ہوتے ہیں لیکن اس افسانے میں بھی دراصل مسئلہ جنس اسی طرح زیرِ غور ہے جس طرح "جوانی کی لغزش" میں ممتاز نے شوہر سے بے وفائی کی اور "شہید تغافل" میں ممتاز کا شوہر بے وفا نکلا۔ سوال پھر بھی یہی رہا کہ شادی کی اس چیستان کا حل کیا ہے؟

اس وقت ہماری سوسائٹی میں انتخاب زوج کے دو طریقے رائج ہیں۔ بزرگوں کے ذریعے سے رشتے کی تلاش اور معاشقہ۔ "سوزِ ناتمام" میں ان دونوں طریقوں کی آزمائش کرکے دونوں کو قطعاً ناقص اور مایوس کن ٹھیرایا گیا ہے۔ "تبدیل نظریہ" میں تفضل نے سالہا سال کے معاشقے کے بعد شادی کی مگر اس کی بیوی نے وہی کیا جس کی توقع "سوزِ ناتمام" کی دنیا میں اس سے کی جاسکتی تھی چنانچہ تفضل کے دوست اسحاق کو عورت کے متعلق اپنا وہ نظریہ بدلنا پڑا جو اس کی مغربی تربیت کے آثار قبیض میں سے تھا۔

جس دنیا میں بیویوں کا معیار اخلاق وہ ہو جو ہم دیکھ چکے ہیں اس میں رشک و رقابت کے جذبے کا اپنی دردانگیزترین شکل میں ظاہر ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ مصنف نے کہیں کہیں اس جذبے کی تصویرکشی میں اپنا بہترین زورِ قلم صرف کیا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ مضمون اس سے پہلے اردو ادب میں اس جوش و قوت کے ساتھ کبھی بیان نہیں ہوا۔ اردو اور فارسی شعرا نے ایک خاص قسم کے رشک کا مضمون غزل میں نہایت کثرت سے باندھا ہے لیکن اُس رشک کی نوعیت کچھ اور تھی۔ گھروں کی شریف خواتین اور بیاہتا بیویوں سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ "سوزِ ناتمام" کے جس رشک کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس کی مثال ہمیں صرف مغربی ادبیات میں مل سکتی ہے اور وہاں غالباً "آتھیلو" اس کی بہترین یا کم از کم مشہورترین پیداوار ہے۔ گوئٹے نے اپنے "ورتر" سے اسی جذبے کی ایک خاص رومانی کیفیت منسوب کی ہے۔ مگر اس نرم اور شاعرانہ کیفیت کی جھلک ہمیں "سوزِ ناتمام" کے صرف ایک افسانے "حکایت خونچکاں" میں نظر آتی ہے۔ ورنہ یہ جذبہ بالعموم کرب و عقوبت کی انتہائی حشرانگیزیوں کا سامان اپنے ساتھ لاتا ہے اور اس میں نارِ جہنم کے شعلوں کی وہی لپٹ ہے جسے اناطول فرانس نے اپنے معرکہ آرا ناول "لال حمر" کا موضوع بنایا ہے۔

> چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی شش جہت میں پھیل کر کائنات کو بقعۂ نور بنا رہی تھی . . . اس نشہ آمد ماحول اور ان خمار آفریں اثرات کے اندر صرف وہ، خاموش و مضمحل، بستر پر پڑا جاگ رہا تھا۔ اُس کا دماغ پریشان خیالات کی حدت سے کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل رہا تھا۔ جذبات کی تندی بعض اوقات اُس کی حرکتِ قلب کو اس قدر تیز کر دیتی تھی کہ خون ہیبت ناک سرعت کے ساتھ اُس کی رگوں میں دوڑنے لگتا اور اُس کا جسم ایک خوفناک تھرتھری سے کپکپا اُٹھتا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں روح کو منجمد کر دینے والا مبہم و بے معنی خوف، بارگراں کی طرح اس کے رگ و ریشہ پر مسلط ہوکر اُسے اس قدر ناتواں بنا دیتا تھا کہ وہ گھبرا جاتا کہ کہیں اس کے جسم و جاں کا رشتہ منقطع ہونے کا وقت تو نہیں آپہنچا . . . ایک ہفتے سے وہ اس جانگسل کشمکش کا شکار ہو رہا تھا . . . وہ ٹکٹکی لگائے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ مرے ہوئے انسان کی طرح ساکن و بے نور تھا لیکن دل ناقابلِ توضیح اضطراب میں مبتلا جسم کی ایک ایک رگ کو شعلۂ زار بنا رہا تھا۔ وہ نصف گھنٹہ یوں ہی بے حس و حرکت لیٹا رہا اور آخر ایک اضطراری جنبش کے ساتھ یکلخت بستر سے اٹھا لیکن فوراً ہی نیم مردہ انسان کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی دندانہ دار آری آہستہ آہستہ اس کے اعضا کو کاٹ رہی ہے . . .

> یکایک اس کا سینہ پھیلا اور جذباتِ پنہاں کی خاموش وطویل جنگ نے ایک دردناک آہ کی صورت اختیار کی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک مدہم سی چیخ نکلی اور عالمِ انتشار میں اپنے ہاتھوں کو بے تابی سے ملتے ہوئے اس نے کہا: "میرے اللہ مجھے اس قیامت سے نجات دے۔ اگر اس خبر میں صداقت ہے تو۔ اور اگر یہ افترا ہے تو بھی مجھے حقیقت سے آگاہ کر دے کہ میں یہ جان کنی کا عذاب برداشت کرنے سے عاجز ہوں۔"
>
> اس نے بے اختیار ہو کر تکئے کے نیچے سے ایک شکن آلود کاغذ نکالا . . . آہ یہ نوشتۂ خونیں، کاش اسے کبھی نہ ملتا . . .
>
> وہ زندگی کے بقیہ ایام اسی عشرتِ جہالت میں بسر کر دیتا جس کا وہ ہمیشہ سے عادی چلا آرہا تھا۔ اکرام نے یہ خط بھیج کر یقیناً اس پر بے انتہا ظلم کیا تھا . . . اس نے کاغذ کے پرزے کو چاند کی ناکافی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چند سطریں تھیں جن کے الفاظ جلاد کی خونخوار آنکھوں کی طرح گھور گھور کر اسے لرزہ براندام کر رہے تھے . . . کیا ایک عورت حقوقِ زوجیت کو ہوس کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا کر خاوند کے پہلو میں یوں بے غل وغش محوِ خواب ہو سکتی ہے!

نسوانی اخلاق واعمال کی یہ تصویریں ہمارے دل پر دہشت طاری کر دیتی ہیں مگر نسائیت کی روح جس کے خلاف فصیح وبلیغ انشا پردازی اور نفسیاتی منظر کشی کی یہ قوتیں صف آرا کی گئی ہیں، اپنے خاموش انتقام سے غافل نہیں رہی۔ وہ چپکے سے "سوزِ ناتمام" کی دنیا کو چھوڑ کر نکل گئی ہے تاکہ مرد صرف اپنے دوستوں کے ساتھ جگمگاتی ہوئی محفلیں سجائیں یا کرب وعذاب کے جہنم کی ان ہولناک گہرائیوں تک پہنچیں جہاں تک صرف مرد کی روح اتر سکتی ہے جہاں تک اسے صرف عورت کی محبت گرا سکتی ہے۔

کوئی شخص جس نے اس جہنم کا التہاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو، نسائیت کی وہ بھیانک تصویریں نہیں کھینچ سکتا تھا جو ہمیں ان اوراق میں ملتی ہیں۔

"سوزِ ناتمام" کے مصنف نے ہمارے سامنے بری عورتیں نہیں بڑے عفریت پیش کئے ہیں۔ اس کے نسوانی کرداروں کو عورت ہونے سے اتنا سروکار نہیں جتنا اوراحِ خبیثہ ہونے سے۔ نسائیت کی تصویر کھینچنے میں اتنی بھی کاوش نہیں کرتا کہ عورت گوشت پوست کا زندہ انسان معلوم ہو۔ اس کی نفرت کی انتہا یہ ہے کہ وہ انہیں انسانی افراد کی صورت نہیں دینا چاہتا بلکہ انہیں محض بدی کی قوتیں اور فتنہ وشر کے مظاہر قرار دیتا ہے وہ اپنے قلم کے چند دہکتے ہوئے سرخ چھینٹوں سے کاغذ کو رنگین کر دیتا ہے اور انہیں ایک بری عورت قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس کا قلم اس لطافت وبرجستگی سے عاری ہے جن سے زندہ کرداروں کے خدوخال ابھارے جا سکتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوستوں کی گفتگو میں اس کی بہترین صناعی کس طرح زندگی کی روح بھر دیتی ہے۔ عورت کے ساتھ وہ یہ سلوک صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے افسانے کا مرکز ہمیشہ مرد کی محبت مرد کی مظلومی وتلخ کامی، مرد کا روحانی ارتقا ہوتا ہے عورت کا "پیدائشی شر" اس کے نزدیک ایک مانی ہوئی حقیقت، ایک اصول موضوعہ ہے جس کے ثبوت کے لئے کسی عقلی یا فنی مظاہرے کی ضرورت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ کامل اعتماد کے ساتھ مجسم برائی کے ایک نسوانی مظہر کو اپنے افسانے کے گردابِ حوادث میں پھینک دیتا ہے اور ہماری معمولی روزمرہ کی بصیرت اور انسانی زندگی کے مسلمہ اور عالمگیر تجربے سے توقع رکھتا ہے کہ ہمیں اس علامت سے ایک بری عورت مراد لینے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ صرف ایک موقع پر وہ اپنے اصول کو چھوڑتا ہے۔ شاید اس روایت کا لحاظ کرتے ہوئے کہ پہلی عورت آدم کے پہلو سے نکلی تھی وہ ہمیں ایک حقیقی عورت سے بھی دوچار کر دیتا ہے "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" میں زینت ایک زندہ ہستی ہے جس کی رگوں میں انسانی خون دوڑتا ہے جس کی نبض ہاتھ لگانے سے تڑپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جس کے دل کی دھڑکن کو ہم سن سکتے ہیں۔ زینت۔ جدید ہندوستان کی ان عورتوں میں سے نہیں ہے جن کے خلاف مصنف کے دل میں بے حساب بغض وعناد ہے۔ وہ ایک طوائف ہے شاید اسی لئے اس کے خال وخد کو ہمدردانہ کاوش کے ساتھ نمایاں کرتے ہوئے کسی قسم کی نفرت وکراہت مصنف کو دامنگیر نہیں ہوئی اور اس نے جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ نسائیت کا ایک حسین وجمیل مرقع ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ افسانہ حسنِ آغاز کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہے؛

> وہ آج بھی حسبِ معمول بہت دیر سے اٹھی۔ سورج کبھی کا طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی نرم اور روپہلی کرنیں مسہری کے پردوں پر رقص کر رہی تھیں . . . اس نے بائیں طرف کروٹ لیتے ہوئے

نیم وا آنکھوں کے اندر سے لانبی گھنی پلکوں کو چیرتی ہوئی ایک بے پروا نگاہ جانب مشرق ڈالی جہاں سے دھوپ کی سنہری شعاعیں مسہری کی جالیوں میں سے چھن چھن کر اس کے یاسمینی بدن پر پڑنے لگی تھیں۔ روزمرہ کی طرح آج بھی اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی کہ شاہ سوارِ مشرق کے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کا جسم دکھ رہا تھا اور وہ تمام اعضا میں ایک ناقابلِ بیان شکستگی، ایک بعید از فہم اضمحلال محسوس کر رہی تھی۔ موتیا کے باسی ہاروں کو گردن سے اتار کر اس نے پرے پھینک دیا۔ . . اس کے شکن آلود ریشمیں لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو، جو طبقۂ اناث سے خاص ہے، نکل نکل کر فضا کے محدود حلقے میں تعطّر کی ایک لہر دوڑا رہی تھی۔ وہ بالوں کی برہمی سے بے خبر، لباسِ حریر کی پریشانی سے بے نیاز، نرم و گداز بستر کی بغاوت سے غافل، آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ تمازتِ آفتاب کی تیزی اب اُسے اٹھنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن وہ حرکت کرنا نہ چاہتی تھی، حرکت کرنے سے ڈرتی تھی کہ مبادا اس کا بند بند ٹوٹ جائے۔

اس قسم کے پانچ زرنگار صفحے مصنف نے صرف ایک لمحے کے بیان میں صرف کئے ہیں۔ اس کے الفاظ و تراکیب کی برجستگی اور روانی جگہ جگہ ہم سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ اُسے خوب صورت الفاظ سے عشق ہے اور وہ ان کی باہم آمیزی سے قوسِ قزح کے الوان پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے اس کے الفاظ یاقوت و گوہر کی قیمت رکھتے ہیں اور وہ انہیں ایک جوہری کی محنت اور محبت سے استعمال کرتا ہے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی آمیزش میں اُسے خاص سلیقہ ہے:۔

(۱) آلامِ حیات کے ستائے ہوئے لوگ زندگی کے بکھیڑوں کو موسیقی کے دل نواز سروں میں کھو دینے اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو آتشِ سیال کے ایک گھونٹ سے گرما دینے کے لئے ہر شام اس کے ہاں جمع ہوتے تھے . . . اُسے شب و روز لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا کبھی ان کے ارمان بھرے دلوں کو ایک نگاہِ التفات سے فریبِ الفت میں گرفتار کر دیتی، کبھی انہیں شوقِ وصال و کاہشِ فراق کی الجھنوں میں مبتلا کر کے اُن کی بڑھتی ہوئی آرزوؤں کا جائزہ لیتی رہتی اور پھر یکایک چشمِ سحرکار کی ایک جنبشِ احتراز سے تمام حسین و جمیل امیدوں کو ملیامیٹ کر ڈالتی تھی۔

(۲) یکایک مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ زہرہ گویا ایک پیکرِ مرمریں تھی جسے میرے ہی ہاتھوں نے اپنے جذبات کی پذیرائی کے لئے پرستیدۂ خیال بنا کر تراشا تھا۔

(۳) جو شخص طعنِ خلق سے ڈرتا ہے وہی مٹ کر رہ جاتا ہے اور جو دھڑلے سے سوسائٹی کے خود ساختہ معیارِ اخلاق و ضابطۂ معاشرت کو پسِ پشت ڈال کر لوگوں کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے وہی پھلتا پھولتا ہے۔

سوزِ ناتمام میں اندازِ بیان کی ایک اور نمایاں خصوصیت مصنف کا حسنِ تخیل ہے۔ اُسے مبداءِ فیاض سے ایک شاعر کا تخیل ملا ہے۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو اٹھا کر شاعری کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جگہ جگہ اس کی عبارت ایک منثور شعر بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت ہم کئی اقتباساتِ ماسبق میں دیکھ چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک اور کا حوالہ دیتے ہیں:۔

میں نے جب پہلے پہل تجھے دیکھا تو تو اک کلی تھی ناشگفتہ، اک نغمہ تھی۔ زیرِ لب، اک خواب تھی حسین و روح پرور معصومیت کی الوہیتیں چہرے پر بکھیرے، آنکھوں میں ضیائے مسرت کی کرنیں سمیٹے، گویا ابھی آفتاب طلوع ہوا ہے، اور رُخِ روشن پر سماوی تجلیاں نمایاں کئے تو صحن چمن میں یوں پھر رہی تھی گویا ایک نازک و رنگیں تیتری ہے جو قوسِ قزح کے نظر فریب الوان سے مزیّن، باغ کی معطّر فضا میں، رنگ و بو کا روح افزا ارتعاش پیدا کرنے کے لئے آئی ہے۔ تیرے نازک نازک پاؤں جو مخملیں سلیپروں کے اندر سے یوں جھانک رہے تھے جیسے سبز پتوں میں چھپے ہوئے موتیا کے پھول، اس سرعت و بے تکلفی سے باغ کی روشوں پر پڑ رہے تھے کہ ہر ہر قدم پر تیرا نور و لطافت کے خمیر سے گندھا ہوا بدن دوہرا ہو ہو جاتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ تو بھی پھولوں کی ایک ڈالی ہے جو ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک کر رہ جاتی ہے۔

لیکن "سوزِ ناتمام" کا مصنف اپنی قدرتِ کلام سے صرف شاعرانہ

تخیل کی مینا کاری کا کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے تجربۂ حیات کو بارہا فلسفہ و حکمت کا لباس بھی پہناتا ہے جس کے بعض نمونے گزشتہ عبارتوں میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ نفسیات و اخلاق کے حقائق کو وہ ایسی بے تکلفی سے ایک پر مغز فقرے میں بند کر دیتا ہے جس سے ہم کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ اس نے ہم کو عقلیات کی سرحد پر لا ڈالا ہے اس قسم کے جواہرِ حکمت کتاب میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں :-

خود غرضی کی ابتدا، محبت کی موت ہے۔

عورت کی تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبت ہے

وہ خیال جس کا پشتیبان عمل نہ ہو انسانی زندگی کے لئے کبھی مفید ثابت نہیں ہوا۔

کسی چیز کو یاد رکھنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔

میرے نزدیک زندگی کی اولیں شعاع نفس سے پھوٹتی ہے اور خارجی دنیا اسی شعاع سے حرارتِ حیات حاصل کرتی ہو۔

جس طرح روشنی کی شدت آنکھوں کو چندھیا کر ادراک نور کو ضائع کر دیتی ہے اسی طرح عشرت کی فراوانی اُس حسِ لطیف کو فنا کر دیتی ہے جس سے لوگ غم و شادی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

مسائل اخلاق میں ایک نکتے پر صاحبِ "سوزِ ناتمام" نے بہت غور کیا ہے اور اس کے کئی افسانے رہ رہ کر اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ گناہ کیا چیز ہے؟ اس مسئلے پر اُس کی توجہ بار بار جاتی ہے اور مناسب یہ ہے کہ یہاں اس موضوع پر کسی قدر وضاحت سے روشنی ڈالی جائے۔ سقراط کے شہرۂ آفاق قول نے کہ "نیکی نام ہے علم کا" اخلاقیات کی تاریخ میں موافق و مخالف آرا کا عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا ہے۔ "سوزِ ناتمام" کا فلسفۂ گناہ بھی سقراط کے اسی قول کی شرح کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "قدرت کا انتقام" اپنے ہیرو کی خودکشی سے پہلے اس کی آخری تحریر میں یہ معنی خیز فقرہ اس کے ہاتھ سے لکھواتا ہے :-

وہ زبردست گناہ اور خوف ناک جرائم جو اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کو بالکل دو حصوں میں کاٹ کر ماضی و حال کو ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق کر دیتے ہیں اور جن کے مہلک اثرات ہماری زندگی کو ایک جدید شاہراہ پر ڈال دیتے ہیں، سابقہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔

"عذرِ گناہ" میں ہمیں صراحتہً بتایا گیا ہے کہ "ہم گناہ صرف لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں"۔ اس افسانے کا ہیرو اسلم ان نوجوانوں میں سے ہے جن کے لئے گناہ و ثواب کے قدیم معیار نابود ہو چکے ہیں اور عہد جدید کے ہنگامہ و غوغا میں انہیں کوئی نیا تشفی بخش معیار نہیں ملتا۔ چنانچہ وہ تجربۃً گناہ کی زندگی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک "صحیح علم صرف تجربات کی آگ میں کودنے ہی سے حاصل ہوتا ہے"۔ اسی طرح سہیل خدا کی ہستی کے متعلق یاس و قنوط کا شکار ہو کر خودکشی کر لیتا ہے تو اس کا دوست اس کی داستانِ حیات سناتے ہوئے کہتا ہے :-

سہیل نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا یا غلط! اس کا صحیح محاکمہ کرنے کے میں اب قابل ہوا ہوں مجھے یقین ہے کہ اگر سہیل میرے ساتھ ساتھ مراحل زندگی طے کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچتا تو جس طرح دنیا کے نشیب و فراز آج میری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو رہے ہو اسی طرح وہ بھی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا۔

گناہ و معصیت کو ناواقفیت کا نتیجہ قرار دے کر "سوزِ ناتمام" کا مصنف سوسائٹی سے تعزیرِ جرم کا حق چھین لینا چاہتا ہے، سوسائٹی کے افراد جو بسا اوقات اعلیٰ درجے کے فہم و احساس سے نابلد ہوتے ہیں جب کسی خطا کار کو سزا دینے میں اپنے جوش و غضب کا اظہار کرتے ہیں تو مصنف حسرت و یاس کے لہجے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا :-

دنیا میں کون ہے جس نے عمر بھر میں کبھی غلطی نہیں کی! لیکن لوگ بڑے سنگ دل ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے گناہوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں! اور شاید انتقام کے لئے اس شخص پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو اپنی کسی اتفاقی لغزش سے، لغزش بھی وہ جس پر اُسے اپنے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل قدرت حاصل نہ تھی، نادم ہو کر ان کے طعنوں کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتا۔

اس کے علاوہ مصنف کے نزدیک ہر گناہ اپنی سزا اپنے ساتھ لاتا ہے بلکہ قدرت کا انتقام زیادہ شدید اور قطعی ہے۔ اس صورت میں سوسائٹی کے درندوں کی ہائے وہو مصنف کو خصوصیت سے دل خراش معلوم ہوتی ہے:۔

> جس طرح مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اول تو ہمارے ہاں سوسائٹی سرے سے مفقود ہے لیکن آبادی کے جس بہیمانہ عنصر اور تماشائیوں کے جس غیر تربیت یافتہ گروہ کو تم سوسائٹی کہتے ہو اس کے خلاف بھی تو میں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ یوں تحت الشعور کی خبیث روحیں مجھ پر پنجے جھاڑ کر پل پڑتیں۔

اس تمام چھان بین اور آزمائشی سرگردانی کے بعد مصنف "حیاتِ ثلاثہ" میں گناہ کے ایک نئے تصور تک پہنچا ہے۔

> ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق قطع منزل وحصول مقصد کے لئے اعضاو جوارح کو مصروفِ تگ و دو کئے ہوئے ہے۔ ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے اور ان تخلیقی قوتوں کو ضائع کرنے کا نام ہی گناہ ہے۔ عملی نقطۂ نظر سے برا کام کرنے والا انسان اُس شخص سے بہتر ہے جس کی قوتیں زنگ آلود ہو کر بے کار ہو چکی ہیں۔

اس نئے معیارِ اخلاق سے منحرف ہونے والوں کے لئے تعزیرات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قدرت خود بڑی سختی سے ان کے اعمال کا احتساب کرتی ہے۔

> ہر شخص کی تباہی اور بربادی کے ظاہری اسباب اگرچہ مختلف ہوں لیکن باطنی سبب ایک ہی ہوتا ہے اور وہ تمام ناکام اشخاص میں مشترک ہے جو انسان اپنے خیالات پر قابو کھو دے اور ضبطِ نفس کی قوت سے محروم ہو جائے اس کے ایک ہاتھ میں تم آفتاب دے دو اور دوسرے میں ماہتاب، اس کے قدموں میں بیش قیمت خزانے لاکر ڈال دو، اور اس کے سر پر دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کا تاج لاکر پہنا دو، وہ کامیابی سے ہمیشہ محروم اور اصلی طاقت سے ہمیشہ بے بہرہ رہے گا۔

اس تمام ذوقِ عمل اور فلسفیانہ ادراک کے ہوتے ہوئے بھی "سوزِ ناتمام" کی دنیا مسرت و نور کی دنیا نہیں ہے۔ روح کی تھکن اور افسردگی اور یاس و اضمحلال کی کالی گھٹا ایک تاریک رات کی طرح اس کے آسمان پر منڈلا رہی ہے اور بے اختیار ہم اپنے دل سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اس دنیا میں زندگی اس قابل ہے کہ بسر کی جائے! اس فضائے آبنوس میں ایک روح کے کراہنے کی آواز ہمیں آتی ہے۔ ایک بے حد ذکی الحس روح اپنی بڑھی ہوئی ذکاوتِ احساس کی وجہ سے خود اپنے آپ کو عذاب دے رہی ہے۔ یہ تعذیبِ نفس زندگی سے اس کا انتقام ہے اس لئے کہ زندگی بُری ہے۔ عورتیں بے وفا ہیں۔ خدا اپنی مخلوق کے درد و الم سے ماورا اور بے نیاز ہے۔ دعا کی تاثیر ایک تباہ ہوتی ہوئی دنیا کی آرزوؤں کا واہمہ ہے۔

> زندگی نام ہے ان گنت تکلیفوں کے ایک مجموعے کا جس کا شیرازہ صرف موت ہی بکھیر سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی شکستوں میں ہماری قومی تہذیب نے جو زخم کھائے ان کے درد کی کسک "سوزِ ناتمام" کے اوراق میں ایک چبھتی ہوئی ٹیس بن گئی ہے۔ "مجروحِ احساس" میں دورِ استفہام و اضطراب کا قنوط افسانے کی پردہ پوشیوں کو بے تابی سے جھٹک کر پوری عریانی سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ اگرچہ ایک خاص قسم کی "رجائیت" کا حامل ہے اور ان افسانوں کی تمام قنوطیت سے اس کا انداز الگ ہے لیکن دراصل یہ رجائیت پر مصنف کا سب سے زیادہ پرکارانہ وار ہے۔ یہاں ہمیں بتایا گیا ہے کہ "کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو"۔ حیاتِ دنیا کا باطل و بے قیمت ثابت ہونا ایک قسم کی سلبی تسلی ہے جس پر ہم اپنی مسرت کے قصر تعمیر نہیں کر سکتے۔ "رات کی خاموشی میں" جس تحریر کا عنوان ہے اُسے پڑھئے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کے لئے غم کوئی کتابی فلسفہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے:۔

> رات کی خاموشی میں، تنگ و تاریک جھونپڑے کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر، فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے مگر ہر صبح جب صبحِ قیامت کے استقبال کو اٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرہ کا سورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک بار مجھے دنیا کی رازِ مخفی کا ہولناک

کے سامنے عریاں ہدف استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے . . . ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو ایک لمحے کے لئے ہی سہی، پر نور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلع حیات!!! سال ہا سال گزر جاتے ہیں، ایک، بید گریاں، ایک فریب نفس میں مبتلا ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے افق تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو . . .

ہاں، اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن پھوٹتی ہے۔ اس ناقدر جام دنیا میں دوست داری کا نہ چھوٹ سکنے والا رشتہ ابھی باقی ہے۔ جب مصنف اپنے مرصع طرز نگارش سے احباب کی محفلیں سجاتا ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت سے مسرت و شادمانی کی نامحدود استعداد لے کر آیا تھا مگر قضا و قدر کے فرشتے نے اسے ایک بے کیف و رنگ مرتی ہوئی دنیا میں پھینک دیا۔ وہ دراصل عہد قدیم کا ایک یونانی تھا جس کے چمکتے ہوئے دل و دماغ کو تقدیر نے کوئلے اور لوہے اور بھاپ اور دھوئیں کے تمدن کی غلیظ تاریکی میں مقید کر دیا۔ پھر بھی اس کے یونانی احساس نے اپنے لئے مسرت کی ایک راہ نکال لی۔ اسے دوستی کی محبت و رفاقت پر کامل اعتماد ہے اور یہ اسی لازوال اعتماد کا کرشمہ ہے کہ کبھی کبھی زندگی کے ابر سیاہ کے دامن سے صبح امید مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

حمید احمد خاں

قطعہ

آ، روح کو آلام سے آزاد کریں اک بار ہمیں طوف پریزاد کریں
جو کہتی ہے دنیا اسے ہرگز نہ سنیں معشوقۂ نوخیز سے دل شاد کریں

سعید احمد اعجاز

دوست سے

تری ضو ریزیوں پر انحصارِ شادمانی ہے
تیرے جلووں سے گلشن میں بہارِ جاودانی ہے

تجھی سے ہے جہانِ آرزو اے دوست وابستہ
تجھی سے ہے بہارِ رنگ و بوائے دوست وابستہ

ترے دم سے مرا ذوقِ نوا جنت بداماں ہے
ترے دم سے مرا تاریک دل شمعِ شبستاں ہے

تو آتا ہے تو میرا قلبِ مردہ زندہ ہوتا ہے
کہ یہ مہتاب مہرِ حسن سے تابندہ ہوتا ہے

تجھے پا کر چمن والے خوشی کے گیت گاتے ہیں
بہاریں رقص کرتی ہیں شگوفے مسکراتے ہیں

تو میرے پاس ہوتا ہے تو کوئی غم نہیں ہوتا
خوشی کا عیش کا آرام کا ماتم نہیں ہوتا

سہارا ہے تو ہی اے دوست میری زندگانی کا
تو ہی عنوانِ رنگیں ہے مرے دل کی کہانی کا

روشن نکودری

التماسِ جمیل

(۱)

درِ نشاط یونہیں مجھ پہ باز رہنے دے　　یہی نگاہ یہی ساز باز رہنے دے
حقیقتوں سے مجھے بے نیاز رہنے دے
حقیقت اپنی بہ حدِّ مجاز رہنے دے　　مری نگاہ کو نظّارہ باز رہنے دے

(۲)

جو عشق و حُسن میں ہے امتیاز رہنے دے　　الگ الگ انہیں اے دلنواز رہنے دے
بڑھائے جا یونہیں کیفِ نظر سے لطفِ سخن
تاثراتِ نگاہِ ہوس پرست ہی سُن　　تصوراتِ دلِ پاکباز رہنے دے

(۳)

رہینِ حسرتِ راز و نیاز رہنے دے　　انہیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں ناکام
متاعِ بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام　　مرے لئے ہوسِ سوز و ساز رہنے دے
فروغِ دیدۂ آئینہ ساز رہنے دے　　وہ اپنا جلوہ بینش گداز رہنے دے
خدا گواہ، نہ تھا میں تو سائلِ دیدار
بنا دیا تری شوخی نے مائلِ دیدار　　مجھے قریبِ حریمِ مجاز رہنے دے
مری نگاہ کا دامن دراز رہنے دے　　معاملہ کی خوشی کو نوراز رہنے دے
ترے خیال سے لے جاؤں میں اگر بازی
گناہ میرے لئے کیوں ہو پھر نظر بازی　　کچھ اور دن ابھی حکمِ جواز رہنے دے

علی منظور حیدر آبادی

چلا بھی آ!

مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!
مرے بیقرار جہان میں نہیں اب قرار چلا بھی آ!
مجھے اختیار پہ اب نہیں رہا اختیار چلا بھی آ!
مری شامِ غم ہیں لئے ہوئے رُخِ تابدار چلا بھی آ!
سہے تابہ کے کوئی منتظر غمِ انتظار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

ترے نور سے ہے ضیافشاں دلِ آفتاب درست ہے!
تری آب و تاب سے دو جہاں میں ہے آب و تاب درست ہے!
تو وہ لاجواب جمال ہے کہ نہیں جواب درست ہے!
مگر اک گدائے حقیر تک کبھی شہر یار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

مری چشمِ گریہ نصیب سے ہے لہو رواں تو ہوا کرے
مجھے ضبطِ شوق سے زندگی ہو وبالِ جاں تو ہوا کرے
مرا جلوہ زارِ امید اگر ہے دھواں دھواں تو ہوا کرے
یونہی جل بجھے گا تو جل بجھے دلِ داغدار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

ترا سوزِ غم بھی ہے زندگی ترے سوزِ غم کی قسم مجھے!
ترا ہر ستم ہے نشاطِ جاں ترے ہر ستم کی قسم مجھے!
وہ قسم جو ضامنِ شوق تھی ہے اُسی قسم کی قسم مجھے!
کہ محیط ہے مری روح پر غمِ روزگار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

نہیں تجھ میں خوئے وفا نہ ہو یہ مری وفا کو قبول ہے
جو ترا ہے حاصلِ مدعا مرے مدعا کو قبول ہے
یہ فغاں طرازیٔ ابتدا مری انتہا کو قبول ہے
شب و روز تیری بلا سے میں رہوں سوگوار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

یہ الم بھی تیری ہی دین ہے مگر اس میں کیفِ الم نہیں
مجھے غم نصیب تو ہے مگر مرے غم میں لذتِ غم نہیں
میں کروں وفورِ ستم کو کیا جو ستم میں لطفِ ستم نہیں
بس اب انتہا کی نزار ہے مری جانِ زار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

کیا تجھ سے شکوۂ بے رخی، مری آرزو کی خطا ہے یہ!
تجھے لاجواب بنا دیا مری گفتگو کی خطا ہے یہ!
تجھے خود سے دور سمجھ لیا مری جستجو کی خطا ہے یہ!
تجھے پاؤں پڑ کے مناؤں گا ذرا ایکبار چلا بھی آ!
مجھے یوں نہ داغِ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ!

احسانؔ دانش۔

عزت اور ممتا

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد:۔ [جس ترتیب میں سامنے آتے ہیں]

۱۔ **جنک** ـــــــ	۴۔ **مسز جمال الدین** ـــــــ
۲۔ **بسنتی** ـــــــ نوکرانی	۵۔ **وکرم** ـــــــ
۳۔ **لیڈی وت** ـــــــ	۶۔ **ڈولی** ـــــــ جنک کی لڑکی

[جنک میز کی دراز کو جو مختلف چیزوں سے بھری ہوئی ہے خالی کر رہی ہے۔ فرش پر پڑی ہوئی ایک ٹوکری میں یہ چیزیں نکال نکال کر ڈال رہی ہے چٹھیوں کا ایک انبار ہے کہ ایک طرف لگ رہا ہے۔ ٹوکری کے پاس ایک زنگ آلود پستول پڑا ہے۔ اس کمرے کی بناوٹ اور سجاوٹ یوں ہے کہ داہنی طرف میز کے سامنے ایک پلنگ ہے۔ میز کے بائیں طرف ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی ہے۔ اس پلنگ کے سامنے اور بائیں دیوار کے قریب صوفہ اور کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اندر کی طرف کھلتا ہے اور جس پر پردہ پڑا ہے۔ اس دروازے کے داہنی طرف ایک انگیٹھی ہے جس میں آگ جل رہی ہے۔ میز کے اوپر ٹیلیفون ہے اور بائیں جانب ایک اور دروازہ ہے گویا یہ ایک کمرہ دو کمروں کا کام دے رہا ہے۔ صبح کے وقت ڈرائنگ روم اور رات کے وقت سونے کا کمرہ

جنک کو خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس کے نقش تیز ہیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ان میں بے حد کشش پیدا کر رہے ہیں۔ لباس معمولی سا۔ بال بکھرے ہوئے۔ اور کچھ کچھ گیلے۔ بالوں کے نیچے کندھوں پر تولیہ ہے۔ گویا ابھی نہا کر آئی ہے۔ عمر تیس اور پینتیس کے درمیان]

جنک [ایک خط کو پڑھ کر پھاڑ دیتی ہے اور پرزے کھڑکی سے باہر پھینک دیتی ہے۔ آواز دیتی ہے] بسنتی ـــــ بسنتی [پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ گنگناتی ہے۔ دراز میں سے چند تمغے نکالتی ہے۔ ہاتھ میں لے کر انہیں دیکھتی رہتی ہے۔
بسنتی اپنے دوپٹے سے آنکھیں ملتی ہوئی داخل ہوتی ہے]

بسنتی۔ بی بی مجھے بلایا!

جنک۔ [چونک کر] اوہ تو ہے بسنتی ـــــ اور یہاں ہے ہی کون جسے آواز دیتی ـــــ کیا ہوا تجھے!

بسنتی (آنکھیں ملتی ہوئی) مر گئی میں تو

جنک۔ تجھے تو آج چار بجے اٹھنا چاہئے تھا۔ دیکھ سورج کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اور ابھی یہ کمرہ بھی صاف نہیں ہوا۔

بسنتی۔ پر بی بی میری بھی تو سنو!

جنک۔ آخر کوئی ایک دن کی بات ہو تو سنوں بھی۔

بسنتی۔ کوئلے تو وہ گیلے۔ لکڑی تو وہ گیلی۔ آگ جلے تو کیونکر۔ میری تو آنکھیں باہر نکل آئیں۔

جنک۔ خیر یہ باتیں تو کبھی ختم نہ ہوں گی۔ پہلے ان چٹھیوں کو میرے سامنے آگ میں ڈال۔ سنا۔ اور پھر ان چٹھیوں کو [بائیں طرف جو انبار لگا ہے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے]
دیکھ بھی نا ادھر ـــــ ان چٹھیوں کو میری الماری میں رکھ آ اور چابی مجھے دے دے اور سن ان کا ذکر نہ ہو کسی سے

[بسنتی چٹھیوں کی طرف بڑھتی ہے]

جنک۔ روز کا کام جو تو کرتی ہے وہ تو بھول ہی گئی۔ اس پلنگ کو تو اٹھا پہلے۔

بسنتی۔ بی بی میری تو عقل ماری گئی۔

[جنک پلنگ سے اٹھتی ہے بسنتی بستر لپیٹتی ہے۔ پلنگ اٹھا کر سامنے دروازے سے اندر چلی جاتی ہے۔ جنک دراز میں سے ایک لفافہ نکالتی ہے۔ خط نکال کر پڑھتی ہے۔ سر جھک سا جاتا ہے بسنتی داخل ہوتی ہے۔ اور بستر اٹھا کرلے جاتی ہے۔ جنک خط ہاتھ میں لئے کمرے میں ٹہلتی ہے]

جنک۔ [آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے] تیرہ سال ہوگئے۔ اتنا عرصہ گزر گیا [بسنتی پردہ اٹھا کر آدھی اس کمرے میں آدھی دوسرے کمرے میں کھڑی نظر آتی ہے] ڈولی دو سال کی تھی —— میری کیا عمر ہو گی اس وقت؟

بسنتی [اندر آتے ہوئے] بی بی!

جنک [چونک کر] تو مجھے ہمیشہ ڈرا دیتی ہے

بسنتی۔ بی بی ایک بات پوچھوں۔

جنک۔ مگر جلدی پوچھ ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ سُنا۔ دیکھ یہ کمرہ کتنا گندا ہو رہا ہے۔ لیڈی دت ابھی آ پہنچیں گی اور گاڑی کا وقت بھی ہو جائے گا۔

(بسنتی خاموش رہتی ہے)

جنک۔ اب پوچھتی کیوں نہیں!

بسنتی۔ آج دس سال کے بعد بیٹی آ رہی ہے۔ پھر اتنی اوداسی کیوں؟ پھر یہ آپ سے آپ باتیں کرنے کا کیا مطلب؟

جنک۔ تُو تو ٹھہری پگلی۔ میں حساب کر رہی تھی۔

بسنتی۔ اس چھٹی میں کیا حساب . . . [چٹھیوں کے انبار کی طرف بڑھتی ہے]

جنک۔ [ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی] بڑی چالاک ہے۔

[بسنتی پرانے لفافے، چٹھیاں وغیرہ اٹھاتی ہے۔ جنک اس کے قریب آ جاتی ہے]

جنک۔ ڈولی جب دو سال کی تھی تو اسے ایک قسم کا سخت بخار ہو گیا تھا۔ یہ ان دنوں ولایت میں تھے۔

بسنتی۔ [انگیٹھی کی طرف جاتی ہوئی] کون بی بی!

جنک۔ لیفٹیننٹ صاحب۔

بسنتی یعنی . . .

جنک۔ تُو تو میرا مغز چاٹ جائے گی۔

بسنتی اوہو، میرا مطلب ڈولی کے پتا جی اور آپ کے . . .

جنک۔ خیر اچھا ہوا تو سمجھ گئی۔

[بسنتی ایک ایک لفافہ اٹھا کر آگ میں جھونک رہی ہے]

بسنتی۔ ہاں بی بی تو پھر

جنک۔ یہ خط انہوں نے ولایت سے لکھا تھا۔ آج اس بات کو تیرہ سال ہو گئے۔

بسنتی۔ اور یہ خط آپ سے گم بھی نہ ہوا۔

جنک۔ اگر ان چٹھیوں کو اسی طرح جلاتی رہی تو بس سارے دن میں یہ ایک کام ختم ہو گا۔

بسنتی۔ ایک ہی بار ڈال دوں!

جنک۔ ہاں

بسنتی۔ آگ نہ لگ جائے!

(کھٹکھٹاہٹ)

جنک۔ دیکھ کون ہے [بسنتی باہر جاتی ہے۔ جنک میز کی طرف جاتی ہے پستول اٹھا کر دیکھتی ہے]

بسنتی۔ [اندر داخل ہوتی ہوئی] بی بی کلب کا چپڑاسی ہے، بل لا یا ہے [جنک کو بل دیتی ہے]

جنک۔ کتنا ہے —— [دیکھتی ہے] برج میں تیس روپے ہار گئی!

بسنتی۔ کیا ہے بی بی! —— اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟

جنک [پستول دکھا کر] یہ؟

بسنتی۔ یہی تو —— کھلونا ہو گا

جنک۔ [ہنس کر] ہاں —— مگر بڑا خطرناک۔

بسنتی۔ پٹاخے چلانا ہو گا۔

جنک [قہقہہ لگا کر] ہاں لفٹنٹ صاحب پٹاخے چلایا کرتے تھے [ذرا ٹھہر کر] بسنتی تو بڑا وقت ضائع کرتی ہے۔

بسنتی۔ بی بی

جنک۔ جلدی کر جلدی۔ ڈولی گاڑی میں بیٹھی ہو گی۔ لاہور سٹیشن کا انتظار ہو گا اوہ

[خوشی میں پستول اچھالتی ہے]

بسنتی تو کیا سن رہی ہے۔ دیکھتی نہیں میز پر کتنی چیزیں پڑی ہیں
پہلے تو اس ٹوکری کو اُٹھا۔

بسنتی۔ وہ بھی جلانی ہے؟

جنک۔ ٹوکری نہیں۔

بسنتی۔ ہاں ہاں اُسے کیوں جلاؤں گی — بی بی یہ وہی ہے نہ جو ہم مسوری سے لائے تھے! [ٹوکری کی طرف بڑھتی ہے]

جنک۔ تیرا حافظہ تو بڑا ہے . . . [ٹیلیفون بجتا ہے جنک جلدی سے میز کی طرف دوڑتی ہے۔ پستول میز پر رکھ دیتی ہے۔ بسنتی بغور اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے]

جنک [ٹیلیفون میں] . . . . ہا ہا . . . میں ابھی ابھی بسنتی سے آپ کا ذکر کر رہی تھی . . . اچھا! . . . . مسز جمال الدین . . . ضرور لائیے ساتھ . . . بڑی مہربانی آپ کی . . . ڈولی . . . اور آدھ گھنٹہ تک گاڑی آ پہنچے گی . . . ضرور . . . [ٹیلیفون بند کر دیتی ہے بسنتی کو پاس کھڑی دیکھ کر] او ہو! تو ابھی تک میرے سر پر کھڑی ہے۔ جلدی کر۔ لیڈی دت اور مسز جمال الدین آ رہی ہیں اور اس کمرے کا حال دیکھ۔

بسنتی۔ ابھی صاف کئے دیتی ہوں۔

جنک۔ وہ کیا دیکھیں گی اس کمرے میں — یہ ٹوکری ساتھ کے کمرے میں چھوڑ آ اور جلدی واپس آ۔

بسنتی [دوسرے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی] یہ لو

[جنک باقی چیزوں کو پھر دراز میں ڈال دیتی ہے پستول میز پر پڑا رہ جاتا ہے۔ میز پر ایک فوٹو پڑا ہے اسے اٹھا کر کمرے کے عین وسط میں آ کھڑی ہوتی ہے۔ بسنتی داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں ایک کپڑا ہے جس سے فرش صاف کرتی ہے]

جنک [فوٹو دیکھتی ہوئی] بسنتی!

بسنتی۔ بی بی۔

جنک۔ یہ فوٹو . . .

بسنتی۔ جلانا ہے؟

جنک بے وقوف۔ نہیں۔ مگر اسے یہاں نہیں رکھنا چاہتی۔

بسنتی۔ ڈاکٹر صاحب کا ہے نا؟

جنک۔ ہاں۔ کہاں رکھے گی!

بسنتی۔ جہاں حکم ہو گا۔

جنک۔ اور ڈولی ہرگز اسے دیکھنے نہ پائے۔

بسنتی۔ تو رسوئی میں رکھ دوں۔

جنک۔ بڑی پاگل ہے کیا ڈولی وہاں نہیں جا سکتی۔

بسنتی۔ اے ہے بی بی وہ وہاں کیوں جانے لگی — اول تو رسوئی اتنی چھوٹی پھر دھواں اتنا ہو جاتا ہے کہ آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور پھر ہماری ڈولی پڑھ کر آ رہی ہے انگریزی سکول سے — بی بی بڑا خرچ ہوتا ہو گا!

جنک۔ میں اس فوٹو کا سوچ رہی ہوں۔

بسنتی۔ تو ہیں کہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دو۔

جنک۔ کہہ جو چکی کہ نہیں۔

بسنتی۔ تو لاؤ میں اپنے بکس میں رکھ لوں

جنک۔ [نگاہوں میں تولتے ہوئے] اور کسی کو پتہ نہ لگے گا!

بسنتی۔ [ہاتھ بڑھاتی ہوئی] زبان ہی کٹوا دوں گی۔

[باہر موٹر کے کھڑے ہونے کی آواز]

جنک۔ بسنتی [اس جلدی میں فوٹو پھر میز پر رکھ دیتی ہے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے]

بسنتی! انہیں اندر لا کر بٹھا اور کہہ دیجیو میں غسل کر رہی ہوں — نہیں کر چکی ہوں اور منٹوں میں . . .

[اندر چلی جاتی ہے بسنتی بائیں جانب والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ کپڑا ایک کرسی کے پاس چھوڑ جاتی ہے۔ پھر کچھ خیال آ جاتا ہے۔ واپس آتی ہے۔ کپڑا اٹھا کر صوفے کے نیچے چھپا رہی ہوتی ہے کہ لیڈی دت اور مسز جمال الدین داخل ہوتی ہیں۔ دونوں ادھیڑ عمر کی۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ عام بڑے گھروں کی عورتوں جیسا لباس۔ بیٹھتے بیٹھتے کمرے کا اچھی طرح معائنہ کر لیتی ہیں]

بسنتی [کھسیانی سی ہو کر] اوہ۔ معاف کیجئے — بیٹھئے نا۔ بی بی غسل کر رہی ہیں — نہیں شاید کر چکی ہیں [دروازے کی طرف بڑھتی جا رہی ہے] ابھی بلا کر لاتی ہوں۔

[اب غائب ہو جاتی ہے]

مسز جمال الدین۔ [آہستہ] یہ اتنا گھبرا کیوں رہی تھی

لیڈی دت [مسکرا کر] وہ دیکھو نا۔ وہ سامنے۔ صوفے کے نیچے کپڑا چھپا رہی تھی۔

مسز جمال الدین۔ [زور سے ہنس کر] تمہاری آنکھیں بڑی دور تک پہنچتی ہیں۔

لیڈی دت۔ کالج میں سائیکالوجی میرا خاص مضمون تھا۔

مسز جمال الدین۔ کالج میں تو میں پڑھی نہیں مگر سائیکالوجی کا اس کپڑا چھپانے سے کیا تعلق۔

لیڈی دت [کمرے کے چاروں طرف پھر ایک نظر ڈالتے ہوئے] یہ بڑی گہری باتیں ہیں آج کی شام انہیں کلب کے لئے رکھو۔ جب مرد بھی ہوں گے۔

مسز جمال الدین میں سمجھی نہیں۔

[بسنتی داخل ہوتی ہے]

بسنتی۔ بس جی وہ آرہی ہیں

مسز جمال الدین۔ ذرا جلدی آجائیں۔ ہمیں مارکیٹ جانا ہے۔

بسنتی۔ جی [پھر جاتی ہے]

لیڈی دت۔ مجھے برج سے گھیری چڑ۔ اس لئے آج شام کو میں اور تم کرسیاں لے کر الگ بیٹھ جائیں گی اور پھر جب مرد لیڈیز کے ارد گرد منڈلانا شروع کریں گے تو پھر بتاؤں گی کہ مردوں کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں کس طرح چلتی ہیں۔ خاص کر وکرم

[مسز جمال الدین زور سے ہنسنا شروع کر دیتی ہے]

ہم بیٹھے ہیں جنک کے گھر اور اب ایک دفعہ تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو تمہیں روکے کون۔

مسز جمال الدین [ہنسی کو روکتے ہوئے] وکرم کون!

لیڈی دت۔ وکرم [فوٹو پر نظر پڑتی ہے] وکرم۔ [ادھر ادھر نظر کرتی ہوئی میز کے قریب جا کر فوٹو دیکھتی ہے۔ اٹھا کر دور سے مسز جمال الدین کو دکھاتی ہے]

مسز جمال الدین۔ اوہ وکی کہو نہ۔ اسے تو سب وکی کہتے ہیں۔

لیڈی دت۔ [اپنی جگہ پر بیٹھتی ہوئی۔ آہستہ] ہوں تو وکی صاحب یہاں بھی تشریف رکھتے ہیں [شک و شبہ کی نظروں سے پھر کرے کا معائنہ کرتی ہے]

مسز جمال الدین۔ کیا ہو گیا؟

لیڈی دت مدت سے ایک بات سن رہی تھی مگر۔ . .

مسز جمال الدین [بات کاٹ کر] میں سمجھ گئی۔

لیڈی دت۔ کیا!

مسز جمال الدین۔ یہی کہ وکی جنک کے پاس بہت آیا جایا کرتا ہے۔

لیڈی دت۔ اور تم نے کلب میں کبھی نہیں دیکھا جب جنک آتی ہے تو کتنے تماشے کیا کرتا ہے۔

مسز جمال الدین۔ لوگ تو اور بھی بڑی باتیں سناتے ہیں۔

لیڈی دت۔ مثلاً

مسز جمال الدین۔ کہ ڈولی . . .

لیڈی دت۔ نہیں نہیں یہ بالکل غلط ہے۔ ڈولی پانچ سال کی تھی۔ جب لفٹنٹ سنگھ کی موت ہوئی تھی اور جنک نے اس کے ایک مہینے بعد ہی ڈولی کو مسوری کے ایک سکول میں داخل کرا دیا تھا۔

مسز جمال الدین۔ اور یہ دس سال خرچ کون ——

[جنک داخل ہوتی ہے۔ مسز جمال الدین کچھ گھبرا سی جاتی ہے]

مسز جمال الدین [مجرم کی طرح گھبرا کر] آ!

جنک۔ [اس حال ٹھیک ہیں۔ دھوتی بھی بدلی ہوئی ہے۔ مسز جمال الدین کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے] معاف کیجئے بہت دیر لگا دی میں نے۔ [بیٹھ جاتی ہے]

لیڈی دت۔ نہیں ایسی دیر بھی کیا ہو گئی۔ ہمیں ذرا مارکیٹ جانا ہے —— ہاں تو جنک آج ڈولی آرہی ہے؟

جنک۔ ابھی آ پہنچے گی۔ میں اب سٹیشن ہی جا رہی ہوں۔

مسز جمال الدین۔ کتنے برسوں کے بعد ملو گی بیٹی کو!

جنک۔ میرے خیال میں میں مسوری صرف ایک بار گئی تھی۔

لیڈی دت۔ مجھے یاد ہے۔ مگر کافی مدت کی بات ہے۔

جنک۔ یہی [سوچتی ہے] تین سال ہو گئے شاید۔

مسز جمال الدین۔ [دور میز کی طرف دیکھتی ہوئی] بھئی تمہارا بڑا حوصلہ ہے

[جنک مسز جمال الدین کی طرف دیکھ کر کچھ ہنسنے کی کوشش کرتی ہے]

جنک۔ دیکھئے نہ ڈولی پانچ سال کی تھی جب لفٹنٹ صاحب گزر گئے۔ میں نے اسے مسوری بورڈنگ میں داخل کرا دیا۔

مسز جمال الدین۔ سکول ہی ہیں۔

جنک۔ ہاں۔ سات سال تک میں اس سے نہیں ملی — نہیں — شاید ایک دفعہ ملنے گئی تھی — خیر — اس کے بعد شاید تین سال ہوئے میں پھر گئی اور اب وہ دس سال کے بعد سینیئر کیمبرج کا امتحان دے کر واپس آ رہی ہے۔

مسز جمال الدین۔ تمہاری خوشی کا اندازہ میں اچھی طرح لگا سکتی ہوں۔

جنک۔ کل رات تو مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔

لیڈی دت۔ آج چلئے ہمارے یہاں ہو گی — تم دونوں کی — سنا۔ چار بجے

جنک۔ [مسکرا کر] مہربانی مگر . . .

لیڈی دت۔ اگر مگر اب رہنے دو — ڈکرم [جنک چونکتی ہو جاتی ہے] اس فوٹو میں تو بڑا اچھا نظر آتا ہے۔

جنک [گھبرا کر — ہتھیلیاں ملتی ہے] کونسا — ہاں . . .

مسز جمال الدین [کنکھیوں سے جنک کی طرف دیکھ کر] وہ جو میز پر پڑا ہے

لیڈی دت۔ اس میں تو پچاس سال کا نہیں لگتا۔

مسز جمال الدین۔ تو کیا اس کی عمر پچاس کی ہے!

لیڈی دت۔ تم نے کیا سمجھا تھا۔

[جنک رومال سے پیشانی سے پسینہ صاف کرتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہتے کہتے رک جاتی ہے]

مسز جمال الدین۔ شراب بہت پیتا ہے۔

جنک [جیسے کہ شک دور کرنا چاہتی ہے] ایک دن ملنے آیا تھا۔ فوٹو یہیں چھوڑ گیا — لیڈی دت کیا وقت ہو گا!

مسز جمال الدین۔ [دبی زبان میں] اب یہیں پڑا رہنے دو۔

[جنک گھور کر دیکھتی ہے]

لیڈی دت۔ اوہ۔ تمہیں تو سٹیشن جانا ہے۔ آؤ میں چھوڑ آؤں۔

جنک۔ نہیں — مہربانی

لیڈی دت [اٹھتی ہوئی] وہ پستول کیوں رکھ چھوڑا ہے

جنک۔ اوہ۔ [میز کی طرف دیکھتی ہے] کتنی بے وقوف ہوں۔ باہر پڑا رہ گیا۔ لفٹننٹ صاحب کا تھا۔

لیڈی دت۔ [دروازے کی طرف جاتے ہوئے] آج چار بجے — تم دونوں — بھولنا مت

[لیڈی دت اور مسز جمال الدین باہر چلی جاتی ہیں۔ جنک ان کو جاتے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر موٹر کار کے چلنے کی آواز سنتی ہے۔ صوفے پر آ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک لمحہ یوں ہی بیٹھی رہتی ہے۔ اٹھ کر فوٹو اٹھا کر پھاڑ دیتی ہے۔ انگیٹھی میں ایک ایک ٹکڑا ڈالتی ہے بسنتی داخل ہو کر تعجب سے جنک کی طرف دیکھتی ہے]

بسنتی۔ بی بی یہ کیا کر دیا میں نے جو کہا تھا کہ اپنے بکس میں رکھ لو گی۔ پھر کیوں چلا دیا۔

جنک [جھڑک کر] چپ رہ!

بسنتی۔ بی بی۔

جنک۔ [واپس آ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے] آج ہم دونوں کی چائے باہر ہو گی — میری اور ڈولی کی — لیڈی دت کے ہاں بے چاری بڑی اچھی ہے۔

بسنتی۔ [بے پروائی سے] ہو گی۔

جنک۔ کیوں؟ کیا ہو گیا تجھے۔ ناراض ہو گئی!

بسنتی۔ ابھی یہاں بیٹھی بیٹھی نہ معلوم کیا کیا باتیں بنا رہی تھیں۔

جنک [چونکنی ہو کر] کیا! کون کون!

بسنتی۔ وہ اور ان کی ساتھ والی۔

جنک۔ مسز جمال الدین!

بسنتی۔ ہاں کبھی ہنسیں کبھی . . .

جنک۔ تجھے کس طرح معلوم ہوا!

بسنتی۔ سن جو رہی تھی۔

جنک۔ میں ہرگز تیرا پردے کے پیچھے چھپ چھپ کر باتیں سننا گوارا نہیں کر سکتی۔ سنا تو نے! [توقف] کیا کیا کہہ رہی تھیں!

بسنتی۔ اب کیا بتاؤں بی بی

جنک۔ (فکر و تردد سے) بتا بھی نا۔ دیر ہو رہی ہے۔

بسنتی۔ یہی کچھ وکرم صاحب کی بابت۔

جنک۔ [بے چینی اور گھبراہٹ سے] بڑی بے وقوف ہے۔ ٹھیک طرح بتا۔

بسنتی۔ یہی کہ بی بی کا ساما خوج وکرم . . .

[خاموش ہو جاتی ہے۔ جنک پاگلوں کی طرح ہنستی ہے]

جنک تو ٹھیک کہا۔

بسنتی۔ بی بی۔

جنک۔ ہاں اور کچھ

بسنتی۔ بی بی ایک بات تو وہ جو فیروزپور روڈ پر رہتی ہیں نا۔

جنک۔ سمجھ گئی۔

بسنتی۔ انہوں نے ایک بار پوچھا تھا کہ کیا بات ہے سنا تمہارے ہاں وکرم صاحب بہت آتے جاتے رہتے ہیں۔

جنک۔ پھر؟

بسنتی۔ میں چپ ہو رہی۔

جنک۔ [سوچ میں ہوں] [اٹھتی ہے]

بسنتی۔ اور جو ساتھ والی کوٹھی میں رہتی ہے اس کا بیرا ایک دن کہہ رہا تھا کہ کس کے پاس رہتی ہے وہ تو بدنام ہو رہی ہے۔

جنک۔ [یہ سن کر پھر پاگلوں کی طرح ہنستی ہے اور بیٹھ جاتی ہے] بدنام ہو رہی ہے! ہاں ـــ بسنتی جو کچھ تو نے سنا وہ بالکل ٹھیک ہے وکرم صاحب مجھے خرچ دیتے رہے ـــ وہ بھی ٹھیک ہے۔

بسنتی۔ [حیران ہو کر] بی بی!

جنک۔ حیران کیوں ہو گئی۔ سن بسنتی تئیس چوبیس سال کی تھی جب میں بیوہ ہو گئی تھی۔ ڈولی پانچ سال کی تھی اس وقت۔ میری اپنی عمر کیا تھی گھر والے چاہتے تو میری دوسری شادی ہو سکتی تھی مگر یہی لوگ جو اب میری جوتیاں چاٹتے ہیں۔ ملتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں۔ اس بات کے خلاف تھے۔

بسنتی۔ بی بی سٹیشن نہ جاؤ گی؟

جنک۔ [جیسے کہ سنا نہیں] میں گیند کی طرح پھینکی جانے لگی کبھی سسرال تو کبھی میکے۔ بیوہ کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ تو جانتی ہی ہے

بسنتی۔ ہاں بی بی

جنک۔ لڑکی کی زندگی تباہ ہو رہی تھی۔ مجھے الگ ہونا پڑا۔

بسنتی۔ [ہمدردانہ] ہاں بی بی

جنک۔ وکرم صاحب جس مقصد کے لئے مجھے خرچ دیتے رہے وہ نہ کبھی پورا ہوا۔ اور نہ ہو گا۔

بسنتی۔ [سر جھکا کر] جانتی ہوں بی بی۔

جنک۔ ہاں ـــ تجھے میرے پاس آئے کتنے سال ہو گئے؟

بسنتی۔ اب یہی بی بی۔ کیا بتاؤں ـــ اُسی سال آئی تھی جب ڈولی کو منے

مسوری گئے تھے۔

جنک۔ ہاں یہ تو قریباً تین سال کی بات ہے۔

بسنتی۔ تین سال ہی ہوں گے یا تین سال اور شاید دس دن۔

جنک۔ کبھی تو نے بھی میرے متعلق ایسی ویسی بات دیکھی۔

بسنتی۔ نہ بی بی۔ میں کیوں جھوٹ بولوں۔ لوگوں کا کیا کہنا ہے۔ وہ تو کسی کو کھاتا پیتا دیکھ کر جی نہیں سکتے ـــ بی بی ایک بات کہوں؟

جنک۔ ضرور

بسنتی۔ بی بی سگرٹ نہ پیا کرو۔

جنک۔ دیکھ تجھے بتاؤں وکرم کو خوش کرنے کے لئے کون سے سگرٹ پیتی رہی ہوں۔

[اٹھ کر صوفے کے پیچھے سے سگرٹ کے دو ڈبے اٹھاتی ہے ایک ڈبے میں سے ایک سگرٹ نکال کر اس کا کاغذ کھول دیتی ہے]

دیکھ ذرا۔ یہ تمباکو ہے کہ کوٹے ہوئے سوکھے پتے خود بناتی رہی ہوں اور جو یقین نہ آئے تو جا میری الماری میں دیکھ آ۔ ایک ڈبے میں تجھے کوٹے ہوئے پتے ملیں گے۔

بسنتی۔ بی بی دیر ہو رہی ہے۔

جنک۔ سن اب میں چاہتی ہوں کہ وکرم کو ڈولی کے آنے کا پتہ نہ لگے کوشش یہی ہو کہ وہ یہاں نہ آنے پائے۔

بسنتی۔ اور بی بی جو وہ زبردستی اندر گھس آئے

جنک۔ سن تو سہی۔ لیڈی دت کا چھوٹا بھتیجا ولائت سے آیا ہے میں چاہتی ہوں اور غالباً لیڈی دت نے بھی چائے پر اسی لئے بلایا ہے کہ دونوں کی منگنی ہو جائے۔ اگر یہ ہو گیا یا ہونے کی امید ہوئی تو ڈولی کو میں کہیں بھیج دوں گی۔ سُنا ـــ اس کے متعلق ایک لفظ بھی تیرے منہ سے نہ نکلے۔

بسنتی۔ دیر ہو رہی ہے۔ گاڑی تو آ بھی گئی ہو گی شاید۔

جنک۔ تو نے مجھے پہلے کیوں نہ یاد دلایا

بسنتی۔ یہ لو میں تو کب سے کہہ رہی ہوں کہ دیر ہو رہی ہے

[موٹر کے کھڑے ہونے کی آواز]

جنک۔ اب یہ کون ہو سکتا ہے [جانے کی تیاری کرتی ہے] میں نہیں مل سکتی [دروازے کی طرف بڑھتی ہے] وکرم صاحب اگر آئے تو کہہ دینا نہ معلوم کدھر گئی ـــ

[وکرم، اُدھیڑ عمر کا ہوتا ہے۔ عمر پچاس سے ذرا اوپر۔ گو اتنا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر ہو سکتا ہے۔ جنک وہیں کی وہیں کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس گھبراہٹ میں ہاتھ سے منی بیگ نیچے گر جاتا ہے]

وکرم۔ [زمین سے بیگ اٹھا کر دیتے ہوئے] کہنے کی ضرورت ہی کیا۔ میں خود جو آ گیا۔

جنک۔ اور بسنتی میں شام تک واپس نہیں آؤں گی۔ دروازہ اندر سے بند کر لے۔

[جنک جانے کی کوشش کرتی ہے]

وکرم۔ کہاں جا رہی ہو جنک۔ آخر اتنی جلدی ہی کیا ہے [بازو پکڑتا ہے۔ جنک چھڑا کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے اور بسنتی کی طرف دیکھتی ہے۔ بسنتی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے]

جنک۔ وکرم مجھے ایک جگہ جانا ہے اور بہت ضروری۔ کل نہیں آ سکتے!

وکرم۔ مگر جنک یہ تو بڑا عجیب طریقہ ہے گھر سے نکالنے کا۔

جنک میں نے تو صرف درخواست کی ہے۔

وکرم۔ [جنک کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر] خیر دو منٹ تو بیٹھو۔ میں کتنی دور سے آیا ہوں

جنک۔ نہیں وکرم [ایک طرف ہو جاتی ہے]

وکرم۔ جنک! [صوفے پر بیٹھ جاتا ہے]

جنک۔ بس میں کہہ چکی۔

وکرم۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ آج فیصلہ کر دو گی کہ تم میرے ساتھ کلکتہ جا رہی ہو یا نہیں۔

جنک۔ مگر آج نہیں۔ یہ فیصلہ پھر بھی ہو سکتا ہے۔

وکرم۔ مگر میں تو پرسوں جا رہا ہوں۔

جنک۔ تم جا سکتے ہو [دروازے کی طرف بڑھتی ہے]

وکرم۔ خوب! لڑکی اب پڑھ چکی تو آنکھیں ہی بدل گئیں۔

جنک۔ [مڑ کر شکی نگاہوں سے دیکھتی ہے] وکرم!

وکرم۔ ڈولی آ رہی ہے نہ آج۔ آؤ میں سٹیشن لے چلوں [زور سے ہنستا ہے]

جنک۔ [پریشانی سے برا حال ہو جاتا ہے۔ جاتے جاتے رک جاتی ہے۔ میز کے قریب آ کر] اوہ —— وکرم

وکرم۔ [ایسی مسکراہٹ جس سے شرارت نظر آتی ہو] ابھی ابھی لیڈی دت مارکیٹ میں ملیں [کنکھیوں سے جنک کی طرف دیکھتا ہے] پہلے تو فوٹو کی تعریف کی گئی پھر [اٹھتا ہے] بتایا گیا کہ آج ڈولی آ رہی ہے۔

جنک [دانت پیس کر] ہاں آ رہی ہے۔

وکرم [اس کی طرف جاتے ہوئے] پھر مجھ سے کیوں چھپایا گیا؟

جنک۔ میں یہی چاہتی تھی۔

وکرم۔ [اور آگے آ کر پُرمعنی انداز میں] اور اب؟

جنک۔ میں التجا کرتی ہوں پاؤں پڑتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔

وکرم۔ یہ درخواست پہلے کیوں نہ کی گئی۔ آخر مجھے پلیگ یا ہیضہ تو ہو نہیں گیا کہ تم مجھ سے کوسوں دور بھاگنے کی کوشش کرو۔

جنک۔ کاش کہ تمہیں آج پلیگ یا ہیضہ ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری لڑکی . . .

وکرم۔ [بات کاٹ کر] تم نہیں چاہتی کہ تمہاری لڑکی مجھ سے ملے۔ تم نہیں چاہتی کہ تمہاری لڑکی کو یہ معلوم ہو کہ اس کی تعلیم کا خرچ وکرم دیتا رہا ہے۔ تم نہیں چاہتی کہ تمہاری لڑکی کو یہ پتا لگے کہ اس کی ماں وکرم سے محبت کرتی رہی ہے۔

جنک [چلا کر] یہ جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے

وکرم۔ [جھپٹ کر جنک کے بازو پکڑ لیتا ہے] مگر وکرم چاہتا ہے کہ ڈولی کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس کی ماں سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ . . . .

[جنک ہاتھ چھڑا کر پستول اٹھا کر اس کی طرف کر دیتی ہے]

جنک۔ ایک لفظ بھی اور نہیں۔ ایک قدم آگے بڑھایا تو گولی سے اُڑا دوں گی

وکرم۔ [قہقہہ لگا کر] کاش کہ عورتوں میں اتنی ہمت ہوتی۔

جنک۔ آج تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

وکرم۔ آؤ جنک آؤ۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو آج۔

جنک۔ میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی —— خبردار جو آگے بڑھے

وکرم۔ تمہاری پرورش کرنے کا مجھے یہ صلہ مل رہا ہے۔

جنک۔ میں تمہارے احسانوں سے دبی ہوئی ہوں وکرم۔ لڑکی نہ ہوتی تو میں بھیک مانگ کر بھی گزارہ کر سکتی تھی۔ اب مجھ پر تم زندگی کا سب سے بڑا احسان کرو گے۔ اگر تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔

وکرم۔ اب ان التجاؤں کا مجھ پر کچھ اثر نہ ہو گا۔ میں کافی بے عزتی کروا چکا ہوں۔



وینس کی جلوہ گا:

جنک۔ تو میں تمہیں ایک منٹ اور دیتی ہوں۔

وکرم۔ اور اس کے بعد؟

جنک۔ یہ پستول اور تم!

وکرم۔ [میز کی طرف دیکھ کر] آخاہ آج فوٹو بھی ندارد۔

جنک۔ [انگیٹھی کی طرف اشارہ کرکے] ہمیشہ کے لئے اور اب میں تمہاری منحوس شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تم شاید بھول گئے کہ جب تم بہت قریب ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے تو تمہارے منہ کی بدبو سے بچنے کی خاطر میں مصنوعی سگرٹ جلالیا کرتی تھی اور . . .

وکرم۔ [غصے میں] خاموش۔ کمینی۔ خودغرض . . .

جنک۔ اور کچھ؟

وکرم۔ بیسوا ——

جنک۔ آہ . . . [پستول ہاتھ سے نیچے گر جاتا ہے۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیوار کے سہارے کھڑی ہو جاتی ہے۔ وکرم آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیتا ہے اور جنک کا بازو پکڑ کر صوفے کی طرف لاتا ہے]

وکرم۔ مجھے معاف کرو جنک

[جنک ہاتھ چھڑا کر اندر کے دروازے کی طرف بڑھتی ہے]

جنک۔ بسنتی —— بسنتی۔

وکرم۔ جنک کیا کر رہی ہو۔ اب نوکروں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہو

[بسنتی داخل ہوتی ہے]

جنک۔ دیکھ بسنتی۔ تو دیکھ رہی ہے نا۔ وکرم کے ہاتھ میں پستول یہ مجھے مارنا چاہتا ہے۔ تو میری گواہ ہوگی۔ پولیس کو ٹیلیفون کر جلدی کر۔

[بسنتی خاموش رہتی ہے]

وکرم۔ جنک!

جنک۔ دیکھ کیا رہی ہے۔

[بسنتی ٹیلیفون کی طرف بڑھتی ہے۔ ٹیلیفون کا رسیور اٹھاتی ہے وکرم بھاگ کر اس کی طرف جاتا ہے]

وکرم۔ بے وقوف عورت۔

[جنک پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ وکرم پستول میز پر رکھ کر رسیور چھینتا ہے۔ جنک پستول اٹھا لیتی ہے]

جنک۔ [پستول پھر وکرم کی طرف کرتے ہوئے] بسنتی۔ دوڑ۔ برآمدے میں کھڑی ہو جا۔ ڈولی بے چاری اکیلی تانگہ میں آرہی ہوگی سات سال کے بعد لڑکی واپس آئے اور ماں سٹیشن پر نہ جائے۔ ڈولی کو اندر مت آنے دیجیو۔ اگر تیری کوئی سہیلی ہے تو بہانے سے ڈولی کو اس کے ہاں لے جا۔ کہہ دے جنک یہاں نہیں۔ ہسپتال میں ہے۔ بیمار ہے۔ مر گئی ہے۔ سن رہی ہے نا۔ دوڑ۔ بھاگ۔

[بسنتی باہر جاتی ہے]

وکرم۔ جنک تمہیں کیا ہو گیا۔ پاگل۔

جنک۔ اب تمہارے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔

وکرم۔ [آگے بڑھتا ہے] جنک!

[بسنتی گھبرائی ہوئی اندر آتی ہے]

بسنتی۔ ڈولی آگئی۔

جنک۔ کیا! لے جا۔ لے جا اسے۔ اندر مت آنے دے۔ اُف . . .

[اندر بھاگ جاتی ہے۔ بسنتی باہر جاتی ہے۔ وکرم ادھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے۔ اندرونی کمرے کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ بسنتی گھبرائی ہوئی پھر واپس آتی ہے۔ ڈولی داخل ہوتی ہے۔ پندرہ سولہ سال کی خوبصورت لڑکی۔ بال کھلے ہوئے۔ اندر سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے]

وکرم۔ [اندر کی طرف بھاگتے ہوئے] اوہ —— جنک

بسنتی۔ کیا! ہائے بی بی . . . [اندر بھاگ جاتی ہے]

[ڈولی حیران و پریشان خوف سے کمرے کے چاروں طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

پردہ

(اس ڈرامے کے نام فرضی ہیں)

اندر لال داس

تجلیاتِ اکبر

ہے حسن و عشق سے تمہیں پرہیز کیوں نہ ہو! — اکبر دروغ مصلحت آمیز کیوں نہ ہو!
یہ حسن ہو تو عشق جنوں خیز کیوں نہ ہو — یہ لطف ہو تو آتش دل تیز کیوں نہ ہو
کچھ بھی جو ہو اسے ہوس و عشق میں تمیز — اغیار سے وہ شوخ کم آمیز کیوں نہ ہو
اس دل کو اپنے شیوۂ تمکیں پہ ناز ہے — اس کی طرف نگاہِ جنوں خیز کیوں نہ ہو
ساقی بلائے جاں ہے جگر تفتگی سے مجھے — میرے لئے شراب سم آمیز کیوں نہ ہو

حلقہ بگوش حسرتؒ شیریں سخن ہوں میں
اکبر مرا کلام شکر ریز کیوں نہ ہو

غم جو بھی ملے دوست سے سہنا ہی پڑے گا — راضی بہ رضا عشق میں رہنا ہی پڑے گا
اے دل غم الفت کے جو انداز یہی ہیں — خوں ہو کے تجھے آنکھ سے بہنا ہی پڑے گا
گو لائق اظہار نہیں حال ہمارا — وہ مائل پرسش ہیں تو کہنا ہی پڑے گا

جلال الدین اکبر

اکبرؒ بجناب کے حسرت موہانی بھیجے جاتے ہیں۔

ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات

متمدن قومیں ایک دوسرے سے میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتیں سب قوموں کے جغرافی تعلقات۔ زمین کے خواص اور آب وہوا ایسی چیزیں ہیں جو یکساں نہیں ہوا کرتیں۔ اس وجہ سے ان کے ہاں کی پیداوار اور صنعت کاری بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں اول اول اجناس یعنی ملک کی پیداوار اور کاشت کاری کی چیزوں کی ادلا بدلی کرتی ہیں اور یہ ادلا بدلی کسی نہ کسی شکل میں قایم رہتی ہے خواہ وہ تمدن کی کسی منزل میں ہوں۔

یہ میل جول یا مبادلہ جب مادی دنیا سے نکل کر قوموں کی شائستگی اور تہذیب کی ترقی کی نسبت سے ذہنی مبادلہ کی شکل اختیار کرتا ہے تو بین الاقوامی کلچر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسی کلچر اور اس کے بین الاقوامی تاثر سے متعلق چند باتیں آپ کے پیش کی جائیں گی۔

کلچر کو تہذیب یا سبھیتا وغیرہ کوئی نام دیں لیکن یہ لفظ اپنی اصلی حیثیت ہی میں اتنا جامع واقع ہوا ہے کہ اُسے چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا اس لئے یہاں اسی لفظ سے کام لیا جائے گا۔

قدیم آریہ لوگ جب اس ملک میں آئے تو انہوں نے یہاں ایک اچھی اور ترقی یافتہ تہذیب پائی جس کے آثار اب ہڑپہ اور موہن جڈارو میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ مفتوح تھے اور ہمارے آریہ بزرگ فاتح۔ لیکن بہتر ہتھیار اور جنگ کے فن کی اعلیٰ قابلیت قومی میل جول اور کلچرل ارتباط کو روک نہ سکی۔ دیو بانی اب وہ بانی نہ رہی جس کو مقدس وید کی زبان ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ زبان میں تبدیلیاں دیکھتے ہوئے رشی پانِنی نے ضروری سمجھا کہ اس مقدس زبان کی حفاظت اس کی تنظیم سے کرے۔ اس ضرورت نے اشٹا دھیائی کی شکل اختیار کی۔ اس کے ساتھ آرین فاتحوں کے لئے اپنے مفتوحوں کا جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا اس کا ثبوت وررُچی کی پراکرت گرامر جیسی کتابیں ہیں۔ بالکل ایسی ہی ضرورت پچھلی صدی کے اوائل میں انگریزوں کو ہندوستان میں پیش آئی جسے گلکرسٹ اور فاربس وغیرہ کی ہندوستانی گرامروں نے پورا کیا۔

کلچر کے بین الاقوامی عمل کے سلسلے میں آپ کے سامنے انسان کی تاریخ کے دفتر کھولنے بے سود ہیں یہیں گفتگو کو وطن مالوف تک ہی محدود رکھوں گا۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا تاریخی اعتبار سے درست ہو گا کہ ہندوستان میں تین عظیم الشان تصادم یا کہئے اتصال کم وبیش پختہ کلچروں کے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے اور اسی کو کافی سمجھنا چاہیئے۔ دوسرا تصادم یا اتصال وہ ہے جو مسلمان فاتحوں کے اس ملک کو اپنا وطن بنا لینے کے وقت سے ظہور میں آیا تیسرا تصادم وہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی پروگرام ترک کر دینے اور ملک گیری کے پروگرام کو سامنے رکھ لینے سے وقوع پذیر ہوا۔ یہاں اس نمبر۲ کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس بارے میں مسلمانوں کے یہاں آنے پر جو کچھ ہوا اس کی نظیر ہم کو یونان میں اہل روما کی آمد میں بہت کچھ ملتی ہے۔ یہ واقعہ اب تشریح اور استدلال کا محتاج ہے کہ سندھ میں عربوں کی آمد سے قطع نظر جو مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ آئے اور یہیں کے ہو گئے وہ کون تھے؟ کس تہذیب وتمدن کے علمبردار اور کس کلچر سے بہرہ ور تھے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ان نصابوں میں نہیں ملے گا جو سکولوں اور کالجوں میں ہمارے نوجوانوں کے ذہن پر لادے جاتے ہیں۔ بحث اس سے نہیں کہ وہ سلجوقی تھے یا غوری پٹھان۔ چنگیزی مغل تھے یا کون؟ بحث اس سے ہے کہ وہ کونسی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے! محض مسلمان یا قبیلہ کا نام لے دینا اصل بحث پر روشنی نہیں ڈالتا۔ تاریخ اعظم کے ملاحظہ سے واضح ہو گا کہ جو مسلمان شمال مغربی

دروں کے راستے سے ہندوستان میں آئے۔ وہ خواہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں ایران کی تہذیب اور کلچر کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی اور ان کا تخیل اس کلچر سے متاثر تھے جس کا ابتدائی خاکہ شاہنامے میں پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایرانی کلچر اور لٹریچر کا رنگ ان کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا تھا اور چونکہ ایرانی اور انڈو آرین یعنی ہندوستان میں آنے والے آریہ۔ ایک ہی تنے کے دو ٹہنے تھے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں اس وجہ سے ان مسلمانوں کی کلچر اور ہندوستانیوں کی کلچر میں بہت کچھ ہم آہنگی اور اپنا پن تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان رہ کر اس خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہو گئے کہ رواداری اور یکجہتی کا اوتار بن گئے۔ یہ جتنے فتنے اٹھانے اور فتنے جگانے کے ہیں کہ مفتوح اپنے فاتحوں پر غالب آ گئے یا یہ کہ فاتح اپنی فاتحانہ خود اعتمادی اور انفرادیت سے محروم ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں کلچروں کے مزاج کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ ان کا رو بر و ہونا ہی ارتباط کا قایم ہو جانا تھا۔ یہ ارتباط نگاہ اولیں کی اشتیاق انگیزی سے کم نہ تھا۔ کلچروں کے اس ارتباط کے کارنامے ایک نہیں دو نہیں بہت سے اور گوناگوں ہیں۔ قوموں کے باہمی تعلقات کے ارتقا میں یہ ہوا کرتا ہے کہ پہلے ایک کیفیت اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اہلِ غرض اس کو سیاسی رنگ دے دیتے ہیں اور اس سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ کلچرل ارتباط پہلے ناگزیر صورتوں میں اپنے آپ پیدا ہوا۔ بعد میں اس سے سیاسی استفادہ کیا گیا۔ آپ ادبی زاویہ نگاہ سے اس مسئلے پر نظر ڈالیں اور فرمائیں کہ نئی زبانیں اور لٹریچر جو اس کلچرل ارتباط سے پیدا ہوئے کیا اس کے متعلق کسی کا معہود ذہنی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی کہا جا سکتا ہے؟ مہابھارت یا گیتا وغیرہ کے ترجموں کی نسبت جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے ایسا گمان ہو سکتا ہے۔ لیکن خانِ خاناں رحیم اور رس خاں کا ایسا اچھا ہندی کا شعر کہنا اور ملک محمد جائسی کا ہندی میں پدماوت تصنیف کرنا کونسی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی بتایا جائے گا۔ ایک طرف یہ ہوا تو دوسری طرف ٹیک چند بہار مخلص اور وارستہ نے وہ جید کتابیں فارسی میں لکھیں جو ایران میں سند مانی گئیں۔ اگر یہ ہندو یا مسلمان اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے تو دو کلچروں کا ارتباط۔ یہ فقرہ ہی بے تھا۔ مگر یہاں ایسا ہوا ہی نہیں۔

لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوا کرتا ہے۔ خاصکر قومی اور اجتماعی معاملوں سے متعلق ان کی یادداشت بہت سست ہوا کرتی ہے۔ اس صورت میں کج بحثی کی آڑ لی جاتی ہے۔ خوف دلایا جاتا ہے کہ اگر ان میں اور ہم میں ارتباط ہو گیا تو ہماری ملی انفرادیت اور دھارمک سوتنترتا پھر کہاں! ہم کیوں اپنی قدیم قومی روایات گنوا بیٹھیں! میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہوا نہیں۔ سنئے جب کلچرل ارتباط کی تنظیم نسل، زبان اور قومیت کے محدود احاطہ سے باہر عمل پیرا ہو تو اخلاقی اور ملی معیار سے متعلق یہ نتیجہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ انسانوں کے ذہن غیر مقامی ہو جاتے ہیں یعنی ان کے شعور کا نفسیاتی محور وسیع اور زاویہ نگاہ فراخ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگلے وقتوں میں ایسا ہوا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے ملی تو ان میں سے ایک اپنی قومی انفرادیت کھو بیٹھی۔ لیکن یاد رکھئے اور خوب یاد رکھئے کہ یہ نتیجہ تھا مذہبی میل کا۔ مذہب کے نقطۂ نظر بھی اور چیزوں کی طرح اب بدل گئے ہیں۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہیں کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ:-

لبیں بڑھ رہی ہوں نہ ڈاڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

اور کتنے ہندو ہیں جو اونچے گلے سے کہیں کہ ہندو وہ ہے جو غیر ہندو ہی نہیں بلکہ بعض ہندوؤں سے بھی روٹی بیٹی کا پرہیز رکھے۔ وہ دہلی کا ایک مسلمان ہی تو تھا جس نے اس کا اعلان کیا کہ معرکۂ کربلا کبھی واقع ہوا ہی نہیں اور وہ ایک ہندو عالم ہی تو تھا جس نے یہ لکھا کہ "شکھا سوتر" کا ذکر وید میں کہیں نہیں آیا۔ قصہ مختصر اب نہ ہندو وہ ہندو ہیں جن کا دھرم کچے دھاگے کی مانند ہو اور نہ اب مسلمان وہ مسلمان ہیں جو غیر مسلم سے میل جول یا تشابہ کی علت میں کفر کے فتوے کے مستوجب ہوں۔

آج کل کا کلچرل اتحاد زیادہ تر مختلف روایات کا میل ہوا کرتا ہے۔ روایات کا بہترین نتیجہ ان کا باہمی آزادانہ ملاپ ہے۔ عہدِ حاضر میں کلچروں کا باہم تبادلہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں کہئے سمونا ایسا ہے جیسے ایک پہاڑی نالے سے نہر نکال کر میدانی علاقے کو سیراب کرنا۔ وہاں زمین کم تھی پتھر تھے یا پانی۔ اس لئے زراعت برائے نام تھی۔ جبکہ یہاں زمین زیادہ تھی اور پانی برائے نام۔ امیدیں یا بادلوں کے رحم کی منتظر رہتی تھیں یا لہو پسینہ ایک کر کے چپہ بھر زمین ہل کے سپرد کی جاتی تھی۔ اب یہ ہوا کہ ان کو غلہ مل گیا اور ان کو پانی۔ بین الاقوامی کلچرل

اتحاد کیا ہے۔ دو قوموں کا ذہنی اور اخلاقی لین دین۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوانی روایات اور کلچر میں کچھ خوبیاں ہیں تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ ان خوبیوں کو عام کریں۔ ڈبیا میں بند کر کے نہ رکھیں اور اسی طرح اسلامی روایات اور کلچر میں اگر کچھ محاسن ہیں تو وہ انہیں عالمگیر بنائیں اور مقفل و محدود کر کے نہ رکھ چھوڑیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ تبصرہ اور موازنہ سے کام لیا جائے۔ لیکن یہ کام محض تخیل سے سر نہیں چڑھ سکتا۔ اس کے لئے طبع سلیم اور جرأت عمل درکار ہے۔

آپ مانتے ہوں تو اور بات ہے ورنہ یہ کام ہو چکا ہے۔ ہم ہندو مسلمانوں کو خصوصی طور پر اور کل برادران وطن کو عام طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ ہمارے بزرگوں کی دیدہ وری کی بدولت ہو چکا ہے۔ اسی آپ کے وطن میں جذبہ لگا اور پھر منسوخ ہوا۔ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قوموں کے رسم و رواج اور طرز ماندبود اور اُن کی ذہنیت بدلتی رہتی ہے۔ اساسی اعتقاد جوں کا توں رہتا ہے لیکن اس کے نفسیاتی ذریات کی پرواز بدل جاتی ہے۔ انسانی شعار کا اصلی جوہر خلوص اور راست بازی ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کا جوہر موالات اور رواداری ہے اور ان جوہروں کو جلا دینے میں کلچرل اتحاد اور ادبی و لسانیاتی ارتباط کی تشکیل ہوا کرتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے اور آپ کے قول میں جنبہ داری یا عصبیت کا لوث بتایا جائے اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک یورپین مسٹر جوڈ کی تازہ تصنیف "دی ہسٹوری آف انڈین سویلیزیشن" سے استفادہ کروں لکھا ہے:۔

"قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے تخیل کا اسلامی خیالات سے تصادم ہوا ہندوستان میں مختلف نظاموں کی یہ مڈبھیڑ دیسی کلچر کے غلبہ میں صورت پذیر ہوئی اور اسلامی ذہنیت میں کچھ ہندوانیت جذب ہو گئی۔" صفحہ

یہ تحقیق ایک غیر ہندو اور غیر مسلم کی ہے۔ اس غیریت کے باوجود بھی ممکن ہے کہ اس مصنف کی تحقیق اور دریافت ذاتی پسند اور شخصی رجحان کا رنگ لئے ہوئے ہو جس سے وہ بے خبر رہا۔ یہ کچھ ہی ہو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاثر کے غلبہ سے قطع نظر ہوا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت فکر و تخیل باوجود ان کے مذہبوں کے اختلاف کے شیر و شکر ہو گئی۔ غلبہ ہندوانہ کلچر کا رہا یا اسلامی کا یہ امر تنقیح طلب نہیں نہ اس کا اثر اس تاریخی نتیجے پر پہنچتا ہے جس کی مولود ہماری ہندو مسلم یا ہندیرانی کلچر ہے۔

اس کلچرل ہم آہنگی میں جو حصہ ہماری ورنیکولر یعنی دیسی زبانوں اور ادب کا ہے۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ چنڈی داس۔ چیتنیہ۔ ودیاپتی کبیر۔ نامدیو۔ تکارام۔ نرسنگھ مہتا اور گورو نانک کے نام اس ضمن میں ذکر کے قابل ہیں ایسے اور بہت سے بزرگوں کے نام آپ کو بھگت مالاؤں میں ملیں گے۔ ان کی تلقین اعتقادی فراخدلی سے شروع ہو کر کلچر اور معاشرت کی وسیع نظری میں نتیجہ پذیر ہوئی۔ اردو یا ہندوستانی۔ اپنی تنظیم اور تدوین سے پہلے اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ کرتی رہی اور اب تک کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اردو والوں نے اپنا کوئی پینتھ یا مٹھ قایم نہیں کیا لیکن وہ کام کر گئے جو قوموں کے کلچرل اتحاد میں بے نظیر ہے انہوں نے دیر و حرم اور شیخ و برہمن کو ایک جگہ لا بٹھایا ان کا فکر استقرائی تھا اس لئے معاشرت اور روزانہ زندگی پر چھا گیا۔ یہ بدیہی امور واقعہ ہیں جو تشریح کے محتاج نہیں عمارات کی ملکہ یعنی تاج محل میں ہندو ہاتھ کہاں کہاں نمایاں ہے۔ پراکرت اور اپ بھرنش بھاشاؤں کے لغات پر کیا اثر ہوا مغل یعنی ایرانی نقاشی اور راجپوت پینٹنگ کے باہم کیا اخذ و ترک ہوا۔ ہمارے قدیم سنگیت کے موسیقی میں کیا جدت آفرینی یا کہہ دیجئے بدعتیں ہوئیں اور کتنی نئی سنکیرن راگنیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ اور ایسی بہت سی چیزیں ہند مسلم کلچروں کے ارتباط اور اتحاد کے پھل ہیں ان میں سے ایک ایک شق ایک علیحدہ دفتر چاہتی ہے۔ مفکرین اور شاعروں نے جو اس ارتباط کے سب سے بڑھ کر علمبردار تھے وہ کام کیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مثال کے طور پر متقدمین اور متوسطین اور عہد حاضر کے بعض شعرا کے کلام سے استفادہ بے محل نہ ہوگا۔

ولی مرحوم کا قول ہے۔

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا

حضرت آبرو مغفور نے فرمایا ہے ؎

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبیح کرے فراموش زنار بھول جاوے

میر تقی کا قول ہے ؎

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

منشی بادھو رام جوہر کا ارشاد ہے ؎

دیر و مسجد میں نہیں موقوف کچھ اے غافلو
یار کو جس جا سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

استاد ذوق کا قول ہے ؎

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے جھگڑے [illegible]

حضرت امیر مینائی نے یہ تلقین کی ہے ؎

شرب صہبا کل ہوا ہے زاہد
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے

فصیح الملک داغ مرحوم کا قول ہے ؎

سر نیاز سلامت رہے پئے تسلیم
نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا بت!

چکبست نے یہ فیصلہ کیا ہے ؎

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

حضرت جلیل مانک پوری نے فرمایا ہے ؎

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر
کیا کہیں گے تمہیں سب گبر و مسلماں والے

ثاقب بدایونی کا مشاہدہ ہے ؎

تمہارا نور بالا ہر جگہ اللہ والوں میں
یہی ہے حق حرم میں ہے یہی ہے بت شوالوں میں

اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جائے گا۔ نہ اس سے بحث کی جائے گی کہ مسلمان اور ہندوؤں کے ان اور ایسے ملفوظات نے جمہور کی ذہنیت کو کیا رنگ دیا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ شاعر اپنی قوم کی زبان اور اس کی معاشرت کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ صرف دو شعر اور پیش کروں گا۔ پیشتر اس سے کہ موضوع کے اور شعبوں پر نظر ڈالوں۔ ہندو شاعر نے اس کا دعوے کیا ؎

ذات پات پوچھے نا کوئی
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

یہ دعوے دلیل کا محتاج نہیں۔ مسلمان شاعر نے اعلان کیا ؎

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

آپ نے کلچرل اتحاد کے کارنامے ملاحظہ فرمائے۔ آپ نے اسلاف کے شاہکاروں کو اپنے حافظہ میں ٹٹولا۔ آپ ہندو مسلمان حضرات میرے وطنی بھائی جس طرح رہتے ہیں کیا اس کے ملاحظہ کے لئے آپ کو کسی شیش محل یا آئینہ خانہ میں لے جاؤں۔ معاشری صلاحیت۔ یہ یکجہتی۔ یہ کلچرل اتحاد۔ یہ سوشل یگانگی اور یہ رواداری کسی تعزیرے یا ٹنکار کسی شاہی حکم یا فتوے سے وقوع میں نہیں آئی۔ یہ نتیجہ ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے مدت العمر کے حسن عمل کا اور جلب منفعت اور [illegible] کے اصول کا۔ جماعتوں کا طرز عمل نتیجہ پیدا کرنے کو ایک خاص مدت اور استقلال چاہتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا کئی نسلوں کی انتھک اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جب ہی تو انگلستان کے مفکروں اور مورخوں کو یہ کہنا پڑا جس کی تفصیل بالاجمال آگے پیش کی جاتی ہے۔ سنئے یورپ کی تازہ ترین تصنیف آپ کی نسبت رائے دیتی ہے:

"ہندوستان کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ زاویہ نظر پر نسلوں کے ملاپ کے جو اہم نتیجے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اولین نتیجہ اساسی یگانگی یا یونٹی ہے جو اس سے کہیں زیادہ بین اور مستقل ہے جو ایک ہی جغرافی رقبے میں قربت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یورپین یعنی اہل فرنگ بھی تو ایک ہی جغرافی رقبے میں اکٹھے رہتے ہیں جو رقبہ ہندوستان سے بہت مختلف نہیں ہے لیکن جیسا کہ وہ جنگیں جنھوں نے یورپ کی تاریخ کو بدنام کر دیا ہے اور وہ تنازعے اور باہمی رقابت کے جھگڑے جو اس وقت لیگ آف نیشنز کی کمر توڑ رہے ہیں۔ صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ یورپ کے باشندے اتفاق اور یکجہتی کے احساس کی اس اثر پذیری سے محروم ہیں جس کا امتیاز ہندوستان کے باشندوں کا حصہ ہے۔ قصہ مختصر ہم اس معنوی صحت کے ساتھ ایک یورپین کا ذکر نہیں کر سکتے جس کے ساتھ ہم ایک انڈین کا ذکر کر سکتے ہیں جو رنگ جاتی اور مذہب کے اختلافوں کے باوجود تمام دوسرے اہل ہند کو اپنا ہم وطن اور ہمجولی سمجھتا ہے اور ہندوستان کو اپنا وطن۔"

(اے سٹوری آف انڈین سویلائزیشن ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۳)

آپ کے ہموطنوں کے حق میں یہ قطعی رائے اور موازنہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔ یہ ایسی کلچرل یونٹی کا ظہور ہے جس نے ہماری معاشرتی اور سیاسی قسمتوں کو ایک کر دیا ہے لیکن معاف

نے۔ واقعات سے چشم پوشی اور سہل انگاری ناممکن ہے۔

کچھ بات تو ہے جس نے مدراس کی اسمبلی کو اور اس کے ارباب ست و کشاد کو ملّی مناقشوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی تحریک کی۔ ئی بات تو ہے جس نے ملک کے دوسرے سرے میں پنجاب کی اسمبلی اور ں کے سرگرم دستورِ اعظم کو یونٹی کانفرنس کی ترغیب دی جس نے خلوص رجوش سے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ چند واقعات ہیں جن د کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا جن سے کوئی صحیح دماغ رکھنے والا لکار یا بے اعتنائی نہیں کر سکتا۔

اب کیا یہ سمجھا جائے کہ "ہمارا وطن" کا یا پلٹ ہو گیا اور صدیوں کے کٹے کرائے پر پانی پھر گیا جیسا کہ فارسی کا شعر ہے۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

کوئی حزینت کا پجاری یہ کہے تو کہے لیکن کیفی ایسا نہیں کہہ سکتا آپ اس کے اعتقاد میں اس کے ہمنوا ہوں گے جو یہ ہے

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشانست
مے و خمخانہ با مہر و نشانست

اپنا قول تو یہ ہے۔

قیس کا تجھ میں جنوں، جذبۂ منصور نہیں
ورنہ منزل گہِ دلدار تو کچھ دور نہیں

جو عوارض اس وقت ہمیں درپیش ہیں وہ اپنی نوعیت میں اگلے وقتوں کے عوارض اور ماحول سے مختلف ہیں۔ ہندوؤں اور ہندوؤں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے، مسلمانوں اور مسلمانوں کے، سکھوں اور سکھوں کے باہمی تعلقات جیسے کچھ عریاں واقعات ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ہماری عہدِ حاضر کی تواریخ کے چہرے پر خوشنما داغ ہیں! ہرگز نہیں لیکن سوال پھر بھی وہاں کا وہیں رہتا ہے کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟

وہ عہدِ گزشتہ کی تاریخ کو ذہن میں رکھے ہوئے کس قبیل میں آتے ہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس کے گرد دوسرے تمام مسائل طواف کرتے ہیں۔ وطن کے ہر ذی ہوش، ہر حریت شعار، ہر مفکر کا اہم فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کرے۔ غور کرنا ہے کہ آیا موجودہ عوارض کی اصلیت اقتصادی اور معاشی ہے یا ملی اور قومی؟ اگر آپ مجھ سے اس سوال کا جواب طلب فرمائیں تو میں اسے آپ کی ستم ظریفی کہوں گا۔ معاف فرمائیے اس کلمے کے لئے۔ ایسے مہتم بالشان اور دور رس مسئلے ایک لفظ یا ایک جملہ کہہ دینے سے طے نہیں ہوا کرتے جب تک ہر نقطۂ نظر کے اصحاب اس نیت سے مل کر نہ بیٹھیں کہ اس مسئلے کو حل کر ہی ڈالنا ہے کچھ فائدہ قیل و قال سے نہیں ہو گا۔ اس ضمن میں ایک بات ضرور آپ سے کہنی ہے۔ شروع میں تین کلچرل تصادم یا اتصال آپ کے پیش کئے گئے ہیں۔ اب تک نمبر ۳ کی نسبت کچھ نہیں کہا گیا جس کا تعلق مغربی کلچر سے ہے۔ یہ کل کی بات ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کا اپنی دیسی فضا میں کیا رنگ تھا اور ہم سے مل کر اس کے کیا تیور رہیں؟ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے۔

میں یہ دیکھ کر باغ باغ ہوں کہ ان مسائل پر غور و فکر کی خواہش اہلِ ملک میں پیدا ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس خواہش کی محرک خلوص اور بہبودِ وطن ہے۔ جب ایک کام کرنے کی ٹھن جائے تو کامیابی کے سو راستے نکل آتے ہیں۔ فلسفۂ نفسیات جو عقلوں کی ذہنیت اور جدت عمل کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے کہ جب ایک امر جماعت کے ذہن میں استواری کے ساتھ جاگزیں ہو جاتا ہے تو وہ اس کے حل کی تدبیر خود ہی سرعت سے نکال لیا کرتی ہے اور اپنے فیصلے پر فوراً عمل پیرا ہو جاتی ہے جماعت میں ذوقِ عمل کی کمی نہیں ہوتی۔ کمی ہوتی ہے تو احساسِ اجتماعی کی۔ موجودہ صورتِ حال سے متعلق ہندوستانی قوم کا خواہ کوئی فیصلہ ہو لیکن ایک حقیقت ہے جو اس سوال اور اس نوعیت سے بالاتر ہے وہ کلچرل ہم آہنگی۔ مغربی اتصال نے خواہ کوئی شکل اختیار کی ہو۔ موجودہ صورت چاہے کچھ ہی ہو۔ کلچرل یونٹی جو ہم میں پہلے سے موجود ہے اس کے رنگ مدہم نہیں پڑنے دینا چاہئے۔ اس کی ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کبھی حد سے زیادہ نہیں ہو سکتی یہی ہماری نجات کی شاہراہ ہے اور یہی ہمارے حریت کے خزانے کی کنجی۔ اس بارے میں کاش ہمارا لائحہ عمل وہ ہو۔ کاش ہمارا فوری ذوق ویسا ہی ہو جس کا چربہ بھاکوئی ودیاپتی نے اپنے ان اشعار میں نہایت خلوص اور جذبے سے کھینچا ہے۔ ان الہامی اشعار کے ترجمے کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

دیکھتا ہوں جب سے اس جگ میں ہوں میں اس کا سرو چین پھر بھی میری آنکھوں نہیں اک پل ہوا!
ہے جگوں سے من کو میرے میل اس کے من کے ساتھ پر اس پہ بھی ہے شانتی کی پیاس ہی من کو سدا

کیفی

نوائے راز

پہلے سا مرے حال پہ اکرام نہیں ہے — یعنی وہ مری صبح نہیں شام نہیں ہے
کیوں اے دلِ مشتاق تو آزردہ ہوا ہے — انکارِ محبت کوئی دشنام نہیں ہے

برہم ہوئے کس واسطے اے جانِ تمنّا — اظہارِ محبت کوئی دشنام نہیں ہے

اے جوشِ جنوں اور بڑھے ذوقِ جنوں کا — دامن ہے مرا جامۂ احرام نہیں ہے
بے تابیٔ دل سے ہوئے الفاظ تو مبہم — لیکن نگہِ شوق میں ابہام نہیں ہے

جب دیکھو عزیزان کے ہی کوچے میں ہو بیٹھے
کیا اس کے سوا کوئی تمہیں کام نہیں ہے

نصر اللہ خاں عزیز

شاعر کی موت

زہے حالتِ خوبِ صاحب سخن کہ مرگش بہ از زندگانی بود

یہ ڈرامہ اصل میں فرانسیسی مصنف "پال یرولا" کے فکر کا نتیجہ ہے۔ اور فارسی میں منتقل ہو کر "سیمرغ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اب قاضی فضل حق صاحب نے اسے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قارئین کرام کی سہولت کے لئے ہم یہ لکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ قاضی صاحب نے جدید فارسی کے بعض لفظ جن سے اُردو خوان طبقہ عام طور پر مانوس نہیں۔ اردو ترجمے میں جوں کے توں رہنے دیے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں ان الفاظ کو رائج کرنا چاہیئے۔

(ادارہ)

(پردہ اٹھتا ہے۔ سین ژان دیوین نام گاؤں کے لوگوں میں غیر معمولی چہل پہل نظر آتی ہے۔ سب لوگ مشہور شاعر "فرانسو روبینول" کا مجسمہ نصب کرنے کی تقریب پر جشن کی تیاریوں میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں یہ شاعر جنگ کے سالِ اوّل میں مفقود الخبر ہو گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی یادگار میں اس کے ہموطنوں نے اس کے مولد "سین ژان دیوین" میں اس کا مجسمۂ نیم تنہ نصب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجسمہ گاؤں کے میدان میں سنگ مرمر کے چبوترے پر رکھا ہے۔ چبوترے کی دیوار میں ایک کتبہ ہے جس میں شاعر کا نام اس کا سالِ ولادت، وفات وغیرہ درج ہیں۔ گاؤں کا مکھیا سامان کی ترتیب میں سرگرمی سے مصروف ہے۔ کرسیوں اور میزوں کی قطاریں مجسمے کے گرداگرد دائرے کی صورت میں رکھی ہیں۔ ان کے گرد گاؤں کے مزدور، کسان اور عورتیں اور بچے ہمہ تن جوش و اشتیاق بنے کھڑے ہیں۔ پولیس کے سپاہی اور آگ بجھانے کا انجن بھی عملہ کی نگرانی میں موجود ہے۔

(مکھیا اور اس کا معاون داخل ہوتے ہیں)

مکھیا (فخر اور مسرت کے لہجے میں) آخر آج جشن کا مبارک دن آپہنچا۔ سخت بے چینی اور بے صبری سے وقت کے جلدی گذرنے کا انتظار کر رہا ہوں۔

معاون "یہ سب انتظام آپ کی ان تھک کوششوں اور شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے۔ میں کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے خواب و خور حرام کر کے اس تقریب کی کامیابی کے لئے دن رات ایک کر رکھا ہے۔ فی الواقع آپ نے کمال کر دکھایا ہے۔

مکھیا۔ الحمدللہ اب ہماری محنتوں کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے جو اس جشن ادبی کی کامیابی کے لئے ہمیں برداشت کرنی پڑیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کی مخلصانہ امداد کے بغیر اس اہم کام کو کبھی سرانجام نہ دے سکتا۔

معاون ۔ (تواضع سے) آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مجھے آپ سے اشتراک کار میں ایک گونہ فخر اور مسرت ہے۔ آپ میری جزوی اور ناچیز خدمات کی تعریف میں بے حد مبالغہ فرما رہے ہیں۔ یہ آپ کی بندہ نوازی ہے ورنہ میں نے درحقیقت کوئی خاص خدمت نہیں کی۔ جس کے لئے تعریف کا مستحق ہوں۔ صرف آپ کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ اور یہ میرا فرض تھا۔

مکھیا۔ (بات کاٹ کر) ہاں اپنے زندۂ جاوید شاعر کی یادگار قائم کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ روبینول ہمارے گاؤں کے ابدی افتخار کا باعث ہے۔ اس کے ادبی آثار[1] کے طفیل ہی آج ہم تمام ملک میں اپنے ہموطنوں

[1] انگریزی Best

ہیں ممتاز اور مفتخر ہیں۔ یا یہ تھا کہ سب روزنامے آج ہمارے اور ہمارے زندہ جاوید شاعر کے متعلق پرشان دار فقرا مقالات شائع کر رہے ہیں۔ ع

کاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

معاون۔ (گھڑی کو دیکھ کر) اوہو! بج گئے۔ محفل جشن میں صرف آدھ گھنٹے کی دیر ہے۔ نائب الحکومت ابھی پہنچنے والا ہے۔ گر پیرس سے مجلس شوریٰ کے نمایندہ کے متعلق جو محض اس جشن میں شرکت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ابھی کوئی خبر نہیں۔

مکھیا۔ آہ! نمایندہ محترم کے ذکر سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ آیا آج تک ان لوگوں سے ہمارے مایۂ افتخار شاعر کے مقام ادبی کے متعلق کچھ سنا بھی تھا۔ آج بھی ہر جگہ یہی چرچا ہے۔ اور ہر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی سب سے پہلا شخص ہوں جس نے اس مشہور شاعر کے ادبی رتبے کو محسوس کیا۔

معاون۔ (مسکرا کر) ہاں کسی کو اس کے متعلق خبر تک نہ تھی۔ ہمارے اسی گاؤں میں کوئی متنفس بھی ایسا موجود نہیں جو اس کے علمی اور ادبی تبحر کا احساس تک کرتا ہو۔

مکھیا۔ دوست تم غلطی پر ہو۔ مجھے روبینول کی شاعرانہ عظمت میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کی زندگی میں ہماری طرف سے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ اس کے متعلق ہر قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس کی شاعری کو دیوانگی، خبط اور پاگل پن پر محمول کیا جاتا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے لوگ ہنسی مذاق کر کے اس کی طرح کو ستاتے رہے ہیں۔ مگر سارے گاؤں میں صرف ایک میں ہی ایسا فرد تھا۔ جو اس کی شاعرانہ روح کے اسرار و غوامض سے واقف اور اس کا حقیقی قدر دان تھا۔

معاون۔ بیچارہ روبینول! کاش اسے معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد وہ اس قدر مشہور ہو جائے گا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ اس کی وفات کے بعد اس گاؤں میں اس کا یادگاری مجسمہ نصب کیا جائے گا۔ . . .

. . . اور وہ لوگ جو زندگی میں اس کی تحقیر و استہزا کرتے تھے۔ آخر اپنے گاؤں کے کوچوں اور سڑکوں کے نام اس کے نام پر رکھیں گے۔

مکھیا۔ (متانت سے) بہر حال آج ان سب بدسلوکیوں کی تلافی کی جائیگی۔

معاون۔ اور اس کی شہرت آسمان تک پہنچ جائے گی۔

مکھیا۔ (اپنے بایاں ہاتھ کو معاون کے قریب لے جا کر) واقعی لوگوں کے لئے بہت مشکل تھا کہ اس کی ظاہری شکل و صورت سے اس کی غیر معمولی قابلیت اور ہنر کا اندازہ کر سکیں۔

معاون۔ (فلسفیانہ انداز میں) ہاں صاحب بزرگوں کی قدر مرنے پر ہی معلوم ہوتی ہے (تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد) میں اس وقت عالم تصور میں اسے زندہ او مجسم دیکھ رہا ہوں کہ دریائے اندیشہ میں غوطہ مار کر ملکوتی تخیل اور افکار کے بے بہا موتی نکال کر انہیں سلک شعر میں منظوم کر رہا ہے . . . .

مکھیا۔ حالانکہ سب لوگ اسے کاہل الوجود، نکھٹو اور بیکار سمجھتے تھے۔ اور اس کی عقل کے توازن میں بھی شک کرتے تھے۔ اور تو اور اس کی بیوی بھی اپنے عالی قدر شوہر کی تحقیر میں پیش پیش تھی۔ اور اپنی زبان درازی کی وجہ سے اسے دم بھر چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی۔

معاون۔ لیکن آج بیگم صاحبہ افتخار و مسرت سے پھولی نہیں سماتی ہیں۔

مکھیا۔ ہاں بڑھیا بہت خوش قسمت ہے۔ کہ آج ایسے شوہر کے ساتھ ہمسری[1] کی وجہ سے بقائے دوام کا تاج پہنے مرجع خواص و عوام ہے۔

معاون۔ سننے میں آیا ہے کہ اب دوبارہ شادی نہیں کرے گی . . . (استہزا سے) تا وقتیکہ اس کی ہمسری[2] کے لئے اکاڈیمی کا کوئی رکن آمادہ نہ ہو۔ اور ہے بھی سچ۔ کیونکہ اگر مرحوم روبینول آج زندہ ہوتا تو وہ ضرور اکاڈیمی کا رکن منتخب ہو جاتا۔

مکھیا۔ انصاف کی بات تو یہ ہے۔ اس کے شوہر کی وفات کے بعد اس کے چال چلن کے متعلق کوئی افواہ سننے میں نہیں آئی۔

معاون۔ —— سچ ہے! بے شک شوہر کی وفات کے بعد . . . لیکن اس کی زندگی میں . . . بہر حال آج تو ہم اسے ماتمی لباس میں دیکھیں گے وہ بت کی طرح بے حس و حرکت اور خاموش ہو گی۔ گویا دنیا کی کوئی چیز اس کے غم و اندوہ کو ہلکا نہیں کر سکتی۔

اسی طرح کی باتیں کرتے۔ مکھیا اور اس کا معاون مجسمے کی طرف جاتے ہیں۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔

(۲)

(مکھیا۔ معاون۔ پلیس۔ داروغہ موجود ہیں۔ اتنے میں ایک اجنبی شخص داخل ہوتا ہے۔ اور صحن[3] کے وسط میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنی سیاہ اور مدہم عینک کے نیچے سے مجمع کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی ڈاڑھی گھنی ہے۔ اور گنواری لباس میں ملبوس ہے۔)

پولیس افسر۔ (داروغہ کو مخاطب کرتے ہوئے) اس اجنبی مسافر کو دیکھا

[1] شادی۔ [3] آنگن۔

صبح سے اب تک ادھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی اسے نہیں پہچانتا معلوم نہیں کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

داروغہ۔ لباس سے آوارہ گرد معلوم ہوتا ہے۔

پولیس افسر۔ میں اس کی خاص نگرانی کروں گا۔

(اجنبی تماشائیوں کے درمیان کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ ہر ایک سے اس ہنگامے کا باعث پوچھتا ہے۔ لیکن اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اس کے سوالات کا جواب تک نہیں دیتا!)

پولیس افسر۔ شاید اس احمق نے وہ اعلان جو درو دیوار پر چسپاں ہے نہیں پڑھا۔

داروغہ ـــ ممکن ہے ان پڑھ ہو۔

پولیس افسر۔ خیر اس پر کڑی نگرانی رکھوں گا۔

(پولیس افسر اور داروغہ آگے بڑھ جاتے ہیں)

(۳)

(وہی پہلے اشخاص۔ چند تماشائی۔ گاؤں کا مدرس)

اجنبی ـــ (چند زمینداروں کے پاس پہنچکر دیہاتی بیچے ہیں) ـــ صاحبان! معاف فرمائیے! کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کرکے جواب سے سرفراز فرمایئے۔

ایک زمیندار ـــ کیا پوچھتے ہو!

اجنبی ـــ میں بھی فرانسو روینول کے مجسمہ کے نصب سے متعلق جشن میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔ مہربانی سے ارشاد فرمایئے کہ جلسہ کس وقت ہوگا؟

زمیندار ـــ تین بجے۔ صرف چند سرکاری افسروں کا انتظار ہے۔

دوسرے زمیندار ـــ بھئی تم کون ہو؟

اجنبی ـــ میں ایک دور دراز گاؤں میں مزدور ہوں۔ آج کل بیکار ہوں۔ تلاش معاش میں سرگرداں ہوں۔

زمیندار ـــ تو پھر جاؤ۔ آگے بڑھو اور سرگردانی کرو۔

اجنبی ـــ (خفت سے) صرف ایک اور سوال پوچھنے کی اجازت دیں

زمیندار ـــ بھئی اپنی راہ لو۔ ہمارے پاس سوال جواب کے لئے وقت نہیں اگر ہم ہر ایک سوال کا جواب دینا چاہیں۔ تو اپنے کاموں کے لئے کہاں سے وقت نکالیں۔

(سب اجنبی کے پاس سے چلے جاتے ہیں)

(۴)

(وہی اشخاص پیکر تراش داخل ہوتا ہے)

مکھیا۔ (مجسمے کے سامنے کھڑے ہوکر پیکر تراش کی طرف روئے سخن کرکے) آپ کی صنعت کاری واقعی لاجواب ہے۔ آپ نے اس کی ساخت میں استادانہ کمال مہارت کی انتہا کردی ہے۔

معاون۔ کیسا ہو بہو مجسمہ ہے۔ اصل سے ذرا بھی فرق نہیں پیشانی کس قدر بلند ہے۔ سر کتنا خوش نما ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ہمیں شاعر کی ان خوبیوں کا پہلے علم نہ تھا!

مکھیا۔ پیکر تراش صاحب! میں نہایت مسرت سے آپ کو ایک خوشخبری دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بڑی محنت اور کوشش کے بعد میں محکمہ وزارت فنون لطیفہ سے ایک تمغہ منظور کرانے میں کامیاب ہوا ہوں۔

پیکر تراش۔ آپ مذاق فرماتے ہیں۔ مجھے بنا رہے ہیں۔ میں کہاں اور وزارت فنون لطیفہ کا تمغہ کہاں۔ میری ناچیز صنعت کے مقابلے میں یہ بہت بڑی عزت ہے۔ اور میں کسی طرح اس کا اہل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہاں آپ کی عنایت سے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمغۂ افتخار مجھے پہلے ہی سے مل چکا ہے

مکھیا۔ کیا مل چکا ہے؟

پیکر تراش۔ تمغہ۔ نشانِ افتخار!

مکھیا۔ تو پھر ہم نے سخت غلطی کی؟

پیکر تراش۔ نہیں! نہیں!! کچھ پروا نہیں۔ دو تمغے ہونے میں کیا ہرج ہے

(سب ہنس پڑتے ہیں اور پیکر تراش سے ہاتھ ملاتے ہیں)

پیکر تراش۔ حضرات میں آپ کی عنایات کا بہت ممنون ہوں! آج کا دن میری زندگی کا بہترین دن ہے۔

(سب ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے ہیں)

(۵)

(اجنبی۔ دیہاتی معلم)

(اجنبی۔ ادھر اُدھر غور سے دیکھتا ہے۔ جونہی معلم پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ مسکرا کر اس کی طرف بڑھتا ہے)

اجنبی۔ (معلم سے) گستاخی معاف۔ کیا میں روینول شاعر کے متعلق کچھ سوالات پوچھ سکتا ہوں۔

معلم۔ ہاں بڑی خوشی سے، جو چاہیں دریافت فرمایئں۔

اجنبی۔ کیا آپ کی رابینول شاعر سے ذاتی طور پر شناسائی تھی۔

معلّم۔ (فخر سے سینہ تان کر) میں نہ صرف اس علاقے میں اس کے مخلص ترین دوستوں اور بہترین رفیقوں میں سے تھا۔ بلکہ جب لوگ اس کی ادبی قابلیت سے منکر تھے۔ اور اسے پاگل، مجنوں اور سڑی سمجھ کر سنا تے رہتے تھے۔ اکیلا میں ہی اس کے مقام شاعری کی رفعت سے آگاہ تھا۔ اور نہایت دوستوں اور ملامت سے اس کے الہامی اور آسمانی تخیلات سے مستفیض ہوتا تھا۔ مرحوم میرا نہایت بے تکلف دوست تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ وہ مجھ سے اپنی دلی باتوں کو چھپا نہ رکھتا تھا۔ بلکہ وہ زمانہ کی کج رفتاری کی شکایتیں صرف میرے سامنے ہی بیان کرتے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔ اور اپنے دل درد مند کا غبار میرے سامنے ہی نکالتا تھا۔ . . . میں اس گاؤں کے مدرسے میں معلّم ہوں۔

اجنبی۔ آپ کو یقین ہے کہ واقعی اس کا انتقال ہو گیا ہے۔

معلّم۔ جی ہاں! اس میں شک ہی کیا ہے۔ اگر وہ مر نہ چکا ہوتا۔ تو اس پانچ سال کے عرصے میں اس کی طرف سے کم از کم مجھے کوئی نہ کوئی خبر ضرور ملتی۔

اجنبی۔ اس کی شکل و صورت کیسی تھی۔

معلّم۔ اس کا چہرہ کشادہ اور نورانی تھا۔ پیشانی تاباں۔ آنکھیں نرگسیں تھیں اور وہ ڈاڑھی مونچھ منڈواتا تھا۔ اس کے مجسمے کی طرف دیکھو۔ یہ نقل ہو بہو اصل کے مطابق ہے۔

اجنبی۔ (مجسمے کو غور سے دیکھتا ہے) واقعی بڑا خوبصورت سر ہے۔ اس کی زندگی کے طور طریق کیا تھے۔

معلّم۔ وہ ہمیشہ فکر و خیال میں مستغرق رہتا تھا۔ نہایت سادہ طبیعت اور عادت کا آدمی تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ تھی کہ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دور رہ کر پہاڑ کی بلند ترین چوٹیوں پر عالم تنہائی میں فکر و تامّل کی گہرائیوں میں محو و مستغرق رہے۔ کیونکہ اس کا عقیدہ تھا۔ کہ تنہائی کے بغیر تفکر میں رفعت اور بلندی نہیں آسکتی۔

اجنبی۔ درست . . . . (تھوڑے سکوت کے بعد) لیکن اس کی روحانی بلند پروازیوں کی حقیقت آپ لوگوں پر کیسے منکشف ہوئی۔

معلّم۔ دارالحکومت کے ایک ناقد نے ایک مفصل مقالے میں اس کے کلام اور اس کی حیاتِ شعری[1] پر ایک مفصل تنقیدی مضمون لکھا۔ اور اس کے ضمن میں تحریر کیا کہ روبینول شاعر کی موت سے ادبیاتِ فرانس کو سخت نقصان اور صدمہ پہنچا ہے۔ اور اس کے بعد لکھا کہ روبینول ان شعرائے نامدار میں سے ہے جن کو مبدءِ قدرت سے وہ روحیت عطا ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندۂ جاوید رہتے ہیں۔ بے شک وہ نہیں مرتے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی روح تابندہ تر ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اپنی لازوال شاعری کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔ ان کے خیالات اور اشعار کی تابانی عدم کی تاریک فضا میں[2] آفتابِ تاباں کی طرح ہمیشہ ضوفشاں رہتی ہے۔

اس عہد بزعقیدہ کو پایۂ تخت کے اخباروں سے ملک کے باقی تمام اخباروں نے نقل کیا۔ اور اس پر مختلف پہلوؤں سے رائے زنی کی گئی۔ جس سے تمام ادبی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اس کا کلام مدوّن کیا گیا۔ اور ملک میں شایع ہوا۔ اس کے مطالعہ سے تمام اہلِ ذوق حضرات کو شاعر اور اس کے کلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ (تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد) ایسے بزرگ اور باعظمت شاعر کا مقام ادبی کب تک نظروں سے مستور رہ سکتا ہے!

اجنبی — (سر کو جھکا کر اور تھوڑی دیر سوچ کر) — واقعی! شاعر کی خوش قسمتی اس کی موت ہی میں ہے (تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد) ہاں! اس کی اہلیہ کس حال میں ہے۔

معلّم۔ آہ! بیچاری بڑی مصیبت میں ہے۔ اس پر رنج و غم کا پہاڑ آگرا ہے بیچاری کو کسی طرح تسلی نہیں ہوتی . . . . وہ ابھی آرہی ہو گی۔ چند منٹوں میں آپ اس کی زیارت سے مشرف ہو سکیں گے۔

اجنبی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان سے میرا تعارف کرا دیں۔

معلّم۔ کیوں نہیں۔ آپ کو ان سے کوئی کام ہے؟

اجنبی۔ ہاں میں نے ان کے عالیمقدار شوہر کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے جو میں انہیں سنانا چاہتا ہوں۔

معلّم۔ (تعجب سے) تو ماشاء اللہ آپ شاعر بھی ہیں۔

اجنبی۔ (انکسار سے) جی ہاں! ٹوٹے پھوٹے لفظ جوڑ سکتا ہوں۔

معلّم۔ میں تو سمجھا تھا۔ کہ آپ صرف اُجڈ گنوار ہی ہیں۔

اجنبی۔ گنوار تو ہوں ہی۔ (ہنس کر) مگر شاعر بھی ہوں۔

معلّم۔ تعجب ہے! مگر ہو سکتا ہے . . . . . ہاں ادھر دیکھو بیگم صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔

(۲)

(وہی اشخاص۔ شاعر کی بیوی)

شاعر کی بیوی سیاہ ماتمی لباس میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی فخر سے سر کو اوپر اٹھائے نہایت متانت و وقار سے چلی آرہی ہے لوگ اسے گذرنے کے لئے رستہ دے رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ

[1] لٹریری پوزیشن۔ [2] عالی قدر۔

کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ معلم اجنبی کا اس سے تعارف کراتا
ہے۔ وہ اس کے سامنے جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور پھر جیب
سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالتا ہے)
ی۔ خانم محترم! مجھے اجازت بخشیں۔ کہ یہ اشعار جو میں نے آپ کے
نام شاعر شوہر کی شان میں تصنیف کئے ہیں۔ عرض کروں۔
۔ (سرد مہری اور بے اعتنائی سے) کیا آپ کو مرحوم سے پہلے
اسائی تھی۔
ی۔ بالکل نہیں۔ بیگم! لیکن میں نے مرحوم کے سب قصیدوں کو
ر رکھا ہے۔ اور اس لحاظ سے میں ان کے مخلص ترین ارادتمندوں میں
ا ہوں۔
ہ۔ آپ کا اسم شریف؟ (تواضع سے جھک کر اجنبی کے ہاتھ سے
ذ لے لیتی ہے)
بی۔ جوزف۔ جوزف ولیم
ضرین میں سے ایک آواز) کیا بکواسی لیچڑ ہے۔ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔
ب اور آواز) وقت ضائع کر رہا ہے!
ہ۔ (اجنبی سے) آپ اس گاؤں میں مقیم ہیں؟
بنی۔ جی نہیں۔ بیگم صاحبہ۔ مدت ہوئی یہاں سے ہجرت کر گیا ہوں۔
یہی وجہ ہے کہ مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔
حاضرین میں سے ایک آواز) عجب سنکی ہے!
دوسری آواز) . . . . میلی کچیلی شلوار! پھٹا ہوا کوٹ۔
وئی آوارہ گرد ہے۔
ایک اور آواز) شاید چور ہو۔ ہمیں اس سے کیا؟
معلم۔ خواہ کوئی ہو! اس کو بھی حق ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اپنے مخصوص
طرز میں ہمارے مرحوم شاعر سے اپنی عقیدت کا اظہار کرے۔
بیوہ (اس اثناء میں قصیدہ کا مطالعہ کرتی ہے) ہاں نظم تو بری نہیں۔
(بلند آواز سے پڑھتی ہے) ؎

موت ہے در اصل رازِ زندگی   موت ہے اک لفظِ بے معنی و پوچ
زندگی کی جب حرارت کم ہوئی   کھا گئے کیڑے مکوڑے جسم کو
خاک میں جب مل گئے اجزائے تن   تو سمجھتا ہے یہی ہے انتہا
یہ تری الٹی سمجھ کا ہے قصور   تو ابھی زندہ ہے بلکہ زندہ تر
ہے تحرک روح میں اب تک تری   اور ترے دل میں ابھی ہے ارتعاش

قبر کی تاریکیاں کچھ بھی نہیں   ہیں حجاب عالمِ ظاہر فقط
جسم کے مٹنے سے تو مردہ نہیں   جاں کو ہے جبتک بقائے لازوال

(تماشائیوں کی طرف متوجہ ہو کر قدرے بے پروائی سے) شعر تو برے نہیں!
شاعر ابھی تازہ مشق ہے (اجنبی سے) ممکن ہے کسی وقت سعی پیہم سے
کمال سخن کی حد تک پہنچ سکے (کاغذ اجنبی کی طرف سرکا دیتی ہے)
اجنبی۔ (آہستہ آواز میں مجسمے کی طرف اشارہ کر کے) ہاں اس کی طرح . . . .
موت کے بعد۔
ایک آواز۔ کیسے پھیکے اور بے مزہ اشعار ہیں۔
دوسری آواز۔ بالکل بکواس اور فضول!
تیسری آواز۔ بے معنی و بے آہنگ!
چوتھی آواز۔ لغو اور لچر۔
پانچویں آواز۔ یہ شاعر کہاں سے آ ٹپکا۔ کم بخت رنگ میں بھنگ ڈال
رہا ہے۔

(۷)

نائب الحکومۃ اور مجلس شوریٰ کا نمایندہ داخل ہوتے ہیں سب
لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجمع میں ہنگامہ سا پیدا ہو جاتا ہے
دونو بزرگ وقار و متانت سے آگے بڑھتے ہیں۔ حاضرین دوڑ
کر ان سے مصافحہ کرنے میں سبقت کرتے ہیں۔ مجلس کا نمایندہ
صدر کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے دائیں طرف شاعر کی بیوہ
اور بائیں طرف نائب الحکومت اور مکھیا کرسیوں پر بیٹھ جاتے
ہیں۔ کچھ عرصہ تک محفل میں خاموشی طاری رہتی ہے۔ اس کے
بعد نمایندہ مجلس اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

نمایندہ۔ گاؤں کے مکھیا اپنا ایڈریس پڑھیں گے۔
مکھیا۔ (کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھ کر سر جھکا کر کاغذ پر لکھا ہوا ایڈریس
پڑھنا شروع کرتا ہے۔ معلم اس کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے)
حضرات! نمایندہ محترم! نائب الحکومت! خانم محترمہ! ہموطنان عزیز!
آج ہم ماتم اور نوحہ سرائی کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہمارا مرحوم
شاعر ان لوگوں میں سے ہے جو بقول خود . . . . نَ . . . نَ (بدخطی
کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتا)
معلم۔ (لقمہ دیتا ہے)
نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام   کہ تخم سخن را پراگندہ ام

منکھیا:" حضرات! فرانسوا دیبیول مردہ نہیں بلکہ آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہے۔ ہاں وہ زندہ جاوید ہے ؎

"مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں"

اس کی عظمت نے شاعری نے موت اور فنا پر فتح پا لی ہے۔ اور وہ ابدالآباد تک زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔۔۔۔۔۔

(حاضرین نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں)

منکھیا۔ (سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) افسوس ہم نے زندگی میں اس کی قدر نہ پہچانی۔ ہمارا ہموطن محترم مشہور شاعر ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں کا فخر۔ نہیں بلکہ تمام ملک کا مایۂ ناز شاعر۔ دیبیول فرانسوا اس وقت میری چشم تصور کے سامنے مجسم ہے اور اپنا یہ شعر پڑھ رہا ہے ؎

زندگی ایسی ہے اک خواب گراں کی مانند
جس سے ہم ہوں گے نہ بیدار مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔

(پڑھا نہیں جاتا)

معلم:۔ (لقمہ دیتے ہوئے "فوت" "فوت" پڑھتا ہے) مگر فوت کے بعد"

منکھیا۔ ہاں (زور سے) "مگر فوت" کے بعد۔۔۔ ہمارے شاعر کی روح صبر و استقلال سے اس لمحہ کا انتظار کرتی رہی کہ پیکر عنصری سے علیحدگی اختیار کرتے ہی ہماری نظروں میں ایک لازوال اور حقیقی ادبیت کی صورت میں جلوہ گر ہو۔ اور آج اس کے انتظار و صبر کے یہ آخری لمحے ہیں۔ حضرات! ہمارے شاعر نے گمنامی اور مفلسی میں ظاہری رنج و الم کی دشوار گذار وادیوں کو طے کیا۔ اور دنیا کی نعمتوں سے نہایت بے نیازی اور قناعت سے بے اعتنائی کرکے دنیا پر ثابت کر دیا کہ بے سر و سامان جھونپڑیوں میں رہنے والے ہی ملاء اعلیٰ کے اسرار و رموز کی حقیقت کو جان سکتے ہیں۔ اور روحانی عظمت کے مقابلے میں دنیاوی آسائشیں اور نعمتیں بالکل بے حقیقت ہیں۔ زندہ باد قدر شناس کہ آخر اس کے متفرق کلام کو وطن پرست اور ادب دوست ہاتھوں نے مدون کیا اور ادبیات کے دربار بقائے دوام میں پہنچایا۔ یعنی پایہ تخت کے جوہر شناس ناقدوں نے اس گنجینۂ رموز و اسرار کی طرف ادب پرست فضلاء کی توجہ منعطف کرائی اور اس طرح خزانہ ادبیات میں قیمتی اور بے نظیر اضافہ کیا۔ کہ عالم متمدن کے تمام حقیقت شناس ادیب ان افکار نادرہ کو پڑھ کر انگشت بدنداں ہیں۔ اور ان نغمات ملکوتی کو سن کر سر دھن رہے ہیں یہاں تک کہ ایک مشہور نقاد لنگا نے لکھا ہے۔ کہ "ملک" فرانس نے ادبیات عالم میں فرانسوا کی شخصیت میں ایک زبردست شاعر غزل سرا کا اضافہ کیا ہے۔"

حضرات! ہمارے اس گاؤں کو فخر ہے کہ اس وقت کی دنیائے متمدن کا سب سے بڑا شاعر فرانسوا اسی خاک پاک کی پیداوار ہے۔ اور ہم باشندگان دہ اس پر جتنا فخر و ناز کریں بالکل بجا ہے۔

حضرات! ہمارے اس شاعر بزرگ نے اپنے قصائد میں مناظر طبیعت اور مظاہر فطرت کی جو نقاشی کی ہے وہ در اصل ہمارے اسی گاؤں کے ماحول کی ایک تصویر ہے۔ جس سے یہ گاؤں گمنامی سے نکل کر افتخار و شہرت کے آسمان پر آفتاب تاباں کی طرح نمایاں ہے۔ (زور سے اور دیر تک تالیاں)

ہاں حضرات! دیبیول وہ ممتاز شخصیت ہے۔ جو مر کر بھی زندہ ہے۔ اور خود اس نے ایک مشہور نظم میں اس کے متعلق پیش گوئی کی تھی۔

(اور وہ شعر جو پہلے درج ہیں پڑھتا ہے)

(نہایت زور سے اور بہت دیر تک تالیاں اور نعرہ ہائے تحسین)

مختلف آوازیں۔ شعر نہیں واللہ سحر ہے۔ قلم توڑ دیا۔ کتنے بلند تخیلات ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی کیا لکھے گا!

(دستے میں ایک گوشے سے زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سب ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ہنسنے والا وہی اجنبی ہے۔ مجلس میں ہنگامہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ سب اس پر حملہ کرنے کو دوڑتے ہیں)

ایک آواز۔ ارے یہ کون ہے؟

دوسری آواز۔ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟

تیسری آواز۔ تم یہاں کے رہنے والے تو نہیں۔

ایک تماشائی۔ ہمارے دشمنوں نے اسے سکھا پڑھا کر یہاں بھیجا ہے کہ جلسے میں ابتری پیدا کرے۔

بہت سی آوازیں۔ اسے یہاں سے نکالو۔ نکالو اس کو۔ پیٹو

نائب الحکومت۔ (افسر پولیس سے) داروغہ صاحب! اس کی تفتیش

نمایندہ مجلس۔ اس کا پروانہ راہداری ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ کون ہے۔

(سب اس امر پر متفق ہو جاتے ہیں)

افسر پولیس (لوگوں کو پیچھے ہٹاتا ہے) بہت اچھا صاحب۔ (اجنبی سے)

؎ فوت

اگر اس کو بازو سے پکڑ کر) اپنا پروانۂ راہداری جلدی دکھاؤ۔

(اجنبی اپنی جیب سے پروانۂ راہداری اور دوسرے کاغذ نکال کر پیش کرتا ہے۔

پولیس افسر۔ (پروانے کو دیکھ کر) یہ کیا۔ سرکاری افسروں سے بھی مذاق! عجیب آدمی ہو!

نائب حکومت۔ (آگے بڑھ کر کاغذوں کو دیکھتا ہے اور وحشت کے عالم میں پکار اٹھتا ہے) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اجنبی۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پروانۂ راہداری پڑھ لیا ہے۔ پروانہ پر اس پر لکھا ہے:۔

"فرانسوا روبینول۔ سن ژان دیوی کے گاؤں میں بروز یک شنبہ بتاریخ ۱۸ جنوری ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوا"۔ ہاں صاحبان! میں وہی فرانسو روبینول ہوں"۔

اگر آپ مجھے پہچان نہ سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میری پانچ سال پہلے کی اور آج کی شکل و صورت میں بہت فرق ہے۔ میں نے اس عرصے میں اپنی داڑھی مونچھیں نہیں ترشوائیں۔ جس سے وہ بہت بڑھ گئی ہیں اور میری ظاہری ہیئت ناشناس ہو گئی ہے۔

پھر بھی اگر غور سے دیکھو تو (آنکھوں پر سے سیاہ عینک اتار کر) ژان نژآن (ایک شخص کی طرف متوجہ ہو کر) تم اب بھی مجھے نہ پہچانو گے؟ (ایک دوسرے شخص کی طرف مخاطب ہو کر) ناریل تم بھی نہیں پہچانتے۔ میں کشود نمبرے شخص کو) یاد ہے۔ جب ہم تم بچپن میں ان پہاڑیوں میں سیر کو جایا کرتے تھے؟ (ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے) یہ میرا مکان ہے۔ (لوگ دہشت زدہ سے ہو جاتے ہیں)

اجنبی (وزاننڈی سے) ہاں تم لوگوں نے مجھے بہت ستایا۔ مجھ پر زندگی تلخ کر دی۔ یہاں تک کہ میں یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔ اور اپنی موت کی خبر مشہور کر دی۔ یہ اقدام میرے حق میں بہت مفید ہوا۔ (ہنس کر) کیونکہ لوگ صرف مُردوں کے متعلق ہی انصاف سے کام لیتے ہیں۔ تم ابھی مجھے مُردہ سمجھ رہے ہو۔ صاحبان! افسوس کہ میں ابھی اس عالم میں ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ شوخی کی انتہا ہو چکی۔ آؤ ذرا اب ہنس بول کر وقت گذاریں...

مکھیا۔ یہ شخص جھوٹا اور لپاڑیا ہے؟

تماشائی:۔ بس بس! یہ ہم سب کو اُلّو بنا رہا ہے۔ اسے نکالو یہاں سے معلوم نہیں کتنا چالاک اور حقہ باز ہے!

اجنبی۔ (بلند آواز سے) یہاں ایک اور شخصیت ایسی بھی موجود ہے جو کسی طرح میرے متعلق لاعلمی کا اظہار نہیں کر سکتی (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے) اور وہ یہ عورت ہے۔

(لوگوں میں گڑبڑ پیدا ہوتی ہے)

بیوہ۔ (حقارت سے) میں اس شخص کو نہیں جانتی۔

تماشائی۔ دیکھا! پاگل!! اسے باہر نکالو اور جیل کی ہوا کھلاؤ۔

اجنبی (میدان میں آ کودتا ہے اور لوگ ہنسنا شروع کرتے ہیں) احمقو! تم پاگل ہو۔ یہ مجسمہ تم اپنے لئے نصب کر رہے ہو۔ غرور اور خودخواہی کی نمائش کر رہے ہو۔ فرانسو روبینول بہت بڑا شاعر نہ تھا۔ اور اس کی ادبی قابلیت جھوٹ اور اس کا شاعرانہ کمال بے بنیاد! تمہاری قدرشناسی افترا! اگر وہ فی الحقیقت شاعر بزرگ تھا۔ تو تم نے اس کو نہیں سمجھا۔ یا تم میں اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی نہ تھی اور نہ ہی اب ہے۔ تم نے اسے بے وجہ بڑا بنا دیا۔ وہ مرا نہیں بلکہ کھانے پینے والا زندہ انسان تمہاری نظروں کے سامنے مرمری مجسمے کی صورت میں نہیں بلکہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسانی صورت میں زندہ موجود ہے۔ اور اس وقت میں تم سب سے زیادہ اس کے متعلق رائے ظاہر کرنے کا اہل ہوں۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے.....

(شور و غوغا کی وجہ سے فقرہ تمام نہیں کر سکتا اور وہاں سے چلا جانا چاہتا ہے۔ سب چلاتے ہیں)

اس کو پکڑ لو۔ دریا میں ڈبو دو۔ سب برافروختہ ہو کر دانت پیستے ہیں۔ افسر پولیس اور سپاہی اسکے قریب پہنچکر اس کو سختی سے مجمع سے باہر نکال لاتے ہیں)

پولیس افسر۔ بکواس بند کرو۔ اور چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔ (وہ اسے ساتھ لیکر باہر چلا جاتا ہے۔ بینڈ سے ترانہ ملّی کی لَے بلند ہوتی ہیں)

نمائندہ۔ (کھڑا ہو جاتا ہے اور حاضرین سے سکون و سکوت کی درخواست کرتا ہے) میرے عزیز دوستو! اس دیوانے نے ہمارے جشن میں کھنڈت ڈالدی۔ مگر یہ ناگوار واقعہ ہمارے فرضِ مقدس کے ادا کرنے میں حارج نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہمیں زیادہ جوش کے ساتھ اپنے بزرگ شاعر فرانسو روبینول کی یادگار قائم کرنے میں مشغول ہونا چاہیئے۔

آوازیں۔ (زندہ باد روبینول! زندہ باد شاعر ملی!

نمائندہ۔ حضرات! آؤ جشن کو جاری رکھیں۔ فرانسو روبینول درحقیقت ہمارے وطن کا مایۂ افتخار و ناز شاعر ہے۔ جس کے فوت ہو جانے نے ادبیات ملک بلکہ تمام عالم متمدن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے......

(تقریر جاری رہتی ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرنا شروع ہوتا ہے)

ترجمہ فرانسیسی بواسطہ فارسی — قاضی **فضل حق** ایم۔اے

ـــه ناقابل شناخت۔ ـــه شعبدہ گر۔ ـــه مردِ بہتن۔

غزل

حسن اُن کا اپنے ذوقِ دید میں پاتا ہوں میں
سامنے ہو کر وہ چھپتے ہیں تڑپ جاتا ہوں میں

عشرتِ جلوہ بھی ہو جائے جہاں حیرت زدہ
اے خیالِ دوست اُس منزل پہ گھبراتا ہوں میں

دیکھتا ہوں اپنے غمخواروں کی جب بے دردیاں
حسنِ بے پروا کی رہ رہ کر قسم کھاتا ہوں میں

انتظار اُس کا ہے کتنا جاں گسل کیونکر کہوں
خط میں جس کا نام ہی لکھ کر تڑپ جاتا ہوں میں

کب سنبھلنے دے گی غش سے اُن کی چشمِ برق پاش
مژدہ باد اے بیخودی آتے ہیں وہ جاتا ہوں میں

بے خیالی میں کبھی اپنی زبانِ حال سے
خستہ حالی کے مزے ان کو بھی سمجھاتا ہوں میں

آہ، اب تک کی نہیں سیرِ بہارستانِ دل
اک خیالی رو میں اے ہمدم بہا جاتا ہوں میں

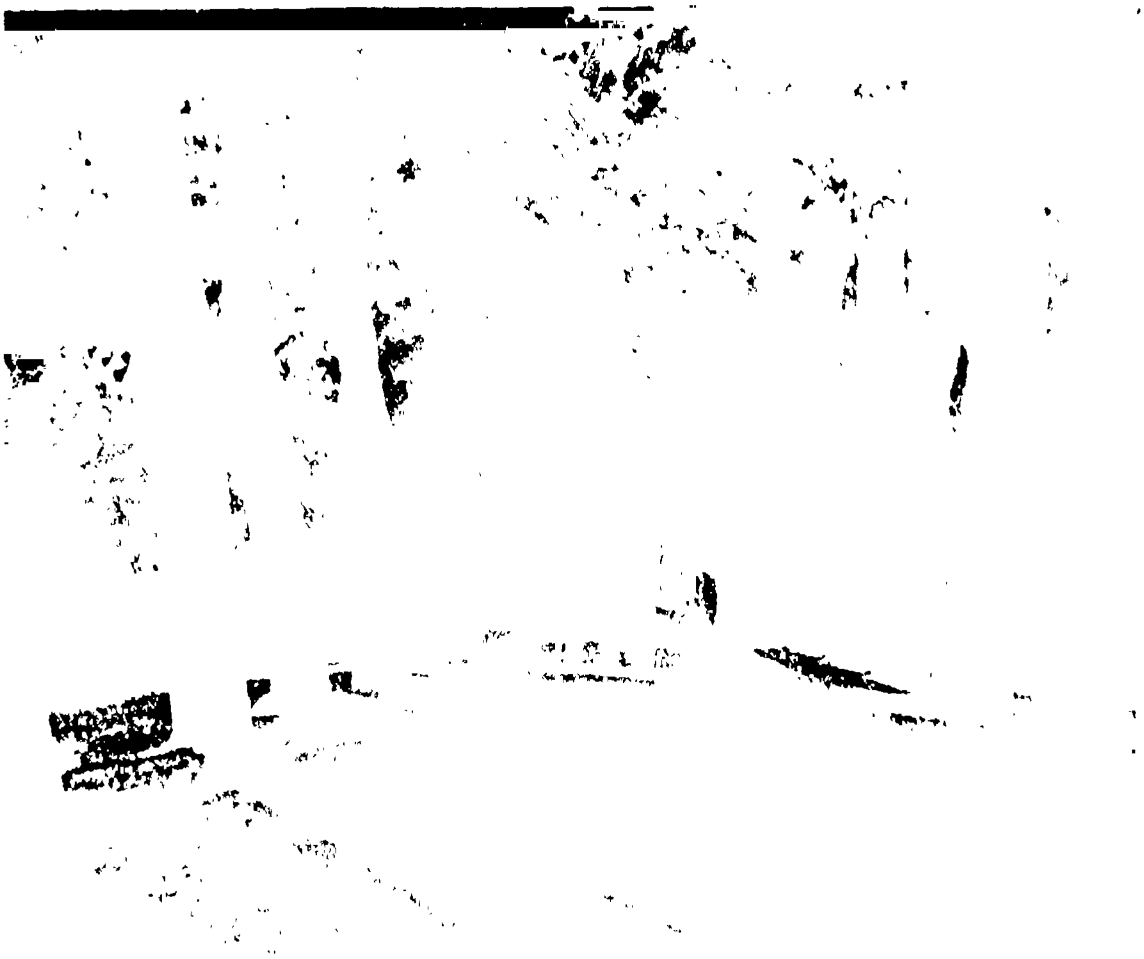
حیرت افزا ہے مرا عشقِ محبت آفریں
خود ہی اب مضطر نہیں اُن کو بھی تڑپاتا ہوں میں

راستہ چھوڑ اے تغافل میرے گھر آتے ہیں وہ
رہبری کر اے تمنا اُن کے گھر جاتا ہوں میں

حیرتِ مشقِ تصور کھو نہ دے مجھ کو کہیں
سامنے اپنے تجھے اے دلنشیں پاتا ہوں میں

لا رہی ہے ان کی چشمِ لطف عشرت کے پیام
دیکھ اے منظور اب کیسا نظر آتا ہوں میں

علی منظور حیدرآبادی



ٹھنڈی چھاؤں

ا اٹھنے
ی جن کی
ر چکے تھے۔
صہ ہوا۔



دئول تلداس

دیوی

افرادِ تمثیل:—

(۱) پجاری - (۲) منورما - (۳) رکمنی

منظرِ اوّل:- خاموش فضا میں مندر کی گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز

دیوی کے سامنے مندر کا پجاری بیٹھا گنگنا رہا ہے۔

پجاری - کون اکیلا جگ کے اندر۔ سب کے ساتھ ہے نند نندن

——— پوجا کر نادان۔

کیا جانے کس روپ میں آکر۔ دھیرے دھیرے مدھو لٹکا کر

——— آن ملیں بھگوان

(دروازہ کھول کر منورما داخل ہوتی ہے۔ پجاری چپ ہو جاتا ہے)

منورما - میں اندر آسکتی ہوں مہاراج؟ ——— پوجا کے لئے؟ ———

پجاری - آؤ بیٹی آؤ۔ تم پوجا کر سکتی ہو۔

منورما - مہاراج! میں بہت سویرے چلی آئی ہوں آج۔ پوجا کا وقت شروع تو ہو گیا ہوگا؟

پجاری - ہاں گگن کے چمکتے ہوئے تارے بتا رہے ہیں کہ ابھی کچھ رات باقی ہے۔ لیکن تم پوجا کر سکتی ہو۔ صبح کا وقت دیوی اور دیوتا کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

منورما - اچھا تو لیجئے میری گٹھری میں کچھ پھول ہیں۔ اور تھوڑی سی مٹھائی۔ پھول تو دیوی کے استھان پر بھینٹ چڑھا دیجئے اور مٹھائی آپ کی ہے۔

پجاری - لیکن تم اپنے ہاتھ سے بھینٹ کیوں نہیں چڑھاتیں۔ تم خود پوجا کرو۔

منورما - بس میں یہاں آگئی۔ یہی میری پوجا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کروں۔

منورما - کیا پرارتھنا بھی نہیں کرو گی؟

منورما - دل میں کوئی آرزو نہیں ہے۔

پجاری - تم کو سب کام پوری طرح کرنے چاہئیں۔

منورما - آخر کیوں؟ ——— اور بھی تو بہت سے ادھورے کاموں کو پورا سمجھ لیا جاتا ہے۔

پجاری - میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا پتری۔

منورما - آپ کیا سمجھیں گے۔ جانے بھی دیجئے ان باتوں کو۔

پجاری - پھر بھی آخر معلوم تو ہو۔

منورما - سوچئے نا مہاراج۔ بہت سی استریاں اپنے سوامی کا منہ دیکھنے سے پہلے ہی بیوہ ہو جاتی ہیں۔ اور سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ بس اُن کا بیاہ ہو گیا۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) کیا یہ بات ادھوری نہیں ہوتی؟

پجاری - اُف! تمہارے آنسو بہ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو بہت دکھ پہنچے ہیں۔

منورما - مجھ کو ہی نہیں سب کو۔ عورت ذات، اس سنسار میں دکھ سہنے ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کسی کے لئے کم ہے اور کسی کے لئے زیادہ۔

پجاری - تم سچ کہتی ہو پتری! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا بیاہ ہو چکا ہے؟

منورما - بیاہ؟ ——— ہاں ہو تو چکا ہے۔ اگر اس کو بیاہ کہا جا سکے۔ کیونکہ براتیوں کو کھانا تک دیا گیا تھا۔ لیکن جھوٹی پتلیں اُٹھنے سے پہلے میرا سہاگ ختم بھی ہو گیا تھا۔ میرے سوامی جن کی جھلک تک میں نے نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے منہ موڑ چکے تھے۔

پجاری - اُف کتنی دُکھ کی بات ہے۔ اس چیز کو کتنا عرصہ ہوا۔

منورما۔ جتنا چاہو سمجھ لو مہاراج۔ کیونکہ منورما جیسی دکھیاری کے لئے تو مصیبت کی دو گھڑیاں بھی برسوں کے برابر ہوتی ہیں۔

پجاری۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اور تم رہتی کہاں ہو منورما؟

منورما۔ ہر جگہ اور کہیں بھی نہیں۔ ان دنوں اس اندھیر نگری میں میرے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ہاں شاید پرسوں تک اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔ بہت قریب۔ رام نگر۔ شاید آپ جانتے ہوں۔ برسات کے دنوں میں جب دریا بہت چڑھا۔ تو ساری بستی پانی میں ڈوب گئی۔ اور سب لوگ اسے چھوڑ یہاں آپ کے قریب بسے۔

پجاری۔ اچھا۔ میں سمجھا۔ بڑے میدان میں جن لوگوں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ اُف! تم بڑی دکھی ہو۔ بولو۔ میں کسی طرح تمہاری سیوا کر سکتا ہوں۔

منورما۔ پرماتما کی آپ پر کرپا ہو۔ مجھے میرے حال پر رہنے دیجئے۔ یہ سر کا درد نہیں ہے۔ جو صندل لگانے سے دور ہو جائے۔ دل میں بھڑکتی ہوئی آگ گنگا جل سے بھی نہیں بجھ سکتی۔

پجاری۔ پرماتما کا دھیان کرنے سے کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تم پوجا پاٹ میں زیادہ حصہ لیا کرو۔ تمہیں مندر میں روز آنا چاہیئے۔ اور ہاں اب تو تم چلی ہی جاؤ گی۔

منورما۔ میں پوجا کرتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی آنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ گھر کے کام کاج سے فرصت کم ملتی ہے۔

پجاری۔ میں نے اس سے پہلے تم کو مندر میں آتے نہیں دیکھا۔

منورما۔ نہ دیکھا ہوگا مہاراج! میں ساتھ والیوں میں مل کر آتی تھی۔ اس لئے آپ کی نظر نہ پڑی ہوگی۔ آج میں جان بوجھ کر اکیلی اور بہت سویرے آئی ہوں۔

پجاری۔ اکیلی اور بہت سویرے:— لیکن اس کی وجہ؟

منورما۔ کچھ نہیں۔ کل شام میں نے سنا۔ کہ میری ساتھ کی کھیلی ہوئی ایک سہیلی کا بیاہ گاؤں میں پہنچتے ہی ہوگا۔ رات بھر من اُداس رہا اور یہی چاہتی رہی کہ خوب جی بھر کر رو دوں۔ لیکن اس کام کے لئے دیوی کے چرنوں سے زیادہ اچھی جگہ کوئی نہیں۔ اور یہاں بیٹھ کر آنسو بہانے کے لئے اکیلے اور سویرے آنا ہی ضروری تھا۔

پجاری۔ تو پھر آگے بڑھ جاؤ نا پتری۔ پوجا میں دیر مت کرو۔ پرماتما کی تم پر کرپا ہو گی۔

منورما۔ نہیں اب میں پوجا کئے بغیر یہاں سے چلی جاؤنگی۔

پجاری۔ کیوں؟— کیا وچار ہے؟— تم نے اپنا ارادہ بدل دیا؟

منورما۔ ہاں مہاراج! یہاں آ کر میں نے سوچا کہ جب دیوی اپنے سخت ہاتھوں سے کسی کے دھڑکتے ہوئے دل کو سہارا نہیں دے سکتی۔ اپنے آنچل سے کسی کی روتی ہوئی آنکھ کے آنسو نہیں پونچھ سکتی۔ تو یہاں رونا ویسا ہی ہے۔ کہ کوئی اپنے گھر میں منہ لپیٹ کر چپکے چپکے آنسو بہا لے۔ پرماتما یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی۔

پجاری۔ تو کیا اب تم جا کر پھر کبھی نہیں آؤ گی؟

منورما۔ میں ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ پرماتما ہی جانیں۔

پجاری۔ اچھا سنو تو۔ میں ایک بات بتاؤں۔ جس سے تمہارے جیون کا دکھ شاید سکھ میں بدل جائے۔

منورما۔ کہئے میں سب کچھ سننے کے لئے تیار ہوں۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس سارے جنم میں کسی طرح سکھ نہیں مل سکتا۔

پجاری۔ تم اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ۔ اور دوسری بار بیاہ کر کے اپنے من کے مندر کو زندہ دیوتا سے آباد کر لو۔

منورما۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج! میں ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتی۔

پجاری۔ کیوں؟— کیا ہرج ہے؟ تمہارا دکھ تو جاتا رہے گا۔

منورما۔ آپ برت رکھتے ہیں۔ تو آپ کو بھوک ضرور لگتی ہوگی۔ لیکن بھوک کی تکلیف سے تنگ آ کر آپ برت توڑ تو نہیں دیتے۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ میں درد سے گھبرا کر وہ کروں جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے۔

پجاری۔ برت توڑنے سے بھگوان کے ناراض ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ لیکن دھرم یہ نہیں بتاتا کہ بیوہ کا بیاہ پاپ ہے۔ اور بیوہ بھی ایسی جس نے اپنے سوامی کی جھلک تک نہ دیکھی ہو۔

منورما۔ رہنے دیجئے۔ ان باتوں کو۔ عورت ذات کی نگاہ میں دھرم اور سماج دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ سماج کے جن بندھنوں میں اسے جکڑ دیا گیا ہے۔ وہ ان کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔

پجاری۔ میں نے تمہاری بھلائی کی کہی ہے منورما۔

منورما۔ ہاں کہی ہے۔ لیکن میرے ہی منہ پر۔ بھری پنچایت میں سب کے سامنے تو یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ وہاں آپ کو ڈر معلوم ہوگا

پجاری۔ خیر اب تمہاری مرضی ہے۔ مانو یا نہ مانو۔

منورما۔ ہاں یہی ٹھیک ہے کہ میں اسے نہ مانوں ــــ لیکن آپ یہ مٹھائی تو لے لیں۔ یا نہیں لیں گے؟

پجاری کیوں نہیں۔ جو چیز تم خوشی سے میرے لئے لائی ہو۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا ــــ لیکن یہ پھول؟

منورما۔ یہ بھی آپ لے لیجئے۔ یا میں مندر کے باہر کسی کونے میں ڈال جاؤنگی۔

پجاری۔ دیوی پر نہیں چڑھاؤگی کیا؟

منورما۔ نہیں۔ اگر دیوی کو یہ پھول لینے ہیں۔ تو اپنے استھان سے اتر کر آئے اور میری سنگری قبول کرے۔

پجاری۔ اگر دیوی اپنے استھان سے اتر کر آئی تو وہ تم کو ہی قبول کر لے گی۔ کیونکہ تم خود بھی ایک پھول ہو۔

منورما۔ میں پھول ہوں۔ آپ مذاق کر رہے ہیں مہاراج۔ میرا دل دکھانے کے لئے .... پرے ہٹ جائیے۔ پرے ہٹ جائیے ..... میرے قریب مت آئیے ...... چھوڑ دیجئے مہاراج .... میرے ہاتھ چھوڑ دیجئے ... مجھے چھوڑ دیجئے ــــ پرماتما کے لئے چھوڑ دیجئے ــــ (سسکیاں)

پجاری۔ تمہارے ہاتھ کتنے نرم اور سندر ہیں۔ پیار کرنے کے لائق۔

منورما۔ ایسا مت کہئے۔ مت کہئے۔ کوئی سن لے گا ... یہ میرے لئے پاپ ہے۔ مہا پاپ۔ میں کہیں کی نہ رہونگی۔ میں جاتی ہوں مہاراج۔ جاتی ہوں۔

پجاری۔ جا رہی ہو ــــ پھر کب آؤگی منورما۔

منورما۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں آؤں گی ــــ اس مندر میں قدم بھی نہ رکھوں گی ــــ

منظر دوم: چند ماہ بعد رام نگر بستی کے باہر ایک کنوئیں کی منڈیر پر منورما پاؤں لٹکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ اس کی سہیلی رکمنی قریب آتی ہے۔

رکمنی۔ اری پگلی۔ او پگلی منورما۔ تو پانی بھرنے آئی ہے۔ یا کنوئیں کی منڈیر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھنے۔

منورما۔ (چونک کر) کون؟ ــــ رکمنی؟ ــــ بڑے اچھے موقع پر آئی بہن۔ میں سوچ رہی تھی کہ کوئی آجائے۔

رکمنی۔ خاک اچھے موقعے پر آئی۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے۔ رات ہونے کو آئی۔ اور تیرا پانی بھرنا ختم نہیں ہوا۔

منورما۔ (مسکرا کر) پانی بھرنے کے لئے یہ اچھا وقت نہیں ہے۔ تو پھر تو کیوں آئی ہے؟

رکمنی۔ تجھے دیکھنے کے لئے۔ اور کیا۔ گھر گئی تھی۔ ماتا جی نے کہا منورما تو بڑی دیر کی پنگھٹ پر گئی ہوئی ہے۔ لوٹ کر نہیں آئی میں نے سوچا کہ لاؤ ایک گھڑا میں بھی بھر لاؤں۔ تیرے کارن آئی ہوں۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔

منورما۔ چل یہی سہی۔ لیکن ڈول رسی کیوں نہیں لائی؟

رکمنی۔ اور تیرا ڈول کیا ہوا۔

منورما۔ کنوئیں کے اندر گر گیا۔ یہی سوچ رہی تھی۔ کہ کوئی آجائے تو میں بھی گھڑا بھر لوں۔

رکمنی۔ خوب! کس کے دھیان میں تھی جو رسی چھوٹ گئی۔

منورما۔ دھیان کس کا ہونا تھا۔ تو بھی مجھے چھیڑنے لگی۔ اری سر میں درد تھا۔ چکر آرہے تھے۔ ہاتھ کانپے اور رسی چھوٹ گئی۔

رکمنی۔ ہوں بڑے نخرے ہو گئے۔ روز سر میں درد ہونے لگا۔ تو میری بہن کے بیاہ تک بھی نہیں آئی۔ جی چاہتا ہے۔ کہ تجھ سے کبھی نہ بولوں۔

منورما۔ سچ کہتی ہوں۔ اس دن بھی بہت زور کا درد تھا۔ اس لئے نہ آسکی۔

رکمنی۔ وقت نکل جاتا ہے اور بات رہ جاتی ہے منورما۔ تو جانتی ہے کہ استری کا بیاہ عمر میں ایک ہی دفعہ ہوتا ہے۔ یہ موقع بار بار نہیں آتا۔

منورما۔ ہاں جانتی ہوں بہن اور تجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) تو نے یہ بات دوسروں سے سنی ہے۔ لیکن مجھ پر بیت رہی ہے۔ میں نہ جانوں گی۔ تو اور کون جانے گا ــــ (سسکیاں)

رکمنی۔ ہائیں ــــ تو تو رونے لگی۔ کیا میری کوئی بات بری معلوم

ہوتی ہے؟

منورما۔ مجھے کسی کی بات بری معلوم نہیں ہوتی۔ میرا اپنا ہی جی چاہ رہا تھا۔ کہ خوب آنسو بہاؤں۔

رکمنی۔ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ آنسو بہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔

منورما۔ ہاں۔ تو میری طرح نہیں ہے نا۔ اس لئے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ اور پرماتما کرے۔ تو ان کو کبھی نہ سمجھ سکے۔ تیرا سہاگ ہمیشہ بنا رہے۔

رکمنی۔ اچھا اب میں سمجھی۔ سچ بات یہ ہے منورما۔ تیرے حال پر سبھی کو ترس آتا ہے۔ نہ جانے تیرا پلّہ ایسے کے ساتھ کیوں باندھا۔ جسے جلد ہی اس سنسار کو چھوڑ دینا تھا۔ لیکن اب آنسو بہانے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے سوامی جی اٹھنے سے رہے۔

منورما۔ یہ میں جانتی ہوں۔ اگر وہ جی اٹھے بھی تو میرے نہیں ہو سکتے۔ وہ میرا پلّہ پکڑتے ہوئے ڈریں گے۔ کہ کہیں پھر نہ مر جاؤں۔ لوگ ان سے کہہ دیں گے کہ یہ بڑی پاپن ہے۔ کرموں جلی ہے۔ کسی کی جیون ساتھی نہیں بن سکتی۔ (سسکیں)

رکمنی۔ بس بس۔ چھوڑ ان باتوں کو۔ ہر وقت آنسو بہانے سے جی بھاری ہوتا ہے۔ کوئی اور روگ لگ گیا۔ تو بڑی ہوگی۔

منورما۔ کیا ہوگا۔ بس یہی نا کہ مر جاؤں گی؟ ۔۔۔ بلا سے۔ اس جنجال سے چھٹکارا تو ملے گا۔

رکمنی۔ چل۔ اٹھ۔ گھر چلیں۔ ماتا جی انتظار کر رہی ہونگی۔

منورما۔ اچھا ذرا اور ٹھہر جا۔ رکمنی تجھ سے ایک بات کہنی ہے۔ اگر تو کسی سے ذکر نہ کرے۔

رکمنی۔ اری چل۔ کیا تجھے میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ کہہ کیا کہنا ہے۔

منورما۔ بھروسہ تو ہے۔ مگر ڈر لگتا ہے۔ خیر سن۔ تجھے یاد ہوگا۔ جب برسات میں دریا امنڈ آیا تھا۔ تو ہم لوگ گاؤں کو چھوڑ کر بڑے میدان میں جا بسے تھے۔

رکمنی۔ ہاں۔ نہ جانے کس دیوتا کے سراپ سے وہ بلا ہم پر آئی تھی۔

منورما۔ تجھے یہ بھی یاد ہوگا کہ ہم سب مل کر مندر میں پوجا کے لئے جاتے تھے۔ تو ایک دن ایسا ہوا کہ میں جان بوجھ کر اکیلی گئی۔ اور بہت سویرے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف پنڈت جی مہاراج تھے۔ اور . . . . . .

رکمنی۔ کیوں؟ ۔۔۔ کیا ہوا؟ ۔۔۔ کہتے کہتے کیوں رک گئی۔

منورما۔ کچھ نہیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میں رونے لگی۔ اور اپنے من کی وہ باتیں کہہ دیں جو اُن سے نہیں۔ صرف دیوی سے کہنے کی تھیں۔ اس لئے کہ دیوی کے کان ہوتے ہیں۔ مگر وہ سُن نہیں سکتی۔

رکمنی۔ تو پھر کیا ہوا ۔۔۔ اس میں ڈرنے کی بات کیا ہے؟

منورما۔ (بلند لہجہ میں) وہ کہنے لگے۔ تو اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جا۔ اور دوسرا بیاہ کر کے اپنے من کے مندر کو زندہ دیوتا سے آباد کر لے۔

رکمنی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔ ساری دنیا جنم میں تھوکے گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ کنبہ والوں کی ناک کٹ جائیگی۔

منورما۔ ہاں اسی لئے تو میں نے بگڑ کر جواب دے دیا کہ ایسی باتیں مت کرو۔ اس کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ اور زور سے میری انگلیاں بھینچ دیں۔ میں نے غصہ سے اُن کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ اور بگڑ کر چلی آئی۔ لیکن اس دن سے سوچ رہی ہوں کہ اُن کے ہاتھوں میں کیا چیز تھی۔ جس سے میرے پاؤں تک کپکپا اُٹھے۔ میرا دل ہل گیا۔ سر چکرا گیا۔ (بہت بلند لہجہ میں) اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بڑے زور کا بھونچال آ رہا ہے۔ اور یہ ساری دنیا ڈوبتی ہوئی نیّا کی طرح ہچکولے کھا رہی ہے۔

رکمنی۔ (ٹھنڈا سانس لے کر)۔ انہوں نے بڑی زیادتی کی۔ انہیں ایسا نہیں چاہیئے تھا۔

منورما۔ چاہیئے تھا یا نہیں۔ میں نے یہ نہیں پوچھا۔ ہاں تو مجھے وہ چیز سمجھا دے۔ جو مجھے سمجھنی نہیں چاہیئے۔ لیکن سمجھے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔ مجھے بتا دے۔ پرماتما کے لئے بتا دے۔ جب تیرے سوامی تیرے پاس ہوتے ہیں۔ تیرے ہاتھوں کو چھوتے ہیں۔ تیری انگلیوں کو بھینچتے ہیں۔ تجھے اپنی گود میں لے کر پیار کرتے ہیں۔ (آواز بھرا جاتی ہے) تیرے پہلو میں گدگدیاں کرتے ہیں۔ تیرے گلے میں باہیں ڈال کر ہونٹوں کو چومتے ہیں۔ تو اس آنند سے اس عجیب مزے سے تیری کیا حالت

ہو جاتی ہے۔ تو مر تو نہیں جاتی۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن معلوم کرنا چاہتی ہوں۔

رکمنی۔ (ڈانٹتے ہوئے) ہوش میں آ منورما۔ ایسی بہکی بہکی باتیں مت کر

منورما۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) تو مجھے یہ بتا دے کہ جھوٹ موٹ بگڑ کر منہ پھلا کر اپنے سوامی سے خفا ہو جاتی ہے۔ تو وہ کس طرح تجھے مناتے ہیں۔ اور اگر کھکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ تو کیا وہ بھی خوشی سے ناچ اٹھتے ہیں۔ اس سمے جو سپنا برکھا رت کی سہانی راتوں کے بغیر جاگتی حالت میں تجھے دکھائی دیتا ہے۔ وہ مجھے بھی دکھا دے۔ ایک ہی بار دکھا دے۔

رکمنی۔ بس گھر چل منورما۔ دیکھتی نہیں کتنا اندھیرا چھا گیا ہے۔

منورما۔ تو مجھے وہ سب باتیں سمجھا دے۔ جو میں جاننا چاہتی ہوں۔ پھر میں تجھے سمجھاؤں گی۔ ایک ایسی بات جو میرے سمجھانے کے بعد بھی تو سمجھ نہ سکے گی۔ میں تجھے بتا دوں گی کہ ہر وقت میرے دل کی آگ جوان کنیا کی چتا کے شعلوں سے بھی زیادہ تیز رہتی ہے۔ میرا سارا شریر میری آتما تک اس کی آنچ ہی میں جلتی رہتی ہے۔ لیکن میں جل کر راکھ نہیں ہو جاتی۔

رکمنی۔ ماتا جی انتظار کر رہی ہونگی۔ اب تجھے گھر چلنا ہی چاہیئے۔

منورما۔ میں سنا ہے۔ اور ضرور ایسا ہوا ہوگا۔ آکاش منڈل پر براجمان ہونے والے دیوتا اس دھرتی پر اترے ہیں۔ اور یہاں کی سندر استریوں سے پریم کیا ہے۔ اُن استریوں سے جو اُن دیوتاؤں کی طرح ہمیشہ جیتی نہیں رہتیں۔ (رو کر) لیکن میرے کرم کا لکھا کتنا بُرا ہے۔ میرے لئے کوئی دیوتا بھی نہ اُترے کسی کی ہنسی کی آواز میرے کانوں میں نہ پہنچی۔ سپنے تک میں درشن نہ ہوئے۔

رکمنی۔ تو میرے ساتھ چلتی نہیں۔ میں تجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ پھر بتا کروں تو کیا کروں؟ ماتا جی.....

منورما۔ ماتا جی سے جا کر کہہ دے۔ تمہاری منورما مر گئی۔ جب ندی کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ تو پیاسے کو کنوئیں کی تلاش ہوتی ہے وہ خود دوڑ کر کنوئیں پر جاتا ہے۔ دیوتاؤں نے اس سنسار میں جنم لینا ہی چھوڑ دیا۔ تو پھر میں ہی ان کے چرنوں تک پہنچ جاؤنگی۔ اب زندہ نہیں رہا جاتا۔ اگر ندی میں اتنا پانی نہیں ہوگا جو اپنے اندر ڈبو سکے۔ تو کچھ کھا کر سو جاؤنگی۔

رکمنی۔ نا منورما۔ یہ کبھی مت کہیو۔ ایسا کرنا پاپ ہے۔

منورما۔ پاپ ہے۔ تو نہیں سمجھتی ان باتوں کو۔ جب اس جگت کی ریت ہی پریم سے خالی ہو گئی۔ تو یہاں جنم لینا مہا پاپ ہو گیا۔ اور جب مہا پاپ کر گذرے تو کسی چھوٹے پاپ سے کیوں ڈرا جائے۔ لیکن ابھی تو گھر چلنا ہے۔ ماتا جی انتظار کر رہی ہونگی۔

رکمنی۔ (خوش ہو کر) ہاں ہاں۔ چل۔ جلدی چل۔ وہ سوچ رہی ہونگی۔ آج یہ دونوں کی دونوں کہاں چلی گئیں ــــ

منظر سوم۔ ایک ہفتے کے بعد آدھی رات کو مندر کا پجاری مندر کے اندر دیوی کے سامنے کھڑا ہے۔ کواڑ بند ہیں۔ چھوٹے سے دیئے کی مدھم روشنی میں دیوار پر اس کا مہیب سایہ ناچ رہا ہے۔

پجاری۔ (گڑگڑاتے ہوئے) دیوی! میں تجھے ماتا سمجھتے ہوئے تیری سیوا کرتا رہا۔ آج اس بات کو پورے دس برس ہو گئے۔ میں نے تیرے مندر کو نہیں چھوڑا۔ اور ان باتوں کی طرف دھیان بھی نہیں کیا۔ جو مرد کو اپنے سنہرے جال میں پھنسا لیتی ہے۔ (دروازے پر دستک) حالانکہ لوگوں کو یہ تاک کہتے سنا کہ اس جال میں پھنس جانا ہی زندگی ہے۔

(باہر سے رکمنی کی آواز سنائی دیتی ہے)

رکمنی۔ پنڈت جی مہاراج! دروازہ کھولئے۔

پجاری۔ (خیال نہ کرتے ہوئے) جب میں نے دوسروں کو جو پاپ کرنے سے نہیں ڈرتے چین کی نیند سوتے دیکھا۔ تب بھی میرے دل میں شبہ پیدا نہ ہوا کہ سچائی کا راستہ کونسا ہے۔ میں تیرے ہی چرنوں میں سکھ ڈھونڈتا رہا۔ جسے آج تک نہ پا سکا۔

رکمنی۔ (دستک دیتے ہوئے) مندر میں کوئی ہے۔ کوئی ہے ــــ دروازہ کھولو۔

پجاری۔ لیکن منورما ایک بیکل کر دینے والے سپنے کی طرح میرے آتما پر چھا گئی ہے۔ اب مجھ سے سہار نہیں ہو سکتی۔ پانی سر کے اوپر سے گذر رہا ہے۔ اور مجھے اس کے اندر ڈوب

جانا ہی پڑے گا۔

رکمنی۔ (بہت تیزی سے کواڑ پیٹتے ہوئے) پنڈت جی۔ پنڈت جی آپ موجود ہیں کسی سے بات کر رہے ہیں۔ گر دروازہ نہیں کھولتے جلدی دروازہ کھولئے۔ نہیں تو کواڑ توڑ ڈالونگی۔

پجاری۔ (چونک کر) ہیں! ۔ آج بہت جلدی سویرا ہو گیا۔ پوجا کے لئے لوگ آنے شروع ہو گئے۔ اب نانا بندھ جائے گا۔ پھر میرا نکلنا مشکل ہے۔ لیکن خیر ——

(دروازہ کھول دیتا ہے)

رکمنی۔ آپ کو ہوش آگیا مہاراج! میں پیٹتے پیٹتے تھک گئی۔ جب آپ نے دروازہ کھولا ہے۔

پجاری۔ معاف کرنا بیٹی۔ میں دیوی کے سامنے جھکا ہوا اپنے دھیان میں تھا۔ اس لئے تمہاری آواز سنائی نہیں دی۔

رکمنی۔ اچھا راستہ چھوڑ کر تو ہٹئے۔ مجھے اندر آنے دیجیے۔

پجاری۔ لیکن اندھیری اور یہ سناٹا چھایا ہوا۔ گائیں بیل کے گلے کی گھنٹیاں تک ابھی سو رہی ہیں۔ اور تم اس وقت پوجا کے لئے آئی ہو۔

رکمنی۔ ہاں جانتی ہوں۔ آدھی رات باقی ہے۔ لیکن تم بھی جان لو گے کہ میں کیوں آئی ہوں۔ میں رکمنی ہوں۔ منورما کی سہیلی۔

پجاری۔ اوہ۔ منورما کی۔ منورما کی سہیلی ہو۔ بولو تم کیوں آئی ہے۔ منورما ہے تو اچھی طرح۔

رکمنی۔ اچھی طرح ہو یا نہ ہو۔ تمہاری بلا سے۔ تم نے تو اسکی آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹا دیا نا۔ جس کا پڑا رہنا ہی ٹھیک تھا۔ وہ جب تک نہ جانتی تھی۔ اُسے خیال بھی نہ تھا۔ لیکن آپ نے چھیڑ کر ان امنگوں کو جگا دیا جو اب تک اس کے سینے میں سو رہی تھیں اور شاید ہمیشہ سوتی رہتیں۔

پجاری۔ ٹھیک اس کی طرح میں بھی نہیں جانتا تھا۔ صرف اس وقت سے جاننے لگا ہوں اور ساتھ ہی پچھتا بھی ہوں۔ اسی دن سے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ سمجھ نہیں سکا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور اب سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اپنی ساری شکتی کھو بیٹھا ہوں۔ ہاں ساری شکتی۔ مجھ سے پاپ ہو گیا ہے نا۔ اگر منورما یہاں آجائے تو یہی ہاتھ جوڑ کر اس کے پاؤں پر گر پڑوں۔

رکمنی۔ تم نہیں جانتے وہ پاگل سی ہو گئی ہے۔ بات چیت نہیں کرتی روئے جاتی ہے —— اور ہاں پچھلے سنیچر کی رات ڈیڑھ بجے وہ نالے کے بند پر گئی۔ اور اُسے توڑ ڈالنا چاہا۔ کہتے ہیں کہ کئی بند ٹوٹ گئے۔ اور بہت سا پانی بہ نکلا۔ لوگوں نے پکڑ لیا۔ اور اُسے گھر لے آئے۔ ورنہ وہ ضرور ڈوب جاتی۔

پجاری۔ ڈوب جاتی! لیکن بند کیوں توڑ رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے وہ سچ مچ پاگل ہو گئی ہے۔ پرماتما کے لئے تم جاؤ اور اسے یہاں لے آؤ۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔

رکمنی۔ منورما۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (پاؤں کی چاپ جیسے کوئی گرتا پڑتا آرہا ہو)

منورما۔ (نحیف آواز میں) مہاراج!

رکمنی۔ کون؟ —— منورما؟ اری تو یہاں کیسے؟

منورما۔ اپنا بچن توڑ کر مجھے آنا ہی پڑا۔ میں بہت کچھ سوچ کر آئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ وقت نہیں رہا۔ شاید میں ساری باتیں نہ کہہ سکوں۔

رکمنی۔ میں بھی تیرے ہی کارن آئی ہوں۔ ابھی پنڈت جی سے کہہ رہی تھی کہ اس دن آپ نے برا کیا تھا۔

پجاری۔ میں خود پچھتا رہا ہوں منورما۔ تم دیوی ہو۔ مہادیوی اور میں بڑا پاپی ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔

منورما۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو نہیں کہہ رہی کہ تم نے کوئی پاپ کیا ہے۔

پجاری۔ اور یہ تمہاری ٹانگیں کیوں کانپ رہی ہیں۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ ۔ تم ہو تو اچھی طرح منورما —— اور ہاں تم نے نالے کا بند کیوں توڑا تھا؟

منورما۔ نالے کا بند! —— کسی کو کس طرح سمجھاؤں کہ بند کو توڑ دینا میرے دل کی وہ آخری کامنا تھی جو پوری نہ ہو سکی۔

رکمنی۔ بہت پوچھنے پر بھی کسی کو بتایا ہی نہیں کہ اس میں کونسا بھید چھپا ہوا تھا۔ بند توڑ کر اسے کیا مل جاتا۔

منورما۔ کیا تو بھی اور لوگوں کی طرح ہے رکمنی۔ اتنی سی بات نہ سمجھ سکی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اس مندر میں ایک بار اور آکر دیوی کی پوجا کر لوں۔ جہاں نہ آنے کا بچن دے چکی ہوں۔ اور یہ

اسی وقت ممکن تھا کہ ندی کا پانی پہلے کی طرح امنڈ کر ہماری ساری بستی کو ڈبو دیتا۔ اور ہم سب رام نگر کو چھوڑ کر یہاں بڑے میدان میں آ بستے۔ انتظار کی گھڑیاں کٹیں۔ برسات آئی اور گذر گئی۔ ساون کے اوچھے چھینٹے تپتی ہوئی زمین کی پیاس بھی نہ بجھا سکے۔ پانی کا چڑھ آنا تو بڑی بات تھی۔ پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ندی کا بند توڑ کر میں خود وہ طوفان لے آؤں۔ جس کو قدرت کے ظالم ہاتھ نے روک دیا تھا۔ کیونکہ قدرت بھی سماج کی طرح ایک بیوہ کی آس توڑ دینے کے لئے تلی رہتی ہے۔

رکمنی۔ لیکن تو ویسے ہی آ جاتی تو تجھے کون روکتا۔ جیسے اب آگئی ہے۔

(منورما چکرا کر گر پڑتی ہے)

منورما۔ ہائے ہائے اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ رکمنی! میں نے زہر پیا تھا۔ جو اپنا کام کر چکا ہے۔ ہائے ..... مجھے گھسیٹ ـــ ابھی بہن مجھے گھسیٹ کر ـــ دیوی کے قریب ......آہ! ... یہ میرا آخری بلیدان ... ہائے ... دیوی ... دیوی .... میرے پاس وقت نہیں رہا .... وقت نہیں رہا۔

پجاری۔ (گھبرا کر) ارے ـــ ارے! یہ کیا ـــ یہ تو مر گئی ـــ اتنی جلدی ... اُف زہر ... منورما نے زہر۔

رکمنی۔ (روتے ہوئے) منورما ـــ میری منورما۔ تو مر نہیں سکتی۔ میں تجھے مرنے نہیں دونگی۔ (گرج کر پجاری سے) جا پاپی باتیں نہ بنا۔ بھاگ کر جا۔ کسی نہ کسی وید کو دیکھ۔ میں اسے مرنے نہیں دونگی۔

پجاری۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ بھگوان جانتے ہیں کہ منورما نردوش تھی۔ اور میں پاپی۔ مہا پاپی (رونے لگتا ہے)

رکمنی۔ پاپی ـــ ہاں پاپی ـــ ستیاناس ہو تیرا پنڈت۔ نردئی راکشش۔ تجھ پر پھٹکار پڑے۔ دیوتا تجھے سراپ دیں۔ تیری موت بھی اسی طرح ہو۔ اس ہتیا کا بوجھ تیری گردن پر رہے۔ اگلے جنم میں بھی تجھے سکھ نصیب نہ ہو۔ اب ٹسوے گھلانے بیٹھا ہے۔ تیرے آنسو اسے زندہ کرنے سے رہے۔

پجاری۔ (غمگین لہجہ میں) جس قدر چاہو مجھے کوس لو۔ خوب جی بھر کر کوس لو۔ میں اسی جوگ ہوں کہ سنسار کے سب رہنے والے مل کر مجھے سراپ دیں۔ پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ دھرتی کے ناگ مجھے ڈس لیں۔ ندی کا پانی مجھ اپرادی کو ڈبو دے۔ اور وہ سب کچھ ہو جو نہ ہونا چاہیئے۔

رکمنی۔ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اس جگ میں مرد ذات کے لئے دکھ کا نام نہیں۔ وہ پاپ کرنے پر بھی سکھ کی نیند سوتا ہے۔ کچھ دیر چیخ کر۔ چلا کر۔ آنسو بہا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ جس طرح آندھی کے بعد مینھ کا ذرا سا چھینٹا سمے کو سہاونا بنا دیتا ہے۔ اسی طرح آنسوؤں کی ریل پیل اس کی سوگواریوں کو بہا کر اسے پھر ہنس مکھ بنا دیتی ہے۔

پجاری۔ نہیں نہیں۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ اگر میں بلیدان نہ دوں تو میری آتما بھٹکتی پھرے گی۔ اور وہ بلیدان خود میں ہوں۔ جلدی ہی تم دیکھ لوگی کہ ہوا کے جھونکے میرا سانس نہ بن سکیں گے۔ رکمنی! تم جاؤ اور منورما کی ماتا کو خبر کر دو۔ کہ منورما اب اس سنسار میں نہ رہی۔ لوٹ کر آنے پر تم دیکھو گی کہ ایک نہیں دو ارتھیاں بنائی ہیں۔

رکمنی۔ میں منورما کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

پجاری۔ (دھیان نہ کرتے ہوئے) میں نے دیوی کو دو وچن دیئے تھے۔ ایک یہ کہ کبھی کسی استری کو بری آنکھ سے نہ دیکھوں گا۔ اور دوسرا یہ کہ اگر ایسا پاپ ہو گیا۔ تو پھر اس سنسار میں نہیں رہوں گا۔

رکمنی۔ ٹھیک ہے۔ تمہارا پہلا وچن ٹوٹ گیا۔ اس لئے دوسرا وچن پورا کرنا ہی پڑیگا۔ لیکن میں منورما کی ماتا جی سے کیونکر کہونگی۔ میری زبان بند ہو جائیگی۔ میرے ہونٹ سل جائیں گے۔ میری آواز نکل نہ سکے گی۔

پجاری۔ کچھ بھی ہو تمہیں جانا ہی پڑیگا۔ میں چلا جاتا۔ لیکن نہیں جا سکتا۔ (تیزی سے) مجھے یہاں کے سب کام دیوی کو سونپنے ہیں۔ یہ پتھر کی بے جان مورت ہے تو ہوا کرے۔ ہے تو دیوی۔ ساری دنیا نے اس کو پوجا ہے۔ اب اس کو اپنی جگہ سے اٹھنا ہی پڑے گا۔ مندر کی گھنٹیاں بجانی ہونگی۔ اور سنکھ بھی۔ شام کو دیئے جلانے پڑینگے۔ جھاڑو دینی ہوگی۔ اور وہ سب کچھ جو میں کرتا رہا ہوں۔ اسے کرنا پڑے گا۔ یہ دیوی ہے۔ لیکن منورما سے زیادہ بڑی دیوی نہیں ہے۔

فضل حق قریشی

مغنّیہ

ساحرہ اک گا رہی ہے دل رُبا آواز میں !!
زخم خوردہ روح کوئی مضطرب ہے ساز میں

سوز کی تشریح کرتے ہیں خطوطِ آواز کے
ٹوٹتے جاتے ہیں ٹانکے "دل میں پنہاں راز کے"

گیت کی رَو میں درخشاں ہلکے ہلکے رنگ ہیں
گُم شدہ خوابوں کے جلوے شاملِ آہنگ ہیں

عشق کا آہوں بھرا موسم ہے لہراتا ہوا !
زلف و رُخ کا بتکدہ ہے آنکھ جھپکاتا ہوا

ننھی ننھی سیپیاں، موتی، سمندر کا اُفق !
جنگلی صد رنگ خودرو پھول، افسانے، شفق !

شعلۂ فطرت بُت گروں کے ناتراشیدہ خیال
شاعروں کے ذہن میں گوندھی ہوئی روحِ جمال

اس طرح گھُل مِل گئے ہیں بہتے ہوئے نغمات میں
زہرہ و ناہید کے جلوے ہوں جیسے رات میں

ہو گیا ہے اس قدر احساس نغمہ بیکراں !
بن گیا ہے گیت فرش و عرش کی روحِ رواں

تھم گیا ہے وقت بھی ظالم کو سُننے کے لئے
جس طرح ٹھہرے مسافر پھول چُننے کے لئے

عدمؔ



ایشیا

ایشیا سب سے بڑی، سب سے مقدس سرزمیں
مشرقِ حسنِ ازل صبحِ نشأۃِ اوّلیں

جس کی وسعت، اک تہائی ارضِ عالم پر محیط
جس کا ہمسر اور کوئی برِ اعظم ہی نہیں

ایشیا، دنیا کا وہ حصّہ، وہ میدانِ وسیع
بحر و بر، کہسار و صحرا سب ہیں جس کے ہمنشیں

ایشیا وہ خطۂ ممتاز جس کی خاک سے
چار، دنیا کے بڑے مذہب ہوئے صورت گزیں

وہ عرب سے تا عجم اور ہند سے جاپان تک
اک مسلسل کائنات، اک مستقل حسنِ حسیں

کرشن "گوتم" اور مسیحؑ و مصطفیٰؐ کی جلوہ گاہ
مہبطِ عرفان و ایقاں مرکزِ دنیا و دیں

اس کا جادہ ہے براہِ راست بامِ عرش تک
سب کنشت و کعبہ و دیر و کلیسا ہیں یہیں

اس میں ہندوستان ہے اک ساحلِ امن و نجات
کوثر و تسنیم سے معمور اک خلدِ بریں

جس کی خوشحالی سے ہے تاریخِ ماضی گلفشاں
جس کی بربادی سے ہے تقویمِ حال اندوہگیں

ایشیا کی وسعتیں معمورۂ نیرنگ ہیں
بزم آرائی کہیں ہے، رزم آرائی کہیں

مادرِ گیتی کا یہ صد رنگ اک کاشانہ ہے
جس میں خود رہتی ہے فطرت یہ وہ فطرت خانہ ہے

ہاں مری نظروں میں ہے حالِ خرابِ ایشیا
جانتا ہوں وجہِ درد و اضطرابِ ایشیا

ہر سحر کرتی رہی ہے اک نیا اعلانِ جنگ
خون برساتا رہا ہے آفتابِ ایشیا

ہمعنانِ ایشیا طوفان و عدوان و فساد
وہ بغاوت وہ تشدد ہمرکابِ ایشیا

خونِ انساں سے بھرا جاتا تھا ہر ذرے میں رنگ
تھا جنوں خیز و جنوں پرور شبابِ ایشیا

نغمۂ امن و سکوں سے انجمن محروم تھی
جاں ستاں تھا نالۂ چنگ و ربابِ ایشیا

لیکن اب تو کچھ دنوں سے رنگِ محفل اور ہے
مطلقاً احساس و بیداری ہے خوابِ ایشیا

جس کے پردے میں قدامت کی پرستش تھی روا
اٹھتا جاتا ہے وہ بوسیدہ حجابِ ایشیا

اب وہ سب باطل کی موجیں جذبِ ساحل ہو چکیں
اب حقیقت کا سمندر ہے سرابِ ایشیا

اب غلامی کے وہ آثارِ کہن مٹنے کو ہیں
ہے بدلنے کو مزاجِ رنگ و آبِ ایشیا

ناتمامی عہدِ ماضی کی ہوئی ماضی میں دفن
دورِ موجودہ ہے دورِ کامیابِ ایشیا

عارضی وہ انقلابِ عالمِ ایجاد تھا
"ایشیا" آزاد ہوگا "ایشیا" آزاد تھا

سیماب اکبرآبادی

جاپانی طالب علم کا لطفِ زندگی

جاپان میں یونیورسٹی کی زندگی ایسی پرکیف اور آزادانہ نہیں ہے جیسی امریکہ یا یورپ میں۔ طالب علم کی وردی جس طرح ایک نوجوان کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث ہوتی ہے ویسے ہی بہت سی پابندیاں بھی عائد کر دیتی ہے مثلاً وہ ناچ گھر میں نہیں جا سکتا۔ ناچ گھر کے مالک یہ کہتے ہیں کہ اس ممانعت میں طالب علم ہی کا فائدہ ہے۔ یہ پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ ناچ گھروں میں وقت صرف کرے گا تو اس کے مطالعے میں ہرج ہو گا۔ ان کی ہمدردانہ رائے بے غرضی پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ یہاں عموماً خوشحال لوگ آتے ہیں جو نوجوان لڑکوں کے ساتھ تفریح کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ابھی تک والدین کی نگرانی میں ہیں۔ اور اپنے اخراجات کی خود کفالت نہیں کر سکتے۔ ناچ گھر والوں کو ان کے آرام کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ان کی آمدنی ماری جاتی ہے ؁

طلباء کے لئے شراب خانے کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ انہیں لڑکیوں سے ملنے جلنے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ وہ چائے خانوں اور دودھ خانوں میں جاتے ہیں تو ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنا وقت اور ماں باپ کا روپیہ ضایع کر رہے ہیں۔ جب سے ابتدائی مدرسے سے فارغ ہوئے امتحانوں کی بلا مسلط ہو گئی۔ خواہ مڈل اسکول ہو خواہ ہائی اسکول خواہ یونیورسٹی سخت سے سخت داخلے کے امتحان پاس کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے لئے صرف دو مشاغل ہیں جنہیں وہ کھیل کے میدان میں یا جماعت کے کمرے میں پورا کر سکتے ہیں ؁

یہاں ایک طالب علم کی دلچسپیوں کا حال خود اس کی زبانی بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس کا باپ تجارتی کاروبار کرتا ہے۔ جس کی آمدنی دو تین ہزار ین ماہوار رہتے یونیورسٹی میں شعبۂ قانون میں پڑھتا ہے۔ گھر شاندار ہے۔ جس میں مغربی وضع کا ایک کمرہ اس کی نشست گاہ ہے۔ وہ مغربی موسیقی کا بڑا دلدادہ ہے۔ خود گانا بجانا کچھ نہیں جانتا۔ تاہم مغربی موسیقی کا بڑا قدردان ہے۔ اس بارے میں اس کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ بے شمار کتابیں پڑھ چکا ہے۔ جن میں بڑے بڑے موسیقی نگار استادوں کے تذکرے شامل ہیں۔ گفتگو میں ایک ماہرِ فن کی طرح موسیقی کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ ایک قیمتی وکیٹر گراموفون اس کے کمرے کی زیبائش ہے۔ رکارڈوں میں سمفنی آرکسٹرا کا بڑا مجموعہ شامل ہے۔ جن میں سے ایک ایک ارکسٹرا کے تین تین چار چار ریکارڈ ہیں۔ جو الگ الگ خانوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے والد اسے چالیس ین ماہوار جیب خرچ کے لئے دیتے ہیں ؁

اس کا بیان ہے کہ میں دوسرے متوسط درجے کے لڑکوں کا حال تو جانتا نہیں۔ مگر ہم چند لڑکوں کی زندگی جو امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں مزے سے بسر ہوتی ہے۔ والدین کا برتاؤ میرے ساتھ اچھا ہے۔ اگرچہ والد کی سختی ناگوارِ خاطر ہوتی ہے۔ بہرحال طالب علم کے پاس روپیہ نہ ہو تو اس کی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ والد میرے ساتھ بڑی کنجوسی برتتے ہیں۔ جب کسی خاص ضرورت کے لئے روپیہ درکار ہوتا ہے تو وہ حساب لگاتے ہیں۔ اور حساب میں کم سے کم جو خرچ نکلتا ہے وہ مجھے دیتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سال موسم گرما کی تعطیل میں میں ہکیدو کے سفر پر گیا تھا۔ انہوں نے آنے جانے کا تیسرے درجے کا ریل کا کرایہ لگایا۔ اور سفر میں کھانے کے لئے پلیٹ فارم پر سینڈوچ خرید کر کھانے کو کہا۔ کچھ فالتو روپیہ ٹیکسی کے کرایہ کے لئے اور سگریٹ پینے اور دو تین مرتبہ سینما دیکھنے کے لئے دے دیا۔ ہکیدو میں مجھے ایک عزیز کے گھر میں ٹھہرنا تھا۔ اس لئے

والد کے نزدیک مجھے زیادہ روپے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ تیسرے درجے میں سفر کرنا تو کچھ ہضا لقے کی بات نہیں۔ مگر سونے کی برتھ بغیر رات کیسے گزاری جا سکتی تھی۔ پھر ریل کی کھانے کی گاڑی میں ایک آدھ دفعہ کھانا نہ کھایا۔ تو سفر ہی کیا آیا۔ مجبوراً مجھے والد سے اور روپیہ مانگنا پڑا۔ والد جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ مجھے ماہوار دیتے ہیں اس کے علاوہ میں عموماً والدہ سے کچھ نہ کچھ لے لیتا ہوں۔ اس کے بغیر گزارا ہی نہیں ہوتا۔ ہم سب یہی کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست کو جتنا جیب خرچ والد دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ بہنیں والدہ سے وصول کر لیتا ہے۔

اس سال موسم گرما میں ایک دوست کے ساتھ کیوشو اور کوریا کے سفر پر جا رہا ہوں۔ خوش قسمتی سے ہم دونوں میں سے کسی کا رشتے دار اُن نواح میں نہیں رہتا۔ ہم سراؤں میں ٹھہریں گے۔ اور پوری آزادی نصیب ہو گی۔ ہم تفریح کے سفر میں زیادہ روپیہ خرچ نہیں کرتے۔ دراصل ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم خرچ بالانشین تھوڑی سے تھوڑی رقم میں زیادہ سے زیادہ لطف اٹھائیں۔ اور جتنا روپیہ بچ سکے توکیو میں خرچ کرنے کے لئے بچا لائیں۔ کیونکہ یہاں کی بابت ہمیں معلوم ہے کہ روپے سے کتنا لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ہم محض طالب علم ہیں۔ اور سب لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہے۔ ویسا ہی وہ برتاؤ کرتے ہیں۔ پھر ہمیں اجنبی شہر میں روپیہ خرچ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہمارے لئے سفر کا مزہ اسی میں ہے کہ سستے داموں سب لطف اٹھا لیں۔ والدہ مجھے کچھ روپیہ اس خیال سے دے دیتی ہیں کہ سستی اور گندی سراؤں میں قیام کرنے سے چھٹکارا ہو جائے۔

کوریا میں ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ وہاں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ البتہ کوہ کونگو پر چڑھنا ہے۔ ہاں موقع ملا تو ایک لڑکی سے بھی ملوں گا۔ جس سے پچھلے سال دوستی ہوئی تھی۔ وہ توکیو اکاڈمی میں موسیقی کی طالبعلم ہے میری چچا زاد بہن نے موسم خزاں میں تعارف کرایا تھا۔ جب سے ہم دونوں کی دوستی ہو گئی۔ کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ اور موسیقی پر بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان خط و کتابت نہیں ہوتی۔ اس کے ماں باپ پسند نہیں کرتے۔ کہ وہ کسی لڑکے سے خط و کتابت کرے۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرے والدین کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ میری چچا زاد بہن اور وہ ایک ہی مدرسے میں پڑھتی ہیں۔ جب کبھی وہ ملنے آتی ہے تو میری بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ میری چچا زاد بہن نے میرے سفر کوریا کا حال اُسے لکھ دیا ہے۔

ہم دونوں ایسے شریف گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو پارینہ خیال کے لوگوں سے زیادہ روشن خیال ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے تعلقات کی موجودہ روش کو سمجھتے ہیں۔ اگر ہم دونوں اپنے والدین کے آگے ایک دوسرے کا ذکر کر دیں تو وہ بُرا نہیں مانتے۔ البتہ خط و کتابت کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم دونو چچا زاد بہن کے ذریعے سے اپنے پیغام پہنچاتے ہیں۔

یونیورسٹی میں دل بہلانے کے لئے بہت سی کلبیں ہیں مثلاً انگریزی گفتگو کی کلب، کلب تفنن طبع، پیدل سفر کی کلب، وغیرہ وغیرہ مگر میں ان میں سے کسی کا رکن نہیں ہوں۔ ہم لوگوں کی الگ کلب ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ اور ہم خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم سب پڑھائی میں محنت کرتے ہیں اور جماعت کے اچھے لڑکوں میں شمار ہوتے ہیں۔

میں اکثر اپنے دوستوں کے ہاں آتا جاتا ہوں۔ اور رات کو وہاں ٹھہر بھی جاتا ہوں۔ ایک دوست کے پاس میرا دل بہت لگتا ہے۔ کبھی اس کے ہاں ٹھہرنے کی اجازت مل جاتی ہے اور رات بسر ہوتی ہے۔ تو بڑے مزے سے گزرتی ہے۔ ہم دونو چوری سگریٹ پیتے ہیں۔ مگر جب اس کے والد دفتر چلے جاتے ہیں۔ تو وہ ان کے کمرے میں سے مٹھی بھر کر ویسٹ منسٹر سگریٹ نکال لاتا ہے۔ صبح کے وقت ہم اکثر جاپانی شطرنج کھیلتے ہیں یا کیمرے سے تصویر اتارتے ہیں۔ یا کسی موضوع پر بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ سہ پہر کو کسی دوست سے ملنے کے بہانے ہم گینزا چلے جاتے ہیں۔

طلباء کو شراب خانوں اور ایک خاص قسم کے چائے خانوں میں جانے کی ممانعت ہے۔ ہم اکثر سہ پہر کو کمونو پہن کر گینزا جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم شراب خانوں میں جانے کے لئے یہ لباس پہنتے ہیں۔ بلکہ وہاں جانے کی تو ہم میں مقدرت ہی نہیں وہاں کی خاصہ برداریں گاہکوں سے روپیہ خرچ کرانا خوب جانتی ہیں اور ہم انہیں خاطر خواہ انعام دے نہیں سکتے۔ فضول خرچ آدمیوں ہی کی وہاں خاطر ہوتی ہے۔ ہم عموماً مخصوص چائے خانوں میں جاتے ہیں اور اگر خواہش ہو تو بیئر منگاتے ہیں۔ یہاں سب چیزیں مہنگی ملتی ہیں۔

مگر خاصہ برداریوں کو انعام دینے کی ضرورت نہیں۔ لڑکیاں ہمارے پاس آبیٹھتی ہیں۔ مگر کبھی شراب پینے کی خواہش ظاہر نہیں کرتیں۔ ہم کوئی آدھ گھنٹہ باتوں میں جی بہلاتے ہیں۔ پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی جگہ جانے سے پہلے ہم حساب لگا لیتے ہیں۔ کہ کتنا روپیہ خرچ کرنا ہے۔

ایک مرتبہ میرے دو دوست چھٹی بسر کرنے کماکورہ گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے روپیہ ختم ہو گیا۔ اور وہ روپیہ لینے ٹوکیو واپس آئے یہاں پہنچے تو گنزا کا پرانا چائے خانہ یاد آگیا۔ بلا سوچے سمجھے اس جانب چل پڑے۔ دونوں کے پاس ملا کر صرف ہونے دو ین تھے۔ وہاں جا کر ایک بوتل بیئر کی منگائی۔ اور ایک آدمی کے لئے سینڈو تچ آدھے آدھے دونوں نے کھائے۔ وہاں سے نکلے تو جیب بالکل خالی ہو چکی تھی ٹیکسی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ پیدل گھر جانے کی ٹھانی۔ پھر کچھ مشورہ کرکے میرے گھر کی جانب روانہ ہوئے فاصلہ اس قدر طویل تھا کہ اتنے چلا کئے علی الصباح میرے مکان پر پہنچے۔ مجھے والدہ سے ان کا حال بیان کرنا پڑا تب ناشتہ ملا۔ ناشتہ کھا کر دونوں ایسے پڑے کہ دوپہر کو جھنجھوڑنے سے اُٹھے۔ دوپہر کو ہم نے مل کر حمام کیا۔ کھانے پر بام مچھلی اور چاول تھے خوب پیٹ بھر کر کھائے۔ سہ پہر کو دونوں رخصت ہوئے۔ اور سیدھے اپنے اپنے گھر گئے۔ وہاں سے روپیہ لیا اور پھر کماکورہ پہنچے۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو اس واقعے کی یاد پر خوب قہقہے اُڑتے ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل انہی میں لطفِ زندگی ہے۔

ہم لوگ کبھی کبھی اپنے اپنے خاندانی حالات کا بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے باپوں سے زیادہ ماؤں سے زیادہ ہمدردی ہے۔ میرا ایک دوست کہتا ہے۔ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے والد کو کاروبار تجارت میں اتنی ترقی کیوں نصیب ہوئی۔ وہ وثوق کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ ضرورتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے میرے والد میں نہ تو غیر معمولی دماغی قابلیت ہے نہ کاروبار کی نمایاں اہلیت۔ مجھے خود اپنے والد کی قابلیت پر شک ہوتا ہے۔ میں اپنی رائے ان کے سامنے ظاہر کرتا ہوں۔ تو وہ جز بز ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میں اتنا روپیہ نہ دوں تو تمہیں آرام میسر نہیں آسکتا۔ مجھے اس سے انکار نہیں مگر مسئلہ زیر بحث دوسرا ہے۔ بہر حال ہم میں سے اکثر کو ماؤں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہے ؂

اپنے احباب سے ملنے جلنے جاتا ہوں تو اکثر بڑے دلچسپ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ میرا ایک دوست لکھ پتی کا لڑکا ہے اس کا باپ کئی برس ہوئے مر گیا۔ اور وہ تمام جائداد کا وارث ہوا۔ اب وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے گھر کی نوکریں سب پرانے دستور کے مطابق بڑی سدھی ہوئی ہیں۔ ہم دسترخوان پر بیٹھے ہوں تو اپنے ہاتھوں کو اس قدر بلند کرکے کھانا پیش کرتی ہیں۔ گویا دو نوابوں کی خاصہ برداری کر رہی ہیں۔ بڑے تکلف سے باتیں کرتی ہیں۔ اور پرانے دستور کے مطابق بڑی نزاکت سے چلتی پھرتی ہیں۔ میں ایسے تکلفات کا عادی نہیں ہوں اور اکثر گھبرا اُٹھتا ہوں۔ پچھلے جاڑے میری ایک رات اس کے گھر میں بسر ہوئی۔ صبح کو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوکر میرا بنیان اور دوراز برقی انگیٹھی پر گرم کر رہی ہے۔ گویا کہ میں بڑا لاڈلا بچہ ہوں۔ اصطبل میں ایک بڑی نفیس موٹر گاڑی ہے۔ مگر میرے دوست کو چلانے کی اجازت نہیں۔ اس کی والدہ کا خیال ہے کہ خانگی گاڑی لڑکے کے چلانے کی نہیں ہوتی ؂

ہماری یونیورسٹی کے نصف طلبا رناچنے کے شوقین ہیں۔ اور کچھ نوناچ کے متوالے ہیں۔ کرائے کی رقاصاؤں اور خاصہ برداریوں کی صحبت میں زیادہ وقت گزارنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض خوبصورت اور طبّاع ہوتی ہیں۔ مگر طبیعت جب ان سے ملنے جلنے کی عادی ہو جاتی ہے تو ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ وہ آپ کے ساتھ سگرٹ پی لیں گی۔ جاز موسیقی کا کوئی گیت سنا دیں گی۔ سینما پر گفتگو کر لیں گی اور بس۔ اس کے آگے کچھ نہیں جانتیں۔ انہیں سمفنی موسیقی کی ابجد کا بھی کوئی علم نہیں جن باتوں میں دماغ کو کام میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سے وہ محض نابلد ہوتی ہیں۔ ذرا سنجیدگی سے بات کرو۔ تو وہ گھبرا اٹھتی ہیں۔ بس وہ صرف اس کام کی ہیں کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ گپ شپ کریں۔ شریف خاندان کی لڑکیاں ان سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔

ناچنے کے شوقین طلبا مغربی سوشل رقص کے پرستار ہوتے ہیں۔ جو اکثر رقص گاہوں میں جاتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس کپڑوں کے باقاعدہ جوڑے بنے ہوتے ہیں۔ کیونکہ طلبا کی وردی میں ان کو داخلے کی اجازت نہیں ملتی۔ میرا ایک دوست بورڈنگ ہوس میں رہتا ہے۔ اسے خرچ کے لئے ڈیڑھ سو ین ملتے ہیں۔ وہ اس میں

سے ایک بڑی رقم رقص میں خرچ کرتا ہے۔ وہ محنتی طالب علم ہے اور جماعت میں اچھے نمبر پاتا ہے۔ مگر وہ درزیوں اور موچیوں کا ہمیشہ قرضدار رہتا ہے۔ اس کے بال بکھرے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ بھدی وردی پہنے رہتا ہے۔ جب ناچ گھر میں جاتا ہے۔ تو بڑا وضعدار سوٹ زیب تن ہوتا ہے۔ اور بڑے خوش وضع بال بناتا ہے۔ وہاں دل بھر کے ناچتا ہے۔ اور دس پندرہ ین خرچ کر دیتا ہے اس سے اس کا دماغی توازن درست ہو جاتا ہے۔ اور ایک ہفتے تک مطالعے میں خوب محنت کرتا ہے۔

اکثر طلبا ہفتے میں دو ایک بار سینما جانے کی مقدرت رکھتے ہیں۔ اور یہ تفریح ان میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ان کے علاوہ بارہ مہینے بیس بال کے میچ ہوتے رہتے ہیں۔ اور دیگر تفریحات کی بھی کمی نہیں۔ بہرحال ہماری زندگی بڑے لطف سے گذرتی ہے کوئی تکلیف ہے تو جیب خرچ کی کمی کی۔ ہمیں بڑی احتیاط سے خرچ کرنا پڑتا ہے کہ تمام مہینہ چل جائے۔ پھر بھی ہم میں سے اکثر آخری ہفتے میں دیوالیہ نظر آتے ہیں۔

نورالحسن برلاس

رباعی

جب یاد تری آ کے رلا دیتی ہے
سوئے ہوئے دل کو جگا دیتی ہے
یوں سوئے ہوئے بربط کا تار
جیسے کوئی اک موج نسیم جھنجھنا دیتی ہے

سید احمد اعجاز

دھوکا

(سانیٹ)

تم نے کیوں دیکھا مری جانب نگاہِ ناز سے
مجھ کو یہ دھوکا ہوا بیدار قسمت ہو گئی
وہ نگاہِ ناز جس سے سینکڑوں پردے اٹھے
داغِ ناکامی مرے دامانِ دل سے دھو گئی

ہو گیا خونِ تمنا میری رگ رگ میں رواں
فتنے جو سوئے ہوئے تھے لیکر انگڑائی اٹھے
چھا گیا دنیا پر افسونِ شبابِ جاوداں
بے نیازِ ہوش ہو کر مست و سودائی اٹھے

تم نے دیکھا ہے اگر مجھ کو نگاہِ لطف سے
بخت خوش ہے سارا زمانہ ہے تو میں غم کیا کروں
جلوہ گر ہر دم رہو میری نظر کے سامنے
دیکھنے کی تاب ہے جب تک نہیں دیکھا کروں
دل لیا ہے روح بھی لے لو خدا کے واسطے
میں تمہارے واسطے ہوں تم ہو میرے واسطے

ضیا فتح آبادی ایم۔اے

جمالِ سلمیٰ

(مری کی صنوبرستانی راتوں میں)

مری کی ہر سبز پوش وادی ہواؤں سے تھرا رہی ہے!
صنوبرستاں کے دامنوں میں، نسیم بربط بجا رہی ہے!
شمیم گل موجِ بے خودی بن کے روح کو گدگدا رہی ہے!
مگر مرے دل کی دھڑکنوں سے صدا یہ رہ رہ کے آ رہی ہے!
"اَحِنُّ شوقاً اِلیٰ دیارٍ لقیتُ فیہا جمالَ سلمیٰ!
کہ می رساند ازیں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما؟"

بہار کی چاندنی فضا میں روپہلی کرنیں لٹا رہی ہے
جو غنچہ ہے مسکرا رہا ہے جو شاخ ہے لہلہا رہی ہے
ہوائے کشمیر منظروں میں شگفتگی سی بسا رہی ہے
مگر مری روح دکھ بھری لے میں اس طرح گنگنا رہی ہے
"اَحِنُّ شوقاً اِلیٰ دیارٍ لقیتُ فیہا جمالَ سلمیٰ
کہ می رساند ازیں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما!"

اختر شیرانی

ـہ جامی رحمۃ اللہ علیہ

برابر کی چوٹ

ارکانِ ڈرامہ:۔

(۱) ارشد ـــــ ایک رئیس زادہ
(۲) شہداد ـــــ ارشد کا دوست
(۳) طلعت خانون ـــــ ایک دوشیزہ
(۴) شبرانی ـــــ ارشد کا ملازم

شہداد۔ مگر شبرانی آخر انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ غضب ہے ۱۲ بجے سے بیٹھا راہ دیکھ رہا ہوں۔ اور اب تک میاں ارشد یہاں تشریف ہی لاتے ہیں نہیں آتے۔

شبرانی۔ حضور پہلی ملاقات جو بہت ہوئی۔ ملتے ملاتے دیر ہو ہی جانا چاہیئے۔ اب جہاں آنا گیا ہے۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر جائیے۔ یہ بھی تو آپ کا گھر ہے۔

شہداد۔ ہاں یہ کہو ارشد کی صحت آجکل کیسی ہے۔

شبرانی۔ کچھ یونہی ہے سرکار۔ نہ چنگے بھلے ہیں نہ روگی۔ ان کی صحت کچھ ڈبدا میں پھنسی رہتی ہے۔

شہداد۔ اور تمہارا خیال ہے۔ میرے ٹھہرنے سے اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔

شبرانی۔ ہاں حضور بات یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی بات آپ سوا کسی سے نہیں کہتے۔ وہ کچھ پریشان سے ہیں حضور۔ اور آپ ہی ہیں جو انہیں اس جھنجٹ سے نکالیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (دھیمی آواز) اور سنیئے گھنٹوں اکیلے بیٹھے آپ سے آپ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ حضور جانتے ہیں یہ کچھ اچھی علامت نہیں۔ اللہ بخشے میری خالہ کی بھی یہی حالت ہو گئی۔ تو بیچاری پاگل خانہ جا کر مری۔

شہداد۔ اوہو۔ یہاں تک حالت پہنچ گئی ہے۔ اور مجھے آج خبر ہوئی۔ تو بھائی کہیں تو قیامت تک یہاں سے جانے کا نہیں مجھے ایک صاحب سے ملنا تھا۔ انہیں میں ٹیلیفون کئے دیتا ہوں کہ مجھے معاف رکھیں۔ کہاں ہے فون؟

شبرانی۔ اب کیا عرض کروں۔ فون تو اٹھا دیا گیا۔ میاں کہتے تھے اس کی آواز کانوں کو بھلی معلوم نہیں ہوتی۔

شہداد۔ یعنی طبیعت اتنی نازک ہو گئی۔ دماغ اس قدر کمزور ہو گیا۔ اچھا تو میں ۹ بجے جیمخ سے پیغام دے کر ابھی آتا ہوں۔

(جاتا ہے)

شبرانی۔ نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔ ایلو۔ میاں بھی آ گئے۔ کیا کہتے ہیں ذرا سنوں۔

ارشد۔ اپنے آپ باتیں کئے جانا اچھی عادت نہیں۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔

شبرانی۔ کیا فرمایا حضور نے؟

ارشد۔ شبرانی کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو بولا تک نہیں۔

شبرانی۔ میں سمجھا کوئی حکم دے رہے ہیں۔ حضور میرزا شہداد

آئے تھے۔ حضور سے ملنے کے لئے بڑی دیر تک بیٹھے
رہے۔ اب ذرا باہر گئے ہیں۔ خدا عمر دراز کرے۔ آپ ہی گئے
ہیں چار کی دیکھ بھال کروں۔

شہزاد۔ ارشاد! خانہ پر جہاں گذاشت اسی کو کہتے ہیں۔ ہفتوں شکل نہیں دکھاتے۔ خاصے عید کا چاند ہو گئے تم۔ خیر کہو کیسے ہو چہرا تو اترا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میاں کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا ہوتا۔

ارشد۔ اچھا مجھے تو اس کا دھیان تک نہ آیا۔

شہزاد۔ کوئی خاص شکایت تو نہیں۔

ارشد۔ بھول بھلیوں میں پھنس گیا۔ نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

شہزاد۔ کچھ روپے پیسے کا جھگڑا ہے۔

ارشد۔ اس سے بدتر ایک لڑکی کے بالوں میں الجھ گیا ہوں۔

شہزاد۔ یہ تنہا خوریاں کب سے حضرت! اچھا ذرا اپنی پریم کہانی تو سنایئے۔

ارشد۔ کوئی لمبی داستان نہیں۔ ہوا یہ کہ چند دن ہوئے ۱۲ بجے چوک کی نکڑ پر اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔

شہزاد۔ اور تم رات کے ۱۲ بجے چوک میں گھوم رہے تھے۔

ارشد۔ کون کہتا ہے رات کو ارے میاں دن کو۔ دن کو۔

شہزاد۔ یعنی تم دن دہاڑے ایک اجنبی عورت کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ کوئی دیکھتا تو کیا کہتا۔

ارشد۔ پہلے بات سن لو پھر لیکچر دینا۔

شہزاد۔ اچھا کہو۔

ارشد۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی۔ اور میں اس سے چند قدم کے فاصلہ پر چل رہا تھا۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا۔ کہ اس کا رومال زمین پر گر گیا۔

شہزاد۔ اور تم جھٹ اٹھا کر گرد جھاڑ کر اس کے سامنے لے گئے۔

ارشد۔ میں کیا۔ تم ہوتے تو ایسا ہی کرتے۔

شہزاد۔ پھر۔

ارشد۔ پھر کیا۔ بس ایک آنکھ دیکھنا تھا۔ کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور اس کی محبت کی لہر میری رگ رگ میں دوڑ گئی۔

شہزاد۔ اور اس نے شکریہ ادا کیا۔

ارشد۔ مگر اس انداز سے کہ میں چاہتا تھا۔ کہ قدم قدم پر اس کا رومال گرتا جائے۔ اور میں اٹھاتا جاؤں۔

شہزاد۔ اور ساری عمر اسی شغل میں گذر جائے۔ واہ بھئی رومال بردار

ارشد۔ بس اسی طرح بات سے بات نکلتی جا رہی تھی۔ کہ

شہزاد۔ کہ تم نے اسے رائل رسٹورنٹ میں چلنے کی دعوت دی۔

ارشد۔ پہلے اس بات کا فیصلہ کر لو کہ واقعہ میں بیان کر رہا ہوں یا تم بات کاٹتے چلے جاتے ہو۔ کوئی کہے تو خاک کہے۔

شہزاد۔ اوہو طبیعت کی روانی میں فرق آگیا۔ چلو اب انجن کی طرح کیا مجال جو کوئی روڑہ اٹکنے پائے۔

ارشد۔ تو ہم رائل رسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ شہزاد وہ ایسی حسین معلوم ہوتی تھی ایسی حسین کہ بس حسن ہی حسن تھا سارے کمرے میں۔ مکمل حسن تھا مکمل۔ ایڑی سے چوٹی تک جمال میں ڈوبی تھی۔ اور میں کیا کہوں۔

شہزاد۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسے موقعوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم پر کیا افتاد پڑی۔

ارشد۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں تن واحد ہے۔ نہ اس کا کوئی نہ وہ کسی کی۔

شہزاد۔ یہ تو بہت مفید مطلب رہی۔

ارشد۔ وہاں سے اٹھ کر ہم سینما چلے گئے۔

شہزاد۔ اور تماشا ختم ہونے پر پھر تم دونوں نے رسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔

ارشد۔ ہاں۔

شہزاد۔ اور دوسرے دن تم پھر رسٹورنٹ میں ملے۔

ارشد۔ ہاں۔ ہاں۔

شہزاد۔ اور کھانا کھانے کے بعد تم میوہ وغیرہ کھاتے رہے اور شام ہو گئی۔

ارشد۔ اور ایک دن میں اسے نکاح کی دعوت دے بیٹھا۔ اس بات کو تین ہفتے ہو گئے ہیں۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے یہ کیا کیا۔

شہزاد۔ مگر اس پچھتاوے کی وجہ؟

ارشد۔ بہت سوچا۔ گھنٹوں مغز زنی کی۔ مگر کوئی بہانہ نہیں ملتا جس کی آڑ میں اس وعدہ سے چھوٹ نکلوں۔ اور وہ ہے کہ جلد

سے جلد تکمیل کا تقاضا کئے جاتی ہے۔

شہداد۔ یہ تو میری بات کا جواب نہیں۔ مجھے وجہ بتائیے۔ حضرت جب

ارشد۔ اتنی پہیلیاں جو بوجھ گئے تو یہ بھی بھانپ لو۔

شہداد۔ سمجھا۔ ذرا بد مزاج ہے۔

ارشد۔ یہ تو کوئی بات نہیں۔ تمام عورتیں کم یا زیادہ چڑچڑی ہوتی ہیں۔ اور مرد ہوتے ہوتے اسے درست کر لیتا ہے۔ طلعت بھی ذرا تیکھے مزاج کی ہے۔ مگر اس کا غم نہیں۔

شہداد۔ جی ہاں۔ نیا دولہا یہی سمجھتا ہے۔ اور اسی امید پر شادی کا پھندا گلے میں ڈالے چلا جاتا ہے۔

ارشد۔ بھیا۔ میں سب کچھ جھیل سکتا ہوں۔ مگر پیٹو عورت سے میرا نباہ نہیں ہونے کا۔

شہداد۔ عورت اور پیٹو۔ توبہ توبہ۔

ارشد۔ اور اس قدر کھاتی ہے کہ دانتوں کی چکی ایک منٹ کے لئے بند نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنم بھر سے کھانے کو نہیں ملا۔

شہداد میں مانتا ہوں کہ ایسی عورت سے زندگی بسر کرنا بہت کٹھن ہے۔ تو اسے جواب کیوں نہیں دیتے۔ اجی انجینیر شاہ سلامت کرو کم بخت کو۔

ارشد۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اس سے گلو خلاص کروں تو کیسے۔ مگر طلعت بڑی کایاں ہے۔ وہ تو جناب مجھے عدالت میں کھینچ لے جائے گی۔

شہداد۔ مگر تم اس سے اس قدر ڈرتے کیوں ہو؟

ارشد۔ وہ تو خود قانون دانوں کے کان کاٹتی ہے۔ کئی دفعہ باتوں باتوں میں نقض معاہدہ کی داستانیں سنا چکی ہے۔ اخباروں میں چہ میگوئیاں ہونگی۔ لوگ تھڑی تھڑی کریں گے۔ یہ جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ آج وہ دو ٹوک فیصلہ کرنے آ رہی ہے۔ بس آیا ہی سمجھو۔ اور یہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کروں تو کیا کروں۔

شہداد۔ ارشد ایک بات ذہن میں آئی ہے۔ میں اس کے آنے تک یہاں ٹھیرونگا۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو اور مجھے امید ہے میں تمہیں اس جال سے نکال لوں گا۔ تم ایک کام کرنا۔ جو کچھ میں کہوں کہتے دینا۔ اس میں دخل نہ دینا۔

(شبراتی آتا ہے)

شبراتی۔ حضور طلعت خاتون صاحبہ تشریف لائی ہیں۔

ارشد۔ ہاں ہاں شوق سے آئیں۔

طلعت۔ ارشد کیا کر رہے ہو۔

ارشد۔ تمہارا انتظار اور شہداد سے باتیں۔ یہ میرے دوست میرزا شہداد ہیں۔ اور یہ طلعت خاتون ہیں۔ جن سے میری شادی قرار پائی ہے۔

شہداد۔ اچھا بات پکی بھی ہو گئی۔ اور یار دوں کو چائے کی پیالی تک نہ ملی۔ بیگم صاحبہ آپ کی ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ یہ اندر ہی اندر کھچڑی کب سے پک رہی تھی۔

طلعت۔ کوئی تین ہفتے کی بات ہو گی۔ مگر اس گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ میں تو بھوک سے مری جا رہی ہوں۔

ارشد۔ ابھی سب کچھ آ جاتا ہے۔

شہداد۔ بیگم صاحبہ آجکل موسم خوب ہے۔

ارشد۔ ذرا اور ٹھنڈ ہو جائے۔ تو بھوک خوب لگے۔

شہداد۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھار سینما بھی جایا کریں۔

طلعت۔ ارشد ایک دن لے گئے مگر کچھ لطف نہ آیا۔ الٹی بیزار ہو گئی۔

شہداد۔ کیوں کیا ہوا؟

طلعت۔ یہ سب ارشد کی مہربانی تھی۔

ارشد۔ میری۔ میں نے کیا خطا کی۔ طلعت!

طلعت وہی بھول جانے کا مرض۔ دیکھئے میرزا صاحب تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ اور حرام ہے جو اس خدا کے بندے نے پوچھا تک بھی ہو۔ کہ کچھ کھاؤ گی۔ اور تماشا دیکھنے رہے۔ اور میں بیٹھی قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔

شہداد۔ اس کی تو میں بھی تائید کروں گا۔ ارشد معاف کرنا تم بے پروا تو ضرور ہو۔ بیگم صاحبہ! ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے۔ شادی کے بعد قدر عافیت معلوم ہو گی۔

ارشد۔ شہداد کیا کہہ رہے ہو۔

شہداد۔ سچی سچی بات کہنے سے میں نہ رکونگا۔ تم لاکھ برا مناؤ۔ اپنی اپنی طبیعت کسی کا اجارہ نہیں اس میں۔

ارشد۔ بیٹھیا شہداد۔

شہداد۔ تم لاکھ اشارے کرو۔ مگر خدا لگتی کہوں گا ضرور۔

ارشد۔ آخر کوئی بات بھی۔

شہداد۔ بیسیوں دفعہ کہہ چکا کہ طبیعت سے مجبور ہوں۔ بیگم صاحبہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس شخص سے جسے ارشد کہتے ہیں۔ محبت کا دم بھر کر آپ سانپ کو آستین میں پال رہی ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے۔ کہ یہ حضرت اپنی معاش کس طرح پیدا کرتے ہیں

طلعت۔ ارشد نے بتایا تھا۔ کہ ان کی پرائیویٹ آمدنی بہت معقول ہے کہیں یہ غلط تو نہیں۔

شہداد۔ بیگم صاحبہ بے شک اُن کی پرائیویٹ آمدنی ہے۔ مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہوتا کہ وہ کس قسم کی آمدنی ہے۔ اور مزا یہ ہے کہ اس وقت بھی اسی آمدنی پر بسر اوقات کر رہے ہیں۔

ارشد۔ شہداد تم کہاں جا رہے ہو۔

شہداد۔ جہنم کو۔ جہاں تم اس معصوم الطرلڑکی کو لے جانا چاہتے ہو۔ ارشد تم میرے دوست ہو۔ مگر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس نادان بچی کی معصوم جوانی کو تم اس طرح تباہ کرنے پر آمادہ ہو اور میں اسے آگاہ نہ کروں۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

ارشد۔ سبزی تو نہیں پی کر آئے۔

شہداد۔ جو چاہے سمجھ لو ارشد مگر میں اپنا فرض بجالانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بیگم صاحبہ آپ پر سب حال روشن کرنے سے مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ آپ کی آنکھوں پر مکر و فریب کا گھٹا ٹوپ چڑھایا گیا ہے۔ جب میں اسے اتار دوں گا۔ تو میاں ارشد اپنے اصلی روپ میں نظر آئیں گے۔ بیگم صاحبہ آپ جانتی ہیں کہ تپے باز کسے کہتے ہیں۔

طلعت۔ نہیں تو۔ میں تو آج ہی یہ لفظ سن رہی ہوں۔

شہداد۔ بیگم صاحبہ تپے بازا آجکل کا ٹھگ ہے۔ یہ ایک گروہ ہوتا ہے جو نا تجربہ کار نوجوان کو دغا فریب سے اپنے جال میں پھنساتا ہے۔ اور اسے موس لیتا ہے۔ یہ میاں ارشد اسی گروہ کے سرگروہ ہیں اور یہی ان کی پرائیویٹ آمدنی ہے۔ پولیس ان کے درپے ہے۔ اور گھڑی دو گھڑی میں ہی گرفتار ہو رہے ہیں۔

ارشد۔ شہداد تم میری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔

شہداد۔ چپ رہو۔ یہ آنکھیں کسی اور کو دکھاؤ۔ مجھ پر یہ جادو نہیں چلنے کا۔ بیگم صاحبہ یہ سن کر آپ کو تعجب ہو گا۔ کہ اس پر بھی میں ارشد کا دوست کیوں ہوں۔

طلعت ہاں یہ بھی بتا دیجئے۔

شہداد۔ بیگم صاحبہ کیا کہوں کیا نہ کہوں کان تلے کی باتیں ہیں کہتے بھی شرم آتی ہے۔ مگر آپکی خاطر کہے دیتا ہوں۔ پہلے ان کا دانت صرف مردوں پر تھا۔ مگر اب انہوں نے خیر سے لڑکیوں کو بھی پھانسنا شروع کیا ہے اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ خاصکر بیگم صاحبہ! آپ کا حسن، آپ کا اخلاق، آپ کا سن مجھے اجازت نہیں دیتا کہ ٹک ٹک دیکھتا رہوں۔ اور آپ کو اس ناپاک روح سے شادی کرنے دوں۔ اونچ نیچ سمجھا دیا ہے۔ اب بیگم صاحبہ مانو نہ مانو تمہیں اختیار ہے۔ ارشد تمہیں بھی زیب دیتا ہے۔ کہ اس خاتون کے قدموں پر جھک جاؤ۔ اور معافی مانگو۔ میں اب جاتا ہوں۔ اور کہے جاتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ کہ ارشد اپنے کو ٹک چھوڑ دے۔ اور سدھر جائے۔

(جاتا ہے)

طلعت۔ ارشد یہ سچ ہے۔

ارشد۔ ہاں۔

طلعت۔ پہلے کیوں نہ بتایا۔

ارشد۔ خیال نہیں رہا۔

طلعت۔ اتنی ضروری بات اور اس کا خیال نہ رہے۔

ارشد۔ طلعت جو کچھ شہداد نے کہا درست ہے۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں اور تمہیں عہد نکاح سے آزاد کرتا ہوں۔

طلعت۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔

ارشد۔ بے شک شہداد ٹھیک کہتا ہے کہ میں اس پیشہ کو چھوڑ نہیں سکتا۔

طلعت۔ ہمیں اس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ تاکہ اس مشکل کا کوئی حل ہمیں مل جائے۔

ارشد۔ اس معاملہ پر سوچ بچار فضول ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ

آپ فوراً چلی جائیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ جو کچھ ہوا ہے اسے خواب سمجھیں۔

طلعت۔ ارشد کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اب میری سنو۔ تمہیں تسکین ہو جائے گی۔

ارشد۔ تمہیں کیا کہنا ہے۔

طلعت۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ لیکن میں نے بھی اس سے کم نہیں کیا۔

ارشد۔ ان باتوں سے کیا ہے گا۔ میرے عیب مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔

طلعت۔ دنیا میں کوئی عیب سے خالی نہیں۔

ارشد۔ مگر میں تو مجسم شیطان ہوں۔

طلعت۔ میں بھی سراسر پاک دامن نہیں۔

ارشد۔ جھوٹ بول رہی ہو۔

طلعت۔ کیا کہہ رہے ہو۔

ارشد۔ معاف کرنا۔ میرا مطلب تھا تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ خواہ تم میں کوئی اخلاقی کمزوری کیوں نہ ہو۔ مگر میں ہرگز تمہارے قابل نہیں۔

طلعت۔ سنو! ارشد اگرچہ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ تم نے یہ راز مجھ سے کیوں چھپایا۔ مگر مجھے یہ باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی اور اب مجھے اپنی کہانی سنانے میں آسانی ہو گئی۔

ارشد۔ مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ نہ سنوں گا۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔ بس ہمارے لئے یہی بہتر ہے۔

طلعت۔ ابھی تک تم وہ بٹن لگائے ہو۔ جو میں نے تمہیں دیئے تھے۔

ارشد۔ ہاں میں واپس کرنا بھول گیا تھا۔

طلعت۔ اس کے علاوہ میں نے تمہیں ایک نکٹائی اور کیا کچھ دیا تھا۔ اور کل میں نے چوک کی ایک دکان پر تمہارے لئے ایک سگرٹ کیس منتخب کیا ہے۔ یہ میں جلد تمہاری نذر کرونگی۔

ارشد۔ میرے لئے قطعاً کچھ خرید نہ کرنا۔ اب بہتر ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔

طلعت۔ اور اب تمہیں اپنا راز بتاتی ہوں۔ سنو میں نے کبھی تمہارے لئے کوئی چیز مول نہیں خریدی۔ میں انہیں بغیر قیمت دیئے اٹھا لایا کرتی ہوں۔

ارشد۔ تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ تم چور ہو۔

طلعت۔ اٹھا لانا اچھا لفظ تھا۔ خیر تم چوری ہی سمجھ لو۔ بیشک میرا پیشہ تمہارے کام کو نہیں پہنچتا۔ گو اپنے کام میں تم سے زیادہ ماہر ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں ارشد! کہ شادی کے بعد اپنے کام کے علاوہ تمہارے کام میں بھی ہاتھ بٹاؤنگی۔ ارشد دنیا میں ایسی سدا بہار جوڑیاں کم ملتی ہیں۔ تمہیں میری قسم کیسی برابر کی چوٹ رہی!!

(صاحبزادہ) محمد عمر

رباعی

ہمکو مرکا سمجھ کر جانا ہے حضور
اور دیکھتی ہے مشیت آستاں سے دور
ہے کلمۂ کفر کہنا پڑتا ہے مگر
مجبور کی دنیا میں خدا بھی مجبور

سید احمد اعجاز

ساقی نامہ

پلا ساقئ مہرباں جامِ مے   دمِ عیسوی ہے مجھے نامِ مے
پلا مجھ کو وہ آبِ آتش نژاد   جسے پی کے مجھ کو رہے کچھ نہ یاد
پلا مجھ کو وہ ساغرِ لالہ فام   نہیں لیتے ہم بے وضو جس کا نام
پلا مجھ کو وہ ارغوانی پلا   ذرا سی وہ نوشیروانی پلا
جوانی چمن پر ہے آئی ہوئی   گھٹا آسماں پر ہے چھائی ہوئی
ہجومِ گل و لالہ گلشن میں ہے   چراغِ طرب ہر نشیمن میں ہے
ہوا ہے مسرت میں ڈوبی ہوئی   مسرت ہے حیرت میں ڈوبی ہوئی
عجب رنگ ستلج پہ ہے آج کل   کنارے گھٹاؤں سے ہیں ہم بغل
برستا ہے آب اور بہتا ہے آب   روانی میں ہر وقت رہتا ہے آب
یہ بہتا ہوا اور بہاتا ہوا
چلا جاتا ہے پیچ کھاتا ہوا
اٹھا جامِ زر ساقئ پاکباز   پلا بادۂ مشکنابِ حجاز
بڑی دیر سے ہے دہن میرا خشک   مرے حلق میں ڈال دے بیدِ مشک
جسے پی کے آنکھوں میں آ جائے نور   نوائے طرب لب پہ دل میں سرور

سفر میں ہیں وہ مثلِ ماہِ مبیں   بیاباں میں ہے رنگِ خلدِ بریں
چلے آ رہے ہیں پسِ کارواں   غزالانِ صحرا جہاں در جہاں
پرندے ہوا میں نوا ساز ہیں   طیورِ ارم سے ہم آواز ہیں
گرجتا ہے بادل برستا ہے آب   بیاباں سے ہے بحرِ رواں کا جواب
جدھر دیکھو سرسبز اشجار ہیں   زمیں پر زمرد کے انبار ہیں
کلی کھل کے حورِ جناں ہو گئی
کہن سال دنیا جواں ہو گئی
دُرِ لعل ساقی لٹاتا ہے کیوں   مری بات پر مسکراتا ہے کیوں
اٹھا شیشۂ لالہ گوں طاق سے   مٹا تیرگی دل کے اوراق سے
پلا ایک جامِ مئے عقل سوز   کہ ہوتا نہیں یہ سماں روز روز
یہ سبزے کا طوفاں یہ آب و ہوا   یہ نہریں مصفّا یہ کالی گھٹا
یہ فوٹو یہ نغمے یہ حور و قصور   یہ فلمی مناظر یہ سیلابِ نور
غلط رو جوانوں کی بے باکیاں   جہاں دیدہ پریوں کی چالاکیاں
اگر اب نہ دے گا تو پھر دے گا کب   ترستے ہیں مے کو ترے تشنہ لب

ترے سر پہ طیار سے قربان ہیں
تری سرد مہری پہ حیران ہیں
ترے لب پہ ساقی تبسم ہے کیوں زباں تیری محوِ ترنم ہے کیوں
بہت دیر سے مست ہیں تشنہ لب اٹھا طاق سے جامِ جمشید اب
دکھا جوشِ رحمت گنہگار کو پلا ایک دو جام مے خوار کو
عجب رنگ تقدیر دکھلا گئی زمیں مصر و یونان کو کھا گئی
کئی اصفہان و سبا مٹ گئے کئی بابل و نینوا مٹ گئے
سکندر بھی معدوم دارا بھی گم پری چہرگانِ خود آرا بھی گم
کرشمہ ہے گردوں کی بیداد کا مٹا یک بیک نام بغداد کا
نہ ساغر نہ صہبا نہ چنگ و رباب
بیاباں ہے اور تابشِ آفتاب
مگر ساقیِ مہرباں اتنی دیر پلا ناتواں کو کہ ہو جائے شیر
وہ جامِ زمرد اٹھا طاق سے نہ کر اس قدر شرم عشاق سے
نہ مینا کو ساقی بغل میں چھپا خدا کے لئے ایک ساغر پلا
نہیں چاہئے آج کل ظلم و جور بدلنے کو ہے آسماں رنگ اور

قیامت زمانے میں آنے کو ہے یہ گردوں نیا رنگ لانے کو ہے
نہ یہ رنگ محفل رہے گا نہ ہم نہیں جھوٹ اصلا خدا کی قسم
زمیں آسماں کو نگل جائے گی یہ دنیا سراسر بدل جائے گی
تباہی کا ہر سمت سامان ہے
جو حاضر ہے اس وقت مہمان ہے
غنیمت ہیں ساقی یہ ایام چند عطا کر مجھے پے بہ پے جام چند
یہ انداز کس کو دکھائے گا تو نہ ڈھونڈے سے یہ دور پائیگا تو
مکیں جو ہے اس کو مسافر سمجھ تماشائے حاضر کو آخر سمجھ
ہواؤں کے دامن میں طوفان ہیں کہ یاجوج و ماجوج مہمان ہیں
فضاؤں میں وہ بجلیاں ہیں نہاں قیامت بھی جن سے نہ پائے اماں
مجھے کہہ رہا ہے کوئی دمبدم برسنے کو ہیں آسمانوں سے بم
چمکتے ہیں تیغ و تبر بار بار نیاموں میں ساطور ہیں بے قرار
تفنگوں نے کھولے ہوئے ہیں دہاں نظر آرہے ہیں الم کے نشاں
ثریا تلک میری پرواز ہے
مری گفتگو رازہی راز ہے

اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

ہندوستان میں عورت کی حیثیت

قدامت پسند لوگوں کی شور پکار کے علی الرغم دنیا بھر میں عورتیں ترقی اور آزادی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں جو لوگ پرانے زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں وہ تو اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے کہ عورتیں بھی مردوں کی برابری کا دعویٰ کریں، لیکن زمانے کی رفتار کو روکنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ زمانہ گزشتہ میں عورتوں کے ساتھ جو بے انصافی اور بدسلوکی ہوتی رہی ہے اس کا احساس عورتوں میں ضرورت سے زیادہ قوی ہو گیا ہے اور اب یہ مردوں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے حقوق و مطالبات کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ حالات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ حقوق نسواں کے سخت ترین مخالفین بھی انہیں کچھ نہ کچھ حقوق دینے پر تیار ہو گئے ہیں اور بہت سے حقوق جو پہلے نظر نہیں آتے تھے۔ اب واضح اور معین طور پر سامنے آ گئے ہیں۔ کچھ دنوں سے تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جو عورتیں پہلے گھر کی چار دیواریوں میں بند رہتی تھیں اب عورتوں کے لئے مساوات و حریت کے مطالبے میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے حقوق مطالبات کا تعین کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی ترقیوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی مساعی کی وسعت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

تاریخ عالم کے صفحات کی ورق گردانی سے پتہ چلے گا کہ جب بنی نوع انسان کا کوئی مذہب نہ تھا اُس وقت عورتوں کی حیثیت بھی بہت ادنیٰ تھی اور یہ مردوں سے متعلق ہو کر خلوت کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں جبکہ انسان عقل و خرد سے آشنا بھی نہ تھا معاشرت کا بنیادی اصول قوت کی حکومت تھا وہ اپنی قوت و شہ زوری کے زعم میں دنیا کی دیگر مخلوقات کا آقا بن بیٹھا تھا۔ چنانچہ عورت کو اپنی ہستی نمایاں کرنے کا کبھی موقع نہ ملا اور زیادہ سے زیادہ وہ مرد کے عملہ خانہ داری کا ایک جزو بن کر رہ گئی۔ انسان عورت پر مختار کامل تھا اور جس طرح جمادات نباتات و حیوانات سے وہ کام لیتا تھا اُسی طرح عورت پر بھی حکمران تھا۔ دیگر اشیا کی طرح اس کی خرید و فروخت بھی کی جا سکتی تھی اور زندگی میں عورت کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ وہ مرد کو خوش رکھے اور اس کی مدد کرے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ تخیل بہت دنوں تک قائم رہا اور یونان و روما کی ذہنی و تمدنی ترقیوں میں بھی عورت کا درجہ بلند نہ ہوا۔ یونانی عورتیں گھر کی چار دیواریوں میں بند عموماً امور خانہ داری میں منہمک رہیں اور روما نے علوم و فنون اور ترقی و تمدن کو بام عروج تک پہنچانے کے باوجود عورت کو قعر مذلت و گمنامی سے باہر نہیں نکالا۔ اس میں شک نہیں کہ رومن شعراء نے عورت کی صورت و سیرت کی تعریف میں اشعار کہے لیکن ان کی اصل خوبی بچوں کی داشت و پرداخت پر مبنی رہی۔ حکومتِ روما نئی نئی فتوحات کے شوق میں صلح سے گریز اور جنگ میں پیش قدمی کرتی رہی اور اس کی وسیع سلطنت اور دور افتادہ ممالک کی حفاظت کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ طاقتور اور بہادر سپاہی پیدا ہوتے رہیں جو سخت سے سخت دشمن کو بھی زیر کر سکیں۔ چنانچہ روما کی حکومت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہاں کی مائیں تنومند و صحیح الجثہ بچے پیدا کریں اور حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ عورت کو صرف اسی حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ مستقبل کے سپاہیوں کی ماں ہے۔ لڑکیوں کی طفولیت میں قدر نہ تھی اور کمزور بچیاں تو پہاڑوں پر سے دھکیل کر مار ڈالی جاتی تھیں۔ سلطنت روما کے انتہائی عروج کے زمانے میں جب قیصر آغسطس فرمانروائی کرتے تھے عورتوں کی حیثیت کچھ بہتر ہوئی مگر اُس وقت بھی اُن کی کوئی جداگانہ ہستی نہ بنی اور نہ عام معاشرت کی تشکیل میں ان کا کوئی حصہ رہا بلکہ جو کچھ قدر اُن کی ہوئی وہ مردوں کی دلچسپی کے لئے آلہ کار کی حیثیت سے۔

مسیحیت جس نے یورپ کے ظلمتکدہ میں روشنی کی کچھ جھلک پہنچائی اس میں عورتوں کے حقوق ایک حد تک تسلیم کئے گئے اور یہ تعلیم

دی گئی کہ "اگر کوئی شخص مر جائے اور اُس کے اولاد نرینہ نہ ہو تو اس کا ترکہ اُس کی لڑکی کو ملے گا۔" لیکن اس ترکہ کی ملکیت آج تک باوجود تمام تر ترقیوں کے تسلیم نہیں کی گئی اور اس وقت بھی شادی کے بعد بیوی کی جائیداد شوہر کی جائیداد میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ عورت انسان کے سب سے پہلے قصور کی ذمہ دار ہے اور سینٹ پال جیسے مبلغین اسے سوسائٹی میں معزز جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سینٹ پال نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "آدم کو فریب نہیں دیا گیا بلکہ عورت کو فریب دیا اور وہی گنہگار ہوئی۔" اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے ایک بادشاہ نے اپنی ملکہ سے جھلاکر کہا تھا کہ "ملکہ میں نے تمہارے ساتھ اس لئے شادی کی ہے کہ تم میرے بچوں کی ماں بنو۔ اس لئے نہیں کہ تم امورِ سلطنت میں دخل در معقولات کرو۔" ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ یورپ کے مشہور مدبر گلیڈسٹون نے کہا تھا کہ "اے ملکہ! تم بہر حال عورت ذات ہو۔" ان حالات و واقعات سے یورپین تمدن میں عورت کی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں عورت کی حالت اس سے بھی بدتر تھی اور زمانہ قدیم سے اسے سرچشمہ بدی سمجھا جاتا تھا۔ رگ وید میں عورت کو بے لگام، ناقابلِ اصلاح اور نیکی سے معرا کہا گیا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکی کا پیدا ہونا خاندان کے لئے مصائب کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ باپ کا کریاکرم اولاد نرینہ کے ذمہ تھا اور لڑکی اسے انجام نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ اگر کسی کے اولاد نرینہ نہ ہو تو کہا جاتا تھا کہ اُسے مرنے کے بعد نجات نہ حاصل ہوگی بلکہ وہ دوزخ کی تاریک ترین تہ میں ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا جائے گا۔ اس طرح سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت بہت ہی ادنےٰ تھی اور منو نے بھی جو ہندو قانون وراثت کا موجد ہے۔ عورت کو کوئی درجہ نہیں دیا۔ موجودہ ہندو معاشرت کی بنیاد منو کے قانون پر ہے اور اس قانون میں گھرانے کی سرپرستی باپ کو سپرد کی گئی ہے اور اسی کی نگرانی میں نا کتخدا لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد جزو کل اپنے شوہر کی نگرانی میں ہو جاتی ہیں۔ صغر سنی کی شادی بھی منو ہی تھی اور منو نے کہا ہے کہ تیس سال کے مرد کو بارہ سال کی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے اور چوبیس سال کے مرد کو آٹھ برس کی لڑکی سے۔ صغر سنی کی شادی کا رواج اتنا عام ہو گیا کہ جو باپ اپنی لڑکی کو بچپنے میں نہ بیاہ دے وہ برادری میں ملعون ہوتا تھا۔ شادی کی بیڑیاں ایک دفعہ پیر میں پڑ جانے کے بعد پھر ٹوٹ نہیں سکتی تھیں اور عورت کے لئے تو یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اس کا خیال بھی کرے۔ طلاق یا بیوہ کی شادی یہ ایسے خیالات ہیں جو اس وقت بالکل ناپید تھے۔ پہلے زمانے میں لڑکے والے لڑکی والے کو عقد کا نقد معاوضہ دیتے تھے۔ پھر لڑکی والوں کی طرف دینے کا دستور رائج ہوا جو آج بھی بنگال و مدراس میں سختی سے برتا جاتا ہے اور جو والدین نقدی نہیں فراہم کر سکتے اُن کی لڑکیوں کی شادی تقریباً ناممکن ہوتی ہے اور آئے دن ایسے قصے سننے میں آتے ہیں کہ پڑھی لکھی ہونہار لڑکیوں نے والدین کے افلاس کی وجہ سے یا اس بار سے سبکدوش کرنے کے خیال سے خودکشی کر لی۔ اور عام طور پر لڑکی کا گھروں میں ہونا ایک وبال جان سمجھا جاتا ہے۔ منو نے یہ بھی کہہ دیا کہ عورت کا جائیداد میں مطلق حصہ نہیں ہے اور نہ اُسے اپنے والدین یا اعزہ کا ترکہ مل سکتا ہے۔ لڑکی کی اگر کوئی ذاتی آمدنی ہے تو شادی سے قبل باپ کی اور بعدِ شادی شوہر کی ملکیت ہوگی۔ اگر کوئی شخص لاولد فوت ہو تو بھی اس کی بیوہ کو صرف حین حیات حق فوت شدہ کی جائیداد پر حاصل ہوتا ہے اور یہ مطلق اختیار نہیں ہے کہ اس کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دے دے۔ بیوہ عورت کی حالت معاشی حیثیت سے اور بھی بدتر تھی اور عام طور پر وہ ایک منحوس چیز سمجھی جاتی تھی جس کا وجود زمین پر بار تھا۔ بیوہ عورتوں پر مظالم کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ ستی کی رسم کی ابتدا ہوئی یعنی ان مظالم کو برداشت کرنے کے بجائے متوفی کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ چتا میں جل مرنے کو ترجیح دیتی تھی اور آخر میں اسی رسم نے یہ شکل اختیار کی بیوہ عورت کو زبردستی دہکتی آگ میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس بے رحمانہ رسم کے انسداد کی کوشش سب سے پہلے شاہانِ مغلیہ کے دور میں شروع ہوئی مگر اس سے مذہبی جذبات اس حد تک وابستہ تھے کہ قانونی بندشوں کے باوجود اس کا سلسلہ جاری رہا اور انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں جاکر اس مذہبی رسم کو جرم قرار دے کر قطعاً بند کیا جا سکا تاہم آج بھی اسلامی اور مغربی تمدن کے اثر و نفوذ کے باوجود ہندو معاشرت میں عورت کو واجبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی حال میں مرکزی اسمبلی میں ہندو عورتوں کے حقوق کا ایک قانون پیش ہوا تھا۔ ہندو اس کے لئے نہیں راضی ہوئے کہ ان کی لڑکیوں کو اُن کی جائداد میں حق ملے۔

عورتوں کی اس تنگ و تاریک دنیا میں حقیقی روشنی دراصل اسلام نے پیدا کی اور اسلامی تعلیمات ہی کے اثر سے حقوقِ نسواں کے مطالبے کی تحریک معرضِ وجود میں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے پیشتر عورتوں کے متعلق عربوں کا خیال بھی دوسروں سے زیادہ بہتر نہ تھا اور وہاں بھی لڑکی کا پیدا ہونا بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ



منصور احمد مرحوم



فصیح الملک نواب مرزا خان داغ

وسلم نے وحی الہٰی کے بموجب یہ تعلیم دی کہ کوئی قوم ذہنی اور تمدنی حیثیت سے اس وقت تک بام عروج پر نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور عدم مساوات کا سلوک کرتی رہے گی۔ آپ نے نہایت ہی شد و مد کے ساتھ اس عام خیال کی تردید کی کہ عورتیں بدی کا سرچشمہ ہیں بلکہ اس کے برعکس قرآن نے پکار پکار کر اعلان کیا کہ عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا اور پھر نبی کریم نے مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی بچوں سے بہتر سلوک کرے"۔ قرآن پاک نے اولاد ذکور و اناث کا امتیاز یک قلم مٹا دیا اور کہہ دیا کہ "اللہ ہی جسے چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکا دیتا ہے"۔ اس معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ وراثت کے قانون میں بھی اسلام نے ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور سب سے پہلے جائیداد میں عورت کے معین مالکانہ حقوق کو تسلیم کیا۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ "مردوں ہی کی طرح عورتوں کے بھی پسندیدہ حقوق ہیں"۔ یہی نہیں بلکہ ترکہ کی تقسیم ایسے واضح اور بین اصول پر کی اور اس طرح ہر حصے کی حدیں مقرر کر دیں کہ اس سے پیشتر ان چیزوں کا وجود نہ تھا اور آج بھی دنیا کی تمام ترقیوں کے باوجود جو کوئی متمدن ملک اپنے یہاں کے قانون وراثت کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اُسے روشنی اور ہدایت کے لئے اسلامی تعلیم ہی کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اسلام نے لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف رکھا ہے اور اسے ظاہر بیں لوگ مساوات کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن ذرا تامل کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ باپ کے ترکہ میں اس حصے کے علاوہ شوہر کے ترکہ میں بھی اس کا حصہ مقرر ہے اور اس کے سارے اخراجات کی ذمہ داری شوہر کے عاید کی گئی ہے۔ پھر اسی شوہر کو گھر کے سارے انتظامات اور بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت وغیرہ کے سارے اخراجات کی کفالت کرنی پڑتی ہے اور اس لحاظ سے ترکہ میں اس کا بمقابلے عورت کے دوگنا حصہ ہر طرح حق بجانب اور مبنی بر انصاف ہے۔ علاوہ بریں باپ کو بذریعہ وصیت و ہبہ اس تقسیم میں فرق کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور اس قاعدے کا فائدہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی پہنچتا ہے۔

لیکن اسلامی قانون کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ عورت کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ پورے مالکانہ اختیارات کے ساتھ دیا گیا ہے جو خرید و فروخت ہبہ اور وصیت کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا مرد اپنی جائیداد کے متعلق کر سکتا ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بعض فرقے اسلام کی اس تعلیم سے بہت دور ہٹ گئے ہیں اور مقامی رواج و دستور کو اسلامی شرع پر ترجیح دے کر عورتوں کو ان کے جائز حق وراثت سے محروم کر رکھا ہے۔ مثلاً بمبئی کے بوہرے اودھ کے تعلقہ دار اور پنجاب کے عام مسلمان لڑکیوں کا حق اسلامی شریعت کے مطابق نہیں دیتے۔ ۱۹۳۷ء کے گرمائی اجلاس مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک مسودہ قانون پاس ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی جو حق تلفی ہو رہی ہے وہ رفع کی جائے اور انہیں وراثت میں مقررہ شرعی حصہ ملنے لگے۔ اس قانون کے عمل سے زرعی املاک کو اس لئے خارج کرنا پڑا کہ صوبہ جات کی حکومت کے دائرہ اختیار میں ہے۔ امید ہے کہ صوبہ جات کی حکومتیں بھی اپنے اپنے صوبہ میں ایسے قوانین نافذ کر دیں گی جو زرعی املاک پر بھی حاوی ہوں گی اور اس طرح مسلمان عورتوں کو ترکہ میں ان کا شرعی اور جائز حق ملنے میں جو رکاوٹیں رسوم و رواج نے ڈال رکھی ہیں وہ دور ہو جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شخصی حیثیت سے ایک مسلمان عورت کو مذہبًا جتنی آزادی حاصل ہے وہ دنیا بھر میں کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اپنی جداگانہ ہستی رکھتی ہے اور مغربی ممالک کی عورت کی طرح شادی کے بعد شوہر کی شخصیت میں مدغم نہیں ہو جاتی۔ اسلامی قانون کے بموجب عورت شادی کے بعد بھی اپنی املاک اور کاروبار کی مالکہ ہوتی ہے اور اس بارے میں انصرام امور کے لئے شادی سے اُس پر کسی قسم کی قید نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ مساوی حق جو اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور کسی دیگر قوم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اسلامی قانون کے بموجب عقد ایک معاہدہ ہے جو دیگر معاہدات کی طرح فریقین کی مرضی پر منسوخ کیا جا سکتا ہے اور کوئی مذہبی بندش ایسی نہیں ہے جو ایک عورت کو کسی مرد سے اس طرح وابستہ کر دے کہ کسی طرح اور کسی حالت میں چاہے ساری زندگی تلخ ہو کر رہ جائے الگ نہ ہو سکے۔ شادی کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے اور مرد یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ کسی عورت سے بلا اُس کی مرضی کے عقد کرے یا عقد کے بعد بھی عورت کی مرضی کے خلاف اُسے روکے رہے اس طرح اسلامی قانون میں صغر سنی کی شادی کی گنجائش شاذ و نادر ہو سکتی ہے کیونکہ اُس کے لئے مثل اور معاہدوں کے ایک اہم قانونی ضرورت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور اگر کسی قانونی یا دیگر مصلحت سے اس کی ضرورت

ہی لاحق ہو جائے تو لڑکی کو یہ پورا اختیار دیا گیا ہے کہ سن بلوغ کو پہنچ کر وہ اگر اس عقد کے خلاف ہو تو طلاق لے لے۔ اسی سلسلے میں مہر کا ذکر بھی بے سود نہ ہوگا جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ مرد پر ایک طرح کی قید اور ذمہ داری رہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیوی کو طلاق دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جائے مہر کا روپیہ بیوی کی ملکیت ہے اور اس کا حق کسی حالت میں شوہر کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اگر مہر نہ ادا کیا گیا ہو تو شوہر کی جائداد پر بیوی کے مہر کا بار دوسرے تمام باروں سے مقدم ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں نے رواج و دستور کی تقلید کر کے اس کے اصل مقصد کو ضائع کر دیا اور نتیجہ یہ ہے کہ مہر کا مقرر کرنا اور اس کا ادا کرنا یہ سب ایک ڈھکوسلہ بن کر رہ گیا ہے اور اکثر اس سلسلے میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ مہر کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

زمانہ حال کے مفکرین یورپ و امریکہ عقد و طلاق کے مسائل کو حل کرنے میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ کوئی راستہ یا روشنی انہیں نظر نہیں آتی ہے۔ کیا میں ان کی خدمت میں عرض کر سکتا ہے کہ ان کے لئے راستہ اور روشنی دونوں اسلامی ملیں گے اور جب تک یہ اس طرف توجہ نہ کریں گے اس وقت تک منزل سے ہٹتے اور روشنی سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ میں ہندوستان اور ساری دنیا کے معاشی اصلاح کرنے والوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ صرف نکاح و طلاق ہی نہیں بلکہ عورت کے بارے میں ہر اہم و غیر اہم پیچیدہ و غیر پیچیدہ مسئلے کا حل مکمل اور معین طور پر اسلامی تعلیمات کے سوا کہیں اور نہیں پا سکتے اور حقوق نسواں کی تحریک کی تقویت و ترقی یا زمانہ حال کی ضروریات کی تشفی کا سامان قابل اطمینان طور پر قرآن کریم کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اسی اسلامی تعلیم کے اثر نے تحریک نسواں کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ آج اسی کی بدولت عورت کے سرچشمہ بدی ہونے کا خیال قصہ پارینہ ہو گیا اور ہر جگہ عورتیں مردوں کے برابر حقوق ہر شعبہ زندگی میں حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ خود ہندوستان میں جہاں ترقی کی رفتار ہر چیز میں بہت سست رہتی ہے عورتوں کے معاملے میں دیگر ممالک کے دوش بدوش ترقی ہوئی ہے اور ایک طرف تو وکیل بیرسٹر ڈاکٹر سرکاری و غیر سرکاری ملازم غرضکہ ہر جگہ جہاں مرد کام کرتے ہیں۔ آج عورتیں بھی کام کرتی نظر آ رہی ہیں اور دوسری طرف مجالس قانون ساز و قومی تحریکات میں ان کے افراد کی تعداد روز افزوں ہے۔ یہ عورتوں ہی کی چیخ پکار کا نتیجہ تھا کہ عمر رضامندی کا قانون پاس ہوا اور اب عورتوں کی معاشی سطح بلند کرنے کے لئے دیگر اسی قسم کے قوانین کے نفاذ کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ سیاسی حقوق طلب کرنے میں بھی ہندوستان کی عورتیں دیگر ممالک سے پیچھے نہیں ہیں اور ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی تشکیل کے وقت جو صدا بلند ہوئی تھی وہ ۱۹۳۴ء کی جوائنٹ پالیمنٹری کمیٹی کے سامنے پوری قوت اور استحکام کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ یہ علامات بہتری کی ہیں اور اگر حالات کی رفتار یہی رہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ اس ملک کی خواتین بحیثیت خواتین کے معاشرت و سیاست میں وہ رتبہ و حیثیت حاصل کر لیں گی جس کی وہ مستحق ہیں اور آج کل جبکہ دنیا کی سیاسیات میں ہر طرف جنگ جنگ کی صدائیں آ رہی ہیں اور موجودہ تمدن قیام امن عالم کے مسئلہ کو اپنی قطعی شکست مان چکا ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس فضا میں ایک ایسا عنصر شامل ہو جو جنگ کو امن سے، فساد کو سکون سے، بے اطمینانی کو اطمینان سے اور خلفشار و اختلال کو یکسوئی و اتحاد سے بدل دے کیا یہ ممکن ہے کہ جس عنصر کا ہمیں انتظار ہے وہ عورت کی ذات میں ملے گا! دیکھیں آگے کے واقعات کیا دکھاتے ہیں مگر غالباً ہماری یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ مستقبل عالم کی پر امن تشکیل میں ہندوستانی خواتین کا حصہ نمایاں ترین اور درخشاں ترین ہوگا۔

سید نجم الدین احمد جعفری

صبح و شام

صُبح

نکلنا مُجلۂ مشرق سے سورج کا یہ تھم تھم کر کرن کے طائروں کا تولنا اپنے سنہری پر
ترانہ ایک ہی پیدا ہے ان لاکھوں رُبابوں سے برستی نور کی بارش ہے ان زریں سحابوں سے

شام

بدل کر بھیس گلشن کا افق پر شام چھائی ہے حسینہ کوئی چھلکاتی مے گلفام آئی ہے
ذرا سے ابر کے ٹکڑے میں کیا رنگیں نظارے ہیں مے احمر کا ہے تالاب نیلم کے کنارے ہیں

مسعود شاہد

غزل

تیری محفل میں ساقی تیرا دیرینہ غلام آیا — لئے ہاتھوں میں اک جامِ شکستہ تشنہ کام آیا

پلٹ آیا ہے ماضی، رنگ بدلا ہے نصیبوں نے — ہو اے تشنہ امیدو کہ مجھ تک دورِ جام آیا

جوانی کے گزشتہ دور پھر واپس نہ لوٹ آئیں — کہ شب کو جاگنے کا دن کو رونے کا پیام آیا

مری آوارگی بھی شوق کی رفعت کا مقصد تھی — قدم بڑھتے گئے اور ہر قدم پر اک مقام آیا

بہت مشکل ہے جینا تیرے وعدوں کے بھروسے پر — جگر کٹ کٹ گیا تب جا کے آخر وقتِ شام آیا

تڑپتے ہی رہے ہم ٹکٹکی باندھے ترے در پر — جب آنکھیں موند لیں ہم نے پیامِ اذنِ عام آیا

تری عالی جنابی نے کرم کی انتہا کر دی — اُدھر ہچکی سے سانس اکھڑی اِدھر تیرا سلام آیا

میں سمجھوں گا جہاں کروٹ بدلنے پر ہے آمادہ — اگر میرے لئے بھی تو کبھی بالائے بام آیا

ترا ہر تحفہ سینے سے لگا رکھنے کے قابل ہے — ترا غم بن کے مجھ تک باعثِ کیفِ دوام آیا

بصد اندوہ ناکامِ تمنا تو پھرا ورنہ
ندیم اس میکدے سے جو بھی آیا شاد کام آیا

احمد ندیم قاسمی بی اے

دس سال

ایک مکالمہ

افراد:۔

قدیر .... ایک ڈاکٹر
صغرا .... اس کی بیوی
وقت .... آج کل اور ہمیشہ

{ایک کمرہ ہے جو آرائش اور سامانِ آسائش سے سجا ہے۔ کرسیاں، صوفا سیٹ، قالین، اور ہاتھی دانت کے بیل بوٹوں سے مرصع لکڑی کی میزوں۔ گلدان اور گلدستہ، دیوار پر "امید" بے کسی اور ایسی ہی دو ایک آسان فہم اور پرانی تصاویر سے میاں بیوی کی مالی حالت، مذاق اور رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ باہر صحن سے پٹاخوں کا شور اور پھلجھڑی۔ انار۔ اور مہتابی کی چمک سے شب برات اور بچوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی کمرے میں ہوا کے ذریعہ سے بارود کی بو اور دھوئیں آ داخل ہوتے ہیں۔

قدیر جو فربہ بدن ہونے کے علاوہ توندیلا بھی ہے۔ ایک گدے دار آرام کرسی پر بیٹھا ٹانگیں پھیلائے اخبار پڑھنے میں مشغول ہے۔ اس کی عمر ۳۵ سال کے قریب ہو گی۔ چہرے سے غیر معمولی ذہانت کا پتہ نہیں چلتا۔ دنیادار اور کامیاب انسان معلوم ہوتا ہے۔ صغرا جس کی عمر تیس اکتیس سال سے کم نہ ہو گی۔ پتلے بدن کی سوکھی ہوئی، ترش رُو عورت ہے۔ کسی زمانے میں اچھی خوش شکل اور کامنی ہو گی۔ اس کے ہونٹ عادتاً ایسے بھینچے رہتے ہیں کہ عام طور پر محض ایک لکیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ آنکھیں موٹی موٹی سیاہ اور گہری ہیں۔ مگر ان میں چمک کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ چہرے پر بے شمار باریک باریک خطوط ہیں۔ جب کبھی اس کی آنکھیں کسی جذبہ کے ماتحت جلنے لگتی ہیں۔ تو ان سے نظر ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ماتھا فراخ ہے؛ بال بہت کھینچ کے بنائے گئے ہیں۔ اس وقت وہ ساڑھی پہنے ہوئے ہے مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ساڑھی پہنی ہوئی نہیں۔ اردگرد لپٹی ہوئی ہے۔ ہاتھوں میں لمبی لمبی سلائیاں ہیں۔ اور وہ اون سے کسی بچے کی سویٹر بُن رہی ہے دونوں ٹھہر ٹھہر کے آہستہ لہجے میں بولتے ہیں۔}

قدیر: (اخبار پڑھتے پڑھتے) یہ سنا؛ وہ سلیمان اب تقریریں کرتا پھرتا ہے! وکالت تو کر چکا۔ اب مقرر بننے کا ارادہ کیا ہے!

صغرا: (جیسے چونک کر) کیا؟

قدیر: (آنکھیں اخبار سے اٹھا کر صغرا پر ایک تیز لیکن طنزیہ نگاہ ڈالتے ہوئے) سلیمان! بھول گئی ہو کیا سلیمان کو؟

صغرا: (ایک لمحہ کے لئے گالوں پہ ہلکی سی سرخی آ جاتی ہے) کیوں؟

قدیر: تو کیا تم نے سنا نہیں تھا؛ (طنزیہ) مسٹر محمد سلیمان، بی۔ اے ایل ایل۔ بی وکیل نے کل ایک جگہ "شادی اور اس کے مسائل" پر لکچر دیا ہے۔

صغرا: (بے دلی سے) اچھا!

قدیر: کم بخت ابھی تک شادی اور اس کے مسائل پر بحثیں ہی کرتا پھرتا ہے۔ شاید شعر بھی سنائے ہونگے اسی مجلس میں؛ معلوم نہیں ایسے دیوانے کی باتیں سننے کون چلا جاتا ہے؟ (صغرا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش رائگاں جاتے دیکھ کر) اس کا تو دماغ ہی چل جانا چاہیئے تھا۔ تمہارے خاندان میں ایسا سر پھرا تو میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔

صغرا:۔ (سلائیاں قدرے جلدی چلاتے ہوئے) جی ہاں!

قدیر:۔ مگر شائد ہوں بھی ایسے ہنسے۔ تمہیں تو کم از کم میں نے کبھی شعر پڑھتے نہیں سنا۔

صغرا:۔ آپ جو شعر پڑھتے رہتے ہیں۔

قدیر:۔ (خود پسندانہ مسکراہٹ سے) میں ؛ میری اور بات ہوئی میں نے کوئی شعر گالیا تو گا ہی لیا۔ گانا اور چیز ہوا۔ میں بحث مباحثہ میں تو شعر سنا کے لوگوں کا دماغ نہیں چاٹتا۔

صغرا:۔ (بے معلوم ترشی سے) آپ بحث مباحثہ کرتے بھی تو نہیں۔

قدیر:۔ میرا دماغ مفت کا تو کہیں سے نہیں آیا ہوا۔ یہ سلیمان تو پاگل ہے پاگل!

صغرا:۔ (لاپروائی سے) ہوں!

قدیر:۔ ہونہہ! (طنزیہ مسکراہٹ سے) اور شاید تمہیں تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں دکھائی دیتی ہوگی! (ٹھہر کے) آخر تمہارا رشتہ دار ہے۔!

صغرا:۔ (متانت سے) میرے بہت سے رشتہ دار ہیں۔

قدیر:۔ مطلب یہ کہ میرے فقط نام کے دو ایک رشتے دار ہیں؛

صغرا:۔ میرا کوئی خاص مطلب تو نہیں۔

قدیر:۔ مگر یہ کہ تمہارا خاندان بہت لمبا چوڑا ہے اور میرا کوئی نہیں؛

صغرا:۔ آپ ناحق غلط معنی لے رہے ہیں۔ بات تو کوئی نہیں۔ رشتہ داروں کا ذکر ہی کیا ہے؛

قدیر:۔ مگر سچ تو ہے۔ کم از کم میرے خاندان میں سلیمان جیسے بدنام اشخاص تو نہیں؛

صغرا:۔ (ایک ذرا گرمی سے) یوں تو مجھے اس بات سے سروکار نہیں مگر میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ وہ بدنام ہے۔

قدیر:۔ کون!

صغرا:۔ وہی اور کون؛ (قدیر کی طرف بغیر جھجک کے دیکھتے ہوئے) آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؛

قدیر:۔ (جیسے کسی لطیفے کا مزا اٹھاتے ہوئے) تم نام کیوں نہیں لیتیں۔ کیا آجکل ناراضی ہے؛

صغرا:۔ آپ کیوں آج بار بار یہ ذکر چھیڑ رہے ہیں۔ مجھے تو معلوم نہیں۔ سلیمان کے مشغلوں سے ہمیں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور ناراضی کا تو سوال ہی نہیں۔ میرا اپنے میکے جانا ہی کم ہوتا ہے، مدت ہو گئی۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔

قدیر:۔ یہی تو مجھے خیال آیا۔ وہ تقریر کی روئداد پڑھتے ہوئے۔ کچھ سال ہوئے تو بہت آیا کرتا تھا!

صغرا:۔ بہت!

قدیر:۔ خیر! بہت نہ سہی، کئی دفعہ ہی سہی؛

صغرا:۔ (بے پروائی سے) مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔

قدیر:۔ (معنی خیز مسکراہٹ سے) تمہاری یاد کچھ کمزور ہو گئی ہے۔

صغرا:۔ (اپنے خاوند کو ایک سرد اور بے مہر نگاہ سے دیکھتے ہوئے) آپ کو شاید بہت سی فضول چیزیں یاد ہیں۔

قدیر:۔ سلیمان کو تو تم فضول نہیں کہہ سکتیں؛

صغرا:۔ (کچھ چڑ کے) آج مدت کے بعد کیوں آپ کو سلیمان کے نام کی رٹ لگی ہے؛

قدیر:۔ (پھر طنزیہ) تمہیں تو شاید نہیں۔ مجھے اس کی شخصیت بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

صغرا:۔ (برداشت کرتے ہوئے) ہوتی ہوگی۔

قدیر:۔ (کچھ لمحے ٹھہر کے) ہماری شادی کو کتنے برس ہو گئے ہونگے؛

صغرا:۔ (سویٹر کی طرف متوجہ) ٹھیک معلوم نہیں۔ کیوں!

قدیر:۔ (مسکراتے ہوئے) یقین تو نہیں آتا۔ آخر اتنی مدت تو نہیں گذری۔ میں ۲۵۔ سال کا تھا۔ اب ۳۵۔ کا ہوں۔

صغرا:۔ تو دس سال ہو گئے۔

قدیر:۔ میرا خیال ہے۔ میں نے اس عرصہ میں تمہیں بہت کم مرتبہ کھل کے ہنستے دیکھا ہے۔

صغرا:۔ (پرسکون مسکراہٹ سے) کیا حیرت انگیز حافظہ پایا ہے! مگر پھر بھی آپ کو دھوکا ہوتا ہے۔

قدیر:۔ نا ہنسنے کی تو تمہیں قسم نہیں۔ بچوں کے ساتھ تو میں نے تمہیں اکثر کھیلتے اور خوش باش دیکھا ہے۔

صغرا:۔ تو آپکا مطلب ہے کہ آپکے ساتھ میں نے کبھی ہنس ہنس کے باتیں نہیں کیں؛

قدیر:۔ نہیں۔ بالکل یہ بھی نہیں۔

صغرا:۔ تو پھر آپ کس الجھن میں پھنسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسا لطیفے رہنے دیجئے۔

قدیر:۔ اول اول تو تم کتابیں بھی پڑھا کرتی تھیں۔ اور رسالے بھی۔ اب میں نے تمہیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے۔

صغرا: گھر کے اور کام تھوڑے ہیں۔

قدیر: پھر بھی! ذرا اپنی طرف تو دیکھو! تمہارے جسم میں تو ابھی تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ اگرچہ جلد میں جو تازگی دس سال پہلے تھی وہ اب نہیں۔

صغرا: میں پانچ بچوں کی ماں ہوں!

قدیر: چار کی!

صغرا: پانچ ہی کی ہوتی۔ ننھی نہ مرتی تو پانچ ہی ہوتے۔

قدیر: مگر میں نے تو تمہیں کتنے ہی "ٹانک" دئے ہونگے، تم پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔

صغرا: میرا جسم شروع ہی سے ہلکا ہے۔ (کسی سوچ میں پڑتے ہوئے) کسی زمانہ میں ....

قدیر: (صغرا کو جو جملہ ختم کئے بغیر چپ ہو گئی ہے۔ غور سے دیکھتے ہوئے) کیا؟

صغرا: (چونک کر) کیا کہا آپ نے؟

قدیر: کچھ نہیں، کسی زمانہ کو یاد کر رہی ہو۔

صغرا: کبھی کبھی ....

قدیر: تو کچھ باتیں تمہیں بھی یاد ہیں۔

صغرا: نہیں تو۔ اب کیا یاد ہے!

قدیر: تم شادی کے وقت اکیس سال کی ہو گی؟

صغرا: (بغیر دلچسپی کے) ہونہہ!

قدیر: بی۔ اے میں پڑھتی تھیں نا؟

صغرا: (ویسے ہی) ہونہہ!

قدیر: معلوم نہیں تم نے بی۔ اے کیوں نہ کیا؟ تمہیں تو شوق تھا پڑھائی کا!

صغرا: یہ سوال تو آپ نے مجھ سے کئی دفعہ کیا ہے؟

قدیر: نہ، جواب تو میں جانتا ہوں، مگر مجھے یقین کبھی نہیں آیا!

صغرا: تو اب دس سال بعد یقین کر کے کیا کیجئے گا۔

قدیر: یونہی! سلیمان کے لکچر نے پھر یاد کرا دیا۔ معلوم نہیں سلیمان نے شادی کیوں نہیں کی۔ میری عمر کا ہوگا۔

صغرا: (بے سوچے) نہیں آپ سے چھوٹا ہے۔

قدیر: ہاں، تمہارا ہم عمر تھا!

صغرا: (جیسے سوچ کر) جی ہی!

قدیر: تمہارے خاندان میں آپس کے رشتے بہت ہوتے ہیں۔

صغرا: (جیسے بات کو ٹالتے ہوئے) بہت سے خاندانوں میں یہ رواج ہے۔ معلوم نہیں بچے کیا کر رہے ہیں۔

قدیر: (آخری جملہ پر توجہ نہ دیتے ہوئے) یہ سلیمان ان دنوں وکالت پاس کر رہا تھا؟

صغرا: شاید

قدیر: اچھا خوش شکل تھا!

صغرا: ہونہہ

قدیر: اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمہارے خاندان میں حسن بہت عام ہے۔

صغرا: (طنزیہ) شکریہ!

قدیر: مذاق نہیں کر رہا۔ سلیمان، مجھے یاد ہے بہت وجیہ نوجوان تھا اور پھر اس کا شعر پڑھنے کا انداز اور جوشیلی طبیعت!

(صغرا سوئیٹر بنتی رہتی ہے۔ کچھ جواب نہیں دیتی)

قدیر: (پھر) تمہاری شادی میں تو میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں ان دنوں کہاں تھا؟

صغرا: (ٹھہر کے) مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ کہیں گیا ہوگا۔

قدیر: ہمارے ہاں شاید اس نے ایک دو سال بعد آنا شروع کیا تھا۔

صغرا: آپ، لوگوں کی نقل و حرکت خوب یاد رکھتے ہیں!

قدیر: فقط مشاہدہ کی بات ہے۔ مثلاً اب چار پانچ سال سے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

صغرا: (ٹھہر کے اسی متین لہجے میں) دنیا میں ہمارے سوا اور بھی بہت چیزیں ہیں۔

قدیر: مگر تمہارا تو وہ نزدیکی رشتہ دار ہے!

صغرا: آپ کے بھائی اسلم کتنی دفعہ آپ سے ملنے آتے ہیں؟

قدیر: بھائی اسلم تو بال بچوں والا ہے۔ اسے کہاں فرصت کہ میری طرف بھاگتا رہے۔

(صغرا اس کا کچھ جواب نہیں دیتی)

قدیر: میرے خیال میں تمہارے ابا سلیمان سے ان دنوں ناراض تھے۔

صغرا: شاید!

قدیر :- (جیسے کسی خیال کے تجسس میں) تمہاری ماموں زاد بہن کسی زمانہ میں تمہاری گہری سہیلی تھی!

صغرا :- جوانی کے دنوں میں سب ہی ہم عمر سہیلیاں ہوتی ہیں۔ اور پھر تو بہی رشتہ دار!

قدیر :- (سوچتے ہوئے) مجھے فقط ایک ہی دفعہ اس سے گفتگو کا موقع ملا ہے۔

صغرا :- (دلچسپی نہ لیتے ہوئے) کب؟

قدیر :- مدت ہوگئی۔ تمہارے میکے میں کوئی بڑی سی تقریب تھی، بہت سے شخص آئے ہوئے تھے۔

صغرا :- (کچھ کہنے کی خاطر) رشیدہ اچھی شوخ لڑکی ہوا کرتی تھی۔

قدیر :- (صغرا کو، جو نظریں نیچی کئے سوئٹر بننے میں مشغول ہے دیکھتے ہوئے اسی مبہم سی مسکراہٹ سے) اتفاق سے گفتگو سلیمان کے متعلق ہی ہونے لگی۔

صغرا :- (بے دلی سے، جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی) اچھا!

قدیر :- وہ تو سلیمان کو دیوانہ کہتی تھی!

(صغرا سُنے جاتی ہے۔ جواب نہیں دیتی)

قدیر :- (پھر) کہتی تھی یونہی بدحواس ہوا رہتا تھا۔ اور شعر لکھتا اور پڑھتا رہتا تھا۔ اور (ذرا رک کے) یہ کہ تمہارے والد کو اس کے شعر اچھے نہیں لگتے تھے۔

صغرا :- (بے توجہی سے) اچھا!

قدیر :- رشیدہ تو یہ بھی کہتی تھی کہ ان غزلوں میں تمہارا نام بھی استعمال کر لیتا تھا۔

صغرا :- (نظر اٹھا کے اپنے خاوند کو سرد مہری سے دیکھتے ہوئے) رشیدہ کی باتیں آپ کو ضرور پسند آئی ہونگی۔

قدیر :- (صغرا سے آنکھ نہ ملاتے ہوئے) وہ تو یہ بھی کہتی تھی کہ تم ان غزلوں کو بہت شوق سے سنا کرتی تھیں۔

صغرا :- (بلا تاسف مگر بجھی ہوئی آواز میں) کسی زمانہ میں مجھے شعر پسند تھے۔

قدیر :- (صغرا کو اتنا متین اور پرسکوں دیکھ کر، تھوڑی سی پشیمانی محسوس کرتے ہوئے) شعروں کو پسند کرنا تو اچھی بات ہی ہے

صغرا :- (اس فقرہ سے متاثر ہوئے بغیر) مگر سب چیزوں کے لئے وقت ہوتا ہے۔

قدیر :- (نہ سمجھتے ہوئے، ذرا شوق سے، جیسے صغرا کچھ بتلانے کو ہے) مثلاً عشق و محبت اور شعر و شاعری؟

صغرا :- (قدرے حقارت سے) شاعر تو آپ کو ہونا چاہیئے تھا۔

قدیر :- (گھبرا کے) کیوں؟

صغرا :- آپ کے خیالات ہی ایسے شاعرانہ ہیں۔

قدیر :- (نہ سمجھتے ہوئے، چڑ کے) کیا!

صغرا :- (تھکی ہوئی آواز میں) آپ ناحق اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں، مجھے اب شعر و شاعری سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ اور آپ کے لئے تو ایسے ہی یہ تجسس عبث ہے۔ آپ ڈاکٹر ہیں، کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ آپ اور باتوں میں کیوں الجھیں؟

قدیر :- (جیسے صغرا نے بہت سچی بات کہی ہے) تبھی تو میں ایسی واہی تباہی تقریروں پہ ہنس دیا کرتا ہوں۔ یونہی سلیمان کی بیہودگیوں پہ تعجب آتا ہے۔ اتنی عمر میں بھی اسے عقل نہیں آئی۔

صغرا :- (ٹھہر کے۔ اور سوئٹر پر نظریں جمائے) بعض طبیعتوں کی افتاد ہی ایسی ہوتی ہے۔ اور یوں بہت سے شاعر اور خیال پرست ساری عمر ہی ایسے گزار دیتے ہیں!

قدیر :- معلوم نہیں اب بھی شعر کہتا ہے کہ نہیں؟

صغرا :- (بے دلی سے) کیا پتہ؟

قدیر :- (سوچ کے) تم واقعی بہت تبدیل ہوگئی ہو۔ تم میں وہ چمک اور شوق نہیں۔

صغرا :- (ٹھہر کے) مجھ ہی پہ کیا منحصر ہے یہ چیزیں کسی میں بھی نہیں رہتیں۔ بس مر جاتی ہیں۔

قدیر :- مگر کبھی کبھی تو آدمی کو شوق آ ہی جاتا ہے۔

صغرا :- بعض لوگوں کی موت دائمی ہوتی ہے۔

قدیر :- مگر ان چیزوں کی یاد؟

صغرا :- (اسی بے ذوق لہجے میں، ٹھہر کے) یاد بھی مر جاتی ہے۔

سید فیاض محمود



غزل

قصرِ کسریٰ نہ رہا، تختِ سلیماںؑ نہ رہا　　"ایک حالت پہ کبھی عالمِ امکاں نہ رہا"

دل ہے برباد کہ دِل میں غمِ جاناں نہ رہا　　گھر ہے ویران کہ گھر میں کوئی مہماں نہ رہا

دِل بھی اب بےحسیِ غم سے پریشاں نہ رہا　　جی بہلنے کا شبِ غم کوئی ساماں نہ رہا

خونِ دِل تو نے بھی حد کردی گُل افشانی کی　　اب گلستاں میری نظروں میں گلستاں نہ رہا

جورِ صیاد سے غنچوں کا تبسم ہے اداس　　مسکراتے ہیں کہ اب کوئی غزلخواں نہ رہا

محض بیخودیٔ عشق بھی کیا محفل ہے　　آگیا کوئی پریشاں تو پریشاں نہ رہا

آپ کی تیغ کے احسان سے وہ بچ نہ سکا　　جو کبھی آپ کا شرمندۂ احساں نہ رہا

اب نہ ممنونِ دوا ہوں نہ دعا کا محتاج　　شکر ہے دردِ مرا قابلِ درماں نہ رہا

نہ وہ ساقی ہے نہ جامِ مئے گلرنگ ہے آج　　آنکھ کیوں خون نہ روئے کہ وہ ساماں نہ رہا

میری ہر سانس ہے آئینۂ ناکامیٔ شوق
کب میں اے نجمؔ اسیرِ غمِ پنہاں نہ رہا

نجمؔ ندوی بی۔ اے

چین کا ملک الشعراء

(لی ۔ پو)

آج رفتارِ زمانہ کی تیزی اور وقت کے سیاسی ہنگاموں میں ہمیں یہ حقیقت ایک بھولا ہوا افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کا تعلق ایشیا کے مشرقی حصے سے ہے اور اس پرانی تہذیب کے بچے کھچے آثار جن کو باقیات الصالحات کہنا چاہیئے، دنیا کی مختلف طاقتوں کی خودغرض ریشہ دوانیوں اور جوع الارض کی نذر ہونے کو ہیں۔ آج اس ملک میں ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ کشمکش حیات کے ہر مسئلے کو بھول کر سپاہی بن جائے۔ لیکن ان سب حالات کے مقابلے میں نگاہِ تصور ماضی کے فارغ البال زمانے کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتی ہے۔

ابھی یورپ وسطیٰ میں تمدن کی سحر طلوع ہی ہوئی تھی کہ چین کے تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اس زمانے کی فنکارانہ ترقیوں میں نمایاں درجہ علم ادب کو حاصل تھا اور علم ادب میں بھی شاعری ممتاز اور مخصوص حیثیت رکھتی تھی۔ ڈراما نگار کوئی نہ تھے، نہ ہی افسانہ نگار تھے، صرف شاعر، اور شاعر بھی کس کثرت سے! اس کے متعلق ایک ملکی نقاد رائے زنی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اُس عہد میں جو کوئی بھی آدمی تھا، شاعر تھا!" اور اس رائے میں طنز کا کوئی شائبہ نہیں۔ چین میں "تیانگ خاندان کا مجموعہ نظم" آج بھی موجود ہے۔ جس کی نوسو جلدیں ہیں اور ان نوسو جلدوں میں اڑتالیس ہزار نوسو نظمیں شامل ہیں، جن کو کم و بیش دو ہزار تین سو شاعروں نے تصنیف کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی واضح رہے کہ یہ مجموعہ اٹھارھویں صدی میں ایک مانچو شہنشاہ کے حکم سے ترتیب دیا گیا تھا۔ گویا ایک ہزار سال تک زمانے کی دست برد سے جس قدر کلام بچ رہا وہی اس مجموعے میں شامل کیا جا سکا۔

شعرا کی اس وسیع فہرست میں شمولیت کسی شخص کے لئے باعث افتخار تصور نہیں کی جا سکتی لیکن ان سب میں سے منتخب ہو کر عظیم ترین خیال کیا جانا، اس ان گنت فوج کا لافانی سپہ سالار بن کر لوگوں کی نظروں میں چمکنا یقیناً ایک نمایاں، غیرمعمولی اور قابل فخر حیثیت ہے۔ یہ قابل فخر حیثیت لی۔پو کو حاصل ہے۔ کسی کو اس فیصلے پر اعتراض نہیں لی۔پو نہ صرف تیانگ خاندان کے عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے بلکہ اُسے ہر زمانے میں چین کا ملک الشعرا کہتے رہے ہیں۔

شاعر کے حالات بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر تیانگ خاندان کے زیر اقتدار چین کی جو حالت تھی اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ خصوصاً شہنشاہ سوان سونگ کے عہدِ حکومت کا جائزہ لے لیں جو کچھ عرصہ لی۔پو کا سرپرست رہا۔ اور جس کا لمبا اور شاندار زمانہ چینی شاعری کا عہد زریں متصور ہوتا ہے۔

(۲)

تیانگ لوگ ساتویں صدی کے اوائل میں برسرِاقتدار ہوئے تائی سونگ جو اس خاندان کا دوسرا شہنشاہ تھا اس نے اپنے تئیس سال کے زمانۂ حکومت میں ملک کے باغی اور مخالف علاقوں کو زیر کیا اور اپنی سلطنت کی پختہ بنیاد ڈالی اور صحرائے منگولیا کے تاتاری قبائل اور تبت کی فتح سے اس سلطنت کو وسعت دی۔ ملکہ وُو۔ہو کو عنانِ حکومت اپنے قابو میں کر لینے پر بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ وہ چین کے قابل ترین حکمرانوں میں سے ایک تھی اور اُس نے اُس صدی کی آخری چوتھائی میں اپنے ملک کا وقار قائم کرنے کے لئے بہت کچھ کیا۔ اس ملکہ کے عین بعد ہی سوان سونگ نے ۷۱۲ء میں تخت پر قدم رکھا اور بیالیس سال تک حکومت کی۔

چین کے لئے یہ زمانہ سیاسی طاقت وعظمت اور ملکی وسعت کا زمانہ تھا۔ سلطنت کی حدیں سائبیریا سے لیکر کوہستان ہمالیہ کی وادیوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور کوریا سے لے کر بحیرۂ ابیض تک اس کا دامن کشادہ تھا۔ ہندوستان اور نانکن سے خراج آتے تھے۔ خلفائے مدینہ قیمتی پتھر، گھوڑے اور دیگر اشیا تحائف کے طور پر بھیجتے تھے۔ جاپان کے قدیم دار الخلافے نارا سے وقتاً فوقتاً طلبا کی آمد ہوتی تھی یہاں تک کہ ایک بار ۶۴۳ء میں یونان کے شہنشاہ تھیوڈوسیس کی جانب سے چین کے دربار میں ایک وفد آیا تھا۔

یہ زمانہ فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ ہوانگ ہو اور ینگ سی کیانگ کی زرخیز وادیوں میں چاول اور باجرے کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، چمکتی ہوئی ندیاں تھیں، اور پانی سے لبریز جھیلیں تھیں۔ اُس چین میں اب امن وامان اور آسایش کا دور دورہ تھا جسے گزشتہ چار صدیوں میں متواتر جنگوں کی شورش نے تباہ اور ویران کر ڈالا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں تجارت کو فروغ تھا اور دور دراز دیہات میں بھی سکون کی حکومت تھی۔

شین سی کے علاقے میں سیان فو کا شہر آباد ہے جس کا نام اُس وقت چانگ این تھا، وہی ملک کا دار الخلافہ تھا اور اس شہر کی امارت شان وشوکت اور جاہ وجلال کو کبھی عروج کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوا تھا جو اس زمانے میں تھا۔ عظیم الشان قلعہ جس کے نو دروازے تھے جنفنیس شاہی محلات اپنے سنہرے ستونوں اور درخشاں میناروں کے ساتھ تمام شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ امرا کی حویلیاں ان میں شامل نہیں اور ان کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ دن کے وقت شہر کے کوچہ وبازار گوناگوں لوگوں کے ہجوم سے بھرپور رہتے تھے۔ گھوڑوں پر سوار آرہے ہیں۔ اور خوبصورت بہلیاں جا رہی ہیں جن میں کالے بیل جُتے ہوئے ہیں اور ان کے علاوہ ان گنت عشرت گاہیں تھیں۔ تفریح کے مقامات تھے ان کے دروازے رات کو کھلتے اور رقص ونغمہ، مے ومینا، اور چاند سے چہروں والی خوبصورت عورتوں سے معمور رہتے۔

اس زمانے میں مذہبی بحث وتمحیص کا بازار بھی گرم تھا۔ بدھ مذہب تیانگ خاندان سے کئی صدی پیشتر چین میں داخل ہو چکا تھا۔ اور ملک بھر میں بدھ مندروں اور خانقاہوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ تائی سونگ کے عہد سلطنت میں مشہور سیاح اور بدھ پجاری ہیون سانگ نے ہندوستان میں اپنی مشہور تیرتھ یاترا کی اور لوٹتے ہوئے وہ سنسکرت کی کئی سو کتابیں اپنے ساتھ چین میں لایا۔ اگرچہ حکومت اور سماج میں کنفیوشس کے وضع کئے ہوئے قوانین جاری رہے پھر بھی طاؤمت نے عقاید میں مذہبی افسانہ طرازی، دیومالا اور اوہام پرستی کے ڈھکوسلے لا کھڑے کئے اور یہ نئے خیالات دربار اور عوام دونوں میں تیزی کے ساتھ مقبول ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ دوسرے مذاہب کے مبلغوں نے بھی سعی وکوشش سے چین کے دار الخلافے میں بار پاکر اپنے قدم جمانے شروع کئے لیکن دار الخلافہ صرف ان مذہبی خیالات کا مرکز ہی نہ بن گیا بلکہ اس میں مختلف علوم وفنون کی درس گاہیں بھی قائم کی گئیں۔ تائی سونگ علم نجوم کا دلدادہ تھا اور اُس نے اپنی دوسری سرگرمیوں کے علاوہ شاہی کتب خانے میں دو لاکھ سے زائد کتب کا اضافہ کیا۔ سوان سونگ نے اپنے زمانے میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کی سلطنت کے پندرہ صوبوں میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں ایسا نہ رہ جائے جس میں کم سے کم ایک مدرسہ نہ ہو۔

سوان سونگ بذات خود ہر بات کے لحاظ سے ایک مکمل شہزادہ تصور کیا جاتا تھا۔ عقلمند اور بہادر، سپاہیانہ کھیلوں اور کرتبوں میں ماہر اور ہر علم وفن سے واقف چونکہ وہ خود ایک اچھا موسیقی دان تھا، اس لئے اس نے اپنے محل میں ایک سکول قایم کیا جس میں مرد وزن دونوں اداکاروں کو راگ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاریخ دان یہیں سے چینی ڈرامے کی ابتدا شمار کرتے ہیں۔ شہنشاہ کے دربار میں حسین عورتوں، فنکاروں اور شاعروں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ لی۔ پو اور تو۔ فو اس کے سامنے قصیدے لکھ کر پیش کرتے تھے۔ "لی کوا۔ ئے آئی نی این" نغمہ سرائی سے اس کا دل خوش کرتی اور "یانگ کوا۔ ئے آئی نے آئی" جسے محل کی تین ہزار حرموں میں سے حسین ترین شمار کیا جاتا تھا۔ ہر وقت اس کی پالکی کے ہمراہ رہتی تھی۔ اگرچہ اپنے آخری ایام میں سوان سونگ عیش وعشرت میں ڈوب گیا، لیکن اس نے کبھی کوئی متبذل حرکت نہ کی اور کبھی بھی اپنے ان عیش کے جلسوں کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیا۔ آج تک اس بادشاہ کو "منگ ہوآنگ" یعنی "رنگیلا بادشاہ" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے!

لیکن اس عہد کی یہ لفظی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک اس تصویر کے دوسرے رُخ یعنی تاریک پہلو کو بھی بیان بھی نہ کر لیا جائے۔ وہ تاریک پہلو، جس کی وجہ سے چینی قوم کی روحانی

طاقتیں پورے طور پر کارفرما ہوگئیں۔ شاہی تاج کے حصول کے لئے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی متواتر تگ و دو اور ریشہ دوانیوں سے تیانگ خاندان کے ابتدائی زمانے سے ہی سرکار دربار کے حالات سکون سے دور بلکہ منتشر اور درہم برہم رہتے تھے اور شاہی محدود حلقے سے باہر خلقت کردگار کے امن و آسائش اور فارغ البالی پر حریفانہ نگاہیں رکھنے والے بھی کچھ کم نہ تھے۔ مختلف دشمن ہمیشہ اس تاک میں رہتے کہ کب موقع ملے اور کب لوٹیں۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ سرحد کی شورشیں دم بھر کو رک جائیں اور شاہی فوجوں کو ان کی سرکوبی اور مدافعت کے لئے قریبًا ہر وقت اپنی توجہ ان کی جانب مبذول رکھنا پڑتی تھی اور ان جھگڑوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں سپاہی کام آجاتے۔

مغربی چین میں تبت والے تھے جن کی خاطر خواہ تسکین ان سیاسی شادیوں سے نہ ہوتی تھی جن میں وقتًا فوقتًا نازک اندام اور مہذب شاہزادیوں کو اجڈ سرداروں سے زبردستی منسلک ہونا پڑتا تھا۔ ان شورشوں کے مصائب کے سلسلے میں سوانگ سونگ کی فوجوں کو سب سے بڑھ کر بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۷۵۱ء میں صحرائے گوبی کے علاقے میں تیس ہزار آدمی تباہ و برباد ہو گئے اور ین نان کے حملوں میں وحشیوں کے خلاف چینیوں کے دو لاکھ آدمی کام آئے اور ان سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر این لوشان کی بغاوت تھی، جس نے ایک بے پناہ طوفان کی طرح شہنشاہیت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔

این لوشان کِتَن نسل کا ایک سپاہی تھا جس نے اپنے ہی قبائل کے خلاف جنگوں میں نام پیدا کیا اور "یانگ کوائے آئی فے آئی" کی نظروں میں مقبول ہو کر سوان سونگ کا اعتماد حاصل کیا۔ اس کا عروج بہت جلد جلد ہوا۔ اُسے نواب کا خطاب دے کر شمال کے سرحدی صوبوں کا گورنر بنا دیا گیا۔ جہاں اُسے سلطنت کی بہترین افواج کی سرداری کا موقعہ ملا اور وہ اپنے دل میں پوشیدہ امنگیں لئے ہوئے، مناسب وقت کا منتظر رہا۔ اس دوران میں شاہی دربار کی حکومت کے حالات ایک تیزی کے ساتھ مائل بہ تخریب تھے۔ اس کی وجہ "یانگ کوائے آئی فے آئی" کے لئے سوان سوانگ کی اندھی محبت تھی۔ اُس کا بھائی "یانگ کواو چونگ" وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر خواجہ سراؤں کو حکم چلانے کا موقعہ ملا گویا ایک طرح سے واجد علی شاہ کے دربار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر کار ۷۵۵ء کے موسم بہار میں

این لوشان نے دربار کو "یانگ کواو چونگ" کے پنجوں سے رہائی دلانے کے بہانے بغاوت کا علم بلند کیا۔ اُس نے بہت جلد لویانگ کے شہر پر قبضہ جما لیا اور ہوانگ ہو کے شمال کا تمام علاقہ اپنے قابو میں کر لیا۔ جن میں شان سی اور چی لی کے صوبے بھی تھے۔ اس کے بعد اُس نے مشرق کے رُخ دار الخلافے کی سمت قدم بڑھایا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ بذاتِ خود شہنشاہ ہے اور اس کا تعلق ین خاندان سے ہے۔ سوان سونگ ایک عمر رسیدہ حکمران تھا اس نے جب تباہی کو اس قدر قریب دیکھا تو وہ اپنے ماتحت اور پروردہ کی ناشکری اور احسان فراموشی پر متعجب ہو کر پکار اٹھا۔ "ناممکن! یہ ناممکن ہے!" نتیجہ یہ ہوا کہ مدافعت کے لئے کوئی اچھی تدبیر عمل میں نہ لائی جا سکی۔ ایک صبح موسلا دھار بارش میں شہنشاہ کو مجبور ہو کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس نے اپنی محبوب ترین حرم اور چند وفادار خادموں کو ساتھ لیا اور یہ سب لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ وہ فوجی اور سپاہی جو سوان سونگ کے ہمراہ تھے انہوں نے اس تمام مصیبت اور تباہی کی علت "یانگ کواو چونگ" کو ٹھہرایا اور اس لئے اُسے اور اس کے تمام رشتہ داروں کو تہ تیغ کر دیا یہاں تک کہ "یانگ کوائے آئی فے آئی" بھی اس انتقام سے نہ بچ سکی۔ اسے اپنے شاہی عاشق کے بازوؤں سے نوچ کر علیحدہ کر دیا گیا اور گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ اور سرِ راہ ایک گڑھا کھود کر بغیر کسی رسم کے دبا دیا گیا۔ شہنشاہ نے اپنے بیٹے کے حق میں حکومت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور خود شوح کے علاقے کی طرف نہایت رنج و تاسف اور غم والم کی حالت میں روانہ ہوا۔

نیا شہنشاہ جس کا نام سُو سُونگ تھا اُس نے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جرنیل "کواو سوا ئی" کے ماتحت ایک جرار لشکر ترتیب دیا ۷۵۷ء میں این لوشان کو دار الخلافے سے نکال باہر کیا گیا۔ اس سے کچھ عرصے کے بعد اُسے اُس کے اپنے ہی بیٹے نے قتل کر ڈالا۔ ان تمام کارروائیوں کے بعد بھی کچھ عرصے تک چھوٹی بڑی بغاوتیں رونما ہوتی رہیں۔ لیکن آخر کار ۷۶۲ء میں ان سب کا قلع قمع کر دیا گیا۔ یہاں سے آگے ہمیں تاریخ کا ساتھ دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اسی سال یعنی ۷۶۲ء میں ہی سابق شہنشاہ سوان سونگ دار الخلافے میں لوٹ آیا اور بہت جلد مر گیا۔

یہ زمانہ تھا اور یہ تھے حالات۔ اگر ایک طرف ملک میں اندرونی

امن و امان تھا، فارغ البالی اور خوش حالی تھی، تہذیب و تمدن کی ترقیاں تھیں اور علوم و فنون کی سرپرستی تھی تو دوسری طرف دور دراز کی جنگیں بھی تھیں۔ درباری مناقشات اور ریشہ دوانیاں بھی تھیں اور ان سب سے بڑھ کر بہ گیر قومی مصائب کا پُرغضب اور المناک اندھا طوفان بھی تھا۔ اس زمانے اور ایسے حالات نے لی۔ پو اور اس کے ہمعصر شعرا کو پیدا کیا اور اُن کے تصورات کو برانگیختہ کر کے ان کے دلوں کے ساز پر مضراب بن کر لافانی گیتوں کی تخلیق کی۔

(۳)

لی۔ پو کا شجرۂ نسب بہت سی الجھنوں سے گزر کر پانچویں صدی میں لی۔ کاؤ تک پہنچتا ہے جو ریاست لیانگ پر حکومت کرتا تھا۔ آج کل اس علاقے کو کانسو کا صوبہ کہتے ہیں۔ شاعر کا خاندان کچھ عرصے تک منگولیا کے صحرائی خطے میں گزر اوقات کرتا رہا۔ لی۔ پو نے بھی اس کا ذکر کیا ہے لیکن مستند تحقیقات کے مطابق اس کی پیدائش ساتھ کے علاقے شوح میں ہوئی جس کا موجودہ نام "سسو چوان" ہے۔ یہ دلچسپ اور جاذب نظر مغربی صوبہ پہاڑوں اُن ندیوں سے سرسبز و شاداب ہے جو دریائے ینگ سی کیانگ میں مل جاتی ہیں۔

اس کے سن پیدائش کے متعلق بھی سوانح نگاروں میں اختلاف ہے۔ چند اس رائے کے حامی ہیں کہ وہ ۶۹۹ء میں پیدا ہوا۔ چند اور اس بات کو مانتے ہیں کہ اس کا سن پیدائش ۷۰۵ء ہے۔ اس طرح اس کی عمر کے متعلق دو فیصلے بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی موت کے متعلق سب متفق ہیں۔ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کا آخری سال ۷۶۲ء تھا۔ محقق یانگ چی جو منگ خاندان کے عہد میں گزرا ہے اور جس نے لی۔ پو کے کلیات کو پہلی بار مرتب کیا تھا۔ اس کی بات ہیں ہر ایک شہادت کی بنا پر ماننا پڑتی ہے اور اس کی رائے میں سن پیدائش ۷۰۱ء تھا۔

کہتے ہیں کہ جس رات لی۔ پو پیدا ہوا اس رات اس کی ماں نے خواب میں چانگ کینگ یعنی زہرہ ستارے کو دیکھا۔ اس ستارے کو چین میں عام طور پر "تائی پو سنگ" کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی ہیں "بڑا اسفید ستارہ"، یہی وجہ ہے کہ لی۔ پو کا نام تائی پو رکھا گیا۔ بعد ازاں اُسے ایک بُدھ سادھو کا نام اچھا لگا، اور اس کے نام پر اس نے خود کو "مردِ نیلوفر زمردین" کہنا شروع کر دیا اور کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو "طباعِ بادۂ کہن" کہتا رہا۔

ابھی لی۔ پو چھ ہی سال کا تھا کہ اُس نے پڑھنا سیکھ لیا اور دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اُس نے نہ صرف کنفیوشس کی قصائد اور تواریخ کی کتابیں اور ان کے علاوہ ایک صد دیگر مصنفین کے مختلف کارنامے رٹ ڈالے بلکہ بذاتِ خود نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ ابھی وہ سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا کہ اس نے شمالی "سسو چوان" کے ایک پہاڑ پر کسی گوشہ نشین کے ساتھ دنیا سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس گوشہ نشینی میں ان دونوں کا یہ کام تھا کہ وہ عجیب عجیب قسم کے پرندوں کو پالتے اور انہیں یہاں تک سدھاتے کہ وہ ان کے ہاتھوں سے بغیر کسی قسم کے ڈر کے چوگا نے کر کھانے کے عادی ہو جاتے۔ گوشہ نشینوں کے اِن کرتبوں کی اطلاع مقامی مجسٹریٹ تک بھی جا پہنچی۔ جس نے انہیں سرکاری عہدے قبول کرنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ لی پو کا اپنا شعر ہے:۔

"بہاریں بیں یوں بیتی ہیں میری،
مجھے صحبت رہی ہے بادلوں سے،
فراغت کی مرے دل میں ہے چاہت،
لگا ہے دل مرا ان پربتوں سے!"

۷۲۱ء میں لی۔ پو ینگ سی کے کنارے کنارے ہوتا ہوا "تنگ تنگ" کی جھیل پر اس علاقے میں جا پہنچا جو دریا کے شمال کی جانب واقع ہے۔ یہاں اُس کی شادی کسی سابق وزیر "سو" کی پوتی سے ہو گئی اور وہ اس جگہ تین سال تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد وہ شمال کی طرف "شان تون" کو روانہ ہوا۔ چنانچہ اس زمانے کے بارے میں اپنے کسی دوست کو لکھتا ہے:۔

"میں تیس سال کا ہوں بغیر تکان کے شعر کہتا چلا جا رہا ہوں اور میرے گھر کے سامنے گاڑیاں اور گھوڑے آ جا رہے ہیں!"

کئی سال گزر گئے، لیکن یوں ہی۔ لی۔ پو نے کوئی نمایاں کام کر کے نہ دکھایا اور اس کے اس نکھٹو پن پر اس کی بیوی اس سے تنگ آ کر اُسے بچوں سمیت چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ پانچ اور ہم مذاق دوستوں کے ساتھ شامل ہو کر مے و نغمہ سے اپنا دل بہلانے لگا۔ یہ لوگ چو۔ لائی پہاڑ کے دامن میں جمع ہوا

کہنے اور اپنے آپ کو "بانسوں والی وادی کے چھ تن آسان" کہتے۔ اس زمانے میں لی۔ پو نے سفر بھی بہت کیا۔ ایک بار وہ "یو۔ یانگ" کے شہر میں جا پہنچا۔ وہاں تو تنگ۔ ساؤ۔ چی۔ اؤ نے نہایت فراخ دلی سے اس کی مہمان نوازی کی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک پل کے کنارے خاص لی۔ پو کے لئے ایک شراب خانہ بنوا دیا۔ لی۔ پو نے اپنی ایک نظم "تو تنگ۔ ساؤ۔ چی۔ اؤ" کو مخاطب کرکے لکھی ہے۔ جس میں اس نے اس زمانے اور اس جگہ کا ذکر کیا ہے ؂

جہاں پر گیت بکتے تھے بسنتی زر کے بدلے میں
جہاں پر قہقہوں کا مول موتی اور ہیرے تھے
وہاں لمحے گزرتے تھے مے گلگوں کے جلوے میں
"وہاں بڑھ کر تھے ہم دنیا کے سارے تاجداروں سے"

کچھ عرصہ بعد تو تنگ۔ ساؤ۔ چی۔ اؤ نے لی۔ پو کو پھر مدعو کیا۔ اب کی بار اس کا مقام شانسی کے علاقے میں "بنگ چواؤ" میں تھا جہاں تو تنگ کا باپ فوج میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔ یہاں ان دونوں رفیقوں کا کام عیش و عشرت تھا۔ وہ نوجوان گانے والیوں کو ساتھ لئے ہوئے دریا پر بجروں میں سیریں کیا کرتے اور کوئی بات ان کی ان نشاط انگیز مصروفیتوں میں خلل انداز نہ ہوتی۔ اس مقام پر لی۔ پو کی دوستی "کواو سوآئی" سے ہوئی جو اگرچہ اس وقت ایک نوجوان سپاہی تھا لیکن بعد میں جاکر اس نے سلطنت کی بہت سی خدمات کیں اور لی۔ پو کی جان بچانے کا ذریعہ بھی بنا۔ ۷۳۸ء میں لی۔ پو شان تون لوٹ آیا۔ یہاں پر اس کی ملاقات تو۔ فو سے ہوئی جو اُس زمانے میں شان تون کے صوبے میں آیا ہوا تھا۔ تو۔ فو ہی ایک ایسا زبردست شاعر ہے جسے ہم لی۔ پو کا مدمقابل کہہ سکتے ہیں۔ ملاقات ہوتے ہی ایک گہری دوستی کا آغاز ہوگیا اور تمام عمر وہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی نظمیں بھیجتے رہے۔ چین کی تاریخ ادب میں ان دو بڑے شاعروں کی خوشگوار دوستی ہمیشہ کے لئے ایک یادگار رہے گی۔ تو۔ فو عمر میں لی پو سے چھوٹا تھا۔ ان کی نظموں سے ان دونوں کے باہمی تعلقات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اکٹھے کھاتے پیتے، اکٹھے رہتے سہتے، اور دو بھائیوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ دئے اکٹھے سیریں کرتے پھرتے۔

لی۔ پو نے جنوب کی جانب کے علاقوں کا سفر بھی کیا تاکہ وہ پرانے محلات کے کھنڈروں میں پھر سکے اور ان جھیلوں کو دیکھ سکے جن میں کنول کے پھولوں کی بہتات ہوتی ہے۔ ینّن کے ضلعے میں جو اپنی وادیوں اور اپنے پہاڑوں کی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے پھرتے ہوئے لی۔ پو کی ملاقات "تاؤ عالم" "وُو یون" سے ہوئی اور جب "وو۔ یون" کو دربار میں بلایا گیا تو وہ لی۔ پو کو بھی اپنے ساتھ ہی دارالخلافے میں لیتا گیا۔

لی۔ پو دارالخلافے میں ۷۴۲ء میں داخل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سوان سونگ کا دربار پورے عروج پر تھا۔ لی۔ پو نے "ہوچی چانگ" سے ملاقات کی۔ جو ولی عہد کا درباری تھا۔ لی۔ پو نے اُسے اپنی نظمیں دکھائیں۔ درباری ایک زندہ دل اور خوش طبع انسان تھا۔ وہ ان نظموں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے شراب سے شاعر کی خوب خاطر تواضع کی۔ اس کے علاوہ اُس نے شہنشاہ کے حضور میں بھی شاعر کا ذکر ان الفاظ میں کیا: "عالی جاہ! غریب خانے پر آج کل ایک ایسے شاعر کا قیام ہے جو خادم کی ناچیز رائے میں دنیا کے تمام شاعروں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ میں نے اعلیٰ حضرت سے تا حال اس کا ذکر اس لئے نہیں کیا تھا کہ اس میں ایک نقص بھی ہے اور اس نقص کو رفع کرنا ذرا مشکل سا معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ شراب بہت پیتا ہے اور بعض اوقات تو اتنی اندھا دھند پی جاتا ہے کہ نشے میں دھت ہوکر رہ جاتا ہے۔ لیکن اُس کی نظمیں، ـــ اُن کے حسن و بیان کے کیا کہنے! خداوند کی باریک بین نگاہیں بنفس نفیس ان کا ملاحظہ فرما سکتی ہیں" اور یہ کہہ کر اس نے لی۔ پو کی نظموں کا مسودہ شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ مطالعہ کے بعد حکم ہوا "جس شخص نے ان نظموں کو تصنیف کیا ہے اُسے ہمارے حضور میں پیش کیا جائے" ـــ یہ ایک روایت ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک روایت اور بھی ہے کہ لی پو کو دربار میں "تاؤ عالم" "وو یون" ہی نے پیش کیا تھا۔ بہر حال، شاعر کو دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔ اس کی نظموں اور قصیدے کو شہنشاہ نے بے حد پسند کیا اور اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے فرائض میں صرف ایک بات شامل تھی: ۔ وہ گاہے بگاہے نظمیں لکھتا رہا کرے۔

لی۔ پو بڑے بڑے اُمراء اور اُن کی خواتین کے ساتھ دربار کے اندر اور باہر جلسوں اور دعوتوں میں شریک ہوتا اور کبھی کبھی شہر کے عام مے خانوں میں بھی پہنچ جاتا۔ لیکن اس زمانے میں اس کے خلوتیان راز کون تھے؟ اُس کے گہرے دوست کون کون لوگ تھے؟ ـــ یہ سب

آٹھ دوست تھے جن کا واضح حال "تُو۔فُو" نے اپنی ایک مشہور نظم میں محفوظ کر رکھا ہے۔ ان آٹھ دوستوں کو "آٹھ لافانی بلانوش" کہا جاتا ہے ہم "تو۔فو" کی اس نظم کا ترجمہ نثر میں پیش کرتے ہیں:۔

"آٹھ لافانی بلانوش"

"چی۔ چانگ اپنے گھوڑے پر سوار تو ہوتا ہے۔

لیکن جھومتا رہتا ہے۔

یوں جھومتا رہتا ہے گویا پانی کی سطح پر کوئی جہاز ڈول رہا ہو اگر وہ کسی دن سرور میں آنکھیں جھپکتے ہوئے کسی کوئیں میں جا گرے،

تو اس کی تہ میں پہنچ کر مزے سے گہری نیند سو جائے گا!

"شہزادہ چو۔ چانگ جب تک تین صراحیاں حلق میں نہ انڈیل لے، دربار کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا۔

وہ جب بھی کسی کلال کی گاڑی گزرتے دیکھتا ہے تو اُس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

وہ خود بھی افسوس کیا کرتا ہے اور واقعی بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ بہار سے کا حکمران نہ ہوا۔

ہمارا وزیر لی ہر روز اتنی پی جاتا ہے کہ جس کا کچھ حساب ہی نہیں ہے۔

وہ تو کسی ایسی بڑی وہیل مچھلی کی طرح حلق میں انڈیلتا چلا جاتا ہے، جو سو دریاؤں کو ایک ہی بار پی کر سکھا دیتی ہے۔

اور وہ اپنے ہاتھ میں ساغر کو لئے ہوئے کہتا رہتا ہے۔ مجھے تو سادھو سنتوں سے محبت ہے اور میں عالموں کی صحبت سے دور بھاگتا ہوں۔

سونگ چی ایک جوان رعنا ہے۔ نازک مزاج انفاست پسند۔ اُسے شور و غوغا اور ہاؤ ہو سے نفرت ہے اور وہ ہاتھوں میں اپنا ساغر تھامے ہوئے نیلگوں آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے۔

ہواؤں کے مقابلے میں جیسے کوئی سرسبز و شاداب درخت بن کر کھڑا ہو۔ یوں ہی اُس میں بھی زندگی کی درخشانی دکھائی دیتی ہے۔

سو چین ذرا مذہبی آدمی ہے۔

بدھ کی رنگین مورت کے سامنے بیٹھا وہ اپنی روح کی صفائی میں مشغول رہتا ہے۔

لیکن جب کبھی کسی مے خواری کے جلسے کی خبر سُن پائے، تو پوجا پاٹ کے دھندوں کو چھوڑ کر اُسی جانب رُخ کرتا ہے۔ کیونکہ روح کی صفائی یوں بھی ہو سکتی ہے!

اور لی۔پو کی بات؟ —— اُس کا تو یہ حال ہے۔ ایک صراحی بھر کر اُسے پلا دو، اور وہ ایک صد نظمیں لکھ ڈالے گا۔

وہ عموماً دارالخلافے کے کسی بازاری مے خانے میں ہی اونگھتا رہتا ہے۔

اور چاہے شہنشاہ کے سامنے اُس کی طلبی ہو جائے، وہ شاہی بجرے کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا۔ وہ یوں کہہ دیتا ہے:۔ "عالیجاہ! خداوندا! معاف کیجئے گا! میں تو شراب کا —— دیوتا ہوں!"

چانگ سو بڑا مشہور مصور ہے۔ تین ساغر پی کر اُسے اپنی قابلیت پر پورا قابو ہو جاتا ہے۔ وہ بغیر کسی قسم کے ادب آداب کی پروا کئے ہوئے شاہزادوں کے سامنے اپنی ٹوپی اتار پھینک دیتا ہے۔

اور چند پانگی کئے ہوئے برش کو ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔

اور ایک ہی پل میں، ہاں، ایک ہی پل میں کاغذ کے صفحے پر بادلوں کے جھرمٹ اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

چاؤ۔سو آئی ایک اور لافانی انسان ہے۔ پانچ صراحیاں چڑھا لینے کے بعد وہ خوش خوش نظر آتا ہے اور فصیح و بلیغ گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ دعوت کے منڈپ میں ہر شخص اس کی ان تقریروں کو سن کر حیران رہ جاتا ہے!"

ایک دن کا ذکر ہے۔ بہار کا موسم تھا شہنشاہ سوان سونگ تو چین کی پھلواری میں اپنی محبوب ترین منظورِ نظر یانگ۔کوا۔ئی۔فے۔آئی کے ساتھ بیٹھا مصروفِ نشاط تھا۔ پھلواری میں کھلے ہوئے پھول عجب بہار دے رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ شاہی محبوبہ کو حسن و جاذبیت میں دعوتِ مقابلہ دے رہے ہیں۔ شاہی سازندے پھلواری کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے ہلکے ہلکے سرور انگیز نغمے فضا میں بکھیر رہے تھے اور شہنشاہ کے سامنے انگوری کا دور چل رہا تھا یہ منظر دلچسپ اور یادگار تھا۔ لیکن افسوس کہ دنیا کی ہر شے کی مانند فانی اس کو لافانی بنانے کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ لی پو کو بلایا جائے۔ صرف

اسی کا فن اس کام کا اہل تھا۔ صرف لی۔ پو ہی اپنے اس غیر معمولی فن کے ذریعے سے ان گزرے ہوئے لمحوں کے حسن و عشرت کو الفاظ کے جال میں گرفتار کر کے ابد تک محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن جب شاعر کو شہنشاہ کے حضور میں لایا گیا تو وہ نشے میں چور تھا۔ بے ہوش۔ گرد و پیش کے حالات سے بے خبر۔ خدامِ ادب نے اس کے چہرے پر سرد پانی کی بوچھاڑیں دیں۔ ذرا ہوش آیا تو لکھنے کے لئے اُس نے اپنے ہاتھ میں برش کو تھاما اور منظر کا جائزہ لیتے ہوئے "یانگ کوا سے آئی فے آئی" کی تعریف میں تین گیت لکھے اور ان تینوں گیتوں کو دربار کے مشہور گویّے "لی۔ کوا سے۔ آئی۔ نی۔ این" نے گایا اور خود شہنشاہ نے بنسری پر گویّے کی ہم آہنگی کی۔ ہم ان تینوں گیتوں کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

پہلا گیت

اُڑتے ہوئے بادلوں کی شوبھا اُس کے ملبوس میں ہے،
"اور اس کے چہرے پر ایک پھول کی سی چمک!
"یہ آسمانی حسن ہے، جو بلندی پر ہی دیکھا جاتا ہے،
"پربتوں کی چوٹیوں پر!
" یا جب چاند نی کھلی ہوئی ہو، تو پریوں کے شیش محل میں!
"لیکن یہ کیا بات ہے کہ میں تو اسے زمین پر ہی ایک پھلواری
میں دیکھ رہا ہوں!۔
"روش پر بہار کی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے،
"اور اوس کی بوندیں دمک رہی ہیں . . . "

دوسرا گیت

"وہ تو ایک ٹہنی ہے، کھلے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی،
"جس پر اوس کی ان گنت بوندوں کا بسیرا ہو!
"وہ تو اس گم شدہ پری جیسے روپ والی ہے،
"جس نے ایک کہانی میں،
"اپنے کو نظروں سے چھپا کر کسی راجہ کو رنجیدہ کیا تھا!
"ذرا کہئے تو سہی، کہ ہان کے محل میں۔
"سوائے ایک پرانے راجہ کی محبوبہ کے
کوئی بھی حُسن و جمال میں اس کی ثانی ہے؟"

تیسرا گیت

"وہ آلوچوں کی پھلواری میں۔
"کٹہرے سے لگ کر جھکی ہوئی کھڑی ہے!
"بہار کی ہوا سے جو محبت کی اُمنگیں دل میں پیدا ہو جاتی ہیں!
"اُن کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ختم ہو چکا!
"چمکتے ہوئے پھول، پھولوں کی رانی سے مل کر خوشیاں منا رہے ہیں!
"اور شہنشاہ اس منظر کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہے!"

روایت ہے کہ ان گیتوں میں سے دوسرے گیت کی بنا پر ہی لی۔ پو کو آخر کار دربار سے رخصت ہونا پڑا۔ "کاؤ لی۔ شیح" خواجہ سراؤں کا سردار تھا۔ ایک بار جب لی۔ پو محل میں بہت زیادہ شراب پی گیا تو خواجہ سراؤں کے سردار کو شہنشاہ کے حکم سے شاعر کے جوتے اتارنا پڑے تھے۔ اسے اس نے اپنی توہین سمجھا تھا اور اس رنجش کو مناسب موقع کے لئے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ اب اُسے موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے "یانگ۔ کوا سے۔ آئی فے۔ آئی" کے سامنے دست بستہ عرض کی "حضور! بات کہنے کی نہیں۔ لیکن نمک خواروں سے بغیر کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ سب عمر جس کے احسانات کے نیچے گردن جھکی رہے اس کی ذرا سی اہانت بھی کم سے کم غلام سے ہرگز ہرگز نہیں دیکھی جا سکتی . . .!"

عورت آخر عورت ہے۔ جال بناتی بھی ہے اور دوسروں کے بنے ہوئے جال میں گرفتار بھی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اُس صورت میں کہ اس کی خود پرستی کو ٹھیس پہنچ رہی ہو۔ خواجہ سراؤں کے سردار نے چاپلوسیوں کے ساتھ لی۔ پو پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اس دن پھلواری میں لکھی ہوئی تین نظموں میں سے ایک میں شاہی حرم کا ہان خاندان کے دربار کی ایک مشہور حسینہ عورت سے موازنہ کیا ہے۔ ہان خاندان کی یہ عورت بے وفا تھی اور وہ کبھی بھی ملکہ کے عالی رتبے کو نہ پہنچ سکی تھی۔ خواجہ سرا نے کہا کہ لی۔ پو نے یہ موازنہ طنزیہ طور پر کیا ہے۔ ایک ہجوِ ملیح کے طور پر۔ اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ "یانگ کوا سے۔ آئی۔ فے۔ آئی" جسے ان تعریفی گیتوں کے لئے شاعر کا شکرگزار ہونا چاہئے تھا ہمیشہ کے لئے اس کی دشمن بن گئی اور آئندہ شہنشاہ نے جب کبھی لی۔ پو کو کسی عہدے پر مقرر کرنا چاہا تو اس کی محبوبہ نے ہمیشہ مخالفت کی۔ ایک اور

روایت بھی ہے اور وہ یہ کہ کسی درباری کی ریشہ دوانیوں کی بدولت لی پو شہنشاہ کی نظروں سے گر گیا - یہ روایت بھی عین ممکن ہے - لی پو ایسا آدمی ہی نہ تھا کہ دربار کی پرتکلف زندگی اور چالبازیوں سے عہدہ برا ہو سکتا وہاں کامیابی کے لئے جن خصوصیات کا ہونا ضروری تھا۔ لی پو کی شاعرانہ فطرت میں اُن کا فقدان ایک قدرتی بات تھی - جلد ہی لی پو نے درخواست کی کہ وہ پھر پربتوں کو لوٹ جانا چاہتا ہے، اور اُسے درباری خدمات سے سبکدوش کیا جائے۔ شہنشاہ نے اخراجات کی کفالت کرتے ہوئے اُسے بہت جلد رخصت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اس وقت لی پو کی عمر پینتالیس سال کی تھی اور دارالخلافے میں درباری زندگی گزارتے ہوئے اُسے تین سال ہو چکے تھے۔

لی پو نے از سر نو مسافرانہ زندگی شروع کر دی - وہ ملک بھر میں پھرتا رہا۔ کبھی تو لمبے لمبے فاصلے دنوں ہی میں طے کر لیتا لیکن کبھی اگر کسی جگہ کے مناظر اُسے حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے تو سال بھر وہ اُسی ایک مقام پر ہی بسر کر دیتا -

اس سفری زندگی کے دوران میں ہی اس نے تاؤ مذہب کی تعلیم مکمل طور پر حاصل کی اور پھر شان تُون کے جنوب میں سفر کرتے ہوئے اس کی ملاقات "سو آئی، سونگ - چی" سے ہوئی - یہ جوان رعنا "آٹھ لافانی بلانوشوں" میں سے ایک تھا اور اب دارالخلافے سے برخاست کیا جا کر نانکن کے شہر میں ایک عہدے پر مامور تھا - پرانی دوستی تازہ ہوئی اور اسی پہلی خوش وقتی کے ساتھ لمحے گزرنے شروع ہوئے - کہا جاتا ہے کہ ایک چاندنی رات دونوں دوست ینگ سی کے دریا پر سفر کرتے ہوئے، نانکن کو لوٹ رہے تھے کہ لی پو نے کسی ذہنی لہر کے اثر کے تحت اپنے آپ کو درباری لباس میں آراستہ کیا اور مے کے سرور میں قہقہے لگاتا رہا اور اپنی گول گول آنکھوں کو ایک شوخ انداز میں گھماتا اور جھپکتا رہا۔ کیا یہ عیش و عشرت کی بے نیازی کے قہقہے تھے یا اُس نے اپنے آپ کو ان کی آوازوں میں کھو دینے کے لئے ایسا چلن اختیار کیا تھا، اور یا یہ ایک توہین آمیز اظہار نفرت تھا، اُس بے ڈھب، نادان اور کم فہم دنیا کے لئے جو کبھی بھی ایک شاعر کی روح کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی؟!

۷۵۴ء میں لی - پو کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست سے ہوئی جس کے ساتھ کچھ عرصہ سفری رفاقت - ہی - لی پو نے اُسے اپنی نظموں کا ایک بستہ دے کر کہا "یہ لو اور اس بوڑھے کو یاد رکھنا یقیناً مستقبل میں میں شہرت کے آخری زینے پر پہنچوں گا"!

اس کے بعد کا سال یعنی ۷۵۵ء لی پو کی زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے - کیونکہ اسی سال میں حادثات زمانہ کا ایک ایسا سیلاب آیا جس کی وجہ سے عین ممکن تھا کہ چین کا یہ شاعر اعظم اپنی عمر طبیعی سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا - "این لوشان" نے بغاوت کا علم بلند کرنے کے بعد شہر لویانگ پر اس قدر خون خرابے کے ساتھ قبضہ جمایا کہ روایات کے مطابق دریائے لو میں پانی کی بجائے خون بہتا ہوا نظر آنے لگا - ہر طرف ایک نفسا نفسی کا عالم تھا اور جنگ کی افراتفری اور بدنظمی سے رہائی پانے کے لئے لی پو کو بھی شہر چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی - معلوم ہوتا ہے کہ غدر اور ہبوں کے اسی زمانے میں لی پو نے اپنی فراری کے دوران میں ایسے مناظر سے تاثرات لئے جن کی ایک جھلک ذیل کی نظم میں دکھائی دیتی ہے اور اس جھلک کو چین جیسے خانہ جنگیوں سے لبریز ملک میں ایک عام اور گویا روز مرہ کی بات سمجھنا چاہئیے!

منظر

دریا کے کنارے پر
چُنتی ہے وہ نیلوفر

باتیں کئے جاتی ہے — وہ ساتھ کی سکھیوں سے،
چہلیں کئے جاتی ہے — شرمائے سے پھولوں سے،
کرنوں سے بنا پانی — شفاف سا آئینہ!
عکس اس میں نظر آیا — پیراہن رنگیں کا!
خوشبو سے معطر ہے — دامن جو گُل تر کا،
آوارہ ہواؤں سے — لرزش ہوئی اور تھرکا!
لیکن وہ کنارے پر — دو چار سوار آئے،

آویزاں ہیں جو شاخیں

ان شاخوں کے پتوں میں — ہتھیار چمک اُٹھے!
پھولوں میں صدا آئی — ہر اسپ کے ٹاپوں کی،
رخصت وہ ہوئے سایے — اوجھل ہیں نگاہوں سے!

ان سب نے انہیں دیکھا،
دل ڈر سے لرز اُٹھا!

لی۔پو جنوب کے مختلف مقامات سے ہوتا ہوا آخرکار کیانگ سی کے صوبے میں جا پہنچا۔ جب یونگ کا شاہزادہ لی لنگ دریائے ینگسی کے قریب کے چار صوبوں کا گورنر مقرر ہوا تو لی۔پو بھی اس کے عملے سے منسلک ہوگیا۔ لیکن جلد ہی ۷۵۵ء میں بغاوت کی وجہ سے شاہزادہ لی لنگ کی حکومت کو زوال ہوا اور اس کا ماتحت ہونے کی وجہ سے لی۔پو کو بھی گرفتاری کے بعد اپنے لئے موت کا حکم سننا پڑا۔ لیکن مقدمے پر دوبارہ غور کرنے کے بعد افسروں کا رجحان نرمی کی طرف ہوا۔ افسروں میں سے ایک نے جس کا نام "سونگ سسو جنو" تھا نہ صرف شہنشاہ سے لی۔پو کی جان بخشی کا پروانہ منظور کرا یا بلکہ یہ سفارش بھی کی اُسے حکومت میں کسی اچھے عہدے پر فائز کر دیا جائے لیکن لی۔پو نے جو سپاسنامہ پیش کرنے کے لئے تیار کیا تھا بدقسمتی سے وہ منزل مقصود پر پہنچنے سے رہ گیا اور موت کا حکم جوں کا توں بحال رہا۔ ایک بار پھر شاعر کے لئے گویا تائید غیبی آئی "کو۔او۔شو۔آئی" جواب اپنی جنگی خدمات کی وجہ سے ایک مقبول و معروف ہستی تھا۔ اس نے لی۔پو کی جان بخشی کے لئے اپنے فوجی عہدے کی قربانی کو منظور کرنا پیش کیا اور یوں بوڑھے شاعر کا سفید سر جسم سے علٰحدہ ہونے سے تو بچ گیا۔ لیکن اسے جنوب کے موجودہ صوبہ یون نان میں ہمیشہ کے لئے جلاوطن ہونا پڑا۔

اس کے بعد چار سال تک لی۔پو انہی جنوبی علاقوں میں ہی اپنے دوا ور جلاوطن دوستوں کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے اور حتی المقدور اپنا دل بہلانے میں مصروف رہا۔ ۷۶۱ء میں وہ نانکن پہنچا اور ۷۶۲ء اُس نے موجودہ شہر تائی پنگ میں جا قیام کیا۔ یہیں سال رواں ہی میں وہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد مر گیا۔

ایک روایت سے ہمیں لی۔پو کی موت کے متعلق یہ دلچسپ بات معلوم ہوتی ہے کہ لی۔پو کی موت ڈوبنے سے ہوئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک بار جب شاعر شراب کے نشے میں مخمور تھا تو اس نے پانی میں چاند کا عکس دیکھ کر اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ اس روایت کے متعلق جو حکایت ہمیں فرانسیسی زبان کے ذریعے سے ملتی ہے۔ اس کی دلکشی اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہم اُسے ذیل میں درج کر دیں:۔

"اس رات چاند اتنا چمک رہا تھا کہ چاندنی دن کے اجالے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ لی۔پو دریا پر ایک کشتی میں شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔ اچانک فضا میں اُسے ہم آہنگ آوازوں کی نغمہ سرائی سنائی دی اور رفتہ رفتہ وہ آوازیں قریب تر آتی گئیں۔ پانی میں ایک جنبش پیدا ہوئی سطح آب مضطرب ہو کر پھوٹ پڑی اور اس میں سے دو حسین فرشتے نمودار ہوئے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں رہنمائی کے علم تھام رکھے تھے۔ یہ فرشتے آسمانوں کے مالک کی طرف سے شاعر کو لوٹنے کی دعوت دینے آئے تھے۔ تاکہ وہ لوٹ کر از سرِ نو آسمانی مملکت میں قیام کرے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ شاعر اُن سے رخصت ہو کر فرشتوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ ہم آہنگ آوازوں کی نغمہ سرائی پھر سنائی دینے لگی۔ اور رفتہ رفتہ دور تر ہوگئی۔ جانے والے سب لوگ ایک دھندلکے میں غائب ہوگئے!"

لی۔پو کی گھریلو اور خاندانی زندگی کے متعلق ہماری روح تجسس تشنہ ہی رہتی ہے۔ چین کے سوانح نگار ایسی باتوں کو کسی شخص کے ذاتی معاملات خیال کرتے ہوئے ان میں دخل درمعقولات کا موجب بننا پسند نہیں کرتے۔ تیانگ خاندان کی نئی اور پرانی دونوں تواریخ کی کتابوں میں اس سلسلے سے متعلق پوری خاموشی اختیار کی گئی ہے صرف شاعر کے کلیات کے اُس دیباچے میں جسے "وے۔آئی۔کاؤ" نے لکھا ہے، اتنا بیان آتا ہے:۔

"لی۔پو نے پہلے پہل ایک "شو" عورت سے شادی کی جس سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوئے۔ بیٹے کا نام "روشن چاند جیسا لڑکا" تھا۔ بیٹی اپنی شادی کے بعد جلد ہی مر گئی۔ لی۔پو نے ایک "لی۔او" عورت کو بھی اپنی بیوی بنایا۔ اس کو اس نے طلاق دے دی اور اس کے بعد لو کی ایک عورت سے اس کا عقد ہوا۔ اس سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام "پو۔لی" رکھا گیا۔ آخر کار شاعر نے ایک "شونگ" عورت سے شادی کی"۔

سو۔لی او او اور سونگ، یہ تمام ان عورتوں کے خاندانی نام ہیں جنہیں لی۔پو نے باری باری رشتۂ مناکحت میں باندھا۔ لی۔پو نے چند نظمیں بیوی سے مخاطب ہو کر لکھی ہیں لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سی نظم کس بیوی سے مخاطب ہو کر لکھی گئی ہے۔ لی۔پو کا پہلا بیٹا ۷۹۳ء میں بغیر کسی قسم کا دنیوی مرتبہ حاصل کرنے کے مر گیا۔ اُس کا دوسرا بیٹا گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا اور اس کی دونوں بیٹیوں کی کسانوں سے شادیاں ہوگئیں۔ ہم یہاں لی۔پو کی ایک نظم درج کرتے ہیں جس میں اُس نے اپنی (معلوم نہیں کونسی) بیوی کے جذبات کی اپنے

متعلق ترجمانی کی ہے۔ اس میں لی پو کی مسافرانہ زندگی سے جو شکایت اس کی گھر والیوں کو بجا طور پر ہو سکتی تھی اس کی جھلک بھی ظاہر ہے۔

"تسلسل"

"میں اک درخت ہوں، کسی عمیق و تیرہ غار میں،
"کوئی نہیں کہ جس سے بات ہی کوئی کروں کبھی!
"تم اونچے، دور آسماں پہ گویا ایک چاند ہو،
"تم ایک لمحہ جاتے جاتے راستے میں رک گئے،
"نگاہ تم نے مجھ پہ کی!
"پھر ایسے جیسے آئے تھے چلے گئے، چلے گئے!
"کوئی بھی ایسی تیغ تیز اس جہان میں نہیں،
"جو قطع کر کے آب کی روانیوں کو روک دے!
"میرے خیال اسی طرح ہیں جیسے سطح آب ہو،
"ہمیشہ یہ تمہارے ساتھ ساتھ ہیں رواں دواں!"

اگرچہ لی۔ پو کی آرزو تھی کہ اُسے ایک مخصوص مقام "سبز ٹیلے" پر دفن کیا جائے۔ لیکن مرنے کے بعد اُس کی آخری آرام گاہ "اژدر پہاڑی" مقرر ہوئی۔ اُس کے ایک رشتہ دار نے اس کی قبر پہ ایک کتبہ بنا دیا۔ شاعر کی موت کے انتیس سال بعد نانگ تو کے گورنر نے اس کی قبر پر ایک یادگار قایم کی لیکن نویں صدی کے درمیانی سالوں میں مشہور شاعر "پو۔ چو۔ آئی" جب قبر کی زیارت کے لئے آیا تو اُس نے اُسے نہایت شکستہ حالت میں ایک کھیت کے درمیان گھاس پھونس میں گھرے ہوئے دیکھا۔ اسی زمانے میں ان اضلاع کے انسپکٹر "فان چو آن چینگ" نے معلوم کیا کہ شاعر کی قبر اب صرف تین فٹ اونچا ایک ڈھیر بن کر رہ گئی ہے اور وہ ڈھیر بھی اب رفتہ رفتہ معدوم ہوا جا رہا ہے۔ اس نے گرد و نواح کے کسانوں میں لی۔ پو کی پوتیوں کو تلاش کیا اور اُن سے شاعر کی آخری آرزو معلوم ہونے پر شاعر کے "باقیات" کو "سبز ٹیلے" کے شمالی پہلو میں منتقل کر کے جنوری ۸۱۷ء کو وہاں دو یادگاریں قائم کیں۔ پو چو آئی مشہور شاعر نے لی پو کی شکستہ قبر کو دیکھنے کے بعد اپنے خیالات و احساسات کا اظہار اپنی ایک نظم میں کیا تھا جس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"لی پو کی قبر"

"تسائی شیخ" دریا کے کنارے
"لی۔ پو کی ڈھیری ہے!
گھاس کے اُن غیر محدود میدانوں کے درمیان
جو بادلوں والے آسمان کے نیچے پھیلتے چلے گئے ہیں!
افسوس! گھاس پھونس کے اس کھیت کی زمین کے نیچے
اُس انسان کی ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں،
جس کی تحریروں نے، ایک وقت تھا کہ
زمین اور آسمانوں کو ہلا ڈالا تھا!
سبھی شاعر بدقسمت ہوا کرتے ہیں،
لیکن اے میرے آقا!
تم سے بڑھ کر بدقسمت کوئی نہیں!"

(۴)

تیانگ کی پرانی کتاب" میں لکھا ہے کہ "لی۔ پو عام لوگوں سے بہتر ذہانت، ایک بلند اور آزاد روح، اور ذہن کے غیر معمولی جہان میں انداز نظر کا مالک تھا" سیدھی سادی بولی میں اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک تخیل پرست انسان تھا۔

لی۔ پو درحقیقت مناظر قدرت کا متوالا تھا اور اس کی اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات میں بھی مناظر قدرت کی ہی طرح ایک تنوّع تھا۔ اُس کو یاس پرست کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی یاس پرستی مرزا غالب کی قنوطیت کی مانند نہ تھی، اُس کی یاس پرستی ایک اور ہی رنگ لئے ہوئے تھی، جس کی مثال ہمیں اردو کے شاعر انشاء اللہ خاں کے سوانح حیات میں ملتی ہے یعنی "جتنا دن اجیالا ہوگا، اتنا ہی سایہ بھی گہرا ہوگا" مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں انشاء اللہ خاں کی زندگی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر انسان کی عمر جس طرح مقررہ سانسوں پر منحصر ہے اسی طرح ہر انسان کے کھانے پینے بلکہ شادی و غم کی بھی مقررہ مقدار ہے۔ اگر کوئی شخص یک بارگی اپنی تمام ہنسی ختم کرے گا، تو اس کا رونا بھی یکجا ہو کر زیادہ شدید دکھائی دے گا۔ شادی و غم کے احساسات سے جس اختلاف کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں، لی۔ پو کی یاس پرستی بھی اسی کے لحاظ سے تھی اس کی نگاہ ہمیشہ ایک مقررہ دائرے میں رہتی تھی۔ اس کے لئے بہار آتی تھی، بہار کے بعد گرمی، گرمی کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد سردی کا موسم لیکن بس یہیں تک۔ یہی اُس کی حد نگاہ تھی۔ اُسے بعد کے پھیر سے لوٹ کر آنے کا احساس نہ تھا۔

بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ اپنے غم و یاس کو بھلانے کے لئے وہ مرزا غالب کی طرح اک گونہ بے خودی کی تلاش میں ہی "مے سے غرض" رکھتا تھا۔ لیکن یہ خیال کلیتہ صحیح نہیں ہے۔ جب انسان کی ہیچ مقداری تقدیر کی اٹل وسعت کے ساتھ ایک بے کار تگ و دو میں مصروف دکھائی دیتی تو چین کے شاعروں اور فلسفیوں کی نگاہ میں اس سے رہائی کا صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی ہم آہنگی کی طرف مراجعت! یا یہ کہئے کہ "ابدی مشابہتی کی طرف لوٹ جانا" اور اس کے حاصل کرنے کا صرف یہ ذریعہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو قدرت کی نیرنگیوں میں گم کر دے۔ چنانچہ شاعر ہمہ گیر قوانین سے جسم و روح کو ہوا اور لہروں کی قدرتی حرکات کا ہمدم بنا دیتا تھا اور یوں انتشار اور ذہنی پریشانیاں دنیا کی ابتدائی موسیقی میں گم ہو جاتیں۔

وہ عام قدرت پرست شعرا کی طرح سبز گوشوں پربتوں اور جھیلوں کا دلدادہ تھا۔ لیکن وہ روح فطرت کی پرستش ہرگز نہ کرتا تھا، اس کا مشتاق تھا۔ اس کے حسن کو سراہتا تھا اور کہتا تھا "میرے دل کو پسند آتے ہیں منظر اونچے پربت کے" اس کے لئے مناظر قدرت کا ماحول ایک مندر کی حیثیت نہ رکھتا تھا اُسے ایسی فضا سے گویا گھر گرہستی کی فضا کا احساس ہوتا تھا، جہاں جو جی میں آئے آزادانہ تکمیل کو پہنچایا جا سکے۔ بغیر کسی روک ٹوک اور جھجک کے جی چاہے نظمیں لکھے۔ جی چاہے انہیں گائے۔ جی چاہے مے خواری میں مصروف ہو۔ جی چاہے تو ساغر کو علحدہ رکھ کر نیند کے جھونکوں میں بے خبر ہو جائے اور اگر جی چاہے تو سب کچھ بھول کر اپنی زندگی کی مختلف حرکات پر گیان دھیان میں ڈوب جائے۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ کھلی فضاؤں میں بسر کیا۔ کٹ وہ رستوں پر پھولدار پودوں اور پیڑوں کو دیکھتے ہوئے۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے چلتے ہوئے، اور اپنی ان گنت نظمیں لکھتے ہوئے، جو اس کی روح کا بے ساختہ اظہار تاثرات تھیں اور قدرت کے متعلق اس کے یہ گہرے احساسات ہی تھے جنہوں نے اُسے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا مثلاً وہ کہتا ہے:۔

"پربتوں میں"

"بھلا کیوں پوچھتے ہو۔ کس لئے رہتا ہوں میں ان پربتوں کے سبزہ زاروں میں۔
میں ہنس دوں گا۔ جواب اس کا نہیں دوں گا۔
ہے میری روح میں تسکین کا ڈیرا!
وہ رہتی ہے کسی اک اور ہی دنیا میں جو حاصل نہیں تم کو!
کھلے ہیں پھول پیڑوں پر،
بہا جاتا ہے پانی اک روانی میں . . . !"

تاؤ مذہب کے تخیل پرست اصولوں، اعتقادات اور افسانہ طرازیوں نے لی۔پو کی حکایت پرست ذہنیت پر ایک گہرا اثر کیا۔ اگرچہ وہ نقاد جو کنفیوشس کے پیرو ہیں، شاعر کو تاؤ مذہب کی دلدادگی کے الزام سے مبرا رکھنے کی کوشش میں دلائل پیش کرتے ہیں لیکن وہ دلائل بے بنیاد سے ہیں۔ شاعر نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ وہ پندرہ برس کی عمر سے ہی دیوتاؤں کا متلاشی تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہن پر تاؤ مذہب کی گرفت پختہ تر ہو گئی۔ درحقیقت کنفیوشس کے اجتماعی قوانین اور اخلاقیات لی۔پو کی افتادِ طبع اور زندگی کے حالات کے منافی تھے۔ لی۔پو نے سوان سونگ کے دربار سے جانے کے بعد تاؤ مذہب کے ایک پروہت سے جو ڈپلومہ حاصل کیا تھا اُس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ وہ بھی ایک دلیل ہے۔ تاؤ مذہب کے خیالات کے مطابق جنت مشرقی سمندروں میں سے کسی مقام پر واقع ہے۔ لی۔پو کی شاعری میں ہمیں ایسی کئی خیالی دنیاؤں کی جھلکیں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی نظم "آسمانی بستی کا خواب" جس حسن تصور اور قوت تخیل کو ظاہر کرتی ہے وہ تاؤ مذہب کے دلدادہ شاعر کے ذہن سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں۔ بخود ملاحظہ کیجئے گا:۔

"آسمانی بستی کا خواب"

"سمندروں کا سفر کرنے والے اُس مسرت کے جزیرے کی باتیں سناتے ہیں جو مشرق میں بہت دور کسی مقام پر واقع ہے۔ وہ جزیرہ سمندر کی دھندلی موجوں کی ویرانیوں میں کھویا ہوا ہے۔

"لیکن جنوب کی آسمانی بستی کی جھلکیں تو چمکدار بادلوں کے ٹکڑوں کی درزوں میں سے بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ یہ آسمانی بستی عرش اعظم کی بلندیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ قصر احمریں کے پربت سے بھی اونچی ہے اور فرش عرش کا پہاڑ تو اس کے مقابل میں بہت ہی نیچا ہے۔

اُس آسمانی بستی کا خواب دیکھنے کے لئے میں ایک چاندنی رات میں جھیل کی آئینہ جیسی سطح پر ہوتا ہوا چل دیا۔ چاند بھی جھیل کی تہ میں میرے ساتھ ساتھ ساتھ ہی دوڑتا رہا۔ اور "ژین چی" کے گاؤں تک ساتھ ساتھ ہی دوڑتا چلا گیا۔

اُس جگہ آج بھی گزرے ہوئے شہزادوں کے محلات ہیں۔ میں نے آب زمردیں کو بل کھاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے بندروں کی تیکھی

آوارہ بن سنیں۔ میں شہزادوں کی پاپوش پہنے چڑھتا ہی چلا گیا، بادلوں کی سیڑھی پر، آسمان کی طرف رُخ کئے ہوئے اور جب آسمانی دیوار کے آدھے بیچ میں جا پہنچا۔ تو میں نے صبح کے سورج کو دیکھا اور فضاؤں میں، مرغ آسمانی کی صدا سنی۔

"اب ہزاروں روشوں پر میرا راستہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا۔ راہ میں پھولوں کے انبار کے انبار ایک روک بن کر دکھائی دینے لگے۔ میں ایک چٹان کے سہارے کھڑا ہو گیا اور یکبارگی مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور ایک بے خبری کا عالم چھا گیا۔

"گرجتے ہوئے ریچھوں اور چیختے ہوئے اژدہوں کی آوازوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ گرداب کا بل کھاتا ہوا پانی راہ میں حائل تھا۔ میں گھرے جنگل میں کانپ اُٹھا اور آویزاں ٹیلوں کو دیکھ کر لرز گیا جو ایک دوسرے پر بے ترتیبی سے افتادہ تھے۔

"اوپر بادلوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اکٹھے ہو رہے تھے اور برساتی طوفان کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نیچے تیزی سے ریلتا ہوا پانی دھندلکے کو توڑ کر اس میں گم ہو جا رہا تھا۔ رعد کا ایک بے پناہ شور سنائی دیا۔ پربت چور چور ہو کر ڈھیر ہونے لگے۔ خلائے آسمانی کا سنگین دروازہ کشادہ ہو گیا اور اس میں سے ایک نیلگوں وسعت نظر آئی جس کی کوئی تہ نہ تھی۔ سورج اور چاند زریں اور سیمیں محلات پر چمک رہے تھے۔

"ہوا پر سوار، دھنک کے ملبوس پہنے ہوئے، پھولوں کی ٹوٹ کر گرتی ہوئی پتیوں کی طرح، ہوائی پریاں اتر آئیں۔ خوش الحان پرندے ان کی ہیلیوں کے آس پاس تھے اور چیتے رباب بجا رہے تھے۔ میں ششدر رہ کر رہ گیا اور میرے دل پر ایک اندھے ڈر کی گرفت طاری ہو گئی۔ میں نے حیرانی میں ڈوبتے ہوئے اپنے آپ کو تھامنے کی کوشش کی اور افسوس! میں نے دیکھا کہ میں اپنے بستر پر جاگ اٹھا ہوں۔

"اس خیالی دنیا کی درخشانی معدوم ہو چکی ہے!

"یہی حال زندگی کی تمام خوشیوں کا بھی ہے۔ تمام چیزیں بہتے ہوئے پانی کی طرح گزر جاتی ہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں پھر کب لوٹوں گا؟ غزالوں کو سبزہ زاروں میں چرنے دو، مجھے خوبصورت پربتوں میں جانے دو۔ اس جگہ میرا دم گھٹتا ہے!"

یہ نظم درحقیقت لی۔پو نے سوان سونگ سے رخصت طلب کرنے کے لئے الوداعی نغمے کے طور پر لکھی تھی جس کی اندرونی شہادت آخری بند میں موجود ہے۔ لیکن اس قسم کی مسافرانہ اور گوشہ نشینی کی کی باتیں شاعر کی صرف آدھی زندگی ہی پر حاوی ہیں۔ کیونکہ وہ شہر اور شہر کے شراب خانوں کا بھی متوالا تھا اور اتنا متوالا تھا کہ اس شیفتگی کی وجہ سے ہی اخلاقیات کے کٹر حامیوں کی طرف اُس پر اعتراض بھی ہوئے ہیں کہ وہ آوارہ اور پریشان دماغ انسان تھا۔ لی۔پو نہ صرف عورت اور شراب میں جی بھر کر دلچسپی لیتا تھا بلکہ وہ شبہوں اور دلکش الفاظ میں ان کی تعریفی نغمے گا کر بے باکی سے اپنی خلوت کی کیفیات کی تشہیر کرنے میں بھی رسوا تھا۔

"وے آئی" کہتا ہے کہ "یہ خود لی۔پو کی عادت تھی۔" ایک اور بیان کے مطابق لی۔پو کی آواز بہت بلند تھی۔ آغاز جوانی میں بانکپن کی روح بھی اس میں بیدار تھی۔ چنانچہ اس نے باقاعدگی کے ساتھ تلوار بازی بھی سیکھی تھی اور اس فن میں کئی بار اپنے مقابلے میں آنے والوں کو نیچا بھی دکھایا تھا۔ لی۔پو کا اپنا کہنا ہے۔ "اگرچہ میں لمبائی میں سات فٹ سے کم ہوں۔ لیکن قوت میں دس ہزار کو کافی ہوں" گویا ذوق کے الفاظ میں "پست ہمت وہ نہ تھا۔ گو پست قامت ہو تو ہو" یہ بات جتنا نا کوئی زیادہ ضروری نہیں۔ کیونکہ اس کا اظہار شاعر کے حالات سے خود بخود بھی ہو ہی جاتا ہے کہ لی۔پو ایک محبوب شخصیت کا مالک تھا۔ ہر دلعزیزی اس کی قسمت تھی۔ جہاں بھی جاتا نہایت آسانی سے ہر شخص اس کا دوست بن جاتا ——— راجہ ہو یا راجکمار، اس مذہب کا ہو یا اُس مذہب کا درباری ہو یا عالم، شہر کا تعلیم یافتہ مہذب انسان ہو یا کسی گاؤں کا کوئی معمولی کلال۔ اور لی۔پو بھی عادتاً ہر شخص سے یکساں لہجے میں بات کرتا۔ چاہے اس کا مخاطب محلات میں رہنے والا شہنشاہ ہو یا کسی بازاری شراب خانے میں گانے والی۔

اپنی پختہ عمر کے دوران میں شاعرانہ افتاد طبع کے باوجود لی۔پو نے چین کے جمہور کی عام خواہشات کو اپنے دل میں پرورش کرنا شروع کیا۔ یعنی اس نے چاہا کہ حکومت کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کر ملک وقوم کی خدمت کر کے نام پیدا کرے۔ دل میں بڑے بڑے ارادوں کو لئے ہوئے وہ دارالخلافے میں شہنشاہ کے دربار میں پہنچا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر جو کام اُس کے سپرد کیا گیا، وہ کیا تھا؟ ——— نظمیں لکھتے جاؤ اور جتنا جی چاہے شراب و شعر سے دل بہلاتے جاؤ اور اپنے

غموں اور اپنی پریشانیوں کو مینا کی قلقل اور ساغر کے بلبلوں میں بھلاتے رہو
بعد ازاں جب خانہ جنگی کے ہنگاموں میں اُسے شہزادہ یونگ کے ماتحت موقعہ ملا تو اس کی امنگیں از سرِ نو تازہ ہو گئیں لیکن اس بار بھی نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ شکست اور دائمی جلاوطنی ہی نصیب ہوئی۔ اس کی زندگی کے چند آخری سال بہت پر اثر اور دلدوز کیفیات میں بسر ہوئے۔ روحِ حیات پژمردہ ہو چکی تھی۔ غم اور غموں کا بارِ گراں ایک مستقل تکان اور بے دلی کا موجب تھا۔ اردو کے شاعر انشاء اللہ خاں کے آخری ایام سے یہ باتیں بہت ملتی جلتی ہیں لیکن ایک بات ذرا مختلف تھی۔ لی پو کے دل میں افتادِ حیات کے باوجود کم از کم حب الوطنی کا جوش ہر دم تازہ تھا۔

این لوشان کی بغاوت اور اُس کے بعد کے حالات کا اثر شاعر کی عمر کے آخری سال تک بھی یکسر محو نہ ہوا تھا اور ان سب باتوں کے علاوہ پرانے طرزِ خیال کی لازمی یاس پسندی کے اضافہ تھی لیکن ہر چیز کے فانی ہونے کا احساس اس کے دل میں زندگی کی ناکامیوں کے سلسلے میں تسکین لے آیا اور ساتھ ہی اس خیال نے اس کی پُرعظمت اور آزاد و بے باک روح کو بھی ایک حد تک اداس کر دیا۔ لی پو کے زمانے میں بھی چینی قوم کی تواریخ اس قدر قدیم ہو چکی تھی کہ شاعر کو غور و تفکر سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ بڑے بڑے شاہی خاندان بھی زمانے کے سمندر میں پرِ کاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ خاک میں کیا ملے ہیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں! یہی وجہ ہے کہ لی پو کی تمام شاعری پر ایک داخلی کیفیت چھائی ہے۔ اور اس کے عیش و نشاط کے اشعار میں بھی غم و ملال کی ایک ہلکی سی آمیزش ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی شاہی دعوت میں بھی دور ساغر کے درمیان بزمِ نشاط سے نغمہ سرائی کر رہا ہوتا ہے تو اس کی روح کے کسی پنہاں پہلو سے یہ ملال آمیز خیال اچانک ظاہر ہو جاتا ہے کہ خاموش! دامنِ شب! ہر چیز بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ہی گزر جاتی ہے! ؎

دریا میں بہتا ہے پانی،
جیون سپنا، ایک کہانی!
ہر شے فانی، ہر شے فانی،
ہر شے فانی، آنی جانی!

ذیل میں لی پو کی چند نظموں کے منظوم ترجمے پیش کئے جاتے ہیں۔

فرقت

مرے پیارے! یہاں تھے تم تو میں نے گھر کو پھولوں سے سجایا تھا،
مرے پیارے! نہیں ہو تم یہاں، اب سیج سونی ہے!
بچھونا سیج پر لپٹا رکھا ہے، سو نہیں سکتی!
وہ خوشبو چھوڑ کر جس کو گئے تھے، آج بھی محسوس ہوتی ہے!
وہ خوشبو ہر گھڑی رہتی ہے میرے پاس لیکن تم۔ کہاں
ہو اے مرے پیارے!
میں ٹھنڈے سانس بھرتی ہوئی،
گرے جاتے ہیں پتے ٹہنیوں سے پیڑ کی مرجھا کے دھرتی پر!
میں روتی ہوں،
ہری مخمل پہ دھرتی کی چمکتی اوس کی بوندیں!

مینائے مے کے سامنے

بہار کی ہوائیں آئیں شرق سے،
چلی گئیں، گزر گئیں کہ تیز تر تھیں برق سے!
مگر وہ ایسے دھندلے دھندلے بلبلوں کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں
ساغرِ شراب میں،
کہ فرق کوئی بھی نہیں ہے اُن میں اور حباب میں!
گلوں کی ایک ایک کر کے پتیاں،
رواں ہیں فرشِ خاک کی طرف جہاں جہاں!
تو اے حسینِ نازنیں!
کہ جس کا چہرہ ہے گلاب گوں،
شراب کے اثر سے جس کی سرخیاں ہوئیں فزوں!
بتا، کہ سبزہ زار میں
درخت جو اُگے ہوئے ہیں کب تلک رہیں گے وہ بہار میں!
قرار اک فریب ہے ہر اک نگاہ کے لئے،
بہت ہی جلد لمحے آئیں گے یہیں،
کہ ہو گی حاجت آدمی کو اک عصا کی قطعِ راہ کے لئے!
ہر ایک سمت نور ہے!
اٹھو اور آؤ ایک رقص، ایک وجد و جوش ہیں!
شباب کی ہے دل میں اب اُمنگ، اک سرور ہے!
یہ جب سماں چلا گیا،

نہیں پھر اس سے فایدہ
کہ آئے اپنے سر کو دیکھ کر سفید، ہوش میں!!

دُکھیا دھرتی

رات جب ختم ہوئی، صبح کی سرخی آئی،
دن مگر زیست کے پھر نہ کبھی لوٹ سکے!
روشِ باغ پہ گلہائے معطر بکھرے،
موت کی طرح نہیں رے گیا بہتا پانی!
جنگلوں میں تھا سکوں، چھائی تھی اک خاموشی،
مٹ گیا سحر وہ، دریا ہوا جب طوفانی!
زاویہ چشم کا رکھتا ہے افق کو دل میں،
یاد باقی ہے بہاروں کی دلِ بسمل میں!
شہر کو چل کہ وہ ہنگامے بھلائیں گے تجھے،
ہاں، وہی درد سے آزادی دلائیں گے تجھے!
اس جگہ بیت چکا، موسمِ گل بیت چکا!
اور زمین محو ہے اب، غم ہے بہت ہی گہرا!!

شہنشاہ کی حرم

اک سنہرے گھر میں بیتا عالمِ طفلی ترا،
پختگی آئی، جوانی، حسن روشن تر ہوا!
اور مسکن بن گیا شاہی محل!
ریشمی ملبوس گلگوں زیبِ تن،
اور درخشاں گیسوؤں میں ایک پھول!
اندرونی خلوتوں سے اس طرح ہوتی ہے ظاہر صبحدم!
اور ہمراہِ شہِ والاتبار،
لوٹتی ہے شام کو!
آہ! لیکن رقص اور نغمے کے لمحے کتنی جلدی کھو گئے!
آسماں پر جا کے شاید وہ شفق میں سو گئے!

عشرتِ کوہستانی

غم آلودہ روحوں کو دھونے کی خاطر،
پیالے پیے ہم نے ساغر پہ ساغر!
عجب تھی، شبِ بادہ نوشی عجب تھی!
فضا پر حکومت فقط چاندنی کی تھی!
دل اپنا نہ چاہا کہ ہم گھر کو لوٹیں!
نہ یہ آرزو بھی کہ بستر میں پہنچیں!
مگر آخرِ کار نشے کا غلبہ،
بڑھا اس قدر، ہوش ہم کو نہیں تھا!
وہیں خاک کا ہم نے بستر بنایا!
تھا سر پر فقط آسمانوں کا سایا!

تنہائی

خزاں کی ہواؤں میں ساری ہے خنکی،
ہے صورت بھی شفاف ماہِ خزاں کی،
گرے تھے جو پتے،
اُڑے مل کے سارے،
ہوئے وہ اکٹھے،
بنا ڈھیر اُن سے،
مگر پھر سے اُڑ کے،
فضاؤں میں بکھر کر!
کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ بتا، تو کہاں ہے؟
مرے دل میں اک درد امشب نہاں ہے!
مجھے کب نظر آئے گی تیری صورت؟

نیند سے بیداری پر، بہار کا ایک دن

زندگی تو ہے سپنا، کیوں مشقت؟ کیوں بپتا!
سارا دن یونہی بیتا
بےخودی تھی، مےخواری، میں دہلیز پہ اپنی.
مدہوشی میں کھویا تھا! خوابیدہ تھا، سویا تھا!
نیند گم تھی، بیداری آنکھوں میں ہوئی طاری.
جاگ اٹھا، میں جاگ اٹھا میں نے پیڑوں کو دیکھا!
اور لو، پھر سنا نغمہ، پھولوں میں اِک طائر کا
کون سا یہ موسم ہے؟
کس کا یہ ترنم ہے؟
آموں سے یہ آیا تھا اک کومل کا نغمہ تھا:
بیٹھے بیٹھے گاتی تھی، گیت سنائے جاتی تھی!
اور ہوائیں آتی تھیں، گیت سن کر جاتی تھیں!

ساون کی ہوائیں تھیں!
کوئل کی صدائیں تھیں!
سوجھ اک مجھے آئی، ساتھ اپنے دکھلائی!
پھر اٹھا کر ساغر میں، اور اس کو بھر کر میں،
زور سے لگا گانے، اپنے جی کو بہلانے!
انتظار تھا اس کا، آسماں پہ ہوں چندا!
لیجئے کہ اب میرا، گیت بھی ہوا پورا،
انشا... تھا کیسا!
یاد ہی نہیں آتا!!

"چاند، میں اور میرا سایہ"

کھلے ہیں پھول پیڑوں پر،
میں ان کے پاس بیٹھا ہوں،
لئے مینا کو پہلو میں!
اکیلے بادہ نوشی کر رہا ہوں میں!
کہاں ہے میرے ساتھی، ہاں کہاں ہیں سب مرے ساتھی؟
وہ لو، مہتاب مجھ کو دیکھتا ہے آسمانوں سے!
درخشانی کو اس کی دیکھ کر میں نے اٹھایا ہاتھ میں ساغر،
پکار اٹھا!——
یہ دیکھو، آگے آگے میرے لرزاں ہے مرا سایہ!
نہیں، ہم تین ہیں، ہم تین ہیں، تنہا نہیں ہوں میں!
اگرچہ ماہِ رخشاں بادہ نوشی کر نہیں سکتا،
مرے ہر طرف سایہ بھی مرا بس رقص کرتا ہے،
مگر ہم آج شب ساتھی ہیں تینوں، تینوں ساتھی ہیں!
شرابی، —— ماہِ رخشاں اور مرا سایہ!
میں گاتا ہوں، مے وحشی فضاؤں میں خراماں ہے،
میں رقصاں ہوں، مرا سایہ بھی ہر سو لڑکھڑاتا ہے،
ابھی بیدار ہیں ہم، آؤ محوِ عیش ہو جائیں!
بس اک میٹھی سی مدہوشی میں ہی اس درجہ قوت ہے
کہ وہ ہم کو جدا کر دے!
چلو ہم آج اک اس قسم کا عہدِ وفا باندھیں،
کہ یہ انسان جو فانی ہیں اس کو جان سکتے ہی نہیں ہرگز!
ہم اکثر اس جگہ آکر ملیں گے شام کے نمدار لمحوں میں،
کھلی، پھیلی ہوئی، بھیگی ہوئی رنگیں فضاؤں میں!

میراجی

رباعی

صہبا فصلِ شباب میں دے ساقی
لا ساغرِ آفتاب میں دے ساقی
پیمانۂ ماہتاب سے خورشید
خورشید کو ماہتاب میں دے ساقی

سعید احمد اعجاز

احسن الکلام

کھلے ہوئے یہی معنی ہیں مسکرانے کے
ہنسی ہنسی میں ارادے ہیں دل اڑانے کے

انہیں کا نام ہے دفتر میں ہر فسانے کے
یہ حسن و عشق ہیں فرمانروا زمانے کے

یہ بے رخی کا ہے عالم کہ ہو رہا ہے گماں
نہ ہے زمانہ ہمارا نہ ہم زمانے کے

بہار حسن کی رنگینیاں نہ بدلیں گی
ہزار رنگ بدلتے رہیں زمانے کے

بھویں کشیدہ، جبیں پر شکن، پھر اس پہ طلب
بلائے جاں ہیں یہ تیور ترے بلانے کے

جنہیں نہ آپ نے پوچھا پھرے وہ خستہ خراب
کہیں نہ سمجھے گئے اہل منھ لگانے کے

معاف رکھ ہمیں واعظ کرم سے اپنے، کہ ہم
امیدوار نہیں تجھ سے بخشوانے کے

وقارِ ضبط نہ کھو چشمِ تر، نہ اشک بہا
کہ بے بہا ہیں یہ موتی ترے خزانے کے

جہاں نگاہ اٹھائی وہاں اسے دیکھا
کہاں نہیں ہیں ٹھکانے مرے یگانے کے

ملائے ہاتھ، نہ آنکھیں ملائیں تم نے کبھی
معاملے یوں ہی ہوتے ہیں دل ملانے کے

کہاں کہاں نہ گئے تم کہاں کہاں نہ رہے
کھلے نصیب نہ میرے غریب خانے کے

یہ ہے رفاقتِ بلبل کہ اس کے ساتھ اڑ کر
قفس تک آئے ہیں تنکے بھی آشیانے کے

نہال پر آہ ہے دم لب پر، اشک آنکھوں میں
نکل رہے ہیں نتیجے یہ دل لگانے کے

خمِ شکستہ کے ٹکڑے اٹھائے رندوں نے
تبرکات سمجھ کر شراب خانے کے

غمِ مآلِ محبت ہو گیا نظر انداز
کہ میرے سامنے حالات ہیں زمانے کے

جنونِ عشق بھی ہے بولتا ہوا جادو
فسوں گروں میں ہیں چرچے مرے فسانے کے

قضا کے ساتھ ہی آئے ہو مری بالیں پر
تم انتظار میں تھے کیا اسی بہانے کے

شباب کے لئے موزوں نہیں حجاب و نقاب
یہی تو دن ہیں ترے دیکھنے دکھانے کے

کفن ہے صاف و معطر، بدن ہے شستہ و پاک
تکلفات ہیں یہ خاک میں ملانے کے

وطن وہ شے ہے کہ مرغِ چمن کی نظروں میں
سوا ہیں پھول سے کانٹے بھی آشیانے کے

جوابِ خط میں لکیریں سی کھینچ کر احسن
بنا رہے ہیں وہ نقشے مرے مٹانے کے

احسن مارہروی

ساجن سے جدا ہو کر

(۱)

در در کی محبت میں ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں
ہر دشت کی وحشت میں ہم خاک اُڑاتے ہیں
ہم رہ گئے دنیا میں
بے برگ و نوا ہو کر ساجن سے جدا ہو کر

(۲)

آنسو جو بہاتے ہیں ہم عشق کے دیوانے
رستے چلے جاتے ہیں آنکھوں کے یہ پیمانے
ہم رہ گئے دنیا میں
مقتولِ جفا ہو کر ساجن سے جدا ہو کر

(۳)

ناکام محبت ہیں مرنے کی تمنّا ہے
پابندِ مصیبت ہیں جینا بھی تو مرنا ہے
ہم رہ گئے دنیا میں
ساجن سے جدا ہو کر

(۴)

دکھ سہنا ہے قسمت میں رونا ہے مقدر میں
ہیں اُن کی محبت میں نشترِ دلِ مضطر میں
ہم رہ گئے دنیا میں
مجبورِ وفا ہو کر ساجن سے جدا ہو کر

(۵)

کیا ان سے کریں شکوہ ہم اپنی تباہی کا
بہزاد یہ ہے قصّہ تقدیرِ الٰہی کا
ہم رہ گئے دنیا میں
تصویرِ وفا ہو کر ساجن سے جدا ہو کر

بہزاد لکھنوی

ماؤ ماؤ

(۱)

ماسکو کے ایک غیر آباد خطہ کی ایک خاموش گلی میں وہ اپنے بے شمار نوکروں سمیت رہا کرتی تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ لڑکے پیٹرسبرگ میں مقیم تھے۔ اور لڑکیاں اپنے اپنے سسرال میں تھیں۔ وہ زندگی کے بقایا اُداس اور غیر دلچسپ دن تنہائی میں گزار رہی تھی۔

اس کے نوکروں میں اس کا دیو قامت دربان جرتظیم غیر معمولی فطرت کا آدمی تھا۔ وہ پیدائشی گونگا اور بہرا تھا۔ مالکہ اُسے اس کے گاؤں سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ جہاں وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں تنہا رہتا۔ اور کھیتوں میں کام کرکے گذر بسر کیا کرتا تھا۔ اپنے کام میں تجربہ کار ہونے کی وجہ سے وہ گاؤں بھر میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ شہر آنے پر وہ اپنی مالکہ کے لئے ایک قابل خدمتگار ثابت ہوا۔

قوی الجثہ ہونے کے باعث وہ ہمیشہ چار آدمیوں کا کام اکیلا کر لیا کرتا تھا۔ اس کی دائمی خاموشی سے اس کے ماحول پر انتہائی سنجیدگی مسلط رہتی تھی۔ لیکن جب سے وہ ماسکو لایا گیا تھا۔ اسے شہریوں کا سا لباس پہنکر صرف دربانی کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔

اولاً وہ اپنی زندگی کے اس نئے دور سے مطمئن نہ تھا۔ بچپن سے وہ گاؤں کے اور لوگوں کی طرح کھیتوں میں کام کرنے کا عادی تھا۔ اپنے ہم پیشہ و ہم مذاق لوگوں میں پُر مسرت زندگی بسر کرنے کی وجہ سے وہ آئے دن زرخیز زمین میں بڑھتے ہوئے درخت کی طرح قوی سے قوی تر ہوتا جاتا تھا۔ لیکن جب سے وہ شہر میں لایا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا ہوگیا ہے۔ اور وہ کس لئے پریشان اور کھویا سا رہنے لگا ہے۔

گاؤں کی مصروفیات کی مناسبت سے اس کے تازہ فرائض اسے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہ اپنے کاموں کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ختم کر لیتا۔ اس کے بعد صحن کے دروازے پر کھڑا ہو کر گلی سے گذرنے والوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتا۔ گویا وہ چاہتا تھا۔ کہ کوئی تو اُسے اس انتقال مکانی کے راز سے آگاہ کردے۔ جب وہ بیکاری کے اس شغل سے تنگ آجاتا۔ تو باغ کے کسی کونے میں جا کر منہ کے بل لیٹ جاتا۔ اور ایک مقید صحرائی جانور کی طرح گھنٹوں اسی حالت میں پڑا رہتا۔

کسی ایک حالت میں رہنے سے لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے وہ اپنے نئے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اس کی ذمہ واریاں برائے نام تھیں۔ اس کی جملہ مصروفیات صرف یہ تھیں۔ کہ وہ صحن کو صاف رکھے، دن میں دو بار کنوئیں سے پانی بھر لائے، لکڑیاں چیرے، اور مکان کی نگرانی کرے۔ یہ کہنے کی شائد ضرورت نہیں کہ اپنے فرائض کو انجام دینے میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ صحن میں کوڑا کرکٹ تو کیا کبھی گھاس پھوس کا ایک تنکا بھی نظر نہیں آیا۔ ایک رات جب اس نے دو چوروں کو مکان میں گھستے ہوئے پکڑ لیا تو اس صفائی سے اُن کا سر آپس میں ٹکرا دیا کہ غریب اس قابل ہی نہ رہے کہ انہیں پولیس کے حوالے کیا جائے۔

گھر کے اور نوکروں کے ساتھ جرتظیم کا تعلق صرف اس حد تک دوستانہ نہ تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ اس سے خائف رہا کرتے تھے۔ ورنہ اس نے اپنے آپ کو کبھی ان پر فوقیت نہ دی۔ وہ اس کے ساتھ اشاروں میں باتیں کرتے اور یہ انہیں سمجھ کر حرف بحرف ان پر عمل کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے حقوق اور خودداری کی حفاظت کرنا جانتا تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی دوسرا ملازم کھانے کی میز پر اس کی جگہ بیٹھ جاتا۔

باورچی خانہ کے قریب ایک چھوٹا سا کمرہ جرتظیم کو علیحدہ دے دیا گیا تھا۔ اس نے اسے اپنے مذاق کے مطابق ایک چارپائی۔ ایک چھوٹی سی میز اور تین ٹانگ کی ایک کرسی سے آراستہ کر رکھا تھا۔ یہ تمام فرنیچر اس نے خود تیار کیا تھا۔ جو اسی کی طرح مضبوط تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کمرے کو قفل لگا کر کنجی اپنے پاس رکھتا تھا۔

(۲)

جرتظیم کو ماسکو آئے ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اُسے

ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز شام کو جب وہ دریائے راسکو کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی چیز کیچڑ میں تڑپ رہی ہے جھک کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی کتیا کنارے پر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن موجیں بار بار اسے واپس گھسیٹ لے جاتی ہیں۔ اس کا ننھا۔ گیلا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ جرنظیم نے ہاتھ بڑھا کر اس لجلجی سی چیز کو اٹھا لیا۔ اور کوٹ میں چھپا کر الٹے پاؤں واپس لوٹا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اسے بستر پر لٹا کر کوٹ اوڑھا دیا۔ اور خود اصطبل سے گھاس اور باورچی خانہ سے پیالی بھر دودھ لانے چلا گیا۔ واپس لوٹنے پر اس نے نہایت احتیاط سے اپنا کوٹ تہ کر کے اس پر گھاس بچھا دی۔ اور بستر پر دودھ کی پیالی رکھ دی۔

لیکن کتیا جو بمشکل تین ہفتوں کی ہوگی۔ اور جس کی آنکھیں کھلے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ پیالی سے دودھ نہ پی سکی۔ غریب کھڑی منہ بسورتی اور سر سے پاؤں تک کانپتی رہی۔ چنانچہ جرنظیم نے آہستہ سے دو انگلیوں میں پکڑ کر اٹھایا۔ اور اس کا منہ دودھ میں ڈبو دیا۔ پھر کیا تھا اس نے کانپتے، جھجکتے اور جھرجھری بھرتے ہوئے دودھ پینا شروع کر دیا۔ جرنظیم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بڑی دیر تک اسے سہلاتا رہا۔ اور بہت کوششوں کے بعد اسے سلا کر خود بھی اس کے پاس سو گیا۔

کسی ماں نے اپنے بچے کی اس قدر حفاظت نہ کی ہوگی۔ جس احتیاط سے جرنظیم نے اس کتیا کو پالا۔ ابتدا میں وہ بہت کمزور تھی۔ اور اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن غالب تھا۔ لیکن جرنظیم کی مادرانہ شفقت سے بہت جلد اس کی حالت تبدیل ہوگئی۔ اور آٹھ ماہ کے عرصے میں وہ نہایت خوبصورت، ملائم بال، لمبے کان اور دلکش آنکھوں والی پیاری پیاری سی کتیا بن گئی۔

وہ اپنے مالک پر سو جان سے فدا تھی۔ جہاں جہاں وہ جاتا۔ اس کے پیچھے پیچھے پھرتی۔ وہ اسے "ماؤ ماؤ" کہا کرتا تھا۔ نام کی قسم سے صرف یہی ایک آواز تھی۔ جو جرنظیم اپنی گونگی زبان سے پیدا کر سکتا تھا۔ گھر کا ہر چھوٹا بڑا اسے اسی نام سے پکارنے لگا۔ اپنے مالک سے محبت کے ساتھ ساتھ اس نے اور نوکروں سے بھی انس پیدا کر لیا۔ جہاں تک جرنظیم کا تعلق تھا۔ وہ اسے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔ اگر دوسرا کوئی شخص ماؤ ماؤ کو چمکارتا یا سہلاتا۔ تو اسے اس سے سخت تکلیف ہوتی۔ ایسا کس جذبہ کے ماتحت ہوتا تھا، حسد یا کتیا کی جانب سے اس کے خوف کی وجہ سے، کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

ماؤ ماؤ کا روزانہ یہ معمول ہو گیا۔ کہ ہر صبح اپنے مالک کو اس کا کمبل کھینچ کھینچ کر جگا دیتی۔ کنوئیں پر اس کا ساتھ دیتی، جب وہ صحن صاف کرنے میں مشغول ہوتا۔ تو اس کے استعمال کی چیزوں کی رکھوالی کرتی اور اس کے کمرے کی سخت حفاظت کرتی۔ جرنظیم نے اپنے کمرے کے دروازہ کا کچھ حصہ کاٹ کر اس کے آنے جانے کے لئے راستہ بنا دیا تھا۔ وہ جب چاہتی اپنے پر سکون کمرے میں آکر آرام کرتی۔ بلکہ اپنے مالکانہ حقوق کے اظہار کے لئے نہایت اطمینان سے جرنظیم کے بستر پر سو رہتی۔

حالانکہ ماؤ ماؤ تمام رات گھر کی رکھوالی کے لئے جاگتی رہتی تھی لیکن اور پالتو کتوں کی طرح کبھی اس نے خواہ مخواہ بھونکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ترنم آگیں عف عف کبھی بلا وجہ سنائی نہیں دی۔ یوں تو گھر کا ایک کتا پہلے ہی موجود تھا۔ لیکن اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور دن رات صحن کے دروازہ پر بندھا رہتا تھا۔

ماؤ ماؤ کبھی گھر کی مالکہ کے کمروں میں نہیں گئی۔ جب کبھی جرنظیم اس طرف جاتا۔ تو وہ اطمینان سے دروازہ پر بیٹھی کان کھڑے کئے اس کا انتظار کرتی رہتی۔

ایک سال اور اسی طرح گذر گیا۔ جرنظیم اپنے فرائض کو بدستور انجام دیتا رہا۔ وہ اپنی قسمت پر قانع تھا۔ زندگی کے دن ایک ہی نہج پر گذر رہے تھے۔ کہ ایک روز ایک عجیب ہی واقعہ پیش آیا۔

(۳)

گرمیوں میں ایک دن گھر کی مالکہ اپنی خادماؤں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اس دن وہ کچھ خوش خوش سی نظر آتی تھی۔ مسکراتی ہوئی وہ کھڑکی کے قریب گئی۔ جو پھولوں کے ایک چھوٹے سے باغ میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کے عین مقابل میں گلاب کی جھاڑی کے نیچے ماؤ ماؤ ایک ہڈی سے کھیل رہی تھی۔

"ہیں! یہ کتا کیسے باغ میں گھس آیا؟ کس کا کتا ہے وہ؟" اس نے پلٹ کر دریافت کیا۔

"میں نہیں جانتی بیگم، شاید گونگے کی کتیا ہے۔" ایک خادمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"کیسی خوبصورت کتیا ہے"، مالکہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "کسی کو بھیج کر اسے پکڑواؤ۔ کیا گونگے نے اسے بہت دنوں سے پال

رکھا ہے؟ مجھے کیوں نہ بتلایا؟ میرے پاس لاؤ اُسے۔ جلدی کرو۔
ملازمہ کمرے سے نکلتے ہوئے چلائی "اسطیپان، اسطیپان مادام ماؤ ماؤ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ باغ میں ہے۔ جلدی پکڑ لاؤ اُسے!"

"تو اُسے ماؤ ماؤ کہتے ہیں" مالکہ نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو بڑا اچھا نام ہے۔"

خادماؤں نے مادام کے اس خیال کی تائید کی۔

ملازم دوڑا ہوا باغ میں گیا۔ لیکن ماؤ ماؤ عین موقع پر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جرنظیم کے پاس پناہ لینے کے لئے بھاگ گئی۔ جو اس وقت باورچی خانہ میں کام کر رہا تھا۔ اسطیپان نے یہاں بھی اس کا تعاقب کیا۔ اور چاہتا تھا کہ لپک کر پکڑ لے کہ ماؤ ماؤ نے ایک جست لگائی۔ اور پھر چھوٹ گئی۔ جرنظیم بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

ملازم نے بمشکل تمام اشاروں سے سمجھایا کہ مالکہ نے کتیا طلب کی ہے۔ جرنظیم کو مالکہ کی اس فرمائش پہ تعجب ضرور ہوا۔ لیکن اس نے ماؤ ماؤ کو پکڑ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اسطیپان فوراً مالکہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ماؤ ماؤ جس نے اس قدر ٹھاٹھ کاہے کو کبھی دیکھا تھا، خوف سے کانپنے لگی۔ اسطیپان نے اسے مادام کے سامنے ڈال دیا۔ بیچاری سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپتی ہوئی، سمٹی سمٹائی دیوار کے پاس دبک گئی۔

مالکہ نے اُسے چمکارا، خادماؤں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن ماؤ ماؤ کسی کی سننے کے لئے آمادہ نہ تھی۔

"کیسی شریر کتیا ہے؟ اپنی مالکہ سے اس قدر ڈرتی ہے۔"

"ابھی وہ آپ سے مانوس نہیں ہوئی ہے"

اس عرصہ میں اسطیپان ایک طشت میں دودھ لے آیا۔ اور اُسے ماؤ ماؤ کے آگے رکھ دیا۔ مگر اس نے توجہ نہ کی۔ اور ڈرتی کانپتی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

"کیسی شوخ ہے"۔ مالکہ قریب جا کر اُسے تھپتھپانا چاہتی تھی کہ ماؤ ماؤ بطور احتجاج دانت نکال کر غرائی۔ مالکہ نے سہم کر فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

ایک لحہ خاموشی چھائی رہی۔ ماؤ ماؤ کچھ خوف اور کچھ بیزاری کے اظہار کے لئے غراتی رہی۔ مالکہ بڑبڑاتی ہوتی دور ہٹ گئی کتیا نے اسے ڈرا دیا تھا۔

یہ رنگ دیکھ کر خادمائیں دوڑیں "اس نے آپ کو کاٹ تو نہیں لیا؟"

ماؤ ماؤ نے آج تک کبھی کسی کو نہیں کاٹا تھا۔

"لے جاؤ اسے یہاں سے" بوڑھی مالکہ نے لہجہ بدل کر کہا۔ "شریر، بدمزاج، کتیا"

وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف چلی۔ خادماؤں نے پُرمعنی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور اس کے پیچھے جانا ہی چاہتی تھیں۔ کہ وہ مڑی اور پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے نہائت سرد مہری سے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ میں نے تمہیں نہیں بلایا۔" اور خلوت خانہ میں چلی گئی۔

نہائت بد دلی سے کتیا اسطیپان کے حوالے کر دی گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر دروازے سے نکل سیدھے جرنظیم کے قدموں میں لا ڈالا۔ مکان پر ایک مکمل خاموشی چھا گئی۔ مالکہ تنہا اپنے کمرے میں طوفانی بادلوں کی طرح اُداس بیٹھی تھی۔

دوسری صبح اس نے اپنے خانساماں گوریلا کو معمول کیخلاف ایک گھنٹہ پہلے طلب کیا۔

"تم بتا سکتے ہو" اس نے خانساماں کے آتے ہی کہنا شروع کیا "کہ پچھلی رات صحن میں کونسا کتا بھونکتا رہا؟ اس نے میری نیند حرام کر دی"!

"کتا، مادام؟ کتا؟" گوریلا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید وہ بہرے کی کتیا تھی"۔

"میں یہ سب کچھ جاننا نہیں چاہتی۔ میں صرف اس قدر جانتی ہوں۔ کہ اس نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جگہ اتنے بہت سے کتے کیوں جمع ہو گئے ہیں۔ کیا گھر کا کتا کافی نہیں ہے؟"

"جی ہاں مادام، والتشاک تو ہے ہی"۔

"ہے تو پھر ایک اور کتے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے سوائے تکلیف کے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ آخر اس بہرے نے کتیا کس لئے پال رکھی ہے۔ اسے میرے گھر میں کتیا رکھنے کی اجازت کس نے دی۔ کل جب میں نے اُسے باغ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک گندی سی بڈی چچوڑ رہی تھی...."

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔

"آج ہی اس کتیا کو گھر سے نکال باہر کرو۔ تم نے سنا؟"

"بہت بہتر مادام"

"آج ہی۔ سمجھتے ہو یا نہیں؟.... اچھا اب تم جا سکتے ہو"۔

(۴)

گوریلا وہاں سے دالان میں گیا جہاں اسطیپان ایک بنچ پر پڑا سو رہا تھا۔ اسکے پاؤں کوٹ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ جسے اس نے کمبل کے بجائے اوڑھ رکھا تھا۔ خانساماں نے اسے جگا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

جس کا اس نے انگڑائی لیتے ہوئے ایک قہقہہ سے جواب دیا۔ اس کے بعد گوریلا رفوچکر ہوگیا۔ اسطیپان بھی اٹھا۔ اور جوتے اور کوٹ سنبھال کر صحن میں چلا گیا۔

پانچ منٹ کے بعد جرتظیم پشت پر لکڑیوں کا ایک بڑا سا پشتارہ اٹھائے کبھی جدا نہ ہونے والی ماؤ ماؤ کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنا بوجھ رکھ کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ اور ماؤ ماؤ حسب معمول دروازہ پر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اسطیپان موقع پاتے ہی اس پر جھپٹا۔ اسے اٹھا کر فوراً گلی میں آیا۔ اور سب سے پہلی سواری ٹھہرا کر بازار کا رخ کیا۔ یہاں پہونچکر اس نے ماؤ ماؤ کو ایک خریدار کے ہاتھ نصف روبل میں اس شرط پر فروخت کردیا۔ کہ وہ اسے کم از کم ایک ہفتہ تک باندھے رکھے گا۔ واپسی پر وہ باغ کی دیوار پھاند کر مکان کے احاطہ میں داخل ہوا۔ تاکہ صحن کے دروازہ پر جرتظیم کا سامنا نہ ہوجائے۔

لیکن ایسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ جرتظیم صحن میں موجود ہی نہ تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلا۔ تو ماؤ ماؤ وہاں سے غائب تھی۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ اس کا انتظار کئے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔ اس نے اسے ہر جگہ، گھر کے تمام کمرے، گودام، اصطبل حتےٰ کہ سڑک پر بھی تلاش کیا۔ تمام نوکروں سے زمین سے چھ انچ اوپر ہاتھ رکھ رکھ کر اشاروں میں ماؤ ماؤ کے متعلق دریافت کیا۔ جو ناواقف تھے انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور جو جانتے تھے۔ انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ خانساماں اسے اپنی جانب آتا دیکھکر کوچبان کو بلانے کے بہانے سے دوسری جانب چلا گیا۔ بالآخر گھر میں ماؤ ماؤ کو نہ پاکر وہ اس کی تلاش میں باہر نکل گیا۔

شام ہوتے ہوتے وہ واپس لوٹا۔ اس کے مضطرب اور نڈھال چہرے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں اور گرد آلود کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ شہر ماسکو کے کم از کم آدھے حصے کی آوارہ گردی کے بعد واپس لوٹا ہے۔ اس نے صحن میں یکجا شدہ نوکروں کے مجمع پر ایک جھلتی ہوئی نظر ڈالی اور ایک بار پھر ماؤ ماؤ کو پکارا۔ لیکن ماؤ ماؤ نے کہیں سے جواب نہ دیا۔ اور وہ چلا گیا۔ تمام ملازم سکتہ کے عالم میں اسے جاتا ہوا دیکھا کئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پھر تمام رات روتا رہا۔

دوسری صبح کو جرتظیم کام کے لئے اپنے کمرے سے نیچے نہیں اترا۔ کوچبان کو کنوئیں سے پانی لانے کے لئے جانا پڑا۔ مادام کے دریافت کرنے پر خانساماں نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔ کہ مالکہ کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کی گئی۔ دوسرے دن حسب معمول جرتظیم نیچے اترا۔ لیکن ملازموں سے اشاروں سے سلام یا کسی قسم کی گفتگو نہیں کی۔ اس کا چہرہ جس پر زندگی کے آثار کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ پتھر کا بن گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر گیا۔ اور واپسی پر اصطبل میں خشک گھاس کے انبار پر چڑھ گیا۔ اسے اب بھی ماؤ ماؤ کی تلاش تھی۔

(۵)

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ جرتظیم بے چینی سے گھاس کے انبار پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کہ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے کوٹ کا دامن پکڑے گھسیٹ رہا ہے۔ وہ سر سے پیر تک کانپ گیا۔ لیکن سر اٹھا کر دیکھنے کی پروا نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے اس کے دامن کو قدرے زور سے کھینچا۔ اس مرتبہ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے گرد ماؤ ماؤ چوکڑیاں بھر رہی تھی۔ اس کی گردن میں رسی کا ایک ٹکڑا بندھا تھا۔ جرتظیم کے منہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے بے اختیار ماؤ ماؤ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور ماؤ ماؤ نے بے کوفت اس کی ناک، داڑھی، اور مونچھوں کو چاٹ کر رکھ دیا۔

جرتظیم نے کچھ دیر واقعات پر غور کیا پھر اپنے ارد گرد ایک نظر ڈالی اور اٹھ کر چھپتا چھپاتا اپنے کمرے تک پہونچا۔ وہ پہلے ہی واقعات کی تہ تک پہونچ چکا اور سمجھ گیا تھا کہ ماؤ ماؤ خود اسے چھوڑ کر نہیں گئی ہے۔ بلکہ یہ سب مالکہ کے حکم سے ہوا ہے۔ کیونکہ خادموں نے ماؤ ماؤ سے مالکہ کی خفگی کی وجہ اسے پہلے ہی سمجھا دی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ ہر امکانی احتیاط برتے گا۔ تاکہ پھر ایسی مصیبت نہ آنے پائے۔

ماؤ ماؤ کو کچھ کھلا پلا کر سلا دینے کے بعد وہ اس کے تحفظ کے لئے نظام العمل تیار کرنے بیٹھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ دن بھر اُسے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گا۔ اور صرف راتوں کو مکان سے باہر لے جایا کرے گا۔ دن میں فرصت ملنے پر وہ اُسے دیکھ جایا کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کی درز کو اپنے پرانے کوٹ سے بند کر دیا۔

دوسرے دن، تاکہ اور ملازموں کو ماؤ ماؤ کی واپسی کا شبہ نہ ہو۔ جرتظیم پچھلے دنوں کی طرح رنجیدہ صورت بنائے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ ماؤ ماؤ بھونک بھونک کر لوگوں کو اپنی واپسی سے مطلع کر دے گی یا کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر کے تمام ملازم یہ جانتے تھے۔ کہ وہ آ گئی ہے۔ لیکن کچھ رحم اور کچھ خوف کی وجہ

سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر خاموش تھا۔ گوریلا الگ اپنی خیر منا رہا تھا۔ کہ خدا کرے۔ مالکہ کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔

(۶)

اس روز جرنظیم اس قدر جانفشانی سے اپنے کاموں میں مشغول رہا کہ مادام کو بھی اس کی تعریف کرنی پڑی۔ کاموں کے درمیان دو بار اُسے ماؤ ماؤ کو دیکھ آنے کا موقع ملا۔ رات کو پہلے تو وہ دو بجے تک سوتا رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر ماؤ ماؤ کو کھلی ہوا میں سیر کی خاطر لے گیا۔ ابھی وہ باغ کی چار دیواری سے باہر نکلنے نہ پائے تھے۔ کہ صدر دروازہ پر کچھ آہٹ سنائی دی۔ ماؤ ماؤ کان کھڑے کر کے غرائی اور آگے بڑھی۔ تھوڑی دور جا کر وہ زور زور سے بھونکنے لگی۔ کیونکہ ایک شرابی نشہ میں چور زیر دیوار پڑا سو رہا تھا۔

بدقسمتی دیکھئے۔ کہ عین اسی وقت بمشکل تمام مالکہ کی آنکھ لگی تھی۔ ماؤ ماؤ کی عف عف نے اُسے پھر جگا دیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھی۔ اور چیخوں سے سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ خادمائیں اس غیر متوقع عتاب سے ڈرتی کانپتی جمع ہو گئیں۔

"اوہ۔ مجھے زندہ نہیں رہنے دیا جائیگا" اس نے دونوں بازو پھیلا کر انتہائی اضطراب و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کتیا! پھر وہی کتیا!! اوہ!!!"

کم نصیب ماؤ ماؤ برابر بھونکتی رہی اور غریب جرنظیم اُسے خاموش کرنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔

"وہ دیکھو! وہ پھر آگئی" مالکہ نے کھڑکی سے باہر باغ پر نظریں ڈال کر کہا۔

ایک خادمہ دوڑی ہوئی گول کمرے میں گئی۔ اور اسطیپان کو جگایا اسطیپان نے لپک کر گوریلا کو ہوشیار کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر جاگ اُٹھا۔

جرنظیم نے جو مڑ کر دیکھا۔ تو تمام کمروں میں روشنی پائی۔ فوراً ماؤ ماؤ کو اٹھا بغل میں داب اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ اور یہاں پہونچکر بطور حفظ ماتقدم دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ گھر کے تمام ملازم اس کے دروازہ پر جمع ہو گئے۔ لیکن اسے بند پایا گوریلا نے بڑھ کر چند ملازموں کو تاکید کی۔ کہ وہ صبح تک یہیں رہیں اور کمرے کی سخت نگرانی کریں۔

اس کے بعد اس نے ایک خادمہ سے کہا کہ مادام سے کہو کہ اس ہڑبونگ میں ماؤ ماؤ کہیں بھاگ گئی ہے۔ اسے صبح ضرور ڈھونڈوایا جائے گا۔

اب وہ اطمینان سے سو رہیں۔

صبح کو ایک اچھے خاصے مجمع نے جرنظیم کے کمرے پر آخری دھاوا بول دیا۔ تمام زینہ نوکروں سے بھر گیا۔ گوریلا نے دروازہ پر دستک دی۔

"دروازہ کھولو" اس نے چیخ کر کہا۔

کمرے سے سوائے کتیا کی ہلکی سی عف عف کے اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو" گوریلا دوبارہ چلایا۔

"لیکن وہ تو بہرا ہے نا بھائی" اسطیپان نے پیچھے سے کہا۔ "وہ تمہیں سن کب سکتا ہے"

تمام لوگ ہنس پڑے۔

"پھر کیا کریں" گوریلا نے چڑ کر کہا۔

"دروازہ میں یہ جو سوراخ ہے۔ اس میں سے چھڑی ڈالو۔ اسے متوجہ کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے"

"لیکن اس نے اسے اپنے کوٹ یا کسی چیز سے بند کر رکھا ہے" گوریلا نے جھک کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوٹ چھڑی سے ہٹایا جا سکتا ہے"۔

کتیا کے بھونکنے کی دبی دبی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"ہاں ہاں تو پھر تکلف کس بات کا ہے"۔

سب لوگ ہنس پڑے۔ مگر گوریلا اس تجویز پر آمادہ نہ ہوا۔

"نہیں، نہیں، اگر تم چاہتے ہو۔ تو تم ہی اس کوٹ کو ہٹاؤ"۔

"اچھا تو لاؤ مجھے دو!"

اسطیپان نے چھڑی لے کر سوراخ کے منہ پر سے کوٹ ہٹا دیا۔ اور جھک کر اس میں جھانکنا شروع کیا۔ ابھی وہ اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ اس قدر غیر متوقع طور پر کھل گیا۔ کہ سب لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور زینوں سے نیچے صحن میں آ رہے۔

جرنظیم چوکھٹ پر نمودار ہوا اپنی سرخ قمیص میں وہ اچھا خاصا لال دیو معلوم ہوتا تھا۔ اس نے زینوں کے نیچے نسبتاً چھوٹے چھوٹے لوگوں پر نظریں گاڑ دیں۔ اور دیو ہیکل مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا گوریلا ہمت کر کے ایک قدم آگے بڑھا اور کہنے لگا "دیکھو جرنظیم اب ضد نہ کرو"

اس نے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کی: "مالکہ تمہارا کتیا رکھنا پسند نہیں کرتیں۔"

جرنظیم نے گوریلا کو مخاطب کیا، ماؤ ماؤ کی طرف اشارہ کر کے اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔ اور گلا گھونٹنے کا نقشہ پیش کر کے اس پر استفہامیہ نظریں گاڑ دیں۔

"بالکل ٹھیک، اب آیا تمہاری سمجھ میں"۔ گوریلا نے تائیداً اثبات میں سر ہلایا۔

جرنظیم نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ پھر دفعتاً شانوں کو جنبش دی۔ اور ماؤ ماؤ کی طرف اشارہ کر کے ایک بار پھر پھانسی کا نقشہ پیش کیا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا۔ کہ اگر اس کی جان ہی لینا مقصود ہے۔ تو یہ کام بھی مجھ پر چھوڑ دیا جائے۔

"ہاں، مگر اس کا یقین کیونکر ہو کہ تم ایسا کرو گے"۔ گوریلا نے اعتراض کیا۔

جرنظیم نے حقارت آمیز تبسم کے ساتھ سینہ پر ہاتھ مارا اور مڑ کر کمرے کا دروازہ زور سے بھیڑ لیا۔

ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ملازم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"اس کے کیا معنی" گوریلا جھنجلا کر بولا۔ "اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔"

"اُسے اپنے حال پر چھوڑ دو "گوریلا" اسطیپان نے کہا۔" وہ اپنے وعدے پر ضرور عمل کریگا، اس بارے میں وہ ہماری تمہاری طرح نہیں ہے"۔

"ہاں ہاں وہ قابل اعتماد ہے"۔ تمام نوکروں نے تائید کی۔

"بہت اچھا، یوں ہی سہی، لیکن پھر بھی احتیاط لازم ہے"۔ گوریلا نے مڑ کر باغبان کو مخاطب کیا۔ "دیکھو ایروشکا تم اس کی نگرانی کرو، اگر وہ دھوکہ دینے کی کوشش کرے تو مجھے اطلاع دو"۔

ایروشکا زینوں کے قریب بیٹھ گیا۔ نوکروں کا مجمع منتشر ہو گیا۔ گوریلا نے مادام کو کہلا بھیجا کہ احکام کے مطابق ماؤ ماؤ کو برطرف کر دیا گیا۔ مالکہ نے اس خبر کو بے توجہی سے سنا۔ کپڑوں میں عطر لگایا۔ چائے پی۔ اور خوابگاہ میں چلی گئی۔ گویا کچھ بات ہی نہیں ہوئی۔

(۷)

گھنٹہ بھر بعد جرنظیم کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے چھٹی کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ماؤ ماؤ پتلی سی رسی سے بندھی ہوئی اس کے ساتھ تھی، ایروشکا نے ہٹ کر اُسے راستہ دیا۔ اور وہ اپنے اردگرد دیکھے بغیر صحن سے گزر کر سڑک پر ہو لیا۔ گوریلا کے کہنے پر ایروشکا اس کے تعاقب میں گیا۔

جرنظیم کچھ دور چل کر ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اور ایروشکا اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

ہوٹل کے ملازم اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور اس کے اشاروں کو سمجھتے تھے۔ وہ گوشت اور شوربے کی فرمائش کر کے میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ماؤ ماؤ اطمینان سے کرسی کے قریب کھڑی ذہین نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ اس کے لمبے لمبے ملائم بال چمک رہے تھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی ابھی انہیں صاف کر کے برش کیا گیا ہے۔

گوشت پیش کیا گیا۔ جرنظیم نے روٹی توڑ کر شوربے میں ڈالی۔ بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے اور طشت اٹھا کر فرش پر رکھ دیا۔ ماؤ ماؤ نے اپنے دلچسپ انداز میں طشت کو گلموچھوں سے چھوئے بغیر جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔ جرنظیم ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتا رہا۔ یکبارگی دو موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں سے ٹپک کر رخساروں پر بہہ گئے۔ اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ماؤ ماؤ نے نصف طشت خالی کیا اور دور ہٹ کر پنجے چاٹنے لگی۔ جرنظیم اُٹھا، قیمت ادا کی، اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اسے آتا دیکھ کر ایروشکا آڑ میں ہو گیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا۔ تو پھر اس کا تعاقب شروع کیا۔

جرنظیم ماؤ ماؤ کی رسی تھامے آہستہ آہستہ چلا۔ سڑک کے اختتام پر رک کر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادہر اُدہر دیکھا۔ اور مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ندی کی جانب چل پڑا۔ راستہ میں اس نے ایک زیر تعمیر مکان کے احاطے سے دو اینٹیں اٹھا لیں۔

ندی پر پہونچکر وہ ساحل کی دوسری جانب گیا۔ جہاں دو کشتیاں ساحل سے بندھی تھیں۔ وہ کود کر ایک میں داخل ہو گیا اور زنجیر کھول دی۔ قریب کی جھونپڑی سے ایک لنگڑا ملاح نکل کر شور غل مچانے لگا۔ لیکن جرنظیم نے شنوائی نہ کی اور زور زور سے چپو چلاتا ہوا بہاؤ کی مخالف سمت پر چل پڑا۔ ملاح سر کھجلاتا ہوا اسے ساحل سے دور ہوتے دیکھا کیا۔ آخر مایوس ہو کر جھونپڑی میں واپس آ گیا۔

جرنظیم برابر چپو چلاتا رہا۔ وہ ماسکو سے کافی دور ہو چکا تھا۔ دونوں کناروں پر کھیت اور جھونپڑیاں گذرتی جا رہی تھیں۔ بالآخر اس نے چپو روک لئے اور ماؤ ماؤ پر جھکا جو ڈگمگاتی ہوئی کشتی پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ یکایک وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی شدید غصہ کی حالت میں ہو۔ ایک رسی نکال کر دونوں اینٹوں سے باندھی اور درمیان میں پھندا بنا کر

ماؤ ماؤ کی گردن میں ڈال دیا۔ پھر ہاتھوں میں اٹھا کر آخری بار اس پر نظر ڈالی۔ ماؤ ماؤ اطمینان سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ اور ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔

بہرا جرنظیم کچھ نہ سن سکا۔ نہ تو اسے ماؤ ماؤ کی قیں قیں سنائی دی۔ نہ وزنی اینٹوں کے پانی میں گرنے کی آواز۔ اس کے لئے سب سے زیادہ پُرشور دن ایسا ہی بے آواز تھا۔ جیسی ہمارے لئے خاموش سے خاموش رات ہو۔ جب اس نے مڑ کر دیکھا۔ تو موجیں بدستور سابق ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی کشتی سے ٹکرا رہی تھیں۔ دور بہت دور اس کی پشت پر وسیع لہریں ساحل کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

یہاں جیسے ہی جرنظیم، ایروشکا کی آنکھوں سے اوجھل ہوا۔ وہ دوڑا ہوا گھر پہنچا اور اس واقعہ کی اطلاع دی۔

"اطمینان رکھو، اس نے حقیقتاً ماؤ ماؤ کو ندی میں غرق کر دیا"۔ اسطیپان نے کہا۔ "وہ وعدہ کا کس قدر پابند ہے"۔

اُس روز جرنظیم کو کسی نے نہ دیکھا۔ وہ کھانے پر حاضر نہیں ہوا۔ شام کو بھی جب تمام ملازم کھانے کی میز پر جمع تھے۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"عجیب آدمی ہے وہ بھی" موٹی دھوبن نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "ایک کتیا پر وہ اس قدر جان چھڑکتا ہے"...

"وہ آیا تو تھا یہاں ......" اسطیپان بولا۔

"کب، کیسے؟ ......"

"تقریباً دو گھنٹہ پیشتر! مجھے صدر دروازہ پر ملا۔ وہ باہر جا رہا تھا۔ میں اس سے کتیا کے متعلق پوچھنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت نامناسب سمجھ کر خاموش ہو رہا۔ اس کے علاوہ وہ غصہ کی حالت میں تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے اپنے سامنے سے دھکیل کر پرے کر دیا۔ شائد وہ اس موقع پر کسی سے گفتگو نہ کرتا۔

اسی وقت ایک دیوقامت شخص اسباب کا بڑا سا پشتارہ شانوں پر رکھے، ہاتھ میں چھڑی لئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ماسکو کی سڑکوں سے گذر رہا تھا۔ وہ جرنظیم تھا۔ اور گاؤں میں اپنی سابق قیام گاہ کو جا رہا تھا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر وہ بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ماؤ ماؤ کو ندی کے حوالے کرنے کے بعد وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچا۔ اور اپنی تمام ملک کا پشتارہ بنا، شانوں پر لاد کر چل کھڑا ہوا۔ راستے سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ یہ اس نے اسی وقت ذہن نشین کر لیا تھا۔ جب وہ ماسکو لایا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں اس کا گاؤں شہر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ سڑک پر وہ سیدھا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں افق پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کے قدم تیز تھے۔ جیسے اس کی ماں گھر پر اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اور وہ عرصہ دراز تک پردیس میں آوارہ گردی کے بعد واپس لوٹا ہو۔

دوسرے دن وہ اپنی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ فصل کٹنے کا موسم تھا۔ محنتی ہونے کی وجہ سے اسے فوراً کھیتوں میں کام مل گیا۔

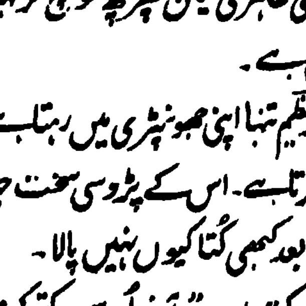
اس دوران میں ماسکو میں اس کی تلاش شروع ہوئی۔ پولیس کو بھی اطلاع دی گئی۔ مالکہ نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا۔ بلکہ رو بھی دی۔ اور نوکروں کو دھمکایا کہ اس نے کتیا کو مار ڈالنے کے لئے کبھی نہیں کہا تھا۔ گوریلا الگ ہدف ملامت بنا۔ بالآخر گاؤں سے خبر پہونچی کہ جرنظیم یہاں ہے۔ مادام کو ذرا اطمینان ہوا۔ پہلے تو اُسے واپس بلانے پر آمادگی ظاہر کی لیکن پھر کچھ سوچ کر کہا کہ مجھے ایسے بیوفا ملازم کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ اب جرنظیم تنہا اپنی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اور ہمیشہ چار آدمیوں کا کام اکیلا کرتا ہے۔ اس کے پڑوسی سخت حیران ہیں کہ اس نے ماسکو سے واپسی کے بعد کبھی کتا کیوں نہیں پالا۔

"بہر حال" وہ کہتے ہیں۔ "آخر اُسے کتے کی ضرورت ہی کیا ہے کون ایسا بے وقوف چور ہوگا۔ جو اسکے گھر میں گھسنے کی کوشش کریگا؟ کیونکہ سارا گاؤں بہرے کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر ہے"

(ترجمہ)

غلام عباس (موتوی)



زود پشیماں

(۱)

تم سے پوچھا نہ کبھی میں نے یہ دیوانہ سوال
آشنا درد کی چیخوں سے نہ تھی بزمِ خیال
کیوں شفق روز بہاتی ہے لہو کے آنسو
کیف میں غرق تھے صہبائے محبت کے سبو

(۲)

آرزوؤں کو جواں ہونے دیا تھا لیکن
منتشر ہونے لگی دم میں فضائے نغمہ
جو وفائیں نظر آتی تھیں جفائیں نکلیں
دل کے ہر تار سے پر درد صدائیں نکلیں

(۳)

تم نے پیمانِ وفا توڑا تو ویراں آنکھیں
تم جو ٹھکرا کے گئے ایک تمنا کا چراغ
ذوقِ نظارہ سے بیگانہ بنا دیں میں نے
محفلِ زیست کی سب شمعیں بجھا دیں میں نے

(۴)

اب کہاں میرے تخیل میں وہ تصویرِ شباب
سینۂ بحر میں سو جاتے ہیں جب ہنگامے
عشق بہکا ہوا اور حُسن پہ مدہوشی سی
موج کے گھیر میں رہ جاتی ہے خاموشی سی

(۵)

عہدِ رفتہ کی تمنائیں محبت کی کسک
دور سے آتی ہے آواز سی یوں جیسے ہوا
ڈھونڈتا ہوں جو کبھی روح کے کاشانوں میں
سسکیاں لیتی ہوئی چلتی ہو ویرانوں میں

(۶)

دلِ ویراں میں ہے موت کی وادی کا سکوت
کائنات اپنی شبِ غم پہ لٹا دی میں نے
اب رہے جل کے تمنا کسی بیتاب کے پاس
ایک آنسو بھی نہیں دیدۂ بیخواب کے پاس

(۷)

دردِ تکمیل کی منزل پہ پہنچ جاتا ہے
اب مرے ساز کے تاروں میں نہیں بینائی
جنبشِ لب ہی میں رہ جاتی ہیں جب فریادیں
رہ گئیں دب کے مرے پہلو میں سب فریادیں

(۸)

وہ حسیں نقش جو تھے میرے جنوں کی تخلیق
کس لئے آئے ہو اب آنکھوں میں آنسو لیکر؟
غم کی تاریکی نے کر ڈالے ہیں یکسر موہوم
دل تو باقی ہے مگر دل کی حقیقت معلوم

(مسعودِ حفیظ)

لندن میں اُردُو

سارے جہاں میں دُھوم ہماری زباں کی ہے!

نواب فصیح الملک داغ دہلوی کا ایک مشہور مصرعہ ہے۔

ع ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

انہوں نے اس ذریعے سے اپنی زبان کی سلاست اور روانی کی داد چاہی تھی۔ اور حق یہ ہے۔ کہ وہ صاف اور سادہ اُردو جوان کے اشعار کی خصوصیت ہے۔ انہی کا حصہ تھی۔ میں نے ان کے مصرعہ میں ذرا سا تصرف کر کے اس کی حدود کو بہت وسیع کر لیا ہے یہاں "ہماری زبان" سے مراد ہے ہمارے ملک کی زبان یعنے اردو یا ہندوستانی اور اس کا دائرۂ اثر وسیع ہوتے ہوتے ہندوستان کی حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ جہاں جہاں ہندوستان کے باشندے بیرونی دنیا میں گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے ملک کی عام زبان وہاں پہنچی ہے۔ کوئی کسی صوبہ کا رہنے والا ہے۔ کوئی کسی کا۔ اور جس ملک میں کام کر رہے ہیں۔ وہاں اس ملک کی زبان ان کو سیکھنی اور بولنی ہوتی ہے۔ مگر جب آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ تو جزوِ مشترک ہندوستانی زبان ہی ہوتی ہے۔ مجھے انگلستان میں۔ فرانس میں۔ جرمنی میں۔ اٹلی میں۔ آسٹریا میں ہنگری میں۔ اپنے وطن کے آدمی ملے ہیں۔ اُن میں ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ملتے ہی ہندوستانی زبان میں باہم گفتگو شروع ہو جاتی تھی۔ یہی حال مصر اور ٹرکی۔ اور فلسطین کی سیاحت میں رہا۔ ان ملکوں کے علاوہ بہت سے ملک ہیں۔ جہاں میں خود نہیں گیا۔ مگر جہاں کا حال ان لوگوں سے سنا ہے۔ جو وہاں رہتے ہیں۔ یا ان ملکوں کو دیکھ آئے ہیں۔ اور وہ یہی بتاتے ہیں کہ امریکا میں، کینیڈا میں جنوبی افریقہ میں اور مشرقی افریقہ میں۔ اور بعض جزائر میں۔ جہاں کہیں ہندوستانی پہنچے ہیں۔ اُن کی زبان اُن کے ہمراہ گئی ہے۔ امریکہ میں تو کئی مرتبہ اردو میں اخبار بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ایک اخبار ہمارے مشہور ہم وطن سید حسین صاحب نے نکالا تھا۔ جو آج کل مدت دراز کے بعد اس ملک میں آئے ہیں۔ اس کا نام وطن تھا۔ اردو ٹائپ میں نہایت آب و تاب سے چھپتا تھا۔ اس میں مضامین بھی بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ اور مشاہیر کی تصویریں بھی۔ ایسی عمدگی سے خود ہندوستان میں کم اخبار نکلے ہوں گے۔ کچھ عرصہ ہوا۔ مجھے ایک سکھ صاحب لنڈن میں ملے۔ جو مدت تک امریکہ میں کاروبار کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستانیوں کے مجموں میں انہوں نے وہاں اکثر سر اقبال کا مشہور ملکی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سنا۔ اسی طرح انگلستان میں کئی جگہ اردو کا چرچا ہے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج کی ہندوستانی مجالس میں تو مجھے خود بھی اردو کی بابت تقریروں کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔

مگر اس کے علاوہ اڈنبرا۔ گلاسگو وغیرہ برطانیہ کے دیگر مقامات میں بھی جہاں ہندوستانی طلبہ یا کاروباری لوگ موجود ہیں۔ اردو کی آواز کانوں میں پڑتی ہے۔ برطانیہ کے ساحل سمندر کے ایسے مقامات میں جہاں کچھ مزدور پیشہ ہندوستانی رہتے ہیں۔ وہاں اردو کے اخبار پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ باہم ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہیں۔ جو بہر حال ان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے بہتر ہوتی ہے۔ خود لنڈن میں جو برطانیہ کا دارالحکومت اور اس وقت مغربی دنیا کا مرکز ہے۔ گاہے گاہے اردو کا چرچا رہتا ہے۔ میں جب وہاں گیا تو میں نے ایک مجلس شروع کرنے کی تحریک کی

جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ کبھی کبھی ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ مل بیٹھیں۔ اور اپنے ملک کی بولی سے کام لیں۔ یہ تحریک پسند کی گئی۔ اور "ہندوستانی سپیکنگ یونین" یعنے "ہندوستانی بولنے والوں کے اتحاد" کے نام سے ایک جماعت قائم ہو گئی۔ اور دیوان آتما نند شرما صاحب بی۔ اے۔ جو پنجاب کے ایک مشہور اہل قلم ہیں اس کے اعزازی سکریٹری قرار پائے۔ یہ جماعت عموماً مہینے میں ایک مرتبہ ایک پارٹی کرتی ہے۔ جس میں اراکین اور ان کے مہمانوں کی چاء اور مٹھائی وغیرہ سے تواضع کی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد کچھ اردو نظم و نثر کے مضمون پڑھے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ دو سال سے زیادہ سے جاری ہے۔ پارٹی عموماً اراکین میں سے کسی ایک کی طرف سے دی جاتی ہے۔ باہم میل جول کا لطف بھی رہتا ہے۔ اور علمی اور ادبی صحبت کا بھی۔ سیاسیات پر ان جلسوں میں بحث نہیں ہوتی۔ تاکہ ہر سیاسی خیال کے لوگ شریک ہو سکیں اور کسی کو اختلاف رائے کی وجہ سے اس دوستانہ جلسے میں شامل ہونے کے متعلق تامل نہ ہو۔

اردو کی یہ ہمہ گیری دیکھتے ہوئے یہ کہنا داخل مبالغہ نہیں کہ ہماری زبان کی دھوم سارے جہاں میں ہے۔

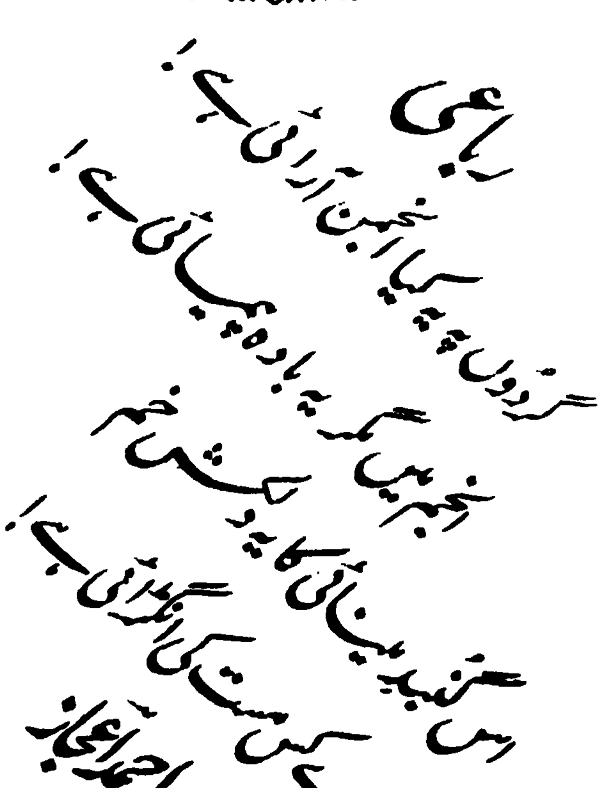
ان مجالس میں جن کا ذکر کیا گیا۔ غالب اور ذوق کا کلام پڑھا گیا۔ ٹیگور کے کلام کے اردو ترجمے سنائے گئے۔ اقبال کی نظمیں پڑھی گئیں۔ حفیظ جالندھری کے اشعار گائے گئے۔ ایک جلسے میں رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو شریک ہوئے اور انہوں نے اس تحریک کو پسند کرتے ہوئے ہندوستان اور ہندوستانی زبان کی بہتری کو ایک دوسرے کا لازمہ قرار دیا۔ ایک جلسے میں آنریبل سر عبدالرحیم صاحب صدر مرکزی اسمبلی تشریف لائے۔ اور انہوں نے اس تحریک سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اراکین یونین میں ایک صاحب مسٹر اغنتانی ہیں۔ جو در اصل سندھ کے رہنے والے ہیں مگر اب مشرقی افریقہ میں کینیا کے علاقے میں تجارت کرتے ہیں اور بیرسٹر بھی ہیں۔ ایک موقعہ پر ان کی موجودگی میں ظفر کا یہ شعر پڑھا گیا۔

ع میری سیدھی بات پر ہوتے تھے وہ ٹیڑھے ظفر
کچھ جو ٹیڑھی میں نے کی تقریر سیدھے ہو گئے

یہ ہے تو غزل کا شعر۔ مگر اس پر غور کریں تو اس میں ایک پہلو ایسا نکلتا ہے۔ جو حالات حاضرہ پر بخوبی عائد ہو سکتا ہے۔ ان کو یہ اس قدر پسند آیا۔ کہ اسے لکھ کر لے گئے۔ اور ایک اخبار میں جو کینیا میں شائع ہوتا ہے۔ چھپوا دیا۔

اکثر اوقات تو اساتذہ کی نظمیں جو کسی کو یاد ہوں۔ ان جلسوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی طبعزاد نظمیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اتفاق سے ہمارے لاہور کے ایک فاضل بیرسٹر مرزا جلال دین صاحب لنڈن میں کئی مہینے مقیم رہے۔ اور ہر مہینے ایک نظم خود لکھ کر جلسے میں پیش کرتے رہے۔ اور حاضرین سے تحسین حاصل کرتے رہے۔ میرے لنڈن سے روانہ ہونے سے پہلے جو آخری جلسہ ہوا۔ اس میں جو نظم مرزا صاحب موصوف نے پڑھی۔ اس کی ایک نقل میں نے ان سے مانگ لی تھی۔ وہ درج ذیل ہے۔ اس سے ان کے کلام کا نمونہ بھی آپ کے ناظرین کے سامنے آجائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گا۔ کہ مذکورہ بالا یونین کے ذریعے کچھ خدمت ادب اردو کی انگلستان میں بھی ہوتی رہتی ہے۔

(سر) عبدالقادر



لندن کا موسم

موسم کے تلون کا جو لندن میں سماں ہے   اس شہر کی خوبی کے لئے آفتِ جاں ہے
سیماب کی مانند یہ محرومِ سکوں ہے   اک حال پہ رہنا اسے دشوار و زبوں ہے

ہر لحظہ بدل جاتی ہیں موسم کی ہوائیں
بادل میں اُلجھ جاتی ہیں سورج کی شعاعیں

رہتا ہے کبھی "فاگ" کبھی "مِسٹ" کا منظر   مشکل سے فضا صاف نظر آتی ہے دم بھر
یکسانیٔ موسم کی تمنا میں شب و روز   ہے دیدکے قابل خَلِشِ جانِ غمِ اندوز
پیغمبرِ موسم کے صحیفہ کی بشارت   پڑھتے ہیں مگر ہوتی ہے مبہم سی عبارت
مقیاس حرارت کی ہے رفتار دورنگی   سردی جو دکھاتا ہے تو ہو جاتی ہے گرمی

القصہ نہ سردی کے نہ گرمی کے ہیں اوقات
تغیُّر کے چکر میں اُڑے جاتے ہیں دن رات

پر اس کا نرالا ہے اثر طبعِ بشر پر   تمکین میں ہرگز نہیں وہ کوہ سے کمتر
گو موسمِ لندن کو تلون کا جنوں ہے   باشندۂ لندن کی طبیعت میں سکوں ہے
موسم کی طرح اس کو بدلنا نہیں آتا   پابندیٔ خصلت سے نکلنا نہیں آتا
عادات و خصائل میں بھی رکھتا ہے وہی شان   بدلا ہے وہ پہلے نہ بدلنے کا ہے امکان
قائم ہے وہی وضع جو فطرت کی ہے افتاد   موسم کے تاثر سے سدا رہتا ہے آزاد

اس واسطے ہر ملک میں جانے کے ہے قابل
موسم کی تکالیف اٹھانے کے ہے قابل

ہم گرمی میں جلتے ہیں تو سردی میں ٹھٹھرتے   لندن کی فسوں سازیٔ موسم سے ہیں ڈرتے

آتے ہیں تو موسم کی زباں پر ہے شکایت
کیوں قابلِ تضحیک نہ ہو اپنی حکایت

(مرزا) جلال الدین

ہندوستانی سپیکنگ یونین کے اجلاس منعقدہ ۵ دسمبر کو بمقام لندن پڑھی گئی

بھولا ہوا خواب

طرازہ نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا "وہ بوڑھا کون ہے۔ جو تم نے مجھے کل دکھایا تھا چہرے سے اک قسم کا جلال اور بزرگی ٹپکتی ہے"۔

یزدونہ یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہی اور پھر تیزی سے اپنے آپ کو پنکھا جھلتے ہوئے، جھک کر، اُس نے کہا "یہ خاموش اور فکرمند بوڑھا جو ہر وقت کسی گہرے خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس ملک کا رہنے والا نہیں۔ یہ اور اُس کے ساتھی کبھی قید ہو کر یہاں آئے تھے"۔

"طرازہ! اس بوڑھے کی باتیں پُراسرار ہیں۔ میں نے اپنے بھائی سے سنا ہے۔ کہ یہ آسمانی باتیں بتاتا ہے مجھ پر اس کو دیکھ کر ہمیشہ اک قسم کا رعب اور اُداس کر دینے والی ہیبت چھا جاتی ہے"۔ پھر قدرے رُک کر اور پاس کے خونخوار کلدانی سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے "ان کو اسرائیلی کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ لوگ ہمارے دیوتا بلاز و اور بعل کو نہیں مانتے"۔

"ملکہ شماترج اس بوڑھے اسرائیلی کی بڑی عزت کرتی ہیں اور ان کے خدا پر بھی اُن کا اعتقاد ہے۔ جیسا ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے"۔

طرازہ نے یکایک گھبرا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "یزدونہ! سُن رہی ہو؟ فصیل کی طرف سے کیسی بھیانک آوازیں آ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بہن! اس محاصرے کا کیا انجام ہوگا؟ مجھے تو آثار کچھ اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ کارشمس کی دیوی ہماری محافظ ہو۔ ہماری میدانی شکست سے ایرانیوں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ اور محاصرے میں روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں۔ آخر شہر کی مضبوطی کب تک کام دیگی"۔ یہ فقرہ مایوسی اور جوش میں بلند ہو گیا۔ سپاہی نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

پنکھوں کی حرکت رک گئی اور لڑکیاں سہم کر رہ گئیں۔

سپیدہ پھٹ چکا تھا۔ دن نکلنے والا تھا۔ کہ بابل کے راحت پسند تاجدار بلشزر نے کروٹ لی۔ اور انگڑائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے آسمان کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"محل سرا میں جاؤ اور مقدس دیوتاؤں سے فتح کی دعا مانگو۔ وہ اپنے اس مرکزی شہر کو ایرانیوں سے ضرور محفوظ رکھیں گے"۔

لڑکیاں ادب سے سلام کر کے چلی گئیں۔ فوج کے سردار اور دربار کے امیر اجازت لے کر باریاب ہوئے۔ بادشاہ نے ایک اندازِ بے اعتنائی سے کہا۔

"شمرخ! کہو رات دشمن کی نقل و حرکت کا کیا حال رہا؟

ایران کے ان نومشق، اناڑی سپاہیوں کو معلوم نہیں کہ بخت نصر آنجہانی کے مضبوط اور باتدبیر ہاتھوں نے ایسی کمزور اور پست دیواریں نہیں اٹھائیں کہ سیڑھیوں کے ڈنڈے ان کے کنگروں تک پہنچ جائیں یا قلعہ شکن آلات کی ضرب ان کے سخت اور جمے ہوئے پتھروں پر کارگر ہو جائے۔ تم دیکھتے ہی ہو گے۔ کہ کس طرح ان کے تیز پرواز تیر دیواروں سے ٹکرا کر خس و خاشاک کی طرح زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اگر ہم میدان کی سرحدی لڑائی میں پسپا ہو گئے۔ تو اس یقین پر کہ ان کو محاصرے پر مجبور کر دیں اور انہیں دیواروں کی مضبوطی سے ان کی ہمتوں کو پست کر کے ناکام واپس کریں۔ یہ ہمت اور ارادوں کو بڑھائیں گے بھی تو کہاں تک؟ شہر میں بے شمار سامان رسد موجود ہے۔ غلے اور دیگر ضروریات زندگی کے ذخیرے اور دریائے فرات کا خوشگوار پانی ہم کو بیس سال تک ایرانیوں کی تدبیروں سے بچانے کے لئے کافی ہے"۔

"جہاں پناہ! رات خاموشی سے کٹی ہے۔ البتہ اس وقت

ان کی فوجیں کسی خاص ارادے سے مرووق والی سڑک کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جو حضور کے جنر آنجہانی نے اپنے جلوس کے لئے بنوائی تھی۔ غالباً اس پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ تاکہ سامان رسد اور وہ چیزیں جو اسیریا کی طرف سے آتی ہیں۔ روک لیں۔ یہ اس لئے کہ وہ شہر کے ذخیروں سے بے خبر ہیں۔ البتہ ایک بات قابل لحاظ ہے۔ جو نہر کچھ دن ہوئے۔ انہوں نے دریائے فرات کا پانی نکالنے اور کم کرنے کے لئے شہر کے جنوب کی طرف سرعزل کے ٹیلوں کے قریب کھودنی شروع کی تھی مکمل ہو چکی ہے۔"

"یہ ان کی خام خیالی ہے۔" بادشاہ نے سر کو جھٹکا دے کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں دریا کے کنارے بہت بلند ہیں اور ریتے کے نیچے پتھریلی زمین ہے۔ جو ایسی عارضی کھدائی سے کٹ نہیں سکتی اور پانی کی سطح پر نہیں پہنچ سکتی۔"

"یہ بات خطرہ سے خالی نہیں۔ حضور حکم دیں کہ آج سے دریا کے پھاٹک کھلے نہ رکھے جائیں۔ بلکہ بہتر ہو کہ ان پر خلصے کی فوجوں کا پہرہ لگا دیا جائے۔"

"خیر شمروخ! تم فکر نہ کرو۔ وزیر بحری کو پہلے ہی تمام باتوں کی ہدایات دے دی گئی ہیں۔ ہمیں اپنے شہر کی مضبوطی پر پورا اعتماد ہے۔ میں اس وقت یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ آج شاہی محل میں ایک عام دعوت ہوگی۔ تمام امرا رؤسا اہل دربار اور فوج کے چھوٹے بڑے سرداروں کو اطلاع دے دو۔ اور خاص طور پر خود اس کا انتظام کرو۔ یہ رات ذرا راحت و آرام میں گزاریں اور کچھ دیر غم دنیا سے یکسو ہو جائیں۔ باہر کے آنے جانے والوں کے لئے آج رات دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔ کل سے تاکید کر دی جائیگی۔"

"بہت مناسب جہاں پناہ کے احکام کی تعمیل ہوگی۔" شمروخ نے جو شمالی فصیل کی فوجوں کا سردار تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کے کہا۔ اور پچھلے پیروں محل سے باہر چلا گیا۔

شہر بابل آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے اپنی صد سالہ عظمت وشان کے ساتھ دریائے فرات کے دونوں کناروں پر اس طرح آباد ہے۔ کہ تین سو فٹ بلند فصیل سولہ مربع میل کی وسعت کو چاروں طرف گھیرے کھڑی ہے۔ جس میں سَو کے قریب مضبوط و مستحکم پیتل کے دروازے لگے ہوئے ہیں۔ اور پر سے اتنی چوڑی ہے کہ چار گھوڑوں والی گاڑی آسانی سے مڑ سکتی ہے۔ سڑکیں نہایت کشادہ اور سیدھی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور چوک بناتی ہوئی شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً گذرتی ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے مقابل دو قصر شاہی کھڑے ہیں۔ جن کو دریا کی تہ کی سرنگ ملاتی ہے۔ بعل کا مندر جو تخت بر تخت چبوتروں پر قائم ہے مخروطی شکل میں گوش سحاب سے سرگوشی کر رہا ہے۔ تمام شہر اور اس کی عمارتیں دیکھنے والے کو یقین دلاتی ہیں کہ یہ کام انسانی ہاتھوں سے انجام نہیں پا سکتا۔ دریائی فصیل کے آہنی پھاٹک رات کے وقت بند کر دئے جاتے ہیں۔

چاروں طرف فصیل پر سپاہی پٹے پڑے ہیں۔ لیکن یہ بخت نصر کے سپاہیوں سے مختلف ہیں۔ نہ فرض شناسی نہ مستعدی۔ نہ ویسی دلیری نہ جوش۔ آنے والے حالات سے بے خبر۔ ہاتھوں میں نیزے لئے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ کمانوں کے ساتھ ترکش بھی خاموش کاندھوں پر لٹک رہے ہیں۔ جنوبی قصر کے پاس معلق باغ ہے۔ جو بے شمار ستونوں پر اس طرح قائم ہے کہ ستر فٹ تک محراب دار منزلیں سے جا کر اوپر مٹی کا ہموار میدان بنایا گیا ہے۔ اور اس میں ہر قسم کے پھل پھول درخت اور پودے لگائے گئے ہیں۔ جو تروتازگی اور خوبصورتی میں باغ عدن کو شرماتے ہیں۔

شام کا وقت ہے۔ سورج اپنی آخری سنہری کرنیں عمارت کے کنگروں اور درختوں کی چوٹیوں پر ڈال رہا ہے۔ پرندے شام کی خوشی میں خوراک کی تلاش کو چھوڑ کر شاخوں پر جمع ہو رہے ہیں کھیل رہے ہیں چہلیں کر رہے ہیں۔ پھدکتے ہیں چہچہاتے ہیں۔ شاخوں پر بے فکری اور آزادی سے اچھلتے پھر رہے ہیں کبھی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی پھر سے اڑ کر شاہی محل پر آزادی سے جا بیٹھتے ہیں کبھی نہر کی چھوٹی چھوٹی نالیوں پر نہاتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ محل کے شرقی دروازے کی طرف محل سرا سے ملا ہوا ایک خوبصورت اور ٹھنڈا کنج ہے۔ اور سامنے لمبی لمبی روشیں ہیں۔ جن پر کچھ عورتیں ٹہلتی ہوئی کنج کی طرف آ رہی ہیں۔ بیچ میں ایک دراز قد چھریرے جسم کی عورت ہے۔ سر پر چھوٹا سا تاج اور پیچھے کی طرف تاج سے نکل کر ایک ریشمی رومال شانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ جسم میں کرتی نما آدھی آدھی آستینوں کا شلوکہ ہے۔ آدھی رانوں سے ناف تک ایک چوڑا رومال سایہ نما لباس پر دھوتی کے طریقے پر بندھا ہوا ہے۔ جسکو پٹکے

سے مضبوط کرکے آدھا پنکھا سامنے لٹکا لیا ہے۔ ایسی چال سے قدم اٹھا رہی ہے۔ کہ ہر قدم پر اداؤں سے نمایاں ہوجاتی ہے۔ اس نے ایک مرتبہ مڑکر عورتوں پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"طرازہ! تیرے باپ نے اس لڑائی میں نہایت دلیری دکھائی ہے۔ اور جانفشانی سے کام کیا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ شمروخ کی رائے فوجی معاملات میں نہایت صائب اور مصلحت پر مبنی ہوتی ہے۔ صبح بادشاہ سلامت کے حضور سے جب وزیر اور وہ واپس آ رہے تھے تو میں نے دونوں کو اپنے پاس بلایا تھا۔ شمروزہ بھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ تو کہاں تھی؟"

طرازہ نے پس پشت سے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا "دیوتا بادشاہ اور ملکہ کی حفاظت کریں! میں اس وقت ذراسی دیر کو یزدونہ کے پاس جا بیٹھی تھی۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گی"۔

"لڑکیو! تمہارے والدین کے مکانات چونکہ پل کے پاس ہیں اور غنیم کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس لئے انہوں نے تمہیں میری حفاظت میں بھیج دیا ہے۔ ادھر ادھر نہ ہوا کرو۔ رات گرمی زیادہ تھی اس لئے تمہیں بادشاہ سلامت کی خدمت میں پنکھا جھلنے کے واسطے بھیج دیا تھا۔ ورنہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں"۔

سب نے ایک زبان ہوکر کہا "جیسا ارشاد ہے ویسا ہی ہوگا"

کنج کے سامنے سرسبز گھاس پر پتھر کی چوکیاں پڑی تھیں جن پر مخملی گدیلے رکھے ہوئے تھے۔ ایک بڑی چوکی پر جو بیچ میں پڑی تھی ملکہ بیٹھ گئی۔ لڑکیاں اور دوسری عورتیں کچھ سامنے گھاس پر اور کچھ چوکیوں پر ٹک گئیں۔ لونڈیاں قطار بناکر پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ طرازہ نے جو ملکہ کے پاس ہی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی ڈرتے ڈرتے ادب سے سر جھکا کر ملکہ سے التجا کی۔......

"آپ نے ہم سے ایک دن وعدہ فرمایا تھا۔ کہ کسی وقت فرصت میں بوڑھے اسرائیلی کا کوئی عجیب واقعہ سنائیں گی۔ کیسا پیارا پیارا سہانا وقت ہے۔ شام کی ہلکی اور ٹھنڈی ہوا درختوں اور بیلوں میں سے چھن چھن کر جسم و جان کو تازہ کر رہی ہے۔ اس وقت وہ واقعہ سنا دیجئے۔ ہم سب نہایت مشتاق ہیں"۔

ملکہ نے افق مغرب کی طرف نظر جماتے ہوئے کہا "وقت تنگ ہے۔ سورج گوشۂ مغرب کی طرف جھک رہا ہے۔ تاہم میں مختصر طور پر بیان کرتی ہوں۔ وقت زیادہ ہوتا تو تفصیل سے بیان کرتی، واقعہ یہ ہے۔ کہ اس عظیم الشان خاندان کے حقیقی بانی بخت نصر آنجہانی ایک رات بستر خواب پر امور سلطنت کے متعلق غور و فکر کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے اس حکومت کی بنیادوں کو عرب سے لے کر ایشیائے کوچک اور مصر تک مضبوط کر دیا ہے۔ جو عالمگیر تجارتی کاروبار کے سبب سے بھی مال و دولت کا خزانہ بن گئی ہے۔ دنیا کی طاقتوں میں آج کوئی ایسی طاقت نہیں کہ بابل کے مقابلے کی تاب لا سکے۔ انتظام کی حیثیت سے تمام صوبوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ شہر شہر نہیں بلکہ ایسا مضبوط قلعہ ہے۔ کہ آج تک روئے زمین پر انسانی ہاتھوں نے اس کی نظیر نہیں بنائی۔ ناقابل تسخیر استحکام کے علاوہ اتنا سامان رسد اور زندگی کی اتنی ضروریات جمع ہوچکی ہیں کہ نازک سے نازک وقت میں بھی سامان خوراک سے بے نیازی ہوسکتی ہے۔ پھر بھی کسی شہر یا قوم کی حفاظت صرف انہیں چیزوں پر منحصر نہیں اس کے لئے دلیری جرأت اور تدبیر کی بھی ضرورت ہے۔ اسی شہر بابل کی سرزمین پر کتنے خاندان بن بن کر مٹ گئے۔ ہزاروں سال پہلے یہ علاقہ ایسی ہی تہذیب کا مرکز تھا۔ کتنی مرتبہ اجڑا اور کتنی مرتبہ آباد ہوا۔ عیش و عشرت دولت کا لازمہ ہے۔ اور آرام طلبی اور عیش پرستی سے بزدلی اور بے تدبیری پیدا ہوجاتی ہے۔ اس بات کی کیا ذمہ داری ہے کہ میرے جانشین بھی میری طرح اس بار کو محنت و جانفشانی سے اٹھائے رکھیں گے۔ آثار قابل اطمینان نہیں"۔

"کیا زمانے کے انقلابات اس حکومت کی زنجیروں کو بھی توڑ پھینکیں گے! ایسا ہونا لازمی ہے۔ تاہم مجھ سے جہاں تک بھی ہوسکے گا۔ میں مستقبل میں اس کے قیام و ثبات کو بڑھا دونگا۔ قوموں کو اس قابل نہ چھوڑوں گا۔ کہ میری آنکھ بند ہوتے ہی بابل کی قیادت و سطوت کو توڑ پھینکیں"۔

انہیں خیالات میں نیند آگئی پچھلی رات میں ایک خواب دیکھا جو بیداری کے افکار سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ اور اتنا عجیب پریشان کن اور انوکھی نوعیت کا تھا کہ بادشاہ کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ لیکن بیدار ہونے کے بعد ہر چند خیالات کو جمع کیا۔ اور چاہا کہ کسی طرح سارا نہیں۔ تو اس کا کچھ حصہ ہی یاد آجائے۔ مگر وہ یاد نہ آیا۔ اسی ادھیڑبن اور بیتابی و بےقراری میں دن نکل آیا۔ شہر کے تمام علما فضلا کاہن جادوگر عقلمند

پرہیزگار اور دور رس لوگوں کو جمع کیا۔ اور بھولا ہوا خواب ان سے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ خواب بتانا تو مشکل ہے۔ البتہ اگر حضور یاد کریں تو ہم اس کی صحیح اور سچی تعبیر بتا دیں گے۔ یہ سنکر آنجہانی کو سخت غصہ آیا۔ اور ان سب کے قتل کا حکم دے دیا۔ نہ معلوم کس وجہ سے خاصے کی فوج کے افسر نے اوروں کے ساتھ اسرائیلیوں کے نام بھی لکھ لئے۔ اور جیسا کہ شخصی حکومتوں میں ہوا کرتا ہے۔ حکم کی فوری تعمیل کا بندوبست کرنے لگا۔ یہ بزرگ بوڑھا جس کو تم نے اکثر دیکھا ہے۔"

یہاں پہنچ کر ملکہ نے پہلو بدلا اور چہرے کو زیادہ سنجیدہ بنا کر ایک لمبا سانس لے کر کہا۔

"یہ بزرگ بوڑھا اُس وقت اپنے پیغمبرانہ افعال و اعمال، اخلاق و عادات کے ساتھ نوجوان تھا۔ اس نے جب یہ خبر سنی تو حیران ہو گیا اور بادشاہ کے حضور میں پہنچ کر اُس نے یقین دلایا۔ کہ میں اقبال مند بادشاہ کا خواب بتا دونگا۔ اِن تمام آدمیوں کا قصور معاف فرما دیا جائے۔ بادشاہ نے جو کسی طرح حکم واپس لینے کے لئے تیار نہ تھے جوان کے چہرے پر حیرت کی نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی یہ یاد کر کے کہ اس نے ابھی کچھ دن ہوئے سالانہ امتحان میں اپنی قابلیت اور دماغی قوتوں کا حیرت انگیز ثبوت دیا تھا معافی کا وعدہ دے دیا جوان نے عرض کی کہ میں کسی جادو جوتش یا مخفی علم سے نہیں بتاؤنگا۔ اس دنیا میں ایک قادرِ مطلق زمین و آسمان کا مالک خدا ہے۔ جو بابل کے جادوگروں اور خفیہ علوم کے جاننے والوں کو عاجز کر سکتا ہے۔ میں اور میری قوم اس پر ایمان رکھتی ہے۔ آج رات اس کے حضور میں دعائیں کروں گا۔ مہلت دی جائے۔ بادشاہ آنجہانی کے چہرے پر بشاشت چھا گئی اور اجازت دے دی۔

جوان نے اپنے ساتھیوں کو ملاکر رات کے وقت عاجزی سے گڑگڑا کر دعا مانگی اور اُسی رات خواب میں اس کو سب کچھ بتا دیا گیا۔ صبح اٹھ کر آنجہانی کے حضور میں آیا۔ اور سامنے کھڑے ہو کر بھرے دربار میں اس طرح بیان کیا:-

اے انصاف پسند بادشاہ! جب تو پرسوں رات دنیا کے نشیب و فراز اور سلطنت کے معاملات پر غور و فکر کرتے کرتے سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی جڑ میں ایک نہایت قد آور بت کھڑا ہے۔ سر سونے کا۔ سینہ اور بازو چاندی کے پیٹ اور رانیں پیتل کی۔ ٹانگیں لوہے کی۔ پاؤں آدھے لوہے کے اور آدھے مٹی کے۔ تو اس کو برابر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک پتھر آپ ہی آپ کٹ کے بت کے پاؤں پر آگرا۔ جس سے ان کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر سونا پیتل چاندی سب کی الکدم راکھ سی بن کر ہوا میں اس طرح ملکر اڑ گئی کہ پتہ نہ لگا۔ اور وہ پتھر بعد میں پہاڑ بن کر تمام دنیا پر پھیل گیا۔"

یہ سُن کر تمام عورتوں پر حیرانی سی چھا گئی۔ اور اشتیاق آمیز نگاہیں ڈال کر وہ اپنی اپنی جگہ سے آگے سرک سرک کر بیٹھ گئیں، ملکہ نے جو یہ دیکھ کر کچھ ٹھٹک سی گئی تھی۔ اسی طرح سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور اے جوان بخت بادشاہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ بت میں سونے کے سر سے بابل کی موجودہ حکومت مراد ہے تیرا زمانہ سونے کی طرح چمکدار اور قیمتی زمانہ ہے۔ جو وقت کی فطرت کے تقاضے سے آخر ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حکومت قائم ہو گی جس کو چاندی سے تعبیر کیا ہے۔ پھر ایک پیتل جیسی سلطنت جگہ لے گی۔ بعد ازاں لوہے کی طرح مضبوط سلطنت دنیا میں قائم ہو گی جو ایک صورت پر نہ رہے گی۔ اور باوجود تقسیم ہو جانے کے اپنے استحکام کو نہ چھوڑے گی۔ پاؤں کے لوہے اور مٹی سے یہی مراد ہے کہ وہ سلطنت دو مختلف نسلوں میں بھی اپنی ہستی کو قائم رکھے گی۔ اور یہ جو پتھر پہاڑ بن کر تمام دنیا پر پھیل گیا۔ اس سے وہ حکومت مراد ہے۔ جو اس آخری حکومت کے وقت ہی بننے لگے گی۔ اور رفتہ رفتہ تمام دنیا پر چھا جائے گی یہی وہ حکومت ہے جو ہمیشہ رہیگی۔ اے بادشاہ! یہ بالکل سچا خواب ہے۔ اور خدا نے جو کچھ مستقبل میں ہونے والا ہے تجھے اس کی صاف تصویر دکھا دی ہے۔"

بخت نصر آنجہانی کو خواب اور اس کی صحیح تعبیر سن کر دانیال کی آسمانی طاقتوں کا یقین ہو گیا۔ اور اس بات کا بھی کہ واقعی خدا نے آئندہ پیش آنے والے حالات دکھا دئے ہیں۔ یہودی جوان کی ہر ممکن عزت کرتے ہوئے اس کو صوبہ بابل کا گورنر اور تمام دانایان حکومت کا سردار بنا دیا؛

"لڑکیو! ملکہ نے سب پر نظر ڈالتے ہوئے اور چوکی سے اٹھتے ہوئے کہا؛ سورج غروب ہو گیا۔ اور دعوت میں شریک ہونے والے آنے لگے چلو اب چلیں اور دیکھیں کہ محل سرا میں کیا انتظام ہوا ہے۔ باہر کی قندیلیں

ابھی تک روشن نہیں کی گئیں۔ ان کو روشن کر دو۔

شروع مہینے کی چاندنی دریائے فرات میں ڈوب کر معلق باغ کے قصر شاہی پر ہلکی ہلکی شعاعیں ڈال رہی ہے۔ اور اس کی فلک بوس بلندی کو بھینی بھینی روشنی کی چادر اوڑھا کر دلکش بنا رہی ہے۔ محل میں چاروں طرف گوشے گوشے میں چہل پہل ہے۔ کونہ کونہ آدمیوں سے پٹا ہوا ہے سترفٹ لمبے ہال میں جو قندیلوں کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ قرینے سے میزیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر قسم اور ہر طبقے کے مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ اکثر نے اپنے ہتھیار کھول کر ستونوں پر لٹکا دئے ہیں۔ بیفکری اور اطمینان سے بیٹھے شاہی باورچی خانے کے لذیذ کھانوں سے نمٹ کر شراب کے جام پر جام چڑھا رہے ہیں۔ نچلے حصے میں عام سپاہیوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ایک میز سب سے نمایاں عمارت کے صدر چبوترے پر الگ بچھی ہوئی ہے۔ جس پر بادشاہ اور بڑے بڑے سردار بیٹھے شراب ناب کی لذت لے رہے ہیں۔ جب ایک خم خالی ہو جاتا ہے تو نوکر چستی سے دوسرا لا رکھتے ہیں۔ سب کے سب دشمن کی پیش قدمیوں کو بھول کر اور اپنی کوششوں سے غافل ہو کر دلچسپ گفتگو میں مصروف ہیں۔ دوستوں میں بیٹھے چھپے راز اگل رہے ہیں۔ ڈھکی باتیں کھل رہی ہیں؛ کبھی کبھی دبے دبے ادھورے فقروں میں بادشاہ کی سلامتی کی دعائیں بلند ہو رہی ہیں۔

بادشاہ نے پاس ہی ایک اجنبی معزز مہمان پر مخمور نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "یہ پیالے اور برتن جو میری میز پر دورِ شراب میں استعمال ہو رہے ہیں۔ معلوم ہے کہاں کے ہیں؟"

اجنبی نے اپنا پیالہ میز پر رکھ کر جواب دیا۔ "دیوتا بادشاہ کی حفاظت کریں۔ یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ اتنا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان برتنوں کی ساخت اس شہر کے برتنوں سے کچھ الگ ہے۔

"ہاں یہ برتن میرے دادا یروشلم سے قیدیوں اور مال غنیمت کی دیگر چیزوں کے ساتھ لائے تھے۔ یہ وہی ہیں جو شاید داؤد اور سلیمان اپنے مذہبی تہواروں میں ہیکل کی رسوم میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اسرائیلی سردار بغاوت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے دادا جان یروشلم کو تباہ کر کے با اثر آدمیوں کو قید کر کے بابل میں لے آئے تھے۔ بادشاہ نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے کہا اور ایک اور پیالہ چڑھاتے ہوئے بلند آواز میں دیوتاؤں کی تعریف کا نعرہ لگایا۔ "بعل اور بلازو دیوتاؤں کے دیوتا کالدیا کے محافظ اور بابل کے نگہبان اسرائیلی خدا سے افضل"۔

یہ الفاظ ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ اچانک ایک غیر معمولی شعلہ سا چمک نے حاضرین کی آنکھیں چندھیا دیں۔ سب کی نگاہیں ایک ہی مرتبہ سامنے کی دیوار پر پڑیں۔ جہاں ایک غیبی ہاتھ نے بڑھ کر آتشیں حروف میں کچھ عبارت لکھ دی؛ ایسے رسم الخط اور ایسی زبان میں کہ جو حاضرین کے لئے معمہ تھی۔ انتہائی پریشانی اور اضطراب کے ساتھ سب نے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر بڑبڑاہٹ اور بھنبھناہٹ کے ساتھ ایک آواز بلند ہو کر رہ گئی۔ بادشاہ پر اس سے اتنی دہشت طاری ہوئی کہ جوڑ جوڑ کانپ گیا۔ گھٹنے ٹکرانے لگے۔ ہوش اڑ گئے۔ جو جہاں تھا۔ وہیں سسک کر رہ گیا۔ اتنی تاب نہ رہی کہ کسی پاس والے سے پوچھیں کہ یہ کیا راز ہے۔ یہ شور جب ملکہ شماترج نے سنا تو گھبرا کر اکیلی ہی دوڑی اور ہال میں داخل ہو کر حروف پر نظر ڈالتی ہوئی بادشاہ کے پاس پہنچی۔ اور کہا:۔

"اس سلطنت پر دیوتاؤں کا سایہ رہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اس شہر میں بوڑھا دانیال ایسا انسان ہے۔ جس کو دیوتاؤں کے مخفی اشاروں کے حل کرنے کا علم حاصل ہے۔ آسمانی قوتیں اس کے ساتھ ہیں۔ اس کو بلایا جائے۔ سارا بھید بتا دے گا۔"

فوراً آدمی دوڑائے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دانیال ایک جلالی شان کے ساتھ متانت اور بے پروائی سے قدم اٹھاتا اور ہال کے حاضرین پر اچھلتی ہوئی نگاہیں ڈالتا ہوا بادشاہ کی میز کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اور دیوار کے حروف پر نظر جما کر بادشاہ سے خطاب کیا۔

"اے بابل کے آخری تاجدار! اپنے دادا بخت نصر کے خواب کو یاد کر۔ آسمان و زمین کے مالک نے اپنی مرضی پوری کر دی ہیکل کے برتنوں کا غلط استعمال اس کے غضب کا باعث بنا اور آنے والی ساعت جلدی قریب ہو گئی۔ ان حروف کا مطلب یہ ہے کہ تیری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا کا یہ حصہ بھی خدا نے ایرانیوں کے سپرد کر دیا۔"

یہ فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ محل کے صحن میں تلواروں کی جھنکار اور قتل و غارت کا شور بلند ہوا۔ ایرانی سورما جو پانی کا زور نہر کے ذریعے سے توڑ چکے تھے۔ اور اس دعوت والی رات اہل بابل کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر دریا کے دروازوں سے شہر میں داخل

ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ سیدھے محل کے پھاٹک پر پہنچے اور خاصے کی فوجوں کو کاٹ کر اندر آ گئے۔ مخمور سپاہیوں نے گو ہاتھ پاؤں مارے اور سنبھل سنبھل کر لڑے مگر کچھ پیش نہ گئی۔ بادشاہ اور سارے مہمان تلواریں لے لے کر جھپٹے اور ایرانی سپاہیوں کو دباتے ہوئے محل کے باہر نکال لائے۔ لیکن تمام کوچہ و بازار۔ شہر کا چپہ چپہ غنیم سے بھرا ہوا تھا کہاں تک ہٹاتے۔ آخر انجام وہی ہوا جو ایسی غفلت کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یعنی ایک ایک کٹ کٹ کے گر پڑا اور بابل کی عظمت ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو گئی۔

سیفی نوگانوی

رباعی

یہ بزم گہِ کون و مکاں کس کی ہے؟
یہ رفعتِ ہفت آسماں کس کی ہے؟
ہے منتظر ستاروں کی نگاہ
یہ راہ گزرِ کہکشاں کس کی ہے؟

سید احمد اعجاز

دشمنانِ غزل سے خطاب

سرچشمۂ اجتہاد و ندرت ہے غزل — دنیائے معانی و لطافت ہے غزل
اے شاعرِ قوم شانِ مشرق کی قسم — اک طرۂ امتیازِ ملت ہے غزل

اسبابِ قبول و شان و شہرت ہے غزل — ہر بزمِ سخن میں تاجِ عزت ہے غزل
اے شاعرِ گم راہ تجھے کیا معلوم — اس ملک کے شاعر کی ریاست ہے غزل

گنجینۂ علم و عقل و حکمت ہے غزل — آئینۂ قلب و روح فطرت ہے غزل
اے بے خبر و غزل کو سمجھے کیا ہو — اک خاص عطائے دستِ قدرت ہے غزل

دریائے روانی و سلاست ہے غزل — دنیائے فصاحت و بلاغت ہے غزل
کہتے ہیں جہاں میں شعر گوئی جس کو — اس فنِ لطیف کی شریعت ہے غزل

مژدہ ہو کہ نغمۂ جوانی ہے غزل — سامانِ سرور و شادمانی ہے غزل
ہر شعر ہے جس کا ایک جاں بخش پیام — وہ درسِ حیاتِ جاودانی ہے غزل

اک سانس اگر غزل تری باقی ہے — سمجھیں کہ ادب کی زندگی باقی ہے
تو جانِ سخن ہے، بلکہ سرتاجِ سخن! — یعنی ترے دم سے شاعری باقی ہے

حرماں خیر آبادی

نوائے عجم

غم بدل سازگار افتادہ است — جانِ من در فشار افتادہ است
حسن را گو حجاب نہ پسندد — عشق بے اختیار افتادہ است
گریہ بر من کند سحابِ بہار — چہ قدر غمگسار افتادہ است
کس نمی بیند و نمی گیرد — دِل سرِ رہگذار افتادہ است
دِل بچیزے دگر نمی بندم — چشم بر روئے یار افتادہ است
حسن با ایں ہمہ حجاب و نقاب — چہ قدر آشکار افتادہ است
آں نگوں طالعم کہ در غمِ من — بخت ہم سوگوار افتادہ است

با ہوس پیشگاں بسازد حسن
عشق از اعتبار افتادہ است

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

حقیقتِ افسانہ

میں نے ایک افسانہ لکھا، میں سمجھتا تھا۔ کہ آپ اسے پڑھینگے، اور جب پڑھینگے تو لفظوں کو نہیں بلکہ ان حقیقتوں کو پڑھینگے۔ الفاظ جن کی محض نشانیاں ہوتی ہیں۔ اور جب اسے آپ اس طرح پڑھیں گے۔ تو میرے احساسات آپ کے احساسات بن جائیں گے۔ اور جب آپ کے احساسات وہی ہونگے، جو میرے تھے۔ تو میرے آنسوؤں کی جھلک آپ کی آنکھوں میں بھی نمودار ہو جائے گی۔ مگر حیف! کہ آپ نے ایک بے پروایانہ انداز سے اس کے ورق الٹے، نیم خواب آنکھوں سے دیکھا۔ اور ایک طرف ڈال دیا۔ آپ کو محسوس نہ ہوا۔ کہ وہ تو ایک حقیقی زندگی تھی۔

وہ تو جوانی اور محبت کا افسانہ تھا۔ روشن دنوں اور چاندنی راتوں کا رومان تھا؛ ایک کہانی تھی معصیت کی اور آنسوؤں کی، شانِ شباب کی اور سوگواریٔ حیات کی! وہ ایک ایسی کہانی تھی۔ جس کی ابتدا ہوئی شادی کے ایک گھر سے اور جو ختم ہوئی شمشان کی آگ پر!

اس افسانے میں ایک ہیروئن کا ذکر تھا۔ جس کی آنکھیں کنول کٹوریاں، اور جس کے ہات کنول کی ڈالیں تھے۔ مگر پریم کی ہر شام اس کے کنول کلی چہرے کو افسردہ بنا جاتی تھی۔

اس افسانے میں ایک ہیرو کا بیان بھی تھا۔ جو پریم مد کا متوالا تھا، جیون مد نے جیالا بنا دیا تھا۔

ایک دن جب وہ ہیرو زنانہ اسپتال میں ہیروئن کی خیریت دریافت کرنے پہنچتا ہے۔ تو سنتا ہے۔ کہ آنے میں دیر ہوئی ہیروئن کو تو زچاپے کے زہر نے ختم کر دیا۔

یہ متوالا اور جیالا۔ پریمی، سن ہو کر، بت بن کر رہ جاتا ہے، اس کے گرم ہاتوں میں وہ چیزیں۔ جو وہ اپنی پریم مورتی پر چڑھانے کو لایا تھا مسلتی جا رہی ہیں؛

اس افسانے میں ایک عالی خاندان مگر مقروض باپ کی نوجوان بیٹی کا بھی حال تھا۔ سنگار خانے میں آئینے کے سامنے اس کی آیا بال بناتے بناتے شہر کے "چرچے" بیان کرتی اور ہیروئن کی موت کی خبر سناتی ہے۔ عالی خاندان دوشیزہ اپنی آیا سے یہ دکھ درد کی کہانی سنتی ہے تو اس کے جواہر نگار ہات کانپنے لگتے ہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اس کا خون زیادہ سرخ ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں ایک بوڑھے دولتمند کا بھی قصہ تھا۔ جس کی دولت، پیشہ وری کی محنت اور کفایت شعاری کا نتیجہ تھی۔ اور اس نتیجے کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ اسے اعلےٰ خاندانوں میں شمار ہونے کا خبط ہو گیا تھا۔ وہ خیال میں اپنی دولت کا اندازہ کر رہا ہے۔ اور سوچ رہا ہے کہ بھتیجی کا مر جانا بہت ہی اچھا ہوا۔ اب اس کے اکلوتے بیٹے کی بدھی ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اپنی عقلمندی پر خوش بھی ہے۔ کہ اگر بیٹے کی ضد پوری کرتا۔ اور بیاہ مفلس بھتیجی سے کر دیتا۔ تو کماری شیلا دیوی کا بیاہ کسی دوسرے کے ساتھ ہو گیا ہوتا۔ اب وہ اپنے بیٹے کو بلوا کر اس کا قصور معاف کر دے گا؛ اور اس کے بڑے گھر ناتہ کرنے کے خواب کی تعبیر نکل سکے گی۔

اس کہانی میں ایک غریب وضعیف۔ ایک شکستہ دل اور حواس باختہ بیوہ بھی تھی۔ جو دنیا کو اس لئے ظالم اور بے رحم سمجھتی ہے کہ اس کی پدمنی بیٹی کو اس کے چچا نے سکھ نہ دیکھنے دیا۔ خفیہ شادی کا نتیجہ اس کی رسوائی اور لڑکی کی موت کی صورت میں نکلا۔ افلاس نے علاج نہ کرنے دیا؛ اور پھر کٹھور سنسار نے اس کی کنول کلی بیٹی کو آگ کے سپرد کر دیا۔

ان سب کے سوا، افسانے میں، ایک خدا کا بھی حوالہ تھا۔ جو دنیا کے ظالموں اور مظلومیوں کو دیکھتا ہے، بپتائیں توڑنے والوں اور بلائیں سہنے والوں کو دیکھتا ہے ——— اور دیکھتا رہتا ہے۔

آپ کو میں نے پورا افسانہ سنا دیا! مگر آپ نہ سمجھے کہ یہ افسانہ میرے اوراقِ دل پر، صفحۂ حیات و کائنات پر نقش ہے ——— مگر دل کی کتاب پڑھ سکنا آپ نے کیا انسان ہی نے کب سیکھا ہے!

ل۔ احمد

ڈل کی ملکہ

(۱)

جلوہ فرما ہر طرف ہے صبحِ خندانِ بہار — سبزہ۔ گل۔ جو۔ سرو۔ سب ہیں حاملِ شانِ بہار
باغ کے ہر برگ پر ہے ثبت فرمانِ بہار — موتیا۔ نرگس۔ بنفشہ۔ گلبدن جانِ بہار

کوہ۔ میداں۔ چشمہ۔ صحرا۔ بوستاں گلپوش ہے — حلقۂ حدِ نظر فردوس در آغوش ہے
باغباں۔ گلچین و بلبل، ہر کوئی خط کوش ہے — ہبکدے کا ہیلدہ زاہد کے زیبِ دوش ہے

کارفرما ہر کہیں دستِ چمن بندِ جہاں — برقِ گلشن سوز ہیں بھی ہے بہارِ گلستان
آبشار اس جا نوا پیرا پرندے نغمہ خواں — نغمہ زارِ زہرہ کی بزمِ طرب زا ہے جہان

عطر کی ندی ہے صحنِ باغ کی ہر جوئبار — کوثر و تسنیم کا منبع ہے اِک اِک چشمہ سار
سرمۂ نورِ نظر ہے باغ کا گرد و غبار — ہر کلی اک حور ہے ہر پھول ہے خلد بہار

ٹہنیں پھیلی ہوئی ہیں دہر خوشبو زار ہے — مشکبو خاکِ چمن ہے ذرّہ عنبر بار ہے
دلنشیں مانندِ مژگانِ بتاں ہر خار ہے — گلکدے کا گلکدہ تصویرِ روئے یار ہے

دِل رُبا، دلچسپ، دلکش، روح پرور ہے بہار — گل نگاریں، غنچہ رنگیں، خلد منظر ہے بہار
کیف ساماں۔ بے خودی زا وجد آور ہے بہار — عرش سے لے کر زمیں تک جلوہ گستر ہے بہار

ہر شعاع، زرفشاں عنوانِ صبحِ نور ہے — کوہ کی چوٹی چمک کر جلوہ گاہِ طور ہے
شب کی زلفوں میں سفیدی صورتِ کافور ہے — جلوۂ خورشید سے ساری فضا معمور ہے

مست ہوں کیفیتِ رنگِ بہاراں دیکھ کر — بیخودی طاری ہے حسنِ ڈل کو عریاں دیکھ کر

(۲)

دیکھنا وہ سامنے اک حور آئی گھاٹ پر — ناز سے رکھا سبو کچھ دور آئی گھاٹ پر
جلوے جاگے وہ سراپا نور آئی گھاٹ پر — بھیس میں عورت کے برقِ طور آئی گھاٹ پر

اس کے آتے ہی فضا میں جانِ نو آنے لگی — آتشیں کنولوں کو وہ کچھ اور بھڑکانے لگی
حسنِ عالمتاب کا اعجاز دکھلانے لگی — ہر چمکتی چیز کو وہ اور چمکانے لگی

ڈل گلابی ہو گیا ہے عکسِ روئے حور سے — تہ کی مٹی تک چمک اٹھی جبیں کے نور سے
پڑ نئے ہیں نوکِ مژہ سے قلب میں ناسور سے — آنکھ نے غارتگری سیکھی ہے برقِ طور سے

حورِ جنّت کو ملا ہو گا کہاں ایسا شباب — یہ ادائیں یہ پھبن یہ بانکپن اٹھتا شباب
چشمِ انساں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا شباب — ہوش کا دشمن ہے مثلِ جلوۂ سینا شباب

آہوئے رم خوردہ کی صورت نظر آوارہ ہے — آنکھ کی گردش مثالِ گردشِ سیارہ ہے
بن پیئے سرمست یہ لذّت کش نظارہ ہے — تخت اس کا ہر کنول ہر موج اک گہوارہ ہے

دینا ناتھ کاشمیری

پروفیسر براؤن کے کتبخانے میں

پروفیسر ای۔جی۔ براؤن آنجہانی نے ایران اور ایرانی علوم و فنون کے متعلق خاص طور پر اور عربی علوم وفنون کے متعلق عام طور پر جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا کچھ حال ہم لوگوں کو معلوم ہے ۔ اور وہ لوگ جو مشرقی علوم کا مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس مقام اور مرتبہ سے پورے طور پر واقف ہیں۔ جو پروفیسر آنجہانی کو اس بارے میں حاصل ہے مجھے ان چند سطور میں ان تاثرات کو پیش کرنا ہے۔ جو کئی سال ہوئے آنجہانی کے کتب خانے کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھنے سے میرے دل پر وارد ہوئے ۔اس وقت سے میں نے ارادہ کر رکھا تھا۔ کہ کبھی موقعہ ملا تو انہیں ادبی و علمی مذاق رکھنے والے دوستوں کی خدمت میں پیش کرونگا۔

میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک کیمبرج میں فلسفہ و نفسیات کا طالب علم تھا لیکن مجھے اپنی پڑھائی کے علاوہ کیمبرج کی مستشرقی تحاریک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس غرض سے میں نے ایک ٹرم (کیمبرج میں قریبًا دو ماہ کی میعادِ تعلیم کو ٹرم کہتے ہیں) ارادہ کیا کہ پروفیسر نکلسن کے لیکچروں میں جاؤں۔ پروفیسر نکلسن اس ٹرم میں اسلامی تصرف کی تاریخ پر لیکچر دے رہے تھے اور طلبہ کو اپنے گھر ہی پر بلاتے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو صرف ایک اور طالبعلم موجود تھا ۔ اور کچھ انتظار کے بعد بھی ہماری جماعت دو طلبہ سے آگے نہ بڑھی ان دوسرے صاحب سے پہلے لیکچر کے بعد ہی میرا تعارف ہوگیا۔ یہ صاحب مسٹر جے۔اے۔آربری تھے جو قدیم زبانوں کے اعلےٰ امتحان پاس کر چکے تھے۔ مشرقی زبانوں کا بھی ابتدائی امتحان پاس کر لیا تھا۔ اور اب ان کا آخری امتحان عربی کا باقی تھا۔ یہ صاحب مجھے نہایت شریف الطبع واقف کار اور محنتی معلوم ہوئے ان کے بعد کے حالات بتا رہے ہیں کہ کسی روز وہ بھی انگلستان کے مستشرقین کی صف اول میں شامل ہونگے۔ کیمبرج سے فارغ ہونے کے بعد وہ عربی ممالک کی سیر کرتے رہے ہیں۔ اور قاہرہ میں ایک طویل قیام کے دوران میں تصوف کی ایک مشہور کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ بیشمار عالمانہ حواشی کے ساتھ کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ مسٹر (غالبًا ڈاکٹر) آربری آجکل انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین ہیں۔ اسی عہدہ پر ایک زمانہ میں سر طامس آرنلڈ آنجہانی رہ چکے ہیں جنہوں نے کتاب اشاعت اسلام جو کہ اسلام کی تبلیغی مساعی کی مستند تاریخ ہے۔ اپنی علمی یادگار چھوڑی ہے۔ اسی عہدہ پر سر طامس آرنلڈ کے بعد مسٹر سی۔ اے۔ سیٹوری بھی رہ چکے ہیں جو اب سے سترہ اٹھارہ سال اُدھر علیگڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب کیمبرج ہی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر آربری اپنے علمی مشاغل کو دن بدن وسیع کر رہے ہیں۔ اور اپنے عہدہ کی وجہ سے جو مواقع ان کو مطالعہ اور تحقیق کے میسر ہیں اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آنے والے منصب اور مقام کی طیاری کر رہے ہیں، ڈاکٹر آربری سے قدرتًا میرے دوستانہ مراسم ہوگئے اور ان کے ساتھ کیمبرج کے مستشرقین کے متعلق خاص طور پر اور یورپ کے مستشرقین کے متعلق عام طور پر ذکر آنے لگا۔

میں اکثر اس بات پر زور دیتا کہ یورپین مستشرقین مشرقی مذاہب اور مشرقی علوم کا مطالعہ اس محنت اور مشقت سے کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کچھ عملی نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے اور اس مطالعہ کی مدد سے دنیا کے علمی حلقوں کو مشرقی تمدن کی بنیاد یعنی اُن مذاہب کے متعلق جن کے سایہ میں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ ان کی قیمت کا اندازہ کر سکیں اور ان کو علم کی بنا پر اچھا یا برا کہہ سکیں۔ میں یہ بھی کہا کرتا۔ کہ تبلیغی قسم کے مسیحی مستشرقین نے کم از کم یہ خدمت ضرور ادا کی ہے۔ کہ انہوں نے مشرقی مذاہب کے اصل مقصد کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے ۔ اور محض تاریخی یا ادبی موشگافیوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ میں یہ بھی کہا کرتا۔ کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے مستشرقین چونکہ یورپی مستشرقین سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی انہی امور کا مطالعہ اور انہی مسائل کی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ جن کو یورپی مستشرقین اہم سمجھتے ہیں اس وجہ سے گویا کل دنیا کے اہل علم اصحاب مشرقی علوم

میں ایسی باتوں کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ جن سے ان علوم کی بنیادیں یعنی وہ مذہبی تعلیمیں جو ان علوم کی اصل محرک تھیں، بالکل نظر انداز ہو جاتی ہیں اور ساری توجہ نسبتاً غیر ضروری اور غیر اہم باتوں میں بٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر آربری یہ جواب دیا کرتے کہ علم علم ہے۔ اور جس قدر بھی ایسی باتیں معلوم ہو جائیں۔ جو پہلے معلوم نہ تھیں۔ وہ قابل قدر ہیں۔ اس پر میں یہ کہتا کہ اگر علمی تجسس کا انداز بھی ڈھنگ کا ہو۔ تو ہمیں علمی فائدے کے علاوہ یہ عملی فائدہ بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ ہمیں مشرقی مذاہب کی حیثیت معلوم ہو سکے۔ میں اسلام کی مثال دیتا اور کہتا کہ دیکھو اس کی ادبی اور علمی تحقیق تو بے شک ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب تک مذہبی امور کی تحقیق بھی اس رنگ میں نہ ہو۔ اس وقت تک اسلامی تعلیم کے متعلق یورپ کے لوگ معلومات حاصل کرنے کے لئے الف لیلے جیسی کتابوں پر ہی گذارہ کیا کریں گے۔ ڈاکٹر آربری میرے نقطہ نظر سے اتفاق کا اظہار کرنے لگے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ بھی کہتے کہ کم از کم وہ خود اپنے مطالعہ اور تحقیق میں اس کا ضرور خیال رکھیں گے۔ کہ عربی اور اسلامی علوم کو اس طرح دیکھا جائے کہ اسلام کی مذہبی حیثیت دنیا پر واضح ہو سکے۔ مجھے خیال ہے۔ کہ انہیں اپنا یہ عزم بھولا نہیں بلکہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر آربری کے ساتھ میری ایک نہایت قیمتی یاد وابستہ ہے۔ ان سے پروفیسر ای۔ جی براؤن آنجہانی کا ذکر ہوتا رہتا۔ اور وہ چونکہ اُن کے شاگرد رہ چکے تھے ان کے حالات سے خوب واقف تھے۔ ان سے مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ پروفیسر براؤن اسلام اور اسلامیات میں محض ادبی یا علمی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے دل پر اسلامی (خصوصاً ایرانی) تمدن اور اسلامی آداب کا گہرا نقش تھا۔ اور وہ اپنے میل جول اپنی خاطر داری اور مہمان نوازی میں، ملاقاتیوں سے برتاؤ میں ان آداب کا واضح طور پر اظہار کرتے۔ میرے اشتیاق پر انہوں نے اس بات کا انتظام کیا۔ کہ ہم ایک روز جا کر پروفیسر براؤن کا گھر اور کتب خانہ دیکھیں اور اس طرح اس فقید المثال شخصیت کی یاد تازہ کریں، پروفیسر براؤن کو فوت ہوئے ابھی ایک دو برس ہوئے تھے۔ ان کے گھر کا نقشہ، سامان، زیبائش اور کتابوں کی ترتیب وغیرہ ابھی قریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ ان کی زندگی میں ہوا کرتی تھی۔ عمر کے آخری حصے میں پروفیسر براؤن بہت بیمار رہنے لگے تھے اور ان کی روز و شب کی زندگی کا انحصار دراصل ان کی وفا شعار اور نیک اہلیہ کی مخلصانہ تیمارداری پر تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ کہ ان کی اہلیہ ان سے پہلے ہی فوت ہو جائے۔ چنانچہ رفیقۂ حیات کے اچانک انتقال سے پروفیسر براؤن کے لئے زندگی دوبھر ہو گئی اور اس غم اور جدائی کا شکار ہو کر وہ بھی جلد فوت ہو گئے۔ ان کے دو لڑکے ابھی تعلیم پاتے تھے۔ بڑا یونیورسٹی میں پہنچ چکا تھا۔ اور چھوٹا ابھی سکول ہی میں تھا۔ اپنے وسیع اور نادر کتب خانے کے متعلق ان کی یہ وصیت تھی۔ کہ اگر ان کے لڑکے اسلامی و مشرقی علوم میں کوئی دلچسپی لیں تو یہ ان کے پاس رہنے دیا جائے۔ ورنہ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ بڑا لڑکا قانون کی طرف اور چھوٹا لڑکا سائنس کی طرف مائل ہو گیا اور اب پروفیسر براؤن کا کتب خانہ کیمبرج کے کتب خانے کا ایک بہت ہی شاندار اور قابل قدر حصہ ہے۔

ہم سہ پہر کے بعد پروفیسر براؤن کے گھر پہنچے جو کیمبرج شہر سے باہر خاصے فاصلے پر تھا۔ اور ولایت کے عام گھروں سے ذرا مختلف معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے گھروں کی بہ نسبت اس کا باغ بڑا، اور کمرے بھی کشادہ تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو فقط ایک خادمہ موجود تھی جو ہمارے انتظار میں تھی۔ پہلی بات جس کی طرف میری توجہ ہوئی محراب پر عمدہ عربی خط میں أَهْلًا وَسَهْلًا وَمَرْحَبًا کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ گھر میں ایسی صفائی تھی اور ہر چیز ایسے سلیقے سے رکھی تھی۔ کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ گھر کا مالک راہی عدم ہو چکا ہے۔ ہال، لینڈنگ، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور ان کے علاوہ اور کئی کمرے تھے جو سب کے سب نہایت صاف ستھرے رکھے گئے تھے۔ ہال میں ایک چھوٹی میز پر ملاقاتیوں کے کارڈ ایک چھوٹی ٹرے میں پڑے ہوئے تھے۔ خادمہ سے معلوم ہوا کہ یہ کارڈ پروفیسر براؤن کے آخری ملاقاتیوں کے کارڈ ہیں۔ جو اُسی طرح ہیں جس طرح پروفیسر موصوف کی زندگی کے آخری روز تھے۔ مجھے اب اس گھر کی کوئی تفصیل یاد نہیں۔ کمروں کی کیا ترتیب تھی۔ کتنے کمرے تھے۔ کس طرز کے تھے۔ بالکل یاد نہیں حافظے پر زور دیتا ہوں تو تصور کی آنکھوں کے سامنے قالینوں۔ کتابوں اور قسم قسم کے قطعات نستعلیق فارسی خط کے نمونوں، ایشیائی وضع کے قلمدانوں اور تصویروں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہاں اتنا یاد ہے۔ کہ اگرچہ ہم ان چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس میں اتنے محو ہوئے کہ کئی گھنٹے ان کے دیکھنے میں لگ گئے تھے۔ اور جب وقت زیادہ گذر جانے پر ہم وہاں سے واپس آنے لگے۔ تو محسوس ہوا کہ ہم کھڑے کھڑے اور پھرتے پھرتے تھک گئے ہیں کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ گھر پروفیسر براؤن کے ذخیرہ کے لئے بالکل ناکافی تھا۔ کیونکہ الماریوں کے علاوہ بڑے بڑے میز بھی کتابوں سے لدے ہوئے تھے۔ بلکہ کئی

چھوٹی چھوٹی میزیں اور صوفے بھی کتابوں سے بھرے پڑے تھے۔ اکثر کتابوں کے اندر کوئی نہ کوئی تحریر پروفیسر براؤن کی مل جاتی جس میں کتاب کے متعلق کچھ باتیں درج ہوتیں۔ ہماری نظر گو سطحی تھی۔ لیکن انسانی جذبات سے بھری ہوئی۔ ایک کتاب کو جو غالباً پروفیسر موصوف کی آخری تصنیف تھی۔ کھولا تو اس میں یہ الفاظ نظر آئے۔ "میری اہلیہ کو میرا آخری تحفہ" اس کے نیچے کچھ اور عبارت بھی تھی جو یاد نہیں رہی۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کچھ اور کتابیں ہم نے کھولیں تو ان میں بھی دلچسپ باتیں اختصار سے لکھی ہوئی نظر آئیں۔ ایک کتاب کے اندر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ یہ کتاب اور بعض اور کتابیں مجھے ملاقاتیوں کے ایک وفد نے فلاں تاریخ کو تحفۃً دیں۔ پھر ملاقاتیوں کے نام نمبروار لکھے ہیں۔ پھر لکھا ہے۔ کہ وہ اتنی دیر میرے یہاں ٹھہرے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اندر کے ورق پر اخبار ٹائمز لنڈن میں سے کچھ تراشے تھے۔ جنہیں بعض ایسے واقعات کے متعلق خبریں تھیں جو اسی وفد سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا ہر کتاب پروفیسر موصوف کی باقاعدگی، ضبط اور بیدار مغزی کی ایک دلیل تھی۔ ہم نے دیکھا کہ بعض اخباروں کے تراشے نہایت قرینے سے ترتیب دئے ہوئے ہیں۔ اس میں سے اکثر اسلامی ممالک کے متعلق خبروں اور مضامین پر مشتمل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ پروفیسر براؤن کو اسلامی ممالک سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔ جو لوگ ان کی تصنیفات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ پروفیسر موصوف نے اسلامی ممالک میں یورپ کی دست برد کو سخت ناپسند کیا ہے۔ اور ان کے ایک ایک کر کے یورپ کے ہاتھوں چلے جانے پر دلی تاسف کا اظہار کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ ان کو مسلمانوں سے دلچسپی نہ صرف علمی بنا پر تھی۔ بلکہ جذباتی بنا پر بھی تھی۔ اور آپ اسلامیات سے صرف ایک عالم اور نقاد کی حیثیت سے ہی شغف نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کو مسلمانوں کے ساتھ گہرا انس تھا۔

یورپ کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم میں بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ جب سے یورپ بیدار ہوا ہے۔ یعنی تین چار سو سال کے عرصے سے وہ تمام قسم کے علوم میں گہری دلچسپی لے رہا ہے اور مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں میں یورپ کی دلچسپی اس دلچسپی کی مانند ہے۔ جو ایک فارغ اور فائق مگر بیدار انسان اپنے دور و نزدیک کے ماحول میں لیتا ہے۔ لیکن یورپ کی اس دلچسپی کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ تجارتی اور سیاسی تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ان کے پاس مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کے ماہر موجود ہوں۔ اس غرض سے یورپ کی یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے وظائف اور رہائی مراعات اور اعلیٰ ملازمتوں کی تحریص سے اس بات کا انتظام کر رکھا ہے۔ کہ قابل نوجوان ان زبانوں کو سیکھتے رہیں۔ اس عملی لباس اور اقتصادی ضرورت کے ماتحت یورپ کے ممالک میں مشرقی علوم کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہو گئے اور ایک ادنیٰ غرض نے مناسب اعلیٰ نتیجہ پیدا کیا لیکن افسوس اس بات کا ہے۔ کہ آج مشرق خود اپنے علوم اور اپنی زبانوں کی تحقیق کے لئے مغرب کا دست نگر ہو رہا ہے!

قاضی محمد اسلم بی۔ اے (کنٹب)

رباعی

ہو تشنگیٔ گل و بہار کیا ساقی
لا بادہ کہ انتظار کیا ساقی
وہ چیز جو کر سکے تمنا ہے آخری نصیب
جب بادۂ جو کر تنگ عار کیا ساقی

سعید احمد اعجاز

شبنمِ افتادہ

کیا بات ہے کہ ہم سے پھری ہے نگہ تری
دل ڈھونڈتا ہے مرحمتِ بے پنہ تری

شام و سحر تلاش میں ہے رُوح بے قرار
یہ جاں لبوں پہ آن کے تکتی ہے رہ تری

سجدے تڑپ رہے ہیں جبینِ نیاز میں
اے وائے گر ملے نہ اُنہیں بارگہ تری

تیری امیدِ دید مجھے شمعِ راہ ہے
کرتا ہے جستجو مرا بختِ سیہ تری

اے آفتاب شبنمِ افتادہ پر چمک
لے جائے اوج پر اُسے پھر اک نگہ تری

ہیبت نے تیری مُہرِ لب کر دیا اُنہیں
کہتے نہیں ہیں بات کوئی مہر و مہ تری

وہ بے نیاز ایک زمانے سے کیوں نہ ہو
جس رُوح خوش نصیب سے ہے رسم و رہ تری

ح۔ب

آزادی

تڑپ رہا تھا فلک پر ستارۂ سحری
اسیرِ نورِ سحر بے قرارِ آزادی

نگاہِ شبنمِ آوارہ کی گئی اُس پر
گلوں پہ گرنے لگا آبشارِ آزادی

اچھل کے موج یہ بولی سکونِ ساحل سے
ہے جہدِ شوق پہ دارومدارِ آزادی

افق کے دام کو سورج نے توڑ کر پھینکا
ہر اک شعاع ہوئی نور بارِ آزادی

خبر ہوئی جو گلستاں میں اس مجاہد کی
کھٹک کے ٹوٹ گیا دل میں خارِ آزادی

چٹک کے غنچوں نے دامنِ شمیم کا کھینچا
ذرا قیام تو کر اے شکارِ آزادی!

پلٹ کے غنچوں سے بولی شمیم اے پیارو!
یہی نمود ہے سرِ بہارِ آزادی

صبا نے لی جو اک انگڑائی کیفِ حُسن کے ساتھ
چمن میں عام ہوا کاروبارِ آزادی

چہ برگ و بار چہ نجم و قمر چہ لالہ و گل!
تمام منظرِ فطرت شرارِ آزادی

ساغر نظامی

بھولا

(۱)

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹائی کو دور کرنے کے لئے مایا نے کنوئیں کے صاف پانی سے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جاکر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے خود ہی آجایا کرتا تھا۔ اور راکھی بندھوالیا کرتا تھا۔ راکھی بندھواکر وہ اپنی بیوہ بہن کو بھی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے۔ مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے۔ وہ اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میری اس بات کی تصدیق کردی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا۔

"بابا۔ پرسوں ماموں جی آئیں گے نا —"

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھالیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم ونازک تھا۔ اور اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سرخی۔ اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کردیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبراکر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تاہم میں نے زبردستی اُس کے سرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کردی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھولے — تیرے ماموں جی ..... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں!"

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "ماموں جی"

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑدیا۔ اور کھلکھلاکر ہنسنے لگی میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی۔ اور سماج اُسے اچھے کپڑے پہننے اور کسی خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتی تھی۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروا نہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ مگر مایا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے رُوح فرسا احکام کے تابع کردیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کرکے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری!

پھر اس نے اپنے لعل کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا۔

"بھولے — تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟"

"بھائی" بھولے نے جواب دیا۔

"اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں"

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہوسکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا۔ کہ اس کے ماموں جان اس کے باباجی کے بھی ماموں جی ہیں بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اُچک کر ماں کی گود میں جابیٹھا۔ اور اپنی ماں سے گیتا سنانے پر اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا۔ کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا۔ اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سُن کر وہ بہت خوش ہوتا اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دُور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے بوڑھا جسم۔ تس پر مصیبتوں کا مارا ہوا۔ جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن دُکھنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے اُمید کو یاس میں تبدیل کرکے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا

دراصل میں مر چکا تھا۔

رات کو تھکن کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی میں اونگھنے لگا۔ ذرا دیر میں مایا نے مجھے آواز دی کہ دودھ پی لو اپنی بہو کی سعادت مندی سے میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ میں نے اسے سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

"مجھ بوڑھے ۔۔۔ کی اتنی پروا نہ کیا کرو بیٹیا"

۔۔۔ بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا۔

"بابا جی آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟"

"نہیں بیٹیا ۔۔۔ میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج بہت تھک گیا ہوں ۔۔۔ کل دوپہر کو تمہیں سناؤں گا"

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا "میں تمہارا بھولا نہیں بابا ۔۔۔ میں اماں جی کا بھولا ہوں"۔

بھولا بھی جانتا تھا۔ کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ "بھولا بابا جی کا ہے۔ اور ماتا جی کا نہیں" مگر اس دن ہلوں کو اٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شائد میں اتنا نہ تھکتا۔ اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی مانند روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدہم سا ہونے لگا ۔۔۔ میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح اٹھتے ہی میرے دل میں خیال آیا۔ کہ بھولا سوچتا ہوگا۔ کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی۔ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو۔ کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتا۔ شائد یہی وجہ تھی۔ کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا۔ اور بولا۔

"میں نہیں آؤں گا ۔۔۔ تیرے پاس۔ بابا!"

"کیوں بھولے؟"

"بھولا بابا جی کا نہیں ۔۔۔ بھولا ماتا جی کا ہے"

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا۔ اور چند ہی لمحات میں بھولا بابا جی کا بن گیا۔ اور میری گود میں آ گیا۔ اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو پیٹنے لگا۔ مایا بھری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا۔ اور اسے کونے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹائی کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لئے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا بس بہن بھائی کے اس پیار کے جذبہ پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا۔ عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، خاوند بچے سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے۔ اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میری گالوں کی جھریوں پر رکھے۔ مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا۔

"بابا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا ۔۔۔؟"

"کس بات کا ۔۔۔ بیٹیا؟"

"تمہیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے"

"ہاں بیٹیا" ۔۔۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا۔ کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا بھولے کو اس بات کا علم تھا۔ کہ بابا جی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے۔ جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں۔ جس پر وہ بابا جی یا اماں جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنے کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا۔ کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا۔ کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ماپنے کے لئے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا۔ بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا۔ اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا۔ تاہم ایک خیال کے دل میں آنے پر میں نے کہا۔

"آخر مایا کا بیٹا ہی ہے نا ۔۔۔ ایشور اس کی عمر دراز کرے"

میں نے چوہدری سے کہا کہ تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو۔ اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں۔ تو اس کا چہرہ اس طرح مدہم پڑ گیا۔ جس طرح گزشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں ایک مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے

رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا مایا نے کہا۔

"باباجی۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے؟ —— خانقاہ والا کنواں کہیں دور تو بھاگا نہیں جاتا —— آپ کم سے کم آرام تو کرلیں"۔

"اُوں ہُوں" میں نے زیر لب کہا "پٹواری واپس ہوگیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا"۔

مایا خاموش ہوگئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم دار ہو گئیں۔ اس نے کہا "بابا میری کہانی —— میری کہانی ——"

"بھولے —— میرے بچے" میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا "دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"۔

"راستہ بھول جاتے ہیں" بھولے نے سوچتے ہوئے کہا "بابا تم جھوٹ بولتے ہو —— میں باباجی کا بھولا نہیں بنتا"۔

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا۔ اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لئے نکال سکتا تھا۔ میں بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کرلیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا۔

"اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے —— تو اس کے تم ذمہ وار ہو"۔

—— اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کیا کرتا تھا۔ جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہو جائے مگر میں نے اُس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔ نہ معلوم کیوں؟

(۲)

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رخ نہ کرے۔ میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا۔ تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اُسے بھگا رہا تھا۔ اور کہتا تھا۔

"چل ماموں جی کے دیس —— رے گھوڑے۔ ماموں جی کے دیس ماموں جی کے دیس۔ ہاں ہاں۔ ماموں جی کے دیس گھوڑے ....."

جونہی میں نے دھلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کردیا۔ اور بولا۔

"بابا —— آج ماموں جان آئیں گے نا —— ؟"

"پھر کیا ہوگا بھولے —— ؟" میں نے پوچھا۔

"ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلّو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر ککّی کے بھٹوں کا ڈھیر ہوگا نا بابا —— ہمارے یہاں تو ککّی ہوتی ہی نہیں —— بابا۔ اور تو اور..... ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی"۔

میں حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ کس خوبی سے "خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی"۔ کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ "جیتا رہے" میں نے دعا دیتے ہوئے کہا۔ "بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کریگا"۔

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا۔ تاکہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور سب سے پہل اپنی ماتاجی کو اور مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا توں توں دیوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجہ میں مایا نے کہا۔

"باباجی —— بھیا ابھی تک نہیں آئے"۔

"کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہونگے"۔

"یوں تو رکنے والے نہیں"۔

"ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو —— راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے"۔

"مگر راکھی؟"

"ہاں راکھی کی کہو —— ..... انہیں اب تک تو آجانا چاہیئے تھا"۔

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ "ماتاجی —— ماموں جی کیوں نہیں آئے؟"

مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا۔ "شائد صبح کو آجائیں —— تیرے ماموں جی —— میرے بھولے"

بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا "تمہارے ماموں جی تمہارے کیا ہوتے ہیں؟"

"جو تم منی کے ہو۔"

"بھائی!"

"تم جانو ——"

"اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ——"

"بھائی بھی نہیں ہے ——"

"نہیں ——"

—— اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا جب میں اپنے بستر پر لیٹا۔ تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آگیا۔ جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جلنے پر طیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس نے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا —— شاید نہ آئے۔" میں نے دل میں کہا۔ "اُسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آجانا چاہئیے" میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکایک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔

وہ دودھ کا کٹورا لئے کھڑی تھی۔

"میں نے کئی بار کہا ہے —— تم میرے لئے اتنی تکلیف نہ کیا کرو۔" میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو بھی دعا دے سکتا تھا کہ وہ سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ آہ! اگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو دو برس ہوئے لٹ گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

"بیٹی —— تمہیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا!"

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا منی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اٹھتے ہی اُس نے کہا۔

"بابا —— ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آجائیں گے —— بیٹا۔ سو جاؤ۔ وہ صبح سویرے آجائیں گے۔"

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لئے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بیتاب سی ہو گئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹہ تک سو لیتا پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لئے کہا۔ اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

"بتی جلتے رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو —— میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں ——" میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلہ پر جو لوگ آئے تھے۔ اُن میں ایسے آدمی بھی تھے۔ جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں۔ اور اسی لئے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ پسارا تو دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ مایا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونہ کونہ چھانا —— بھولا کہیں نہ تھا ——!!

(۳)

"مایا —— ہم لٹ گئے۔" میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا۔ یہ کوئی اسی سے پوچھے اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے۔ جتنے کہ اس نے اُس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں

ماررہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہوگئیں۔ اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے بھی زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پرواہ نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں۔ کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔ منتیں مانیں۔ کہ بھولا مل جائے۔ وہی اندھیرے گھر کا اجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اُڑتے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مایا بیہوش ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ چلے تھے۔ بتیسی کھنچی ہوئی۔ اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور عورتیں اس کی ناک بند کرکے ایک چمچہ سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کررہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ ایک لحہ کے لئے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں۔ تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے ایشور کو لرزتے ہوئے بُرا بھلا کہا۔ کہ ان دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! اگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا۔ کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا۔ کہ میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں۔ اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں۔ تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

"مایا بیٹی — دیکھو! میرا یوں خانہ خراب مت کرو — حوصلہ کرو۔ جن کے کبھی بچے اغوا کئے گئے ہیں۔ آخر مل بھی جاتے رہے ہیں۔ بازی گر بچوں کو مارنے کے لئے نہیں لے جاتے۔ پال کر بڑا کرکے کسی کام میں لانے کے لئے لے جاتے ہیں — بھولا مل جائے گا"

ماں کے لئے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چپ ہوگیا ہوں۔ کہ مجھے مایا کے مقابلہ میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر "نہیں" — میں نے کہا "آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیئے"

اس وقت آدھی رات اِدھر تھی۔ اور آدھی اُدھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثہ کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لئے جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا۔ اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو نہ پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اُسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا۔

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کربیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں الجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا — کہ باباجی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا۔ کہ تم راستہ بھول گئے ہوگے۔ اور بابا نے کہا تھا۔ کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا۔ تو تم ذمہ وار ہوگے نا —!!"

"راجندر سنگھ بیدی"




ہمیشہ نوجوان رہنے کے لئے
کروماٹیڈ
کا استعمال کریں
جو کہ
کئی ایک جڑی بوٹیوں
سونے۔ فولاد
کستوری
وغیرہ قیمتی
اشیاء کا
مرکب ہے
کروماٹیڈ کے استعمال سے اس شخص میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ کہ اپنے ایک بازو پر اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی کو خود ہی اٹھا سکتا ہے۔ اگر آپ بھی اسی قدر مضبوط اور تندرست ہونا چاہتے ہیں تو فوراً کروماٹیڈ کا استعمال شروع کریں۔
کروماٹیڈ کا استعمال قوت باہ کو بڑھاتا ہے۔ خون صالح پیدا کر کے رگوں اور پٹھوں کو مضبوط بناتا ہے۔ جنسی کمزوری اور دیگر خاص مردانہ امراض اور شکایات کے لئے نہایت مفید ہے۔ بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو نوجوان بنانے میں اکسیر ثابت ہوئی ہے آزمائش شرط ہے۔
قیمت فی شیشی تین روپے علاوہ محصول
ایجنٹس:۔ ڈاکٹر کرتار سنگھ اینڈ سنز متصل میو ہسپتال لاہور

نوائے فراق

غبارِ دل پریشاں دور کینے ہوتے رہتے ہیں
مصفا کیمیائے غم سے سینے ہوتے رہتے ہیں

سلامت سوزِ پنہاں کیوں دلوں کی فکر ہو تجھ کو
گداز اکثر یونہی یہ آبگینے ہوتے رہتے ہیں

دلوں کو رازِ ساحل بحرِ غم کا مل ہی جاتا ہے
یہاں غرقاب اکثر یہ سفینے ہوتے رہتے ہیں

کریں کس طرح ظاہر عشق کی گستاخیاں اُس پر
ادب کو سامنے جس کے پسینے ہوتے رہتے ہیں

جو سچ پوچھو تو آنا ہے نہ جانا ہے نہ ملنا ہے
یونہی ہر سال دن ہفتے مہینے ہوتے رہتے ہیں

کہیں کیا؟ گو وہاں پیدا نئے اظہارِ مطلب کے
سلیقے ہوتے رہتے ہیں قرینے ہوتے رہتے ہیں

ازل سے کھلتے جاتے ہیں نہاں خانے حقیقت کے
ابد تک عشق کو حاصل دفینے ہوتے رہتے ہیں

فراق اس تک پہنچنے کے مدارج سے میں واقف ہوں
مگر زیر و زبر پیہم یہ زینے ہوتے رہتے ہیں

فراق گورکھپوری

چنڈی داس

بنگال کا زندہ جاوید شاعر

کارزارِ حسن و عشق میں جب تک کرشن اور رادھا کی محبت کے ہنگامے برپا ہیں گے چنڈی داس کا نام اس وقت تک فراموش نہیں کیا جاسکتا!

چنڈی داس ـــــ بسولی دیوی کے مندر کا پجاری ایک دن دریا کے کنارے جارہا تھا کہ اس کی نگاہ رامی دھوبن پر پڑ گئی۔ وہ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا ـــــ اس دن کے بعد چنڈی داس صرف رامی کے لئے زندہ رہنے لگا۔ پگلا چنڈی رامی سے اس قدر محبت کرنے لگا کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول بیٹھا۔ یہ تھا روح اور محبت کا اتصال ـــــ

ـــــ! اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ وہ ایک برہمن ہے اور رامی ایک دھوبن ـــــ جس کی جگہ برہمن کے قدموں میں بھی نہ تھی وہ کھلم کھلا رامی کی محبت کے گیت گانے لگا۔ وہ راگ الاپے جاتا تھا اور کیف عشق میں سرشار ہو کر دنیا سے تمام تعلقات منقطع کئے جارہا تھا۔ رامی بڑی حسین تھی لیکن سوسائٹی میں وہ محض ایک اچھوت تھی۔

ایک دن گاؤں میں یہ ڈھنڈورا پٹ رہا تھا کہ چنڈی کو برہمن جاتی سے خارج کردیا گیا۔ کیونکہ اس نے ایک دھوبن سے محبت کا رشتہ جوڑا ہے۔ اس کے بھائی نکولا نے بڑی بڑی جدوجہد کی کہ چنڈی پھر اپنی برادری میں شامل کر لیا جائے پنچائیت نے فیصلہ کیا کہ چنڈی کو اس صورت میں واپس لیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ رامی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ نکولا کے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بھائی برادری سے خارج ہو اور در در ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ اس نے ہزار طرح سے چنڈی کو مجبور کیا، چنڈی بھی آخر لاچار ہو گیا۔ جب رامی کو یہ پتہ چلا کہ لوگ اس کا چنڈی اس سے چھین رہے ہیں۔ تو وہ مندر کی طرف بھاگی ہوئی گئی ـــــ چنڈی نے دور سے ہی اسے آتے دیکھا۔ اس وقت پرائشچت کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ جو وہ دیوی کے چرنوں پر بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا مگر رامی کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ اور دیوی کی طرف بڑھنے کی بجائے وہ رامی کی طرف بڑھنے لگا۔ اور وہ پھول اس کے پاؤں میں ڈال دئے۔ سارے پجاری دانت پیستے ہوئے باہر نکل گئے۔ اب چنڈی داس کے لئے برہمنوں کے طبقہ میں کوئی جگہ نہ تھی۔ لوگ اسے پگلا چنڈی کہہ کر پکارنے لگے۔ چنڈی رامی کی پرستش کرنے لگا۔ وہ مذہب کے تمام فرائض بھول گیا۔ اس نے رامی کی محبت میں گیت گائے اور اس دھوبن لڑکی کو زندہ جاوید کردیا۔ دراصل رامی کی محبت اس کی روح کی غذا تھی۔ وہ رامی کو یاد کر کے گہرے سپنوں میں کھو جاتا ـــــ ساری کائنات میں وہ صرف رامی کا وجود دیکھنے لگا اور باقی موجودات کی طرف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رامی کی محبت میں اس نے جو گیت لکھے وہ سراسر عقیدت اور عبودیت سے لبریز ہیں۔ ایک جگہ سرشار ہو کر گاتا ہے:۔

"اے رامی! میں نے تمہارے چرنوں میں پناہ لی ہے۔
جب تک تمہیں نہ دیکھوں میری روح بیقرار رہتی ہے۔
جب تک تم مجھے نہ ملی تھیں میں ایک یتیم اور بیکس بچے کی طرح تھا۔
تم دیوی ہو رامی!
میرے گلے میں پھولوں کا ہار ـــــ!
میری ساری کائنات تمہیں تو ہو ـــــ!
تم بن تو جگت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔
میرے من کی آشاؤں کی انتہا تمہیں تو ہو۔!

میں تمہارے سندر روپ اور کامنی مورت کو کیونکر بھولوں!

اور اب تو میرے ہردے میں کوئی آشا باقی نہیں رہی۔"

بعض وقائع نگاروں کی رائے میں چنڈی داس کا عرصہ حیات ۱۴۱۷ء سے ۱۴۷۷ء کے درمیان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے پچپن یا ساٹھ برس کی عمر پائی لیکن اس کے عہد کے متعلق اکثر مؤرخین میں اختلاف ہے۔ مشہور مشرق ماتھر نہ لکھتا ہے۔

"چنڈی داس ذات کا برہمن تھا۔ وہ موضع چھتانا ضلع بیربھوم میں پیدا ہوا۔ ماں باپ اسے بہت چھوٹا چھوڑ کر مر گئے۔ اس لئے اوائل عمر میں ہی وہ اپنا دھن چھوڑ کر ایک گاؤں نانورا (بولپور) میں چلا گیا۔ وہاں وہ برہمنوں کے زیر سایہ پرورش پانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہاں وہ بسولی دیوی کے مندر کا پجاری ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس گاؤں میں اس کے مکان پر ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔

بنگال کے سوانح نگاروں میں بنگال کے اولین شاعر کے بارے میں دو گروہ ہیں۔ جب چنڈی داس نے راگی کی محبت کے نغموں سے فضائے بنگال کو معمور کیا۔ تو اس سے پہلے متھل کا رہنے والا شاعر ودیاپتی اپنے رادھا کے گیتوں کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک گروہ ودیاپتی کو بنگال کی شاعری کا باوا آدم تصور کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متھل اس وقت صوبہ بنگال میں ہی شامل تھا۔ لیکن بہار کے زیادہ نزدیک ہے نیز اس نے متھالی زبان میں جو ایک مقامی بولی تھی۔ اپنے گیت لکھے ہیں۔ اور چنڈی داس نے خالص بنگالی زبان میں اپنی جودت طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لئے چنڈی ہی آدم الشعرائے بنگال تسلیم کیا جائیگا۔

افسوس چنڈی کے حالات زندگی مفصل نہیں مل سکتے۔ اس نے جو کچھ اپنی شاعری کے ذریعے باقی چھوڑا ہے۔ اسی سے اسکے سوانح حیات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ چنڈی داس کی نظموں کا جو مجموعہ پداوی میں ملتا ہے قابل استناد ہے ایک اور مجموعہ "سری کرشن کیرتن" حال ہی میں شائع ہوا ہے لیکن اسکے بعض گیت اس قدر بھونڈے ہیں کہ بلاشبہ اس مجموعے کو نقلی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں چنڈی کا رنگ تغزل مطلق موجود نہیں ممکن ہے یہ گیت کسی اور شخص نے لکھے ہوں اور بعد از اں چنڈی کے نام سے مشہور ہو گئے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اسکا انداز بیان بالکل سادہ تھا اور آسانی سے نقل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن سادگی کے ساتھ جذبات کی فراوانی اور عقیدتمندی کا جوش بھی تو ضروری ہے نقل کرنے والے ان دونوں چیزوں سے قاصر تھے اس لئے ان کی نقالی کا پردہ فاش ہو کر رہ جاتا ہے۔

ابتدا میں چنڈی داس شکتا شاعر تھا۔ اس دور میں مذہب اور ادب ایک ہی دھارے میں بہ رہے تھے۔ اس لئے مذہبی تصورات کے ماتحت شاعروں کے بھی دو گروہ ہو گئے تھے، شو دیوتا کے پجاری اپنے آپ کو شکتا کہنے لگے۔ اور وشنو کے پجاری وشنوی کہلاتے تھے۔ شو دیوتا کے پجاریوں کو "تنترک" بھی کہا جاتا تھا۔ اور وہ درگا یا کالی کی پرستش بھی کرتے تھے۔ چنڈی داس ابتدا میں "تنترک" تھا اور اس کے اصول زندگی بالکل آزادانہ تھے۔ روایت کے مطابق "تنترک" کو ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے تھا۔ "تنترک" گروہ کا عقیدہ ہے۔ کہ عشرت پرستی کو کسی طرح بھی گناہ تصور نہیں کیا جا سکتا وہ لوگ "روحانی شراب" کی مدح سرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور دنیا اور اس کے بنائے ہوئے مقررہ اصول سے بہت دور نکل جانا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حواس کو پختگی دینے کے لئے تمام جسمانی عشرتوں کا تجربہ ضروری ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی ہر ایک چیز نمائشی اور سطحی ہے اسکے معاشرتی اور اخلاقی اصول بھی سطحی ہیں۔ لیکن یہ بے ضابطگیاں ایسی نہ تھیں جو سراسر ہوس کاری اور گناہ کی فریفتگی کی تعلیم دیتیں۔ ان کا اصول تھا کہ دل کی بے لوث محبت قابل ستائش تقدس اور شکتی کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جب تک تمہارے سینے میں بے ریا محبت کا دریا موجزن نہ ہو دنیا کی ہر ایک چیز تمہارے لئے بیکار ہے۔

جوانی میں چنڈی داس شکتا تھا اور کالی کی پرستش کرتا تھا وہ وشنو کس طرح ہوا؟ اس کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے، ایک دفعہ چنڈی داس دریا پر نہانے گیا۔ وہاں اس نے ایک نہایت خوبصورت پھول دیکھا جو پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔ چنڈی اس پھول کی خوبصورتی دیکھکر بیخود ہو گیا۔ اور جوش عقیدت میں اسے لیکر دیوی کے قدموں میں ڈالنے کیلئے مندر کی طرف گیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت دیوی اپنے روپ میں ظاہر ہوئی اور چنڈی سے کہا "یہ پھول مجھے دیدو تاکہ اسے اپنے سر پر رکھوں"۔

پجاری حیران رہ گیا کہ اس پھول میں کیا شکتی تھی۔ جو دیوی کو جسم میں ظاہر ہونے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اسے اپنے چرنوں کی بجائے اپنے سر پر رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دیوی نے چنڈی کے تیور پہچانے۔

"دیو امنے! اس پھول سے میرے سوامی کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس لئے میں اسے اپنے چرنوں میں نہیں رکھنا چاہتی"۔

شاعر نے کہا "آپ کا سوامی کون ہے؟"

جواب ملا۔ "کرشن"!

اس دن سے چنڈی کرشن کی پوجا کرنے لگا۔ قدیم ہند وروایات کے مطابق کرشن وشنو کا آٹھواں اوتار ہے اس لئے اس کے پجاری وشنو کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم ادبیات کو تشکیل دینے میں وشنو شاعروں کا نمایاں حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور قصہ بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ چنڈی داس حقے کا دلدادہ تھا۔ ایک رات اسے حقے کے لئے اپنے گاؤں میں آگ نہ ملی چنانچہ وہ چلم پکڑے دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑا جو قریب ہی تھا۔ راستے میں اسے ایک روشنی نظر آئی وہ اس کی طرف بھاگا لیکن وہ روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ محو حیرت کھڑا تھا۔ کہ بھگوتی (کالی) اس کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئی اور کہنے لگی "کرشن اور رادھا کے گیت ہمیشہ گاتے رہنا"۔

اس دن سے چنڈی کرشن کی پوجا کرنے لگا۔ اور رادھا کی محبت کے نغمے دنیا کو سناتا رہا۔ ہند وروایات کے مطابق کرشن وشنو کا آٹھواں اوتار ہے اسی لئے اس کے پجاری وشنو کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم ادبیات کی تشکیل میں وشنو شاعروں کا نمایاں حصہ ہے۔ دراصل رادھا اور کرشن کی محبت دنیا کا ایک عظیم ترین واقعہ ہے۔ وشنو شاعروں نے اس واقعہ کی سرشار کیفیتوں کو اپنے رنگین تخیل میں اس طرح باندھا ہے۔ کہ کسی اور شاعر کو دم مارنے کی جرأت نہیں رہتی۔ تمام وشنو شاعروں کا مطمع نظر یہی رہا ہے۔ کہ وہ کرشن اور رادھا کے گیت گا کر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیں۔ وشنو شعراء کے سوا کسی کو بھی جرأت نہیں ہوئی۔ کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ اور اگر ہوئی بھی تو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وشنو شاعر اپنے خلوص اور جذبۂ ایمانی کو پیش نظر رکھ کر کرشن اور رادھا کی محبت کے گیت لکھتا ہے۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں۔ وہاں آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ شاعری کی روح کن بلندیوں تک پرواز کرے گی۔

وشنو شعراء کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ تاریخی حیثیت سے جے دیو مصنف "گیتا گوبند" سے لیکر رابندر ناتھ ٹیگور تک ایک مضبوط کڑی ہے۔ جے دیو سنسکرت کا شاعر تھا۔ اس لڑی میں چنڈی داس، ودیاپتی، میرابائی، گوبند داس جیا اور چیتن کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اور چنڈی داس یقیناً ان میں بلند رتبہ رکھتا ہے۔

وشنو شعراء میں بھی عورت اور مرد کا اختلاط ایک حد تک جائز ہے بلکہ عبادت کا ایک جزو تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسے سادھن کہتے ہیں۔ سادھن کا فلسفہ بیان کرنے کے لئے ایک الگ مقالہ درکار ہے۔ یہاں پر مختصراً اتنا ہی لکھ دینا کافی ہوگا۔ کہ عشق حقیقی کی کٹھن منزل طے کرنے کے لئے مجازی محبت کی حدود میں سے ہو کر گزرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور عشق مجازی کے لئے عورت کے سوا اور کوئی رفیق نہیں ہو سکتا۔ ان کے اعتقاد کے مطابق اس رابطے کے لئے اس عورت سے شادی کرنا ضروری ہے۔

چنڈی داس کو ہر صورت سادھن کرنا تھا۔ اور اس نے رامی کو منتخب کیا۔ ہر ایک وشنو شاعر سادھن کرتا ہے۔ لیکن ہمیشہ اونچی جاتی کی عورت کو اپنا منتہائے نگاہ بناتا ہے۔ چنڈی کو اس لئے مورد الزام ٹھیرایا گیا۔ کہ اس نے ایک نیچ ذات کی لڑکی کو اپنی محبوبہ بنایا لیکن چنڈی کو کیا معلوم تھا کہ یہ رسمی تعلق اس کی زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ اور اسی دھوبن کی محبت میں وہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوگا۔ اس نے رامی کی محبت میں سرشار ہو کر اپنے نغموں سے فضائے جہان کو معمور کر دیا۔

دراصل چنڈی داس نے رامی سے صحیح معنوں میں محبت کی۔ اور اسے یہ احساس ہو گیا۔ کہ اس دھوبن نے اس کے تخیل کی بلند ترین پرواز کے لئے تمام راستے صاف کر دئے ہیں۔ چنڈی نے رامی سے محبت کی لیکن پستی میں گرنے سے وہ بچا رہا۔ تقدس ہمیشہ تقدس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کی محبت اور اختلاط سراپا شخصی اور تخلیقی تھا۔ محبت کی انتہا یہی ہے۔ کہ عاشق و معشوق کا وجود ایک ہو جائے۔

چنڈی داس کی رائے یہ ہے۔ کہ عورت محبت کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے لیکن بظاہر وہ بے اعتنائی سے پیش آتی ہے۔ اس کی بے اعتنائی دراصل ایک حجاب ہے۔ اور محبت کا راز پردے میں ہی رہتا ہے۔ اور عورت کے جذبات بھی لطیف سی پوشیدگی میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ عورت خواہشات کے سامنے اپنا سر نہ جھکا دے۔ وہ گناہ کے سمندر میں اپنے آپ کو آزادانہ پھینک کر بھی بے لوث اور پیاسی ہی کنارے پر پہنچے گی۔ چنڈی ایک گیت میں لکھتا ہے۔

"وہ شخص جو سچے پریم کی تلاش میں سرگرداں ہے اژدہا کے منہ میں بھی ناچ سکتا ہے۔

—— اور ہاتھی کو مکڑی کے جالے سے باندھ سکتا ہے۔!!"

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"عورت کی محبت کے ذریعے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے جسم کو کانٹے کی طرح خشک کر دو۔ کیونکہ وہ ذات جو ساری کائنات میں سمائی ہوئی ہے اسی شخص کو مل سکتی ہے۔ جو محبت کے بھیدوں سے واقف ہو —!"

اس سے یہ معلوم ہو سکیگا۔ کہ چنڈی داس کا نظریہ محبت کیا تھا۔ اور رامی سے محبت کر کے وہ کس بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ "دونو طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی" کا مسئلہ چنڈی کے نزدیک روحانی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جو عورت

ایک نااہل مرد سے محبت کرتی ہے۔ ایسی ہے جیسے ایک خوشنما پھول میں بہت سے کانٹے چھپے ہوئے ہوں۔ اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور وہ مرد جو کم ظرف عورت کی محبت میں گرفتار ہوا۔ بیقراری اور بے تابی سے زندگی بسر کرتا ہوا مایوسی کے گہرے غار میں گر جائے گا۔"

حقیقت یہ ہے۔ کہ رامی کی محبت نے چنڈی کو بلند پروازی پر مجبور کر دیا ویشنو شاعر ہونے کی حیثیت سے اسے یوں بھی کرشن اور رادھا کے گیت لکھنے ہی تھے۔ لیکن جو شگفتگی رامی سے تعلق کے باعث ان میں پیدا ہوئی وہ خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ مسٹر فریزر کا خیال ہے۔ کہ رادھا کو دراصل چنڈی نے رامی ہی تصور کیا ہے۔ اور بعض لوگوں کی رائے ہے کہ چنڈی نے اپنے سارے گیت روح اور جسم کے بندھن پر مبنی کئے ہیں۔ رادھا سے مراد روح اور کرشن سے جسم، برندابن میدان تخیل اور سکھیاں دنیاوی روحیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ کرشن کو رادھا اور سکھیوں سے کوئی جسمانی اور مادی تعلق نہ تھا۔ رادھا اور کرشن کے گیتوں میں بعض اوقات چنڈی نیم عریاں ہو جاتا ہے۔ ویشنو شاعروں کا خیال ہے کہ روحانی بلندیوں کے منازل طے کرتے وقت عورت کی رفاقت ازبس ضروری ہے۔ خواہ وہ صرف ذہن سے ہی کیوں نہ تعلق رکھے! بہر صورت چنڈی کے متعلق تو اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا۔ کہ اس نے اپنے لئے ایک تمثیلی دنیا قائم کر لی تھی۔ خواہ اسے رامی کہو یا رادھا۔ عالم تمثیل اس کا ایک ہی تھا:

رادھا کے گیت

چنڈی داس صحیح معنوں میں مصور الفاظ تھا۔ وہ اپنی سحر کاری سے حسن و عشق کے دلآویز نظارے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب اس نے رادھا کرشن کی محبت کا موضوع اپنے سامنے رکھا تو اس پر غیر فانی شہرت کے دروازے کھل گئے۔ جذبات کی روانی میں لطافت اور شیرینی کے دریا بہاتا چلا جاتا ہے۔ اور اس بہتے ہوئے دھارے میں خود بھی سرشار ہو کر بہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی بہائے جاتا ہے۔ تصنع اور تکلفات سے بہت دور وہ عشق و حسن کی وادی میں کھیلتا نظر آتا ہے۔ اور نہایت سادگی سے رادھا کی زبان سے اس طرح کہتا ہے:۔

"سکھی! کالے کا نام کس نے لیا؟
اس کا نام تو مجھ سے میرا ہردے چھین لیتا ہے۔
میرے روح میں آگ لگا دیتا ہے ——— !
کس سے پوچھوں کہ اس کے نام میں اتنا رس کیوں ہے؟
میرے سینے سے شعلے اُٹھ رہے ہیں۔
سکھی! کیا وہ لوٹ کر نہ آتے گا؟"

چنڈی داس کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سادگی اور جذبات کی بے ساختہ تصویر کشی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور اپنے تخیل کی سادہ لیکن بلند پرواز سے پڑھنے والے کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے۔ ودیاپتی اور چنڈی داس میں ایک امتیازی حد قائم کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ دونوں نے کرشن اور رادھا کی محبت کے گیت گائے ہیں۔ لیکن ودیاپتی چنڈی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ ودیاپتی الفاظ کے مصنوعی لباس کو بہت پسند کرتا ہے۔ اور اس کی تشبیہیں اور استعارے تصنع کا رنگ لئے ہوتے ہیں۔ لیکن چنڈی داس اپنی روح کی تسکین پُر خلوص محبت کی سادہ پروازمیں پاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ وہ ہم آہنگ ہو کر سننے والے پر وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

رادھا کو مراری سے عشق ہو گیا ہے اس کی کیفیت چنڈی نہایت سوز بھرے الفاظ میں اس طرح کھینچتا ہے:۔

"سکھی! رادھا کے سینے میں یہ درد کیسا ہے۔؟
وہ ہر وقت الگ تھلگ بیٹھی رہتی ہے!
کسی کی باتوں کو دھیان میں نہیں لاتی۔
اسے کوئی سوچ لگی ہوئی ہے۔!
آنکھیں کالی کالی بدلیوں پر جمی ہوئی ہیں۔
اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے
گیروے کپڑے پہن کر وہ جوگن بن گئی ہے۔!
وہ اپنی زلفوں کو پھیلا کر دیکھتی ہے۔
ان میں پھول آویزاں ہیں۔
پھر وہ مسکرا کر کالی کالی بدلیوں کی طرف دیکھتی ہے۔
پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہے!
وہ موروں اور مورنیوں کی گردنوں کو غور سے دیکھتی ہے۔
چنڈی تو یہی کہیگا کہ رادھا کرشن کے پریم میں جل رہی ہے!"

اس گیت میں خلوص اور سادگی کے بہترین طریقے پر تصویر کشی کی گئی ہے اور فرقت کی گھڑیوں کا بیان اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ایک سوز بھرا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ رادھا اپنے ماحول کو بھی بھول چکی ہے، وہ دنیا سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اور ہر دم اسے کرشن کے پریم کی سوچ لگی رہتی ہے۔ اور اپنے پیتم کو کالی کالی بدلیوں اپنی زلفوں اور مور کی گردن میں ڈھونڈتی ہے۔

چنڈی عاشق اور معشوق میں۔ ایک انتہا درجے کی یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ترجمانی اور علامات کی حد سے بھی آگے گزر جاتا ہے۔ اس نے

اپنے ذہن کی تمام قوتوں کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ اس کے گیت پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوتاؤں کو کھینچ کر زمین کی طرف لا رہا ہے —— اس زمین کی طرف جس کو اس نے اپنے شعروں سے حسن کی ایک رنگین وادی بنا دیا ہے۔ —— اور مذہب کی سخت گیری کے تمام نشانات مٹ جاتے ہیں اور چنڈی داس اپنی شاعری کے آدرش میں اپنے آپ کو فراموش کر کے اپنی آرزوؤں کی انتہا پالیتا ہے۔

مندرجہ ذیل گیت[1] سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ چنڈی داس کا نظریۂ محبت کس قدر بے لوث اور اس کا اظہار بیان کس قدر کیف انگیز ہے:

سنو سکھی! میرے جیون کو اس کی چاہ نے ڈبو دیا!
بُرا دن تھا کہ جب پہلے پہل کانہن کو دیکھا تھا،
کہ اس دن سے مرے جی میں نہیں کچھ بھی رہا باقی
محبت آگ ہے میں کر رہی ہوں آگ کا پیچھا
ٹھہرتی ہوں ٹھہرتے ہی میں چل دیتی ہوں دوبارہ
وہ کوئی اور ہوگی آگ جو پانی سے بجھ جائے
مگر یہ آگ آنسوؤں سے سُلگی ہے نہیں بجھتی۔
بجھاؤ ہاں بجھا دیکھو تمہارے بس میں ہو جتنا
مگر یہ آگ دُگنے زور سے پھر جل ہی اٹھے گی —!
دکھائی دے رہے ہیں دور بن کی آگ کے شعلے
مگر ایسے نہیں ہیں میرے من کی آگ کے شعلے
ذرا دیکھو چھو اس جسم کو تم اپنے ہاتھوں سے
سمجھ میں آ ہی جائیگا یہ بیرن آگ ہے کیسی!
میرے دل میں مری سجنی! برہ کی آگ جلتی ہے۔
یہ اگنی ہے جدائی کی، جدائی شام سندر ہے۔
میرے دل کو مری سجنی! اسی اگنی نے گھیرا ہے —!
یہ اک پل بھی نہیں بجھتی — یہ اگنی بجھ نہیں سکتی —!
میں ہر دم شام سے دوری پہ آنسو ہی بہاتی ہوں
مرے دل میں ابھی تک شیام کی آشا کا ڈیرا ہے
مجھے ہر سانس گویا تیر ہے: ہاں تیر سا زہری
مگر سندر! یہ سن لے بات" چنڈی داس کہتا ہے۔
"خوشی کے ساتھ گر تو جھیلتی جائیگی دکھ سارا
گھٹائیں دور ہو جائیں گی چھا جائیگا اجیارا —!

چنڈی داس کی شاعری سراپا داستان حسن وعشق ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ وہ اسی رنگین وادی میں چل کر جوان ہوا ہے۔ اسے ہی کیفیت اور نغمے گاتا ہوا فنا ہو جائے گا۔ رادھا کی ذات سے جو وابستگی اسے پیدا ہو گئی ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور رادھا کی کیفیتیں جس رنگ میں اس نے بیان کی ہیں وہ کسی اور ویشنو شاعر کے ہاں نہیں مل سکتیں۔ ایک جگہ رادھا پریم کے دکھ میں مبتلا ہے اور سکھی سے کہہ رہی ہے۔

"سکھی! رادھا کے سینے میں اک ہوک اٹھی!
میں گھر بار چھوڑ کر اس طرف جاؤں گی ——
—— اس طرف جاؤں گی جہاں پریت کوئی نہ جانتا ہو!
سکھی! یہ کس نے کہا کہ پریم میں رس ہے!
میں نے پریم کیا۔
میرا پریم ہنستا رہا ——!
پھر میرے جیون کو ایسا روگ لگا
جو مٹائے نہ مٹ سکا۔
آہ! اک دکھ کی ماری یونہی آہیں بھرتی رہے!
آگ اور شعلوں میں جل کر وہ کیوں بھسم ہو؟
اسے کوئی آرام کی موت مرنے دو!"

محبت کے تخلیقی مناظر کے بیان میں کوئی ویشنو شاعر چنڈی داس کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔ جب اس نے آدرش رادھا کو قرار دیا تو اس کے بعد اس نے محبت کے تمام پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ رامی اس کی محبت کی ابتدا تھی اور رادھا انتہا۔ دراصل دونو کو ابتدا اور انتہا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ بعد میں اس نے رامی کی جگہ رادھا ایک نام رکھ لیا تھا اور محبت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبۂ ایمانی کو بھی تسکین ہوتی جاتی تھی؛

محبت کے ابتدائی اثرات پھر برستی ہوئی یاس انگیز تاریکی اور اس دوران میں کبھی کبھی امید کی تابناکی۔ اور فرقت کی روح فرسا گھڑیوں کی کیفیات جس مؤثر زبان میں اس نے بیان کی ہیں وہ ہر ایک شاعر کا حصہ نہیں۔

ابتدا میں کرشن اور رادھا کی محبت کا قصہ وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔ کرشن نے جو کچھ دیکھا، وہ سبل سے کہہ رہا ہے۔

"سبل! کل سپید گائے گم ہو گئی تو میں اس کی تلاش میں محلات کی طرف جا نکلا۔
وہاں میں نے رادھا کو دیکھا۔
رادھا ایک نرم و نازک سائے کی طرح میرے سامنے سے گزر گئی،

---

[1] یہ گیت میرے عزیز دوست "میرا جی" نے نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

وہ سنہری گاگر اپنے کولہے پر لٹکائے ہوئے تھی۔
ہزاروں منڈرماں اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔
ایک ناچتا ہوا شعلہ اسکے سُندر چہرے سے نکل رہا تھا۔
میں نے اسے دیکھا!
گویا یہ ایک سپنا تھا!
اس سپنے نے میرے جیون کو ہلا ڈالا
وہ چلی گئی ـــــ وہ تیز اور چمکتی ہوئی مورت ـــ
اور مجھے ایک بے نام دکھ میں ڈال گئی۔
وہ نیلی ساری پہنے ہوئے تھی،
اس کا چاندی جیسا پیٹ نظر آرہا تھا۔
اس کا روپ چاروں طرف شعلے پھینک رہا تھا۔
میں کہاں تک بتاؤں سبل!
اس کی بیکل آنکھیں پارے کی طرح تڑپ رہی تھیں،
اس نے اتنے زیور پہنے ہوئے تھے کہ دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں سنہری مکھیاں اس کے ساتھ چمٹ گئی ہیں۔
جب وہ چلتی تھی تو مجھے وحشی ہنس کا پانی کی سطح پر تیرنا یاد آتا تھا۔
جب وہ میرے پاس سے ہوکر گزری تو اس نے بے دھیان اپنی کمر کو تولا۔
اس کی کمر انگلیوں میں دبوچی جاسکتی تھی۔
گویا سنہری گاگر کی گردن تھی!
یہ تھی پریم کی مورت جسے میں نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا:
جب وہ ہنستی تو اس کی آنکھوں سے امرت برستا تھا۔
چنڈی داس شاعر کہتا ہے کہ اس طرح رادھا کو کرشن نے دیکھا!"

کرشن رادھا کے حُسن سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ وہ دریائے محبت کی بے پناہ موجوں میں بہتا چلا جارہا ہے۔ اور یکسانیت تخیل کا خالق چنڈی داس نہایت دلپذیر پیرائے میں کہتا جارہا ہے:

"اے سجن! میں نے اسے دیکھا۔
اس کی سندر مورت میری رُوح پر چھا گئی،
جب میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میں اپنے آپکو بھول گیا۔
گنگا کے کوسے کر میں واپس آیا۔
سن رہے ہو سبل؟
میں وہ کرشمہ پھر کب دیکھوں گا،
دنیا کے لیے وہ بالکل نئی چیز ہے
میرے دوست سبل! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟"

چنڈی داس والہانہ محبت کی انتہا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ کرشن کی داستانِ عشق کو اس رنگ میں بیان کرتا ہے۔ کہ آنے والی نسلوں کے ذہن پر بھی وہ افسانہ نقش ہوکر رہ جائے۔ کرشن محبت کی اس والہانہ رفعت پر پہنچ چکا ہے کہ اسے شک ہو رہا ہے۔ کہ سبل اس کی بات سن نہیں رہا۔ اور اگر سن رہا ہے تو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی لئے وہ بار بار پوچھتا ہے

لیکن شاعر خود ہی ان نازک ترین جذبات کی تشریح کرتا ہے۔

"آہ! میرے دکھ کو کوئی کیا جانے!
میں دنیا سے بہت دور پھینک دیا گیا ہوں!
میں اب کسے کہوں کہ مجھے رادھا کب ملیگی؟
میرے من کی اتھاؤں میں آگ سلگ اٹھی!
صرف کل کی بات ہے!
آہ! میری زندگی کٹھن ہو جائے گی!"

اس گرانپایہ شاعر کی فکری عظمتیں کبھی ضائع نہ ہوں گی اور اس کے لطافت اور شیرینی سے بھرے ہوئے اشعار کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ دنیائے حسن کی تخلیق اس کی رگ رگ سے ٹپک رہی ہے۔ ایک گیت میں لکھتا ہے:

"دن ڈھلے میں نے اسے سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا،
میری آنکھیں چین سا محسوس کرنے لگیں!
پہلے تو میں نے اسے نہ پہچانا۔
کس منش میں طاقت ہے کہ اس کے سندر روپ پر آنکھیں جما سکے؟
اس کی ساڑھی خوبصورت تھی ـــ لیکن اس کا روپ!
اس کے روپ سے تو ہی دنیا کے سارے سنگھار قائم ہیں ـــ!
آہ! میرا ہردے کس نے چھین لیا؟
ـــ میں نے رادھا کے پاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا۔
ہمیشہ کے لئے اسی کا داس ہوگیا۔
ـــ اس کی چھاتیاں دو پہاڑوں کی طرح سر لکائے کھڑی ہیں!"

چنڈی داس اس حسن وعشق کے معرکے میں "لذت پسندی" کے محسوسات بیان کرنے سے نہیں جھجکتا۔ بعض نقاد اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے کرشن کی مقدس ہستی کے ساتھ اس قسم کے جذبات جن میں ترغیب جنسی ٹپکتی ہے۔ وابستہ کئے ہیں! کرشن کی ذات سے ایسے واقعات منسوب کرنا ایک بڑی گستاخی ہے۔ اس کے جواب

میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ چنڈی نے جو کچھ لکھا محض حسن صداقت کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا، خلوص اور دیانت ہر وقت اس کے پیش نظر تھی۔ رُوح اور جسم کو عشق دشمن کے کارزار میں ہر وقت برسرپیکار رکھنا اس کی روح و رواں تھی۔ اس کا عقیدہ تھا۔ کہ اس قسم کی بیباکیاں شان محبت کو گھٹا نہیں سکتیں اور عظیم ترین شخصیتوں کو بھی ان سے صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بے باکیاں دراصل شدت احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

چنڈی داس ایک اور گیت میں ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ کہ کس طرح اس نے رادھا کو نہاتے دیکھا، جذبات کی فراوانی اور احساسات کی سادگی نہایت قابل قدر ہے:۔

"میرے دوست! ذرا بتاؤ تو وہ کون حسن کی دیوی ہے جس کا رنگ کندن جیسا ہے!
میں نے اُسے گھاٹ پر نہاتے ہوئے دیکھا!
اے میرے ہمراز! میں تمہیں بتاؤں وہ کیسے نہا رہی تھی!
وہ جمنا کے کنارے بیٹھی اپنے پاؤں پانی میں لٹکائے ہوئے تھی
اس نے اپنی ساڑھی اتار کر اپنے نیچے رکھ لی تھی۔
موتیوں کی مالا اس کی چھاتیوں کے نیچے سے اسے لپیٹے ہوئے تھی۔
وہ جب نہا کر اٹھی تو اس کے سیاہ بال چھید کمر پر آوارہ تھے۔
اندھیرا رو دیا اور رو کر چندرماں کی گود میں جا چھپا۔۔۔!"

کس قدر عمیق مطالعہ ہے حسن اور عشق کی کیفیات کا۔ چنڈی نے رادھا کو عریاں پیش کیا ہے۔ لیکن اس عریانی کے باوجود وہ پستی میں نہیں گرا۔ اس کی شاعری کا نبض منظر یہی ہے۔ کہ وہ عشق کے نغموں کے ساتھ حسن کی تخلیق کرتا چلا جاتا ہے گویا اسی دنیا میں اک رنگین وادی ہے جہاں حسن اور عشق اپنی بے لوث روایات کو ساتھ لئے ہوئے کھیل رہے ہیں۔

ایک سکھی کرشن کو سمجھاتی ہے کہ وہ نند کے خاندان کے نام پر بٹہ نہ لگائے اور اپنی روحانی فضیلت کو ضائع نہ کرے۔ کرشن جواب دیتا ہے۔ یہ جواب کتنی دلآویز کیفیتوں کا حامل ہے۔

"تو پھر ایشور نے دنیا بھر کی لطافتیں رادھا کے نام میں کیوں اکٹھی کر دی ہیں؟"

رادھا کرشن کی جدائی میں بے چین ہے۔ اور اس بے چینی کی کیفیت کو چنڈی اس طرح بیان کرتا ہے۔

"سکھی! میرا سندیسہ میرے پریتم کے پاس لے جا۔
اسے کہہ دو کہ آکاش اور مورکھ چندرماں مجھے بھسم کر دیں گے۔
چندرماں کو آج اگر کچھ ترس آیا تو میں اپنے پریتم سے ملوں گی!
نہیں تو میں انتظار کروں گی کہ یہ مورکھ اپنا منہ چھپا لے،
اسے کہنا کہ مجھے تمہیں ملنے کی کوئی چال نہیں سوجھتی،
میری ساس مجھے ہر وقت بلاتی رہتی ہے۔
میری نند مجھ پر نگاہ رکھتی ہے۔
اور چندرماں مجھے ہر وقت گھورتا رہتا ہے!"

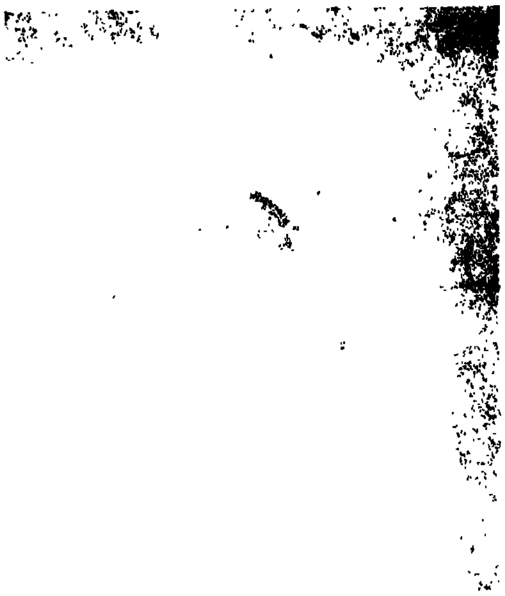
چنڈی داس رُوح اور جسم کے بندھن کا مسئلہ مندرجہ ذیل گیت میں کس خوبی سے بیان کرتا ہے۔ اور محبت کی پاکیزگی کا حسین ترین معیار قائم کرتا ہے:۔

"اے کنول سی آنکھوں والے پریتم! میں اپنا جسم گھر پر ہی چھوڑ آئی ہوں،
اور روح کو تیرے سامنے لائی ہوں،
میں نے سب کچھ تیاگ دیا۔
صرف اس لئے کہ تیرے چرنوں میں رہ سکوں!
اے بنسی والے! میرے پریم کو مت ٹھکرانا
نہیں تو تمہیں سارا جگت بُرا کہے گا۔!
جب تمہارا سندر مکھ میرے سامنے نہ ہو تو میں بے چین رہتی ہوں جب تک تمہیں نہ دیکھوں۔
میرے گلے میں سینے کی درد کی وجہ سے اک پھانس سی لگی رہتی ہے،
اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں اسی کمرے میں بیٹھی ہوں
جہاں دیا جلتے جلتے اچانک بجھ گیا ہو۔۔۔!!"

رادھا نہایت لطیف پیرائے میں کرشن کی شکایت کرتی ہے جس سے شدت جذبات کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

پریتم!
تم تو سب کچھ جانتے ہو،
تمہیں کیا بتاؤں!
پریتم!
دیکھا پریم کے بندھن کیسے ہوتے ہیں؟
اپنے جو تھے وہ بیگانے ہو گئے۔
اور تم جو بیگانے تھے وہ اپنے ہو گئے،
پریتم!
میرے من کی آگ بھڑکتی جا رہی ہے
میں اپنا دکھ بیگانوں سے کیسے کہوں؟"

کرشن واپس متھرا جانے کی تیاری کر رہا ہے اور رادھا فرط غم سے نڈھال ہو رہی ہے،



اصغر حسین خاں نظیر



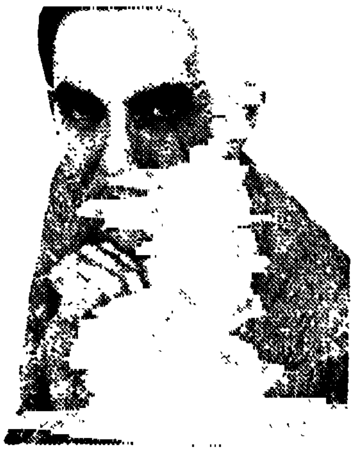
جناب [illegible]



جناب مسعود شاہد



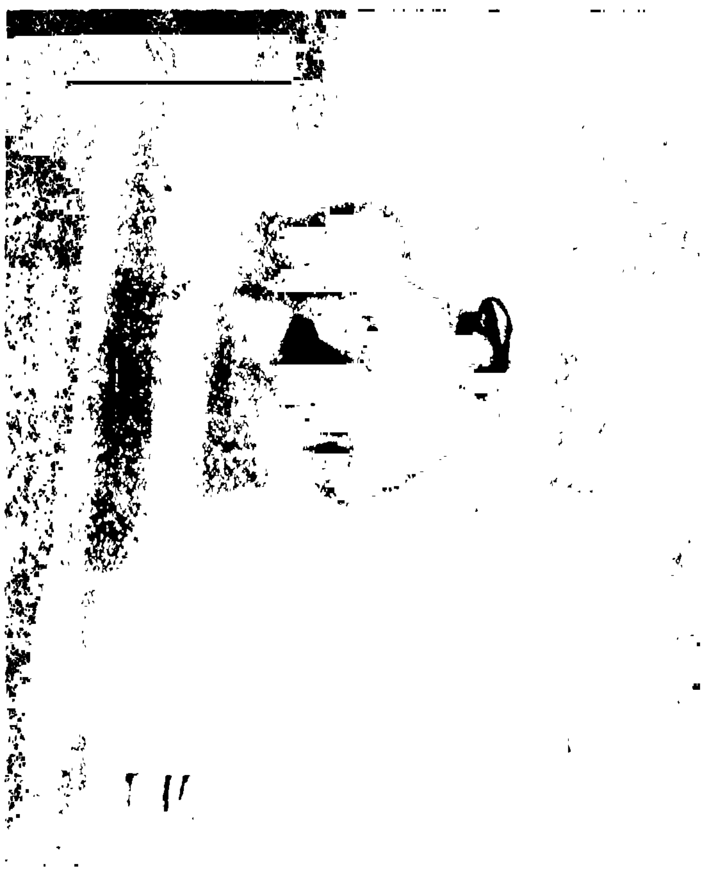
جناب طاہر قریشی



ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید



پروفیسر سید فیاض محمود



پروفیسر فیض احمد فیض



جناب وقار انبالوی



سراج الدین صاحب ظفر

پیتم! میں تمہیں جانے نہ دوں گی خواہ تم کچھ کہو،
میں اپنے آپ کو ڈبو کر مر جاؤں گی،
غم سے میرا جی نڈھال ہو رہا ہے۔
میری جان ڈر رہی ہے۔
گویا ہمسائے کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے!!"

رادھا کی دکھ بھری التجاؤں کے باوجود کرشن متھرا چلا گیا، رادھا متھرا کی جانب اپنی نگاہیں جمائے ہوئے اسی کے انتظار میں دن کاٹ رہی ہیں،

"میرا پیتم متھرا چلا گیا۔
اس نے کہا تھا۔ کہ میں لوٹ آوں گا
لیکن اس نے اپنا قول پورا نہ کیا
میں صرف اُسی کے انتظار میں جی رہی ہوں۔
کبھی اٹھتی ہوں کبھی بیٹھتی ہوں اور پھر لیٹ جاتی ہوں،
میری آنکھوں میں آنسو چمکتے رہتے ہیں،
سکھی! کوئی بتاؤ تو نند کا بیٹا کب تک لوٹ آئیگا؟
اس کے بغیر میرا جیون کیسے شانت ہو؟"

نہایت یاس انگیز جذبات لئے ہوئے رادھا سکھی کے ہاتھ اپنا پیغام بھیجتی ہے۔ ان دو تین اشعار میں ہی چنڈی نے سوز و کرب کی ایک لامحدود وسعت پیش کردی ہے۔

"سکھی! کنول ہتی آنکھوں والے کرشن کے پاس جا اور اسے کہو کہ رادھا کے من کی آشاؤں کا ساگر خشک ہو چکا ہے۔
اس کی روح پیاسی رہ گئی ہے
سکھی! کنھیا کا ہاتھ اس وقت تک نہ چھوڑنا
جب تک کہ وہ لوٹ آنے کا بچن نہ دے!!"

چنڈی داس کا ایک اور گیت جو فلم میں بھی گایا گیا ہے، مکمل پیش کیا جاتا ہے۔ اس گیت میں حسن و عشق کا تخلیقی منظر نہائت حسین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے یہ گیت دراصل رادھا کی زبان سے نکل رہا ہے لیکن فلم میں راَمی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، فلم میں گیت تصرف کے بعد صرف اشارہ گیا ہے:-

"پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سنسار
پریم کا آنگن، پریم کی چھت اور پریم کے ہونگے دوار
پریم سکھا ہو پریم پڑوسی، پریم ہی سُکھ کا سار
پریم کے سنگ بتائیں گے جیون پریم ہی پران آدھار
پریم سدھا سے اشنان کروں گی پریم سے ہوگا سنگار
پریم ہی دھرم ہے پریم ہی کرم ہے پریم ہی ست وچار"

چنڈی کے اصل گیت کا مکمل ترجمہ یوں ہے:-

"میں اپنا گھر پریم نگر میں بناؤں گی
پریم سے ہی میرا سارا گھر بنے گا۔
پریم میرا پڑوسی ہوگا اور پریم ہی میرا سکھا ہوگا
پریم کے سوا باقی میرا سارا جگت اجنبی ہوگا۔
پریم میرے انگ انگ کو سہلائے گا
پریم ہی میرا جوت اجالا ہوگا
پریم کی ہی میں باتیں کیا کروں گی
پریم کے سنگ میرے جیون بتائیں گے
پریم کی سیج پر ہی میں سوؤں گی
پریم کا تکیہ میرے سر کے نیچے ہوگا
پریم سدھا سے میں اشنان کروں گی
پریم رس ہی پیا کروں گی۔
اس عورت کو میں اپنا ہر دے بانٹ دوں گی
جو پریم کے دکھ میں میرے ساتھ شریک ہو۔
چنڈی داس کہتا ہے کہ میں اپنے من کے پنجرے میں پریم کو بند رکھونگا۔"

ایک اور گیت کا نمونہ دیکر چنڈی داس کی روح پرور اور کیف انگیز شاعری کا بیان ختم ہوتا ہے۔ اس گیت میں مایوسی کے جذبات کی انتہا ہو جاتی ہے اس شاعر سحر نگار کی تابناکیوں میں بنگال کے نغمہ خواں آگے بڑھ رہے ہیں اور وہاں کی شاعری کی مجلسوں کی شمعیں اس کی روشنی سے روشن ہو رہی ہیں وہ نشین شعرستان پانصد سال گزر جانے کے بعد بھی آج بنگال کا سب سے بڑا شاعر ہے جودت خیال، علو فکر اور فکری عظمتوں میں آج تک اس کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔ اس کی شاعرانہ سطوتیں آج بھی شعر و سخن کی فضا پر طاری و ساری ہیں،

"سکھی! میں تمہیں اور کیا بتاؤں!
جب میں پریم کا نام لیتی ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ہیں،
میں پریم کی طرف کبھی نہ دیکھوں گی،
اگر کوئی پریم کا نام لیگا تو میں اپنے کان بند کرلوں گی۔
سوتے، جاگتے، کبھی بھی پریم کا دھیان اپنے من میں نہ لاؤں گی،
میں پریم نگر کو چھوڑ کر کہیں دُور چلی جاؤں گی

ایک گھنے جنگل میں بسیرا کروں گی!"

اس گیت میں چنڈی داس نے رادھا کی یاس انگیزی نہایت دلآویز پیرائے میں بیان کی ہے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں سے ناامید ہو چکی ہے۔ کرشن کی فرقت میں اس نے اتنے صدمے اٹھائے کہ اس کا دل ٹوٹ گیا اور شکست دل کے جذبات چنڈی داس اس فطری رنگ کے سوا اور کس رنگ میں بیان کر سکتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں حسین نقوش کا خالق تھا:

ممکن ہے آج سے ہزار سال بعد ادب بنگال کی تمام کتابیں فراموش کر دی جائیں۔ لیکن چنڈی داس کے "رادھا کے گیت" پھر بھی باقی رہ جائیں گے۔!

"خلیلؔ"

محبّت

دو دلوں کی محبت اے اخترؔ
ہے اک ایسی مئے نشاط انگیز
جس کی مستی میں کائنات تمام
نظر آتی ہے حسن سے لبریز

اختر انصاری

غزل

محبت حاصلِ کون و مکاں معلوم ہوتی ہے
محبت مدعائے جسم و جاں معلوم ہوتی ہے

چھڑاتے ہیں عبث دامن سے وہ خونِ شہیداں کو
یہی سرخی تو زیبِ داستاں معلوم ہوتی ہے

میں جتنا غم میں دل کی بے بسی پر غور کرتا ہوں
مصیبت کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

نہ وہ اقرارِ غمخواری نہ وہ رسم و رہ یاری
طبیعت شکوہ سنج دوستاں معلوم ہوتی ہے

سمجھتے تھے جسے ہم حاصلِ عمرِ دو روزہ کا
وہ راحت داستانِ پاستاں معلوم ہوتی ہے

ابھی تو باعثِ تسکین خاطر ہے شباب اُن کا
ابھی تو آرزو میری جواں معلوم ہوتی ہے

نظر سے چھپنے والے! دیکھ! اعجازِ تصور کو
جدھر دیکھوں تری صورت عیاں معلوم ہوتی ہے

وہ کیوں کرتے نگاہِ بے محابا قیس کی جانب
یہ شوخی ضبطِ دل کا امتحاں معلوم ہوتی ہے

قیسؔ شروانی

چنڈی داس کے گیت

(۱)

اُس کی آنکھوں میں ہے بس شام کی موہن مورت،
اُس کی آنکھوں میں نہیں اور کوئی بھی صورت !
کان میں نام اگر ہے تو وہ بس شام کا ہے ،
دل میں بھی دھیان اگر ہے تو اسی نام کا ہے !
اس نے پہنا ہے لباس اپنے بدن پر کالا ؛
نیلے پھولوں سے بنائی ہے اک اچھی مالا !
اس کے سینے کی سجاوٹ کے لئے ہے بیلم
اور وہ کہتی ہے "مری سانولی سجنی ! پیتم !-
"آ بس آجا، مرے آغوش میں آجا سجنی !
"انگ سے اپنے مرا انگ لگا جا سجنی !"
وہ تو اک اونچے گھرانے کی ہے سندر بیٹی،
ہر گھڑی دل ہے اور اُس دل میں ہے اک بے چینی!
اس کا دل موہ لیا تم نے، تمہیں نے مادھو !
یاد کرتی ہے وہ ہر وقت ، ہمیشہ تم کو !
دور ہوتا ہی نہیں دھیان تمہارا موہن!
دیکھو دیکھو، وہ جو صورت تھی کنول کی صورت،
اب وہ سنولا گئی ، مرجھا گئی موہن مُورت !
اس کی آنکھوں سے بہی آتی ہے آنسو ن دھارا،
اور اُن آنسوؤں سے بہہ گیا کاجل سارا !
اس کے بس ہی میں نہیں کیسے بھلائے تم کو؟
رحم کی بات ہے ! رحم آئے تو آئے تم کو !
نیند سے خالی ہیں اب، خالی ہیں، اس کی راتیں،
دُکھ سے بھرپور رہیں، دُکھ والی ہیں اس کی راتیں!
شیام سندر ! ارے ہاں، شیام ! ذرا سچ کہنا،
بس میں ہے، بس میں تمہارے ہی تو دار داس کا!

اور اب سن لو کہ یوں کہتا ہے چنڈی داس؛
"اس طرح چین نہ پائے گا جو دل ہے پیاسا!
چند ہی دن میں بس اب ہوگا تمہارا بندھن !
پاس آجائیں گے اور تم سے ملیں گے موہن !"

(۲) رادھا

تنہا سب سے دور، اکیلی،
دُکھیا دل لے کر ہے بیٹھی،
رادھا ——
بات نہیں سنتی وہ کسی کی ،
اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی ،
رادھا ——
سوریہ کے گھونگٹ بادل کالے،
ہردم بس ان کو ہی دیکھے ،
رادھا ——
"میں ہوں پجارن، جو گیا پہنے"
"بھوک نہیں ہے" بس یہ بولے،
رادھا ——
لو، وہ اُس نے جوڑا کھولا ،
کندھوں پر گیسو لٹکائے ،
جب کالے بالوں کو دیکھا ،
دل میں دھیان کسی کا لائے ،
اب دیکھے آکاش کو رادھا،
اور اپنے بازو پھیلائے ،
کالی گھٹاؤں سے کچھ بولی ،
لیکن کس کے من میں آئے!
مور کی گردن نیلی کالی،

دیر تلک وہ دیکھتی جائے!
آؤ، اس کا بھید بتائیں۔
آؤ، پہیلی ہم ہی بجھائیں۔
ہم نے ان باتوں سے جانا،
دھیان لئے ہے شیام سندر کا،

رادھا ——————

(۳) رادھا

کبھی ہے گھر میں، کبھی ہے باہر، ہزار بار آتی اور جاتی،
ذرا نہیں چین اس کے دل کو بہت ہے بیتاب پیاری رادھا
ہے دل کی دھڑکن میں ایک تیزی کہ آگ جلتی ہے آرزو کی،
کدم کے جنگل پہ ہیں نگاہیں جہاں پہ مادھو کو پہلے دیکھا!
حسین دوشیزہ کیوں سراسر بدل گئی! کیا سبب ہے اس کا؟
بڑوں کی ناراضگی کی دل میں نہیں ہے اس کے ذرا بھی پروا!
ہے اس پہ سایہ، کسی نے جادو کیا ہے، ساری ہی ہے پریشاں،
خلش مٹے کس طرح سے دل کی، نہیں ہوئے پورے دل کے ارماں!
ابھی تو پہنے تھے اس نے زیور، ابھی انہیں پھر اتار ڈالا،
نجانے کیا دھیان آیا اس کو، اتار کر ان کو پھر سے پہنا!
وہ کس لئے اپنی آرزوؤں کو بس میں کرتی نہیں ہے اپنے؟
ہے کیا تمنا! ہے آرزو کیا! امید کیسی ہے دل میں اس کے!
ہیں اس کی باتیں سمجھ سے باہر، مگر حقیقت ہے مجھ پہ ظاہر،
کہ دل ہے نادان رادھکا کا، اسے تو ہے چاند کی تمنا!
سنو، یہ کہتا ہے تم سے شاعر، کبھی نہ رادھا کو تم جھڑکنا،
کہ اس کے دل پہ کیا ہے جادو کرشن نے اپنی بنسری کا!

(۴) شیام نام

کس نے لیا شیام نام!
مجھ کو یہ بتا سکھی!
کان سے سنا اسے دل میں جا بسا مرے،
روح پریشاں ہوئی!
میں یہ نہیں جانتی،
کتنی مٹھاس اس میں ہے، کیسے زبان سے ہٹے؛
بول بول ہر گھڑی،
میں ہوئی ہوں باؤلی!
مجھ کو یہ بتا سکھی!
کس نے لیا شیام نام!
اے سکھی! بتا مجھے،
کیسے ملوں گی اسے!
نام ہی سے یہ ہوا، موہنی سی کر گیا!
جسم اس نے جب چھوا، کہہ سکھی! پھر ہوگا کیا!
جس جگہ ہے اس کا گھر اس جگہ کنواریاں۔
اس کا روپ دیکھ کر ضبط کر سکیں کہاں!
سوچ ہے یہی مجھے،
بھول جاؤں میں اسے!
کیسے بھول جاؤں میں! کس طرح بھلاؤں میں!
کہہ سکھی میں کیا کروں!
اس کی کیا دوا کروں!
گھر سے بات توڑ کر، لاج شرم چھوڑ کر،
جس کو دیکھو اس کو ہی دھن ہے اس کی چاہ کی!
بول بول میں سکھی!
مجھ کو یہ بتا سکھی!
کس نے لیا شیام نام!

میراجی

چور

(۱)

موجی جتنا نامی پہلوان تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نامی چور تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ علاقہ بھر میں اس سے کسی کو نفرت نہ تھی۔ لوگ اس سے خوف کم کھاتے تھے۔ اس کا احترام زیادہ کرتے تھے۔ وہ ہر کس و ناکس کو نہ ستاتا تھا۔ چوری کے معاملے میں اُسے ایک قسم کا بالشویک سمجھنا چاہیئے کہ ایک آدھ لکھ پتی کو تاکتا اور ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارتا کہ گاؤں گوانڈ[1] کے گھر سے ہو گئے۔ وہ دولت اس لئے اڑاتا تھا کہ کسی کو تنگ دست نہ دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی لوگ اُس سے دبتے تھے اس لئے کہ کبھی کبھی وہ انتقامی چوری بھی کر گزرتا تھا۔

وہ ہمارے قصبے کے نزدیک ہی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ کوئی میل بھر کا فاصلہ ہوگا اس لئے قصبہ میں اس کی آمد و رفت اکثر رہتی تھی۔ ضروریات کی چیزیں وہ یہیں سے خریدتا تھا اور پھر تھانہ تحصیل کے کام کے لئے بھی اس کا راستہ قصبہ ہی سے جاتا تھا۔ اس لئے موجی کو قصبہ کے لوگ ایک طرح سے یہیں کا باشندہ سمجھتے تھے۔ اُس پر کچھ فخر بھی تھا اور اُس کا کچھ رعب بھی تھا۔ موجی کی عادت تھی کہ ہر شخص سے مسکرا کر ملتا تھا اور جہاں اس کی تیوری پر بل آیا مخاطب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے۔

(۲)

ایک دن موجی سر شام ہی قصبہ کے بازار سے گزرا لیکن اس انداز سے کہ تیوری چڑھی ہوئی گردن جھکی ہوئی۔ چال میں ایک نفرت آمیز تیزی کسی سے علیک نہ سلیک نہ بات نہ چیت لوگ دیکھتے تھے اور سہم کر رہ جاتے تھے۔ اُسے ٹوکتا کون اور روکتا کون۔ اسی حالت میں وہ بازار سے گزر گیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یار لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں جو لوگ ذرا دولت مند تھے۔ ان کا تو ذکر ہی کیا۔ ہمہ شما سب جل تو جلال تو پڑھ رہے تھے۔ موجی جیسا ہنس مکھ آدمی ہزار خطرناک ہونے کے باوجود بھی اس بازار سے کبھی یوں نہیں گزرا۔ معاملہ کیا ہے۔ آج کس کی قسمت بگڑی ہے کسی سے لڑا تو نہیں کسی نے اُسے کچھ کہہ تو نہیں دیا۔ یہ قصبہ آج تک اس کی زد سے بچا ہوا تھا۔ آج دیکھئے کیا گل کھلتا ہے۔ دیوالی کا اندھیرا اور موجی کا یوں منہ پھلائے گزر جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شام کو قصبہ کے ذمہ دار لوگوں کی ایک خفیہ پنچایت ہوئی۔ اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ آج کی رات قصبہ کی ناکہ بندی کی جائے اور رت جگا رہے۔

مہاجن۔ راجپوت۔ جاٹ۔ شیخ ہر قوم کے نمائندے اپنے اپنے ناکہ کی ذمہ داری سر پر لے کر اُٹھے اور اپنے اپنے محلّوں کو چلے گئے۔

"دیکھو بھئی آج ڈنگروں والے کوٹھے میں سونا"

"میرا دودھ باہر ہی بھیج دینا"

"بیٹا تم دونوں بھائی گلی کے پچھواڑے سے ہشیار رہنا"

"چوپال سے حقہ اٹھا دو بھئی۔ جب تک یہ یہاں رہے گا لوگ جمع رہیں گے"

"چراغ جلتے رہنے دینا۔ بھینس والے مکان کا دروازہ بند رکھنا"

"لاٹھی کے سرے پر شام چڑھوا لاؤ"

یہ الفاظ تھے جو قصبہ کے نمائندے اپنے اپنے متعلقین سے کہہ رہے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی چوپال میں پہنچ کر ایک ایک ناکہ پر چار چار جوانوں کی ڈیوٹی لگا دی۔ دو پہر رات گئے سے آدھی رات تک دو آدمی رات سے پہر رات رہے تک ناکہ پر موجود رہیں۔

(۳)

ناکہ بند گاؤں کے گورے میں اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے سمتیں تقسیم کر لیں اور آٹھ آدمی اپنی اپنی جگہ کو روانہ ہو گئے۔ صفا جنگ چھوپیا تیل پلائی ہوئی لاٹھیاں۔ ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ لیکن نکلے تھے کفن باندھ کر۔ موجی چور سا ہی ہوتا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ظالم پہلوان بھی تھا اس لئے ایک ایک ناکہ پر دو دو آدمی گھات میں بیٹھے۔

[1] گوانڈ۔ مزاح کے معنوں میں یہ لفظ کوئی ترقی کردہ آدمی بولتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے رواج نہ دیا جائے۔

میں ان دنوں فوج سے ملازمت چھوڑ کر آیا ہی تھا اور اپنی عسکریت کا خواہ مخواہ رعب لوگوں پر جمایا کرتا تھا۔ آج سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں اور میری نگاہیں . . .

بہر حال میری ڈیوٹی اس راستہ پر لگی جو موجی کے گاؤں سے قصبہ کو سیدھا آتا تھا۔ میرا ساتھی تھا تو تنومند جوان لیکن آج کی رات وہ بھی حواس باختہ سا ہو رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی معجزے سے وہ اور میں دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔

کاتک کا اندھیرا پاکھ تھا۔ چوری یوں بھی اس اندھیرے میں اتنی ہوتی ہے جتنی سال بھر میں مجموعی طور پر۔ اور پھر آج معاملہ اُس چور سے آ پڑا تھا جو چور بھی تھا اور سینہ زور بھی۔ ساؤنی کی فصل کٹ چکی تھی کھیت بالکل خالی تھے۔ گاؤں کا چوپھیرا سنسان تھا۔ کہیں کہیں کپاس یا ایکھ کا کھیت تھا بھی۔ لیکن ان کی وجہ سے رات کو کھیتوں میں رونق کہاں۔؟ دیسی ایکھ تو اب ہوتے نہیں۔ ولائتی ہیں کہ انسان کھا سکے نہ حیوان اور اساڑھی ابھی اس لئے نہیں بوئی جا رہی تھی کہ بارش کا انتظار تھا۔

ہم دونوں آموں کے ایک گھنے باغ میں آم کے نیچے بیٹھ گئے میرا ساتھی تھا کہ جیا جاتا تھا۔ پہر رات گئے سنسان جنگل میں چھپ کر بیٹھنا آسان کام نہیں اور پھر اندھیرا اس بلا کا کہ توبہ۔ اُس پر تصور اس دیو کا۔ جسے موجی کہتے ہیں۔ پتہ کھڑکا اور دل دھڑکا۔ سانس کی آواز بھی دوبھر ہو رہی تھی کہ ممکن ہے موجی آئے اور آہٹ پا جائے۔ ساتھی ہے حرکت۔ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ اسی طرح اندھیرے کے بھوت بنے بیٹھے رہے۔

(۴)

آدھی رات گزر گئی۔ خدا جانے میرے ساتھی نے اب تک کن کن خدشوں میں وقت گزارا تھا۔ نبض اور دل کی حرکت کے مرتبے بے قاعدہ ہو گئی تھی۔ اب وہ نہ رُکا۔ آہستہ سے کہا۔ "وقت ہو گیا چلیں"۔

میں نے کہا "جب تک ہماری جگہ کوئی آ نہ جائے کیسے جائیں؟ ناکہ خالی رہے گا اور اگر رات کو گاؤں میں جھولوں بھی کسی کا نقصان ہو گیا تو عمر بھر کے لئے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا"۔

ساتھی بولا "بھئی۔ میں تو اب نہیں رکتا۔ تم بیٹھے رہو"۔ یہ کہہ کر وہ چپکے سے کھسک گیا اور میں اکیلا بیٹھا دوسرے آنے والوں کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ اس خیال نے اور ہمت باندھ دی کہ ساتھی جاتے ہی دوسرے لڑکوں کو بھیج دے گا۔ لیکن وہ تو جان چھڑا کر بھاگا تھا۔ سیدھا گھر پہنچا اور لیٹ کر سو رہا۔

کوئی دو بجے ہوں گے تھوڑی دور راستے پر مجھے ایک روشنی دکھائی دی۔ جو کم و بیش تو ہوتی تھی لیکن حرکت میں نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے آگ جلائی۔ میں سمجھا کہ کوئی رکھوالا ہوگا۔ تاپ رہا ہوگا اور جی میں آئی کہ اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبراتے رہنے سے ذرا وہیں چلو کہ آگ بھی ہے اور انسان بھی۔ موجی آخر موجی ہے۔ آئے یا نہ آئے اور پھر آئے گا تو اس ناکہ پر تو میں موجود ہوں۔ کوئی دور کی بات نہیں۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور رنگ ڈنڈی پر ہو لیا۔ یہ پگڈنڈی تھوڑی دور جا کر ایک گڑواٹے میں مل جاتی تھی جو قصبہ میں سے گزر کر منڈی کو جاتی تھی۔

گڑواٹ پر آگ جل رہی تھی اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آخور کے ٹانڈے جمع کئے بیٹھا تھا اور تاپ رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے روشنی روک کر گردن اٹھائی اور میری طرف دیکھا۔

"آؤ بھائی۔ کون ہو تم۔ یہ فلاں گاؤں ہے نا"

"جی ہاں۔ میں رکھوالا ہوں"۔

"رکھوالا۔ ہوں دھنس کیا ہمیں بناتے ہو"

"نہیں تو"

"نہیں تو کیا۔ یہاں کس چیز کی رکھوالی کر رہے ہو۔ کپاس کا کھیت دور دور نہیں۔ ایکھ کو ابھی رکھوالی کی ضرورت نہیں اور پھر یہ وُلائی۔ یہ تین کنی کی دھوتی۔ یہ انگریزی بال۔ بھلا رکھوالوں کا یہ حلیہ ہوتا ہے تم سمجھتے ہو کہ ہم ماں کے پیٹ سے بڈھے ہی پیدا ہوئے تھے۔ جوانی ہم پر آئی تھی۔ اور جوانی کے رنگ ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ جوانوں کو بھی سمجھتے ہیں" ابھی تاپنے والا یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دائیں ہاتھ ایک متحرک روشنی اور نظر آئی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ روشنی دور تھی، لیکن ہماری طرف آ رہی تھی۔ اُس نے ادھر سے منہ موڑا اور آخور کی مٹھی آگ پر ڈالتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ"۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اُس نے کہنا شروع کیا۔

"میاں عقل اور نصیحت کا بیر ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں لیکن جوانی کی قدر کرو۔ تم اچھے گھر کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔ یہ اوباشی تمہیں تباہ کر

ؔ سے گڑ لیکہ بھی کہتے ہیں۔ گاڑیں کا راستہ۔

دے گی۔ نیکی بہر حال نیکی ہے"!

میں نے بات کاٹ کر کہا "آپ خواہ مخواہ شک کر رہے ہیں"۔ وہ بولا۔ "تم نے بات ہی شک کی کہی ہے اور پھر یہ ہاتھ میں صفاجنگ کیوں لے رکھی ہے"؟

میں نے کہا۔ "بڑے میاں سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن پہلے یہ معلوم کر لوں کہ آپ کون ہیں"!

اس نے کہا "میں ——— !" وہ رک گیا اور پھر بولا "تم نے دلاور کا نام تو سنا ہوگا"۔

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ بھلا اس علاقے میں کون ہے جو اس کا نام نہیں جانتا۔ اب کچھ پانچ سات برس سے اس کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آیا ورنہ یہ حال تھا کہ لوگ طاعون اور ہیضے کے دنوں میں بھی اتنے پریشان نہیں ہوتے۔ جتنے وہ دلاور کی سرگرمیوں کے دنوں میں پریشان تھے"!

اُس نے کہا "تو ہاں سنو۔ دلاور آج کل اپنی سرگرمیاں چھوڑ چکا ہے۔ اس کا قصہ تمہیں سناتا ہوں۔ شاید کچھ اثر تم پر بھی ہو اور یہ خطرناک راستہ تم چھوڑ دو"۔

(۵)

"کوئی دس سال کی بات ہے۔ دلاور نے ایک صراف کے ہاں سینڈھ لگائی۔ عمر بھر میں اُس نے اتنا مال نہ پایا تھا۔ دو لاکھ روپیہ نقد۔ زر و جواہر اس کے علاوہ نہال ہو گیا اور سال بھر داد عیش دیتا رہا۔ گلے بندھے سب تنے پھرتے تھے سال بھر میں وہ تمام اثاثہ "مالِ حرام بجائے حرام" ہو کر رہ گیا۔ دلاور نے پھر تاک لگائی۔ اسی شہر میں ایک دوسرا صراف تھا۔ پہلے صراف کا ہمسایہ۔ اُسی پائے کا آدمی۔ یہ اپنے چیلے چانٹوں کو لے کر اس کے ہاں چل دیا۔ مکان کے پچھواڑے سے نقب لگائی۔ اندر داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہر چیز لکشمی کا سنگار ہے۔ سونا ہی سونا۔ نوٹ ہی نوٹ۔ روپیہ ہی روپیہ۔ مال و اسباب باندھ کر وہاں سے چلا آیا۔

صبح کو شہر میں شور مچ گیا۔ مارا گیا۔ مارا گیا۔ ابھی پچھلا زخم ہرا نہ ہوا تھا کہ یہ چرکا لگا۔ مشکل سے ساکھ قایم رکھی تھی۔ پچھلی چوری سے نہ بگڑی۔ اب گئی یعنی ہوا یہ کہ جس صراف کے ہاں پہلے چوری کی تھی۔ اتفاق سے دوسری دفعہ بھی نقب اُسی کے مکان میں لگی۔ یہ خبر شہر سے نکل جب دلاور کے گاؤں میں پہنچی تو اُسے بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے سوچنا شروع کیا۔ کہ سال بھر میں اس شخص کے پاس دوبارہ سب کچھ ہو گیا۔ ادھر ہم نے سال بھر میں لاکھوں روپیہ اڑا دیا۔ یہ کیا بھید ہے۔؟

آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ محنت اور نیکی سے کمایا ہوا روپیہ بڑھتا پھلتا ہے اور ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت ضائع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صراف کا اس مرتبہ کا تمام چرایا ہوا مال واپس کرے گا اور عہد کیا کہ آیندہ کبھی چوری نہ کرے گا۔

متحرک روشنی اب ہمارے نزدیک آ گئی تھی میں نے دیکھا تو موجی تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک ہاتھ میں کاغذات لئے چلا آ رہا تھا۔ پاس آ کر وہ رُک گیا اور مجھے دیکھ کر بولا۔ "صاحبزادے اس وقت تم کہاں"؟

میں کچھ جواب دینے نہ پایا تھا کہ موجی بیٹھ گیا اور اُس نے چلم بھری۔ مسافر نے پھر کہنا شروع کیا۔

"صبح ہوئی تو دلاور صراف کے گھر پہنچا"۔ موجی نے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "تم نے کیسے چور کا ذکر چھیڑا ہے۔ اجی وہ کوئی چور تھا۔ یوں ہی اتفاق سے کہیں ہاتھ مار لیا۔ استاد کا شاگرد ہوتا تو بڑے بڑے دولت منڈوں کو لوٹ کر دکھاتا۔ پیٹ کا کچا اور کم ظرف تھا۔ ایک ہی اچھی چوری کی تھی۔ اسی کو ہضم نہ کر سکا اور پھر ایسا گم ہوا کہ دین دنیا سے گیا"۔

مسافر بولا۔ "سُنتے جاؤ" اور اُس نے کہا کہ صراف نے جوں ہی دلاور کی شکل دیکھی۔ چیخ اٹھا کہ رات کو کیا کسر باقی چھوڑی ہے کہ اب دن میں تشریف لائے ہو۔ وہ اپنے چور کو جانتا تھا لیکن اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ دلاور قانون و آئین کی گرفت میں آنے والا آدمی نہیں اس لئے خاموش تھا۔

دلاور نے کہا "مہاراج میں آپ سے کچھ عرض کرنے آیا ہوں۔ اور آپ کے بھلے کی بات کہنے آیا ہوں"۔ دلاور اور بھلے کی بات صراف یقین نہ کر سکا لیکن دکھی دیوانہ ہوتا ہے۔ بولا۔ فرمائیے۔ دلاور نے کہا "آپ کا چور میں ہوں اور میں آپ کا مال واپس کرنا چاہتا ہوں"۔ صراف کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ دلاور کمزور نہ تھا کہ فریب دیتا۔ اب کچھ پاس نہ تھا کہ دلاور لالچ کرتا۔ تھوڑی دیر تک خیالات کی بھول بھلیاں میں بھٹک کر اس نے کہا "یہ کیوں؟ اگر آپ مال واپس کرنے والے ہوتے تو پہلے ہی کیوں جاتے۔ سال بھر میں دو دفعہ مجھ پر ایسی کرپا کیوں کرتے"!

دلاور نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ چوری کی نیت دوسرے گھر پر تھی۔ نقب لگ گئی آپ کے ہاں۔ صبح کو پتہ لگا تو میں نے سوچا کہ جس شخص

کو ہم پارسال کنگال کر آئے تھے وہ پہلے سے زیادہ دھنّاث ہو گیا۔ اور ہم اتنا مال لے کر بھی سال کے بعد وہی موچی کے موچی رہے۔ یہ بھید کیا ہے۔ آخر میری سمجھ میں آیا کہ نیک نیتی کی کمائی بڑھتی ہے اور پاپ کی کمائی گھٹتی ہے۔ جمار اج میں اس لئے آپ کا مال واپس کرنا چاہتا ہوں کل صبح کھائی کے پاس جو جوار کی پولیاں لگی ہیں۔ ان میں سے اپنا مال اٹھا لائیے!"

موچی نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا "یہ تو دلاور کو خوب سوجھی۔ واقعی حرام کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ میرے پاس گشتی کا روپیہ تھوڑا سا بھی آجائے تو مہینوں چلتا ہے چوری کا روپیہ بہت سا بھی آجائے تو دنوں میں برابر ہو جاتا ہے"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو آپ دلاور کو نام دھرتے تھے۔ اب آگئے رستے پر"۔

مسافر بولا۔ "انہیں کیا معلوم تھا کہ دلاور نے مال کیوں اُگلا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ڈر کے مارے چوری چھوڑی۔ لیکن اس نے سوچ سمجھ کر توبہ کی"۔

موچی نے جلدی سے پوچھا "اچھا تو پھر کیا ہوا!"

مسافر نے کہا "اب دلاور کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ کیا کرے زمین کافی تھی۔ کام کرنے کے لئے سرمایہ نہ تھا۔ لوگوں نے جب سنا تو سارا گاؤں اس کی امداد کے لئے آمادہ ہو گیا۔ دو بچھڑے اُسے قرض مل گئے۔ گاڑی۔ ہل سہاگہ اور جو سامان اُسے درکار تھا وہ لوگوں نے اس اعتبار پر مہیا کر دیا کہ اب دلاور سیدھے راستے پر آگیا ہے۔

صراف کو بھی پتہ لگا۔ وہ کھوئی ہوئی دولت پا کر بہت خوش تھا اور دلاور کا ممنون بھی تھا۔ جب اس نے سنا کہ دلاور قرض پر سامان لے کر کھیتی باڑی کا کام شروع کر رہا ہے تو اُسے کچھ رحم آیا شاید۔ اور وہ دلاور کی عدم موجودگی میں ایک دن اس کے چھوٹے بیٹے کو ایک توڑا دے گیا اور کہہ گیا کہ دلاور سے کہنا احسان کا بدلا احسان ہی ہو سکتا ہے"۔

(۶)

"وہ دن ہے اور آج کا دن۔ دلاور نے اپنی وضع شریفوں کی سی بنالی۔ داڑھی رکھی۔ محنت سے کام شروع کیا۔ اس فصل میں ہزار روپیہ کی کپاس کا اندازہ ہے اور دو ہزار کے لگ بھگ کا ایکھ ہے لڑکا کالج میں پڑھ رہا ہے اور دلاور کپاس کے گڈے لئے منڈی کو جا رہا ہے"۔

دلاور کا اتنا کہنا تھا کہ موچی اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔ "اہا۔ آپ ہیں دلاور۔ خوب زندگی سنواری آپ نے۔ ہم نے تو آج تک نام ہی سنا تھا۔ درشن نہ کئے تھے"۔ رات کے سناٹے میں دلاور کا یہ سبق آموز افسانہ۔ اس کے بعد وہ بغلگیری اور جوش۔ دلاور کی رقت طبع اور میرے گوناگوں تصورات ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے موجی سے پوچھا۔ آج یہ

"بکف چراغ دارد"

ہو کر کہاں چلے تھے۔ موچی نے کہا۔ "یار چلا کہاں تھا۔ کل ایک مقدمے میں شہادت کی تاریخ تھی۔ کچھ کاغذات لڑکے کی غلطی سے گھر رہ گئے تھے۔ بہ مشکل جج نے ایک دن کی مہلت دی۔ شام مرتا کھپتا ضلع کچہری سے آیا تھا۔ سات میل ریلوے سٹیشن ہے۔ سات میل وہاں سے کچہری میں نے سوچا ریل میں جانا کیا ضرور۔ جہاں سات میل چلوں گا ذرا سویرے اٹھ کر سات میل اور سہی۔ اس لئے پیدل ہی چلا جا رہا ہوں۔ عجیب آفت میں جان ہے۔ اُدھر پچھلی فصل یونہی باہر پڑی ہے اُدھر اگلی فصل سر پر ہے۔ کل قصبہ میں نکلا تو پریشانیوں میں ایسا معلوم ہوا کہ تمام دنیا مجھ سے دشمنی کر رہی ہے"۔

پھر دلاور سے مخاطب ہو کر بولا "چچا جان! آج سے میں بھی سچے دل سے چوری سے توبہ کرتا ہوں"!

وقار انبالوی

کایا پلٹ!

بوڑھے نے تین شادیاں کیں!

بوڑھے گوالہ نے جب لیگی لعل شری رتناگر جی مہاراج کی دی ہوئی دوائی کی چھ خوراکیں غلطی سے ایک ہی دفعہ استعمال کر ڈالیں تو اس کی جو حالت ہوئی اس کا پورا حال بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ قصہ مختصر اس بوڑھے گوالے نے تین شادیاں کیں۔ اور ان شادیوں سے یکے بعد دیگرے جیتے جاگتے تندرست اور خوبصورت بچے حاصل کئے۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی۔ راجہ مہاراجہ نواب وغیرہ طرح طرح کی خوشامد کر کے مہاتما جی سے اس نسخہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ نواب بہاولپور کے سسر حاجی حیات محمد کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ اور باباجی نے اس عجیب و غریب دوائی کا نسخہ ان کو بتا دیا۔ حاجی صاحب موصوف سے یہ نسخہ امرت دھارا کے موجد کوی دنود پنڈت ٹھاکر دت جی شرما کے ہاتھ لگا جنہوں نے اپنے دواؤں نسخوں کے ساتھ اس نسخہ کو اپنے طبی اخبار "دیش اپکارک" میں شائع کر کے اس سے بہتر نسخہ بتانے والے کو ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو شائع ہوئے سولہ سال گذر چکے ہیں لیکن آج تک کوئی وید یا حکیم اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا پھر متھرا کے مشہور و معروف وید بابو ہری داس جی نے اس نسخہ کو اپنی طبی کتاب "چکتسا چندرادے" میں شائع کر دیا۔ جہاں سے لیکر ہم نے اسے تیار کر کے ہزاروں جنسی کمزوری و دیگر امراض خاص۔ جریان لیکوریا وغیرہ کے مایوس مریضوں پر اس کی آزمائش کی۔ اس کے حیرت انگیز کرشمے دیکھکر خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ چند روز کے استعمال سے ہی ان کے چہروں پر سُرخی دوڑنے لگی بھوک حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔ اور چالیس روز کے مکمل استعمال سے بیگئے گذرے مریض قابل فخر انسان بن گئے۔ جو صاحب ان موذی امراض کی بدولت زندگی سے تنگ آ گئے ہوں اور دوائیوں سے جن کا اعتقاد بالکل اٹھ چکا ہو وہ مندرجہ نسخہ کو خود بنا کر استعمال کریں۔

اصل نسخہ حسب ذیل ہے:۔ شدھ برادہ فولاد ۱۰ تولہ۔ خالص سنکھیا سفید ایک تولہ۔ خالص کافور ڈیڑھ ماشہ ان سب چیزوں کو ۲۴ گھنٹہ تک گھیکوار کے گودے میں گھوٹ کر مٹی کے کوزے میں بند کر کے پانچ سیر اپلوں کی آنچ میں پھونکیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ایک تولہ ہڑتال ورقی اور ڈیڑھ ماشہ کافور کے ساتھ۔ تیسری بار ایک تولہ گندھک آملہ سار اور ڈیڑھ ماشہ کافور کے ساتھ اور چوتھی بار ایک تولہ شدھ شنگرف پارہ اور ڈیڑھ ماشہ کافور کے ساتھ پھونکیں۔ اسی طرح سولہ آنچ دیکر برابر وزن میں بیر کھوٹی ڈالکر لوہے کی کڑاہی میں ڈالیں اور نیچے آنچ دیکر راکھ کر ڈالیں۔ اور بعد ازاں یہ راکھ پنکھے کی ہوا سے اڑا دیں اب یہ مقویات کی سرتاج دوائی "اپور شکتدا تا" بالکل تیار ہے۔ خوراک نصف رتی صبح اور نصف رتی شام کو ملائی سے یا مکھن کے ہمراہ کھا کر اوپر سے دودھ پئیں۔ گرم اور ترش اشیا سے پرہیز کریں۔

اس دوائی کی تعریف میں متھرا کے بابو ہری داس لکھتے ہیں:۔ کہ ایک ہفتہ کے استعمال سے ایک مریض کا وزن چار پونڈ بڑھ گیا۔ اور اس کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی بھوپال کے وید راج بال کرشن جی شرما نے ۲۵ مریضوں پر استعمال کیا۔ اور امید سے بھی بڑھکر پایا۔ "رتناکر" کے ایڈیٹر آیورویداچاریہ چھوٹے لال جی جین نے اپنی مشہور کتاب "گرہ چکتسا پتھ پردرشک" میں لکھا ہے کہ ہم نے آج تک اتنا تیر بہدف اور مقوی نسخہ نہیں دیکھا۔ رسالہ "متر" کے ایڈیٹر وید بھوشن شری شیام بہاری لال جی وید کی رائے ہے۔ کہ اس دوائی کے چالیس روزہ استعمال کے بعد ۸۰ سال تک بڑھاپا پاس نہیں پھٹکتا۔

ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ اس کے سات روزہ استعمال سے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔ ۱۲ دن میں چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ اور چالیس روز کے بعد کمزور سے کمزور اور مایوس سے مایوس مریض بھی صحیح معنوں میں مرد بن جاتا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ عورتوں کے تمام امراض ہسٹریا۔ جریان الرحم۔ ایام حیض کی خرابی کیلئے بھی نہایت اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ دمہ۔ ذیابیطس جیسے موذی امراض کے لئے اس سے بہتر دوائی دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہم نے واضح طور پر اس کا نسخہ اور ترکیب بتا دی ہے۔ جو صاحب کسی وجہ سے اسے خود تیار نہ کر سکیں وہ بلا تکلف ہم سے دام کے دام پر منگالیں چالیس روز کی خوراک (پانچ روپے دس آنے) جس میں محصولڈاک خرچ روانہ کر دی جائے گی۔

نیازمند:۔ وید رتن سیتہ دیو گپتا۔ روپ بلاس سائن شالہ نمبر ۱۲۲ جسونت نگر (اٹاوہ۔ یو پی)





بوڑھوں کو جوان بنانے

والی عجیب وغریب دوا

انسانی۔ نفسانی۔ حیوانی اور جسمانی امراض کے دور کرنیکے لئے
کویراج پنڈت امرناتھ ناگر وید کویرتن راج وید شفاگھر لاہور کا

بیش بہا جواہرات کندن سونے والا

سدھ مکر دھوج

قیمت ایک ماشہ
۱/۲ ۲ خوراک چھ روپے
(۶ روپے)

سدھ مکر دھوج کھانے سے پہلے اور بعد
شیشے میں اپنا چہرہ دیکھکر اپنی مردمی جوانی اور خوبصورتی کا مقابلہ کرو

یہ وہ دوا ہے جس کا اثر آپ کی پشتوں تک رہے گا

سدھ مکر دھوج طاقت خاص۔ جوانی۔ خوبصورتی بڑھانے کے علاوہ امراض
دل دماغ۔ مرگی۔ ہسٹیریہ۔ کمی بصارت۔ موتیا بند
دل کی دھڑکن۔ ضعف دل۔ ذیابطیس دمہ کھانسی
سردرد۔ جسم کا ہلنا۔ کانپنا وغیرہ کے لئے لاثانی دوا ہے
بھنگ۔ چرس۔ افیون۔ شراب۔ چانڈو۔ کوکین کی عادت
چھڑا دیتا ہے جسم میں تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ اور چہرے پر سرخی
لاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لئے

حاجی صفدر علی
کمیشن ایجنٹ لیب گرد ...
میں سدھ مکر دھوج کا استعمال
کر رہا ہوں۔ واقعی نامرد کے
لئے اچھی چیز ہے۔ مقوی بھی ہے
سید نور شاہ فارسٹ بلاک افسر
کھنڈا گلی دمری مز
مکرمی پنڈت صاحب سدھ مکر دھوج
میں نے استعمال کی ہے۔ بڑی مفید
ثابت ہوئی ہے خدا آپکو دنیا کی
خدمت کیلئے سلامت رکھے

یکساں مفید ہے
استعمال کرنے کے لئے سنہری گولیوں کے دن ہیں

قیمت:۔ ایک ماشہ یا ۲۲ خوراک چھ روپے (۶) ۳ ماشہ (معہ ...) فیتولہ (...)

ملنے کا پتہ:۔ منیجر سدھ مکر دھوج آیورویدک شفاگھر پوسٹ بکس ۱۱ لاہور
(بالمقابل تانگہ شیڈ لوہاری دروازہ انارکلی)

خلیفہ حکمت سے ریٹائرڈ
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور
آپ کا تیار کردہ سدھ مکر دھوج
واقعی ایک بے نظیر مقوی دوا ہے میں
اس بات پر مجبور ہوں کہ آپکو مبارکباد
دوں۔ اور آپکی درازی عمر کیلئے دعا
کروں کہ آپ حقیقت میں ایک سچے وید ہیں
خان بہادر عمر الدین ڈائریکٹر ...
ریٹائرڈ ... ملٹری۔ کیمپ
سدھ مکر دھوج واقعی اثر والی دوا ہے
کمر درد کمر ... اکثر ...

واقعی طاقت کے لئے لاثانی دوائی ہے

آپ کا سدھ مکر دھوج استعمال کیا میں بالکل تندرست ہو گیا
ہوں۔ واقعی طاقت کے لئے لاثانی دوائی ہے۔ (ستیارام گورکھپور)
پوری صحت حاصل ہو گئی۔ سدھ مکر دھوج میں نے اور میرے
بھائی نے استعمال کی پوری صحت ہو گئی (کیشو ناتھ سرینگر کشمیر)

اردو گیہ جیون ۲۳ صفحہ جنتری ۱۹۳۴ء
ایک کارڈ لکھکر مفت طلب کریں

زندگی کا اہم مسئلہ اور اسکا حل

وقت جوں جوں گذرتا ہے انسان جوانی کی منازل طے کرتا ہوا بڑھاپے کے جنگل میں گرفتار ہو جاتا ہے اور آخر شمع کی مانند ختم ہو جاتا ہے۔ جو اصحاب اپنی جوانی میں اپنے پیارے بال بچوں کے مستقبل کیطرف توجہ نہیں دیتے وہ بڑھاپے میں حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے فیملی کی ضروریات کیلئے کچھ نہیں کر سکتے! وہ خود لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں اپنے بال بچوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ جاتے ہیں

اس لئے

کیا آپنے اپنے فیملی کی ضروریات کے متعلق کبھی غور کیا ہے؟ اور اگر خدانخواستہ آپ اس دنیا سے قبل از وقت چل بسیں تو اس صورت میں جبکہ آپنے اپنے بال بچوں اور بیوی کے گذارہ کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا ان کا حشر کیا ہوگا۔ یہ ایک ایسی خوفناک بات ہے کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے اس اہم مسئلہ کا

آسان حل

ہندوستان کی مشہور ٹراپیکل انشورنس کمپنی لمیٹڈ دہلی نے تجویز کیا ہے۔ وہ آپکی زندگی میں ہی آپ کی آمدنی کا نعم البدل مہیا کر دیگی۔ آپ کو صرف ایک لائف پالیسی حاصل کرنی ہوگی۔ بڑھاپے میں اس پالیسی کا روپیہ آپ کو مل جائیگا۔ اور آپ خدا نہ کرے اس دنیا سے چل بسیں تو اس صورت میں آپ کی فیملی کو ہر ماہ گذارہ کے لئے روپیہ ملتا رہیگا۔ اور آپکے بال بچے آنیوالی تکالیف اور مصائب سے بچ جائینگے۔ اسکے متعلق آپ مفصل حالات کمپنی کے ہیڈ آفس کناٹ پلیس نئی دہلی یا اس کے برانچ آفس ۲ بیڈن روڈ لاہور سے دریافت کریں

شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا!

جاتے ہو خفا ہو کے اگر مجھ سے تو جاؤ   للہ مگر دل سے نہ تم مجھ کو بھلاؤ
جو چاہو سزا دو مجھے تم جرمِ وفا کی   پر ترکِ محبت کا سخن لب پہ نہ لاؤ
مدت سے ٹپکتا ہے مرا آبلۂ دل   اس آبلۂ دل کو نہ اب ٹھیس لگاؤ
پھٹ جائے نہ دل میرا گرانباریٔ غم سے   دیکھو مرے دکھتے ہوئے دل کو نہ دکھاؤ
دنیا میں بھلا کون مرے ناز اٹھائے   اللہ! جو تم ہی نہ مرے ناز اٹھاؤ
جاتے ہوئے کہتے ہو نہ آئینگے کبھی ہم   یہ کہہ کے نہ دنیا مری تاریک بناؤ
محرومیٔ الفت ہے بہت سخت مصیبت   اس سخت مصیبت میں نہ تم مجھ کو پھنساؤ
جو مجھ سے شکایت ہو نہیں ہے مجھے تسلیم   پر ترکِ وفا کی مجھے تہمت نہ لگاؤ
جاں میری محبت کا خزانہ ہے نہ بھولو   دلِ عشق کی تصویر ہے اس کو نہ ہٹاؤ
جینا تو عبارت ہے محبت سے تمہاری   کیونکر میں جیوں تم ہی اگر مجھ کو بھلاؤ
مرنا بھی اکارت ہے غمِ ہجر میں اے دوست   مرنے پہ مرے تم ہی جو آنسو نہ بہاؤ
بیکار ہے ہستی مری دنیائے ادب میں   تم ہی جو مرے سحر پہ ایمان نہ لاؤ
بے ربط ہیں اشعار مرے گر نہ سنو تم   بے رنگ غزل ہے جو نہیں اس کو نہ گاؤ
ہو جائے نہ جینے سے طبیعت مری بیزار   اتنا غمِ فرقت میں نہ تم مجھ کو ستاؤ
دِل میں ہے اک امید کی دھندلی سی جو صورت   اُمید کی دھندلی سی یہ صورت نہ مٹاؤ
للہ نہ اس طرح کرو تم مجھے مایوس   دیکھو نہیں میری ہی قسم اب جو نہ آؤ
ٹوٹا سا یہ دل میرا جو پہلو میں ہے میرے   اجڑا ہوا اک گھر ہے پھر اس گھر کو بساؤ
بگڑے ہوئے ایام کو پھر میرے سنوارو   سوئی ہوئی تقدیر کو پھر میری جگاؤ
گردابِ مصیبت میں پھنسی ہے میری کشتی
تم اس کے کھویا ہو اسے پار لگاؤ

جلیل قدوائی

پیکارِ حیات

یہ انجمنِ ہست ہے آئینۂ شمشیر   ہوتی ہیں یہاں زندگی و مرگ بغلگیر
پیکار مسلسل ہے یہ ہنگامۂ ہستی   اس نکتے میں ہے زندگی و مرگ کی تفسیر
جو بڑھتے ہیں پیکار میں وہ رہتے ہیں دلشاد   جو ہٹتے ہیں میداں سے وہ ہوتے ہیں دلگیر
شمشیر کے سائے میں ہیں جنّت کی بہاریں   شمشیر سے قوموں کی بدل جاتی ہے تقدیر
کیوں ڈرتا ہے یہ گردشِ افلاک ہے کیا چیز؟   ایمان کی تلوار سے افلاک کا دِل چیر
ایمان کی آغوش میں پلتے ہیں ارادے   ایمان کے جلووں سے ہے امید کی تنویر
ایمان سے کٹ جاتی ہے زنجیرِ حوادث   ایمان ہی تقدیر ہے ایمان ہی تدبیر
جو قوم جہاں میں ہے جواں ہمت و جانباز   ہے وہ ہی جہاندار و جہانبان جہانگیر
جس قوم کے افراد نہیں موت سے ترساں   اس قوم کے پاؤں کیلئے زیست ہے زنجیر
ہے زندگی آزاد جوانمردوں کی صیّاد   اور مرگ ہے آزاد جوانمردوں کا نخچیر
جینے کی ہے تمہید جواں مرد کا مرنا   اس پردے پہ وہ کھینچتا ہے موت کی تصویر

ہے موت کے دریا میں نہاں گوہرِ ہستی
دیتا ہے پیام آج بھی یہ اسوۂ شبیرؓ

محمد اکبر منیر

بیگمات اودھ کے خطوط

ہندوستان میں سب سے زیادہ صاحب ذوق و وجدان اور بدنصیب ترین انسان اگر کوئی پیدا ہوا تو وہ جانِ عالم واجد علی شاہ تھا۔ اس صاحبِ ذوق (برائے نام) بادشاہ نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں وہ وہ جدتیں کیں کہ ذوق و وجدان دونوں حیران ہیں۔ ادبیات اور فنون لطیفہ کا جتنا صحیح مذاق قدرت نے واجد علی شاہ کو عطا کیا تھا۔ اتنا آج تک کسی کو نہیں ملا، اپنی حکومت کے زمانہ میں اختر پیا نے جتنی خدمت فنونِ لطیفہ کی کی۔ اس سے زیادہ اپنی قید کے زمانہ میں انجام دی۔ یہ واجد علی شاہ ہی کی کرامت ہے کہ کلکتہ میں لکھنؤ کی صاف اور سادہ زبان ان کے ساتھ ساتھ پہنچی، مٹیا محل لکھنؤ بن گیا۔ اور آہستہ آہستہ اردو نے کلکتہ میں پر پرزے نکالنے شروع کئے۔ چنانچہ کلکتہ اب اردو کا مرکز نہ سہی مگر ایک اردو دان شہر بنا ہوا ہے۔ مدراس کی طرح وہاں اُردو کی مٹی پلید نہیں ہوتی، اب بھی کلکتہ کے وہ لوگ جو واجد علی شاہ کے درباریوں اور متوسلین کے خاندان سے ہیں۔ بڑی فصیح اُردو بولتے ہیں۔

"گیسوئے اُردو کے سنوارنے والوں میں بہتوں کے نام لئے جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے عنبروں کو بھی "شانہ بدست" ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروسِ اُردو کے "نوشاہ" اختر پیا کو لوگوں نے بھلا ہی دیا، اختر پیا نے نہ صرف اپنے مصاحبین میں ذوق شعر پیدا کر دیا تھا اور ان کے حاشیہ نشین بڑے اچھے شاعر تھے۔ بلکہ انہوں نے محلات کو بھی ادب اور شعر میں رنگ دیا تھا۔ واجد علی شاہ کی مثنوی "حزنِ اختر" جب دوسری بار طبع ہوئی تو مولانا شرر مرحوم نے اس پر مقدمہ لکھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"نظم و نثر کا دربار میں اس قدر چرچا تھا کہ تحریر درکنار گفتگو میں بھی مجال نہ تھی کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے"۔ (مقدمہ حزن اختر صفحہ ۱۵)

محل خانہ شاہی میں جو اختر پیا کی خود نوشت آپ بیتی ہے۔ اختر پیا تحریر فرماتے ہیں:۔

اسی زمانہ میں مرزا حسن نامی مولوی کو جو غلام رضا خاں کی معرفت ملازم ہوا تھا بیگموں اور پریوں کے سبق دینے کے واسطے مقرر فرمایا اور ایک قطعہ مکان علیحدہ کتب خانہ کے واسطے تجویز فرمایا۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنی لیاقت کے موافق علوم شرعیہ کی تحصیل کی" اور میرے تختِ آبائی پر جلوس فرمانے کے زمانہ تک یہی سلسلہ رہا۔ (محل خانہ شاہی صفحہ ۱۰۲)

اختر پیا نے نہ صرف اپنے محلات کو موسیقی میں طاق کر دیا تھا۔ بلکہ وہ ادب اور شاعری میں بھی شہرہ آفاق تھیں، اکثر بیگمات شاعرہ تھیں، بعضوں کے دیوان طبع ہو چکے ہیں اور بیشتر محلاتِ واجد علی شاہ کا کلام تذکروں میں نظر آتا ہے"۔ واجد علی شاہ کے محلات کی شاعری کے عنوان سے جناب تمکین کاظمی کا ایک مضمون "ادبی دنیا" میں طبع ہو چکا ہے۔ گذشتہ سالنامہ ادبی دنیا میں "شہزادیوں کی شاعری" پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے راقم الحروف نے بھی بیگمات واجد علی شاہ کے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اور اس سے پہلے جناب تمکین کاظمی کا ایک مضمون ادبی دنیا میں خاص محل بیگم صاحبہ عالم کی شاعری سے متعلق طبع ہو چکا ہے۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے ادبی دنیا میں آپ کا ایک اور مضمون بدر عالم صاحبہ بدر کے رقعات پر جو واجد علی شاہ کے نام تھے شائع ہوا ہے۔ مگر آج ہم ایک نئی چیز پیش کر رہے ہیں۔ جو اردو دان طبقہ کے لئے بالکل اچھوتی اور ادب اردو کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ یہ وہ رقعات ہیں جنہیں واجد علی شاہ کی بیگمات نے ان کی قید کے زمانہ میں لکھنؤ سے بھیجا۔ ان رقعات کی اہمیت کے متعلق مولانا شرر مرحوم نے "حزنِ اختر" کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ

واجد علی شاہ کے کورٹ کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ بادشاہ اور ان کے محلات کے درمیان میں جو خط و کتابت ہوتی وہ خطوط "توقیع نامہ" کے لفظ سے یاد کئے جاتے اور رنگین و پُرافشاں کاغذ پر ہوا کرتے، محلات کی طرف سے جتنے توقیع نامے جاتے کاغذ کی طرح نہایت ہی رنگین اور مقفیٰ عبارت میں

ہوتے اور ان میں زبان کی پاکیزگی کے ساتھ نہایت ہی شستہ ورفتہ بامحاورہ زبان کا لحاظ رکھا جاتا اور عاشقانہ رنگین بیانی ہوتی۔ افسوس وہ ذخیرہ فنا ہوگیا۔ ورنہ میرے خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اردو زبان کو میسر نہ نصیب ہوسکیگا۔ اتفاق سے ایسے توقیع ناموں کثرت سے میری نظر سے گذرتے رہے۔ اور میں انہیں نہایت ہی شوق سے پڑھا کرتا اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا یہ انہیں توقیع ناموں کے پڑھنے کی برکت ہے۔

(مقدمہ حزن اختر صفحہ ۱۵ و ۱۶)

خوش نصیبی سے میرے علم دوست کرم فرما مولوی تراب علیخاں صاحب باز کے پاس ایک ایسی کتاب آگئی جس میں بہتر ۷۲ رقعات واجد علی شاہ کے محلات کے اور چند رقعات واجد علیشاہ کے ہیں۔ باز صاحب حیدرآباد کے ان علم دوست اور ایثار پسند افراد سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر دی ہے۔ چنانچہ یہ نایاب کتاب باز صاحب نے مجھے دی تاکہ میں اس پر کچھ لکھوں۔

یہ کتاب رائل سائز کے ایک سو بتیس ۱۳۲ صفحات پر شائع ہوئی ہے مرتب نے اس کا نام تاریخی "مخزن اسرار سلطانی (۱۳۱۹ھ) اور رقعات بیگمات" رکھا ہے کاغذ نہایت معمولی ہے جو اب بالکل بیکار ہوگیا ہے۔ اس کے مرتب امتیاز علیخان نجیب ساکن فرخ آباد ہیں جنہیں ایک ذخیرہ میں سے جو ردی کاغذات کا تھا لکھنؤ میں بہت سے توقیع نامہ جات مل گئے، چونکہ یہ خود کاپی نویس تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک دو صفحے کی تمہید لکھ کر ان رقعات کو چھپوا دیا۔ اور ۱۱ اپریل ۱۹۰۲ء کو یہ مجموعہ چھپا۔ اس میں بہتر نظم و نثر کے رقعے ہیں جو واجد علی شاہ کی بعض محلات نے واجد علی شاہ کے نام بھجوائے۔ اور واجد علی شاہ کے بیس ۲۰ مختصر رقعے بھی ہیں جو انہیں خطوط کے جواب یا سلسلہ میں ہیں۔ اس مجموعے کے رقعات کی تفصیل یہ ہے۔

رقعاتِ شیدا بیگم (۳۹) رقعاتِ حور بیگم (۱۴) رقعات فاطمہ بیگم (۲) رقعاتِ دلپذیر بیگم (۱) رقعات مہدی بیگم (۱) رقعات منور بیگم (۲) رقعات فرخندہ محل (۵) رقعات کنیز فاطمہ (۱) رقعاتِ نواب وزیر (۱) رقعاتِ امراؤ بیگم (۱) رقعات مناجان (۲) رقعات امراؤ محل (۱) رقعات نوروزی بیگم (۲) صفحہ ۳ سے ۱۰۲ تک بیگمات کے رقعات اور صفحہ ۱۰۳ سے صفحہ ۱۲۰ تک جان عالم کے رقعات انہیں محلات کے موسومہ ہیں۔

یہ رقعے ۱۲۷۳ھ سے ۱۲۷۴ھ تک کے ہیں۔ زیادہ تر رقعے ۱۲۷۳ھ ہی کے ہیں۔ ایک آدھ رقعہ ۱۲۷۴ھ کا نظر آتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل محلاتی زبان ہے۔ روزمرہ نہایت فصیح، محاورے ٹھیٹ ٹکسالی اور اسلوب بیان حد درجہ سادہ اور دلفریب ہے۔ چونکہ فراق زدہ بیگمات کے لکھے ہوئے رقعے ہیں۔ اس لئے نہایت دردانگیز ہیں۔ شیدا بیگم اور حور بیگم نے بعض رقعے منظوم بھی لکھے ہیں۔ اور بیشتر رقعوں میں جگہ جگہ اپنے اشعار نقل کئے ہیں۔ مگر طرز تحریر مقفیٰ ہے۔ نمونتاً شیدا بیگم کے چند رقعات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

۲۶ جمادی الآخر ۱۲۷۳ھ کو نواب شیدا بیگم صاحبہ نے یہ رقعہ جان عالم کو لکھا ہے۔ جو مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

"جانی معایا۔ ناصر برایا۔ تم پر خدا کا سایا۔ اشتیاق نامہ تمہارا سترھویں کا لکھا ہوا عین انتظار میں آیا۔ ہم نے دیکھتے ہی آنکھوں سے لگایا۔ جب عشیر نے پڑھ کر سنایا۔ ہر فقرہ رنگین بہایا۔ غنچۂ طبیعت کو کہلایا۔ تمہاری جدائی نے وہ صدمہ دکھایا کہ موہنہ کو کلیجا آیا۔ ہم کو غم نے ایسا رولایا کہ خون آنکھوں سے برسایا۔ پیر فلک نے عجب نیرنگ دکھایا۔ تم کو ہم سے عین جوانی میں چھوڑایا۔"

ترے دام کاکل میں دل ہے اسیر ٭ مرا حال یہ ہے بقول عسیر

کسی وقت آرام آتا نہیں ٭ تصور ترا دل سے جاتا نہیں

اب جلد خدا یہ امید برلائے تمہاری صورت رشک خورشید دکھلائے یعنی تم کو ہم سے ملائے۔ سب تردد جائے۔ دل کو تسکین آئے۔ اور اس زمانۂ ناکام میں کم آرام ہے بسبب اختلاف آب و ہوا بر خود اور رقیہ بانو بیگم کو زکام ہے۔"

"خدا تم کو صحت سے رکھے سدا ٭ کرے ملک جلدی تمہارا عطا"

"مرقوم ۲۶ جمادی الآخر ۱۲۷۳ھ"

شیدا بیگم واجد علی شاہ کی بہت چہیتی محل تھیں "حزن اختر" میں واجد علی شاہ نے شیدا بیگم اور ان کی بیٹی نگین آرا معروف بہ رقیہ بانو بیگم کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

نگیں آرا جو چوتھی شہزادی تھی ٭ حقیقت میں گھر بھر کی آبادی تھی

رقیہ ملائیں جو بانو سے ہم ٭ لکھیں نام اس مہ کا اے ذی کرم

جو نواب پہلے تو بیگم ہے بعد ٭ کھلا اس طرح مہر کا نام سعد

یہ شیدا کی خالق نے امداد کی ٭ یہ تھی والدہ اس پری زاد کی

خدانے یہ کی شیدا بیگم پہ مہر عنائیت جو کی اس کو یہ حور چہر
برس تین ہی یہ بھی تھی نیک ذات ابھی منہ سے کرتی نہ تھی ایک بات
سنا یہ عدم کو گئی رشکِ ماہ خبر یہ ملی ہے مجھے آہ آہ!

ان رقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جان عالم شیدا بیگم کو اور شیدا بیگم جان عالم کو بہت چاہتی تھیں۔ ۷ رشوال ۱۲۷۳ھ کو ایک خط شیدا بیگم نے جان عالم کو لکھا ہے۔ جس میں گرمیوں کی وجہ سے نگیں آرا بیگم کی بے چینی ظاہر کر کے شہزادی کی کھیر چٹائی کی رسم ادا کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس میں حسام الدولہ میر صفدر علی، میر قائم علی اور نواب ناظر کی شکایت کی ہے۔ اسی طرح پورے رقعات معشوقانہ شکوہ و شکایت سے بھرے ہوئے ہیں بعض خطوط نہایت دلچسپ بھی ہیں۔ خصوصاً بعض رقعوں کی ابتدا اور انتہا بڑے مزے کی ہے۔ ۱۰ رشوال ۱۲۷۳ھ کو شیدا بیگم نے ایک بڑے مزے کا خط لکھا ہے۔ ابتدائی چند سطور نقل کئے جاتے ہیں۔

اخترِ آسمان دلربائی، گوہر دریائے آشنائی، بلبل شاخسار یکجہتی، خسرو خو، شیریں گفتگو، سلیمان حشم، بلقیس شمیم یوسف جمال، زلیخا خصال، ماہ صورت، چکور سیرت، لیلیٰ کی سیج مجنوں کی ذبیح، دمن کے دل کا گھاؤ، نل کی صورت کا بناؤ۔ عذرا کا ناز، وامق کا انداز، شاہد کی راحت، عزیز کی عزت، شمع کا رنگ، پروانہ کا ڈھنگ، شہر کی آرائش، پہلو کی زیبائش بند کے کھولنے والے، پیٹ کے سونے والے، زخم فراق کے مرہم۔ مرزا جانعالم بلکہ جان جہان سے بہتر سلطان عالم اختر...... .... الخ

ایک رقعہ میں جو ۱۴ر رمضان ۱۲۷۳ھ کا محررہ ہے۔ عجیب نوک جھونک نظر آتی ہے۔ کوئی شخص شیدا بیگم پر تہمت اٹھاتا ہے۔ جانعالم دریافت کرتے ہیں۔ اور یہ بگڑ کر جواب دیتی ہیں۔

تم نے جو دشمن کے کہنے سے تحریر کیا تھا کہ "۲۳ر شعبان کو نثار علی لہسنا ہاتھی پر چڑھ کے چینی بازار میں تمہارے محل کے کوٹھے کے سامنے چار گھڑی تک کھڑا رہا اور تمہارے یہاں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور عورتیں بیٹھی تھیں نہ تو کھڑکیاں بند ہوئیں نہ عورتیں ہٹیں، اس کے کیا معنی ـــــ جانی! اس کے ہیں دو معنی ایک تو لغوی دوسرے اصطلاحی، پہلے تو لغوی سے ہو آگاہ پھر اصطلاحی سمجھنا خاطر خواہ۔ لغوی تو یہ ہے، نہ اس میں کچھ نو ہے اور نہ خلاف۔ ترجمہ اس حال صدق مآل کا حرف بحرف ہے صاف صاف کہ تین کھڑکیاں دروازہ وار ہمارے محل کے کوٹھے پر جانب چینی بازار۔ کٹہرے پڑی ہوئی آدھی آدھی چھنی ہوئی ابتدا سے ہیں۔ فی الحقیقت بھلا بغیر ہیلچہ وغیرہ کے ان کے کھلنے کی کونسی صورت؟ جس طرح چاہو اس کی پہونچا لو سند کہ قول حاسدوں کا ہو جائے رد، لغوی تو ہو چکے مرقوم اب اصطلاحی کرو معلوم کہ جب سے تم ادہر سدھارے ہو ہم نے چینی بازار کی طرف اپنے کوٹھے پر دو کمرے بنوائے ہیں۔ اور جھاڑ شیشہ آلات سے سجوائے ہیں، پردے تمامی کے بند ہوائے ہیں چاندی سونے کے پلنگ بچھوائے ہیں۔ اور عورتوں کا کیا ذکر ہے۔ خود ہمارا یہ حال ہے۔ کہ ہم کو ایک ذرہ بھی نہیں تمہارا خیال ہے جب دو تین گھڑی دن رہتا ہے۔ تو ہم ہر روز وہاں بیٹھنے کو جاتے ہیں دیدہ و دانستہ ہر ہر دم سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ اور وقت شب جس کو چاہتے ہیں۔ اس کو بلاتے ہیں۔ تمام رات خوب خوب مزے اٹھاتے ہیں۔ ہمارا کام ہنسنا سر راہ ہے۔ یہاں سے کلکتہ تک ہر شخص اس پر گواہ ہے۔ جو طرز و انداز ہمارا ہے۔ تم پر بھی سب آشکارا ہے۔ ہم کو ہرگز کچھ نہیں ہے باک جھوٹوں، حاسدوں کے منہ میں ہے خاک اور ہاں اس وقت مجھ کو خوب یاد آیا! ایک نیا مضمون ذہن میں سمایا: میں تم سے پوچھتی ہوں خلاصہ اس کا بتانا جلد تر لکھ کر بھجوانا، تم نے جو لکھا تھا کہ لہسنا تمہارے محل کے سامنے کھڑا تھا۔ اس بات کو تصور کرو اور بغور دیکھو کہ لہسن پیاز کا یہاں کیا کام ہے۔ اس کا تو باورچی خانہ مقام ہے اگر کوئی باورچی ہوگا جہاں مسالہ بھی ہر ایک ہوگا وہاں ہوگا۔ یہاں کا حال تو تم کو بخوبی معلوم ہے۔ اور ظاہر و باطن سب مفہوم ہے۔ کہ باورچی ہے نہ درزی نہ حجام ہے۔ ان میں سے ایک کا بھی یہاں نہیں کام ہے۔ ہم فقط آپ ہیں یا آپ ہی کے کارکن ہمارے باپ ہیں اور عورتیں بھی ہمارے یہاں جتنی ہیں ان میں سب ضعیف الداد و عیشر ہیں کوئی جوان نہیں، ان پر فعل بد کا کسی کو گمان نہیں، ہاں مگر جوان ایک مغلانی ہے۔ سو وہ بھی ستانی نہیں دیوانی ہے۔ کوئی نمک حرام عیار اپنے اڑھائی چاول پکایا کرے ہزار لیکن یہاں دال نہیں گلنے کی زینہار، بلکہ بعض بخیۃ کاروں

نے ابتدا میں کچھ سمجھ کے ہم کو اکثر دم دیا۔ خدا شاہد ہے کہ ہم نے بجز تمہارے کسی کو قبول نہ کیا فقط"

مرقوم ۱۷ رمضان ۱۲۷۳ھ

ایک خط میں شیدا بیگم نے غدر کی پریشانیاں بھی بڑی تفصیل سے لکھی ہیں جن کو نقل کیا جاتا ہے۔

انیس و ہمدم۔ جانعالم ابقاکم اللہ تعالیٰ۔ بعد اشتیاق وصال نواب شیدا بیگم کا ظاہر ہو تم پر حال، مدت سے خبر خیریت اثر نہیں پائی پریشانی بے شمار ہے۔ اور روز روشن ہماری نظروں میں شب تار ہے۔ حافظ حقیقی صحت و عافیت سے تم کو اپنی حفظ میں مدام رکھے اور یہ جدائی درمیان سے جدا علی الدوام رکھے حال میرا یہ ہے۔ اس سے واقف ہو کہ دسویں کو تمام زیور اسباب نقد وجنس جس قدر ہمارے پاس تھا۔ وہ سب حضرت باغ میں چھٹ گیا اور جو کچھ بچ رہا وہ سب آفت میں لٹ گیا اب سردست یہ حال ہوا ہے کہ جب کسی سے نہیں کچھ قرضہ ہم پہونچتا ہے تو نوبت فاقہ کشی کی آتی ہے دیکھئے قسمت کیا دکھاتی ہے جن لوگوں سے چار مہینے قرض لے کر کھانے اور پینے میں صرف کیا۔ اب جو ان سے اور طلب کیا ایک حبّہ نہ دیا۔ خدا کے واسطے جس صورت سے بنے ہم کو اپنے پاس بلاؤ اور اگر نہیں تو جبطرح ہوگا میں خود چلی آؤنگی یہ صدمہ کہاں تک اٹھاؤں گی۔ اور اے جانعالم! حال میرے والدین کا بھی سب تم پر ہویدا ہے۔ ان کو بھی کہیں سے ایک حبہ تک بھی نہیں پیدا ہے۔ نہ وہ وثیقہ رکھتے ہیں نہ نوٹ، یہ دل پر اور بے چوٹ، جب میں ان کو کچھ دیتی ہوں تب بسر ہوتی ہے ورنہ فاقوں میں ان کی گذر ہوتی ہے اور یہ صدمہ پانچ چھ مہینے کا ہوا کہ جب شہر کے لوگ بھاگے میں بھی اپنے والدین اور ہمشیروں کے ساتھ پیدل ننگے سر گئی اور کرسی میں جا رہی وہاں نگین آرا بیگم کو بخار آیا تین روز وہاں پر مقام ٹھہرایا چوتھے دن وہاں سے سب بھاگے میں بھی بڑھی آگے آخر رفتہ رفتہ تقدیر ہم کو مصیبت کی جگہ لے گئی اور یہ صدمۂ غم ہم کو دے گئی کہ وہاں نہ دوا میسر ہوئی نہ طبیب، سو گئے ہمارے نصیب، کچھ نہ اس کو افاقہ ہوا گرمی سے سر کا تڑاقا ہوا جو جس نے بتایا وہ اس کو پلایا سترہویں رمضان کو اس نے انتقال کیا۔ ہمارا غیر حال کیا اب تک جب صورت یاد آتی ہے ٹکڑے چھاتی ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اپنے تئیں ہلاک کروں گریبان اور کسوت حیات چاک کروں ناچار ہوں اگر اس طرح کی موت نہ ہوتی حرام تو میں کرتی اپنا کام تمام، اب تم کو بھی دیتی ہوں سوگند خدا و رسول کہ تم اس کو پڑھ کے نہ ہونا ملول کیس واسطے کہ تم بھی بڑے بڑے صدموں میں مبتلا ہو۔ مورد آفات و بلا ہو۔ اور دوسرے یہ صدمہ جانگزا ہوا کہ سلطان بیگم نے بھی کی قضا، اگر وہ بھی ہوتی تو میں اپنے پاس رکھتی اور دل بہلاتی۔ کچھ تو بے چینی جاتی ہر چند دل پارہ پارہ ہے۔ مگر مرضی خدا سے کیا چارہ ہے اگر اب حال اپنا مفصل لکھوں تو ایک بار ہو۔ اور تم کو اس کے پڑھنے سے ملال بے شمار ہو۔ اور سترھویں تاریخ کو ماہ محرم کی سید علی واحد کو ہم نے طلب کر کے حال تمہارا استفسار کیا۔ انہوں نے خیریت کا اظہار کیا۔ گو تا دل کو چین ہوا۔ کچھ دیر موقوف شور و شین ہوا اطلاعاً لکھا ہے۔ اب قسم تم کو ہمارے سر کی جواب اس کا جلد بھیجو اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ فقط"

گو اس خط کے نیچے تاریخ نہیں ہے۔ مگر یہ خط شیدا بیگم کے ۱۲۷۳ھ کے دو خطوط کے بعد ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط محرم یا صفر ۱۲۷۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تھا شیدا بیگم کی نثر کا نمونہ اور یہ ایسا نمونہ ہے جو اس زمانے کے ادیبوں کی تحریر کے لگ بھگ ہے۔ اس مجموعہ میں شیدا بیگم کے پانچ چھ خطوط منظوم ہیں اور اکثر خطوط میں جگہ جگہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۰ شوال ۱۲۷۳ھ کے خط میں ایک بڑی اچھی نظم ہے۔ جو نقل کی جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ شیدا بیگم کو نظم اور نثر دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ اس نظم میں شیدا بیگم کے مخاطب جانعالم ہیں اور نظم مسلسل ہے جو عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔

ساقی ہو صحن باغ ہو، ابر بہار ہو ٭ پہلو میں تم ہمارے بعز و وقار ہو
ساون کا تو مہینہ ہو اور دن ڈھلا ہوا ٭ اور ننھی ننھی بوندوں کی پڑتی پھوار ہو
جھولا پڑا ہوا ہو کسی شاخ نخل میں ٭ اک سمت خوش گلو کوئی گاتا ملار ہو
کوئل کہو کہو کی صدا دے ہر ایک بار ٭ ٹپکا لگا ہو آنبہ کا فصل بہار ہو
اسوقت بول اٹھے جو پپیہا کہ پی کہاں ٭ اک تیر عاشقوں کے کلیجہ کے پار ہو
بنگلہ صنوبری بھی چمن میں ہو وہ پڑا ٭ فردوس جس کے دیکھنے سے شرمسار ہو

جو گفتگوئے راز نہ ہو کچھ خیال اور ٭ باتوں کی چھیڑ چھاڑ ہو بجتا ستار ہو
مہندی ہو ہاتھوں پاؤں میں اپنے رچی ہوئی ٭ اور عطر میں بسا ہؤا ہر تار تار ہو
جوبن وہ تم پہ ہم پہ ہو اسوقت نور کا ٭ حور و پری بھی آن کے جس پر نثار ہو
خالی ہو بزم و خل نہ ہو واں پہ غیر کا ٭ دل خوب کھول کھول کے بوس و کنار ہو
لب پر جو لب دھرے ہوئے ہو نہ ہاتھوں میں ہاتھ ہو ٭ سینہ ملا ہو سینے سے دل کو قرار ہو
شیدا تمہاری آٹھ پہر رہتی ہے ملول ٭ اب دیکھئے یہ آرزو کب آشکار ہو

بعض منظوم رقعوں کے ابتدائی شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

۲۸ رجمادی الآخر کا لکھا ہوا ایک منظوم رقعہ ہے۔ جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

اے شہنشاہ شہرِ حسن و جمال ٭ ماہِ تابان اوجِ فضل و کمال
گلِ شاداب گلشنِ خوبی ٭ سروِ آزادِ باغِ محبوبی!
حق سدا مہربان رہے تم پر ٭ اور علیؑ کی اماں رہے تم پر

بعض رقعات میں غزلیں بھی ہیں جن کی ردیف جانعالم کا نام یا تخلص ہے۔ مثلاً

سدھارے جب سے ہو تم میرے ملقا اختر ٭ مرا ستارہ ہی گردش میں آگیا اختر!

سفر سے جلد آؤ جانعالم ٭ جمال اپنا دکھاؤ جانعالم!

شہ ہند رشکِ قمر جانعالم ٭ کر اب مہر کی اک نظر جانعالم!

ایک مثنوی بھی بطور خط لکھی ہے۔ جو بہت بے ساختہ اور نہایت دردانگیز ہے۔ جس میں اپنے فراق اور لکھنؤ کے اجڑنے کا حال نہایت رقت خیز پیرایہ میں لکھا ہے۔ اور شعر نہایت اچھے کہے ہیں، بعض شعر نہایت بیساختہ نکل گئے ہیں جن کے منجملہ دو شعر یہ ہیں:

طوفانِ عظیم ترا اٹھا ہے ٭ خشکی میں جہاز ڈوبتا ہے
بے چین ہے غم سے جان تن میں ٭ مردے بھی تڑپتے ہیں کفن میں

اس مجموعے میں شیدا بیگم کے بعد حور بیگم کے رقعے زیادہ ہیں۔ یہ بھی واجد علی شاہ کی ایک چہیتی ممتوعہ تھیں، اس مجموعہ کی ابتدا، حور بیگم ہی کے رقعہ سے ہوئی ہے جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

جاندارِ کشورِ خوبروئی، شہریارِ اقلیمِ نکوئی، سلطانِ ملکِ حسن و جمال، خسروِ ماہ طلعتانِ شیریں مقال، ضیا افروزِ چہرۂ حور و پری، نور افزائے رخسارِ دلبری، شہنشاہِ گیتی ستان، خاقانِ ابن خاقان، مشتاقوں کے حال سے بے غم جانعالم سلامت رہو!

اب ہمارا وہ حال ہے کہ قلم کو لکھنے میں انفعال ہے دامن کاغذ سے منہ چھپاتا ہے۔ سر اٹھانے میں شرماتا ہے۔ تمہاری یاد نے ایسی صورت دکھائی ہے۔ کہ قابل دیکھنے کے صورت بناتی ہے ہر روز مانندِ رکن مزاحف جو دسلسل کا جو دھیان آتا ہے رکن ابتر کی طرح صورت حال ابتر ہے۔ اصلاح کا مقام نہیں، کیفیتِ اصلی پر کلام نہیں درد صدر کہ آغازِ فراق سے حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائے سخن دشوار ہے تخیل کو اظہار مدعا میں حشو کی شکل حجاب ناگوار ہے۔ ہر چند تحریر میں قلم رکن عروض کی صورت قدم جماتا ہے۔ مگر ضرب مضامیں سے کہ عجب طرح کی چوٹ ہے سینہ شق ہو جاتا ہے۔ وہ بیت کہ جس کو اتحاد قوافی سے مغائرت ہو مطلعِ مدعا نہیں کر سکتی یا وہ قافیہ کہ جس سے صورت زوائد پیش آئے گوہر مقصد کے مانند دامن مطلب میں نہیں بھر سکتی چمن صبر صرصرِ اضطراب سے پریشان ہے۔ جس کے نظارہ سے افسوس حاصل ہو یہ وہ گلستان ہے یقین ہے۔ کہ بلبلِ شوق کو دم نظارہ کماں ملال ہو۔ ہم کو اپنی ویرانیٔ وحشت سے سراپا انفعال ہے۔ صبح سے تا شام انتظار ہے ورودِ محبت نامہ میں دل بے قرار ہے۔ آنکھیں جانب در ہیں کبھی امیدوار کبھی مضطر ہیں، تاخیر تحریر سے عالم دیگرگون ہو جاتا ہے۔ ہاتھوں دل اچھلتا ہے۔ کلیجا منہ کو آتا ہے اور جو کبھی تقدیر نے یاری کی تمہاری محبت نے طرفداری کی۔ کسی نے کہہ دیا کہ لو خط آیا۔ جوشِ شوق نے ہم کو گھبرا کر اٹھایا ازبس کہ دل میں ارمان ہے کہنے لگی کہاں ہے کہاں ہے۔ دل مشتاق ہو کر لب پر آیا۔ کانوں کا پردہ اٹھایا مضامین پر جب عبور ہوا جی مسرور ہوا۔ پھر دو چار دن کو طاقت جسم میں آگئی، گھبراہٹ کچھ ٹھہری تسکین جلوہ دکھا گئی چند دم بیقراری سے فرصت پائی بے اختیار یہ غزل زبان پر آئی:

اے جانِ جان صورتِ جاں اعتبار کیا ٭ تم آؤ یا نہ آؤ ہمیں اختیار کیا
بے اپنے گل کے سیر گلستاں خراب ہے ٭ کیفیتیں دکھائیگی فصل بہار کیا
برہم ہوئے ہیں گیسوئے برہم کی یاد سے ٭ اب پوچھتے ہو تم سبب انتشار کیا
گیسو کی آرزو کبھی عارض کا اشتیاق ٭ دیکھیں دکھائے گردشِ لیل و نہار کیا

ممکن نہیں جو کوچۂ جاناں میں رہ سکے ٭ بیرون نہ جاتے ہے صبا کو غبار کیا
تو ایک دم میرے پہلو میں سو رہو ٭ یہ جانتے ہو تم اے جان غار کیا
قسمت کہاں جو دیکھئے صورت بھی یہ تم ٭ تھے امیدواری بوس و کنار کیا
بگڑی ہوئی ہے کیفیت مزاج ٭ تم ہم سے پوچھتے ہو ابھی بار بار کیا
آتی ہے خوش کسی گل پژمردہ کی بہار ٭ تم کو دکھائیں شکل دل داغدار کیا
لاکھوں حسین ہیں صورت جاناں کے شیفتہ ٭ ہم کس قطار میں ہیں ہمارا شمار کیا
کب ہے یقین کہ زینت آغوش ہو تمہاری ٭ اس دوران کے دل نہیں اختیار کیا

یوں تو اس مجموعے میں حور بیگم کے چودہ پندرہ رقعے ہیں اور ان میں دو تین پورے منظوم بھی ہیں مگر منظوم رقعوں میں کوئی خاص بات نہیں باوجود مغلق الفاظ کے استعمال کے حور بیگم نے اردو نثر بھی اچھی لکھی ہے نمونتاً منظوم رقعہ بھی تھوڑا سا نقل کیا جاتا ہے۔

اے خسرو خوش جمال میرے ٭ اے دلبر ذی کمال میرے
اے میرے انیس میرے جانی ٭ تم پر ہے تمی لی مہربانی
اے میرے وفاشعار دلدار ٭ خالق ذکرے تمہیں دل افگار
اے شعلۂ حسن عالم افروز ٭ عشرت ہو نصیب تم کو ہر روز

اسی طرح کے (۶۹) شعر اس منظوم رقعہ میں ہیں مگر کوئی خاص بات نہیں، ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ کے ایک رقعہ کو ملاحظہ کیجئے۔

انیس و ہمدم جانعالم، زیادہ محبت بہت عرصہ تک خبر خیریت تمہاری نہیں پائی طبیعت بہت گھبرائی خدا حقیقی تم کو صحت و عافیت سے رکھے، حال ہمارا گردش لیل و نہار سے بہت پریشان ہے لبوں پر جان ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب سے سب حالات تمہارے بھاگتے ہیں ہم بھی شہزادی کو لے کے ان کے ساتھ روانہ ہوئی اثنار راہ میں ہر ایک کا چھٹ گیا تمام مال و اسباب لٹ گیا جب سب ہی لوگ آباد ہونے لگے ہم بھی آئی۔ گھر میں آتے ہی یہ مصیبت اٹھائی کہ شہزادی دہیم آرا بیگم بیمار ہو گئی ہماری حالت زار ہوئی، آخر کو ماہ رمضان میں اس راحت جان نے قضا کی ہم واسطے رونے کے رہ گئی، اے جانعالم! خدا کی قسم سب سے میری حالت زیادہ تباہ ہے بہت دشوار کرنا نباہ ہے۔ اس وقت میں کوئی پرسان حال نہیں کسی کو ہمارا خیال نہیں، ہم کو تباہ اور پریشان دیکھ کے عزیز و اقارب ملازموں نے ساتھ چھوڑا ہے۔ سب نے ہم سے منہ موڑا ہے، لیکن تمہارے شاگرد عشیر نے وہ بات کی کہ دینے سے کسی ایسے وقت میں کم ہوئی ہو گی، جب ہماری تباہی کا حال انہوں نے سنا فی الفور آئے ہم سے کہا کہ میں خانہ زاد، فرمانبردار اسی طور سے ہوں جو ارشاد ہو بجا لاؤں لیکن یہ خلاصہ ہے اسی بیت پر خاتمہ ہے:

جان جاتی ہے دم نکلتا ہے ٭ کوئی اندر سے دل کو ملتا ہے

اب تم کو مناسب ہے اس کو پڑھتے ہی اپنی خیریت لکھ کر اندوہ دل ترود منزل ہمارا شاد کرو فقط۔

دوم ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ"

اوپر کے خط میں حور بیگم نے غدر کی بے خانمانی اور دہیم آرا بیگم کے انتقال کا تذکرہ کیا ہے مگر اس کی تفصیل ایک رقعے میں لکھی گئی ہے جو مجموعے میں نامۂ شوقیہ نوروزی بیگم کے نام سے مرتب نے شائع کیا ہے۔ دراصل یہ رقعہ حور بیگم ہی کا ہے۔ چنانچہ اس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

ہر چند قصہ ہماری بربادی کا لا تعد و لا تحصیٰ ہے۔ لیکن مختصر لکھا ....[1] ...... کہ جب ہمراہ محلوں کے ہیں شہزادی کو لے کے ننگے پاؤں نکلی تو راستے میں سب سے مفارقت ہوئی بدشواری تمام سعادت گنج پہونچنے کی نوبت ہوئی وہاں بڑی تلاش سے ایک مکان خالی پایا۔ اس میں دو دن کی بسر تیسرے روز خوف جان و آبرو وہاں سے کیا سفر غرض کہ یونہی ایک دن کہیں رہی اور دو دن کہیں رہی۔ اس آوارگی میں طاقت چلنے کی بھی نہیں رہی اثنار راہ میں کبھی کھانا ملا اور کبھی فاقہ ہوا۔ ایک دم بھی نہ رنج و الم سے افاقہ ہوا۔ آخر کو افتاں و خیزاں ہر قریہ اور قصبہ میں پھرتی ہوئی اپنے گھر معافی خاں کی سرا میں آئی وہاں آکر سب سے زیادہ مصیبت اٹھائی کہ شہزادی دہیم آرا بیگم بیمار ہوئی، ہماری حالت دل زار ہوئی، وہ صدمہ کس منہ سے بیان کروں کہ راحت جان ہماری ماہ رمضان میں قضا کر گئی خدا شاہد ہے کہ میں جیتے جی مر گئی اب تک جب اس کی صورت یاد آتی ہے کلیجہ چھاتی ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ میں بھی اس کی ہم پہلو ہو رہوں یا کچھ کھا کر سو رہوں۔ لیکن اگر اس طرح کی موت نہ ہوتی حرام تو میں اپنا کام کرتی تمام۔ اور اے جانعالم! خدا اور رسول اس کا گواہ ہے کہ سب سے زیادہ میری حالت تباہ ہے کھلنے پہننے کو حیران

[1] یہاں کے حروف طباعت میں چھوٹ گئے ہیں، تمکین

گھر تک جاتا رہا بے مکان ہوں چند روز سے ایک کرایہ کے مکان میں رہتی ہوں ہر گھڑی تکلیف کے صدمے سہتی ہوں اس وقت میں کوئی ہمارا پرسان حال نہیں کسیکو ہمارا خیال نہیں ہم کو تباہ حال دیکھ کے ملازموں اور عزیزوں تک نے منہ ہم سے موڑا ہے۔ سب نے ہمارا ساتھ چھوڑا ہے۔ مگر دن رات تنہائی آتش اندوہ میں جلا کرتی ہوں، پروانوں کی طرح تصور شمع اختیار میں ہر شب کباب ہوا کرتی ہوں، بقول راقم الحروف ؎

"حور کیا عشق میں تاثیر ہے اللہ اللہ ٭ ہر گھڑی کاوش تقدیر ہے اللہ اللہ"

ایک رقعہ فاطمہ بیگم کا اس مجموعہ میں ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

"غواص دریائے ہمہ دانی، مصلح کلیم ہمدانی، اختر اثر ج حشم حضرت سلطان عالم زید اللہ جود ہٗ طبعہ تمہاری فرقت سے دل بیتاب ہے۔ اور چشم پر آب ہے گردش آسمان کہن عجب نیرنگ دکھاتی ہے پاؤں کے تلے سے زمین سرکی جاتی ہے۔ بے تمہارے سارے شہر میں پڑا سنسان ہے۔ ویران ہر ایک مکان ہے تقدیر کام بناتی نہیں کوئی تدبیر بن آتی نہیں، آج کل دریائے غم کا ازدھام فزوں ہے۔ بحر جہان سے مثل حباب مٹنے کا سامان ہے۔ آتش فراق کے بھڑکنے سے شعلۂ آہ سوزان بلند ہے۔ مجھ بے ہجر پروانہ سوید ائے دل پسند ہے، تمہاری صرصر جدائی سے گریبان زندگی چاک ہے۔ ایسے جینے پر خاک ہے۔ اب طاقت بار جدائی کے اٹھانے کی نہیں رہی ہے۔ آٹھوں پہر دعا یہی ہے کہ خدا جلد تم کو یہاں لائے، چاند سی شکل ہم کو دکھائے" ؎

پھر وہ چرچے ہوں پھر وہی باتیں ٭ دن ہوں عشرت کے عیش کی راتیں

۲۲ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ

۴ ایک رقعہ دلپذیر بیگم کا نہایت لاجواب ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی جانعالم کی ایک ممتوعہ تھیں۔ جو لکھنؤ ہی میں رہتی تھیں، ان کی نثر نگاری کا ڈھنگ رقعہ سے ظاہر ہے۔

انیس ہمدم، مونس محرم حضرت جانعالم زید اللہ عشقہٗ محبت نامہ حورت ختامہ تمہارے نے ۱۲ ماہ رجب کو مثل تسکین دل غمگیں نزول کیا اور صورت روح جسم بے جاں میں حلول کیا ہماری طبیعت شاد ہوئی، قید غم سے آزاد ہوئی، تردد دور ہوا، دل مسرور ہوا اگر صدمۂ فرقت ہے۔ اس قدر تمہارا تصور ہے آٹھ پہر کبھی تمہارے دُرّ دندان کے تصور میں اشک بہاتی ہوں اور کبھی لب یاقوت گون کے دھیان میں دیدۂ خونبار سے لخت جگر مثل عقیق احمر ٹپکاتی ہوں، کبھی تمہارے سبز رنگ زمرد ہانی کے خیال میں دست حسرت غیرت مرجان سے اپنے عارض گلفام کو مارے طمانچوں کے لال کرتی ہوں اور کبھی لیشب خیال وصل کی تشنہ واسطے فرع قفقان کے سینہ پر دھرتی ہوں کبھی کاکل مشکین کی یاد میں نیلم کی طرح آنکھوں میں ایسی تیرگی چھاتی ہے کہ ہر ایک آنکھ پتھرا کے نگینۂ سلیمانی بن جاتی ہے غرض الیسار نج جدائی ہے کہ جان لبوں پر آتی ہے۔ اب خدا کامیاب جلد تم کو لائے اور عیش و عشرت کا دن دکھلائے فقط"

"بست و دوم شہر رجب محبوبۂ سلطان عالم دلپذیر بیگم"

مہدی بیگم بھی جانعالم کی ایک پیاری ممتوعہ تھیں، ان کے رقعہ سے جو اس مجموعہ میں ہے پتہ چلتا ہے۔ کہ بڑی اچھی اردو لکھتی تھیں، رقعہ مختصر مگر دلچسپ ہے۔ چنانچہ نقل کیا جاتا ہے۔

قمری سروستان محبت، طوطی شکرستان مودت، آفتاب آسمان کرم، حضرت جانعالم، زید اللہ حسن الحانہ، آنکھیں روتے روتے سفید ہوئیں، تمہارے اشتیاق میں رخسارے گھل گئے اشک باری سے فراق سے دل چین کسی وقت باقی نہیں، بے قراری دم بھر جاتی نہیں، سامنا ہے مصیبت کا ہر گھڑی اجل سر پر کھڑی ہے گھڑی تمہاری فرقت میں بیمار ہوں، زندگی سے بیزار ہوں، کچھ بس نہیں تقدیر سے، ناچار ہوں تدبیر سے، سینہ غم سے پارہ ہے ہر لحظہ دھیان تمہارا ہے۔

"کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا ٭ ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا"

عجب طرح کا انقلاب آیا کہ مرغ دل کو سیخ غم پر کباب پایا، ہمارے طائر ہوش کو تمہارے صیاد محبت نے قید کیا اور شہباز عشق نے کبوتر ہوش کو صید کیا۔ ماہی زبان آب چشم دہن میں بیتاب ہے۔ گوہر عیش و عشرت نایاب ہے۔ خون جگر ہر دم پیتی ہوں فقط تمہارے ذکر سے جیتی ہوں، ظاہر ہیں آثار جنوں، تمہارے شربت وصال کی پیاسی ہوں، اب جلد بامراد تمہیں یہاں لائے۔ اور صحیح و سلامت ہم سے ملائے فقط۔ بست و ہفتم رجب سنہ ۱۲۷۳ھ دلربائے جانعالم نواب مہدی بیگم

اختر پیاری ایک محل منو بیگم بھی تھیں جن کے دو رقعے اس مجموعے میں ہیں، یہ بھی بڑی اچھی نثر لکھتی تھیں، ایک رقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

چراغ دودمانِ خیر و سعادت، شمع شبستان محبت و صداقت!

اختر آسمانِ بیم حضرت جانعالم زید اللہ نور جمالہ، محبت نامہ

مہر شمامہ سر قوم نہم ماہ رجب کا معرفت منشی صفدر جلوہ گر ہوا۔

روشن سارا گھر ہوا۔ خورشید مضمون نے گرد و بن صفحہ نیلگون

سے طلوع کیا، دیدۂ غم دیدہ منور ہونے لگا۔ جب دیکھنا

شروع کیا سبحان اللہ کیا عبارت تھی۔ ماشاء اللہ کیا فصاحت

تھی، ہر فقرہ گوہر شاہوار تھا تسکین بخش دل بے قرار تھا۔

تمہاری تحریر کیا خوب، تقریر تمہاری دل کو مرغوب ہے۔

جدائی سے حال بہت غیر ہے ناچار در پیش ملک عدم کی سیر

ہے۔ جب خط تمہارا آتا ہے۔ دل تھوڑی دیر آرام پاتا ہے

پھر بدستور ہوتی ہے بے قراری، چشمۂ چشم رہتا ہے جاری

اب جامع المتفرقین وہ دن لائے کہ تم کو ہم سے جلد ملائے فقط۔

"بست و ششم شہر رجب ۱۲۷۳ھ جانانہ جانعالم منور بیگم"

فرخندہ محل بیگم بھی ایک فراق زدہ محل جانعالم تھیں، اس مجموعے میں پانچ رقعے ان کے بھی ہیں، ایک رقعہ میں انہوں نے کارتوس پر انگریزی فوج کی برہمی کا حال لکھا ہے جسکا یہ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"......... اور دوسری یہ ایسی تازہ روداد ہوئی کہ

جس سے طبیعت کچھ کچھ شاد ہوئی کہ آٹھویں کو اس مہینے کی

روز یکشنبہ دوپہر سے فوج انگریزی تقسیم پر کارتوسوں کی بگڑ

گئی، جنگ و جدل کی ٹھہر گئی، سب فوج موسیٰ باغ میں

عیسائیوں کے قتل کو لیک جا ہوئی اول ہیبتوں پر ہیبت

غالب سوا ہوئی، کتنا مردمان فوج کو سمجھایا ان لوگوں کے

خیال میں نہ آیا، آخران گدھوں نے کئی سو گورے نکالے

اور قریب شام اوس سمت کو روانہ کیا۔ لیکن کسی نے

صلح کو روانہ کیا۔ وقت تحریر تک وہی مجمع کثیر ہے۔ دیکھئے

کیا ہوتی اس کی اخیر ہے۔ بے ڈھب ہوا یہ بگاڑ ہے، اب

تو عیسائیوں کو موسیٰ باغ جانا پہاڑ ہے۔ اطلاعاً لکھا ہے آگاہ

تم کو کیا ہے۔ اور اے جانعالم معلوم نہیں یہاں کے اخبار

ہر روز تم کو گذرتے ہیں یا اہلکار پوشیدہ کرتے ہیں، جیسا

چاہو ویسا لکھو۔ کہ ہم یہاں سے تحریر کیا کریں اخبار اور

حال مفصل کیا کریں اظہار فقط۔"

"ششم شہر صوم ۱۲۷۳ھ"

۷- خاص محل جانعالم کی بڑی چہیتی تھیں جو جان عالم کے ساتھ کلکتہ گئیں مگر پھر خفا ہو کر لکھنؤ لوٹ گئیں، جانعالم نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر وہ رہنے پر راضی نہیں ہوئیں، اس کا قلق جانعالم کو بہت تھا، چنانچہ انہوں نے اس حال پر ملال کی تفصیل ایک خط میں فرخندہ محل کو بھی لکھی اور اسی کے ساتھ اہل ہند پر تبرا بھی کیا۔ اس خط کے جواب میں فرخندہ محل نے جو کچھ لکھا ہے نقل کیا جاتا ہے۔

"......... اور حال نواب خاص محل صاحبہ کے چلے

آنے کا معلوم ہوا اور تمہارا ہاتھ باندھ کے سمجھانا مفہوم ہوا

وہ تو ایسی نہیں بے وفا ہیں۔ تم پر ہزار جان سے فدا ہیں۔ مگر

بے سبب وہ تم کو چھوڑتی نہیں اور بے وجہ منہ موڑتی نہیں۔

کچھ تو انہوں نے رنج پایا۔ جو چلا آنا یہاں کا پسند کیا اور جو

تم نے لکھا کہ "لعن اللہ علیٰ اہل ہندوستان" اس لکھنے کے

وقت تمہارا دھیان تھا کہاں؟ کہ سکان ہند کیسے کیسے ہیں

اور شہروں میں لوگ ایسے بستے ہیں۔ علی الخصوص لکھنؤ

میں کس کس طرح کے دیندار ہیں، صدہا عالم و فاضل اور

مفتی اور ابرار ہیں، ہر چند بدکار بھی بے شمار ہیں لیکن ان

میں کچھ عاقل ہیں۔ کچھ ہشیار ہیں، چنانچہ بقول شخصے۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد ٭ خدا پنج انگشت یکسان نہ کرد

مگر اس مقام پر قطعہ سعدی نے قطع کلام کیا، لہذا یہ نامہ

اسی پر تمام کیا۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ٭ نہ کہ را منزلت باشد نہ مہ را

نے بینی کہ گاوِ در علف زار ٭ بیالاید ہمہ گاوان دہ را

فقط دہم رمضان ۱۲۷۳ھ

۸۔ کنیز فاطمہ بھی ایک محل جانعالم تھیں۔ ان کا ایک رقعہ اس مجموعہ میں ہے۔ جو نقل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑی اچھی تحریر کی مالک تھیں۔

تازگی بخش گلہائے محبت، رونق افزائے بوستان مودت

دافع درد و الم حضرت جانعالم زید اللہ عشقہ، محبت نامہ تمہارا

دلوں سے پیارا مانند فصل بہار کے آیا۔ خانۂ ویران ہمارا

رشک گلزار فرخار بنایا، دور سارا غم و ملال کیا، ہم کو اوس نے نہال کیا باعث آرام دِل آشفتہ ہوا، غنچۂ طبیعت شگفتہ ہوا، سبحان اللہ کیا خوب مضامینِ رنگین تھے کہ گلہائے مضامین کی خوشبو سے معطر دماغ ہوا، سینہ خوشی سے باغ باغ ہوا۔ گھڑی دو گھڑی تو بے کلی دور ہوئی پھر وہی حالت بدستور ہوئی حال ہمارا یہ ہے کہ تمہارے غم سے دل مضطر ہے جان آئی لب پر ہے نرگس چشم حیران ہے۔ سنبل زلف پریشان ہے۔ رخ و محن میں چمن چمن ہوں، صورت بلبل نعرہ زن ہوں۔ ہر چند قصہ ہجر کا طولانی ہے لیکن مختصر یہ کہانی ہے۔ اے یوسفِ دوران! زلیخاوار تمہارے بیابان محبت میں ہوں سرگردان ؏

"مسر ہو نہیں اس میں کچھ فرق ہے وہ مرا دل تری چاہ میں غرق ہے"

اب بحر ہے آنسوؤں کا رواں۔ روانہ ہوا صبر کا کاروان تمہاری فرقت میں یہ میرا عالم ہے۔ دل مضطر ہے۔ چشم پُر نم ہے ؏

"گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں در ہوا ست سر بصحرا میزنم لیکن حیاز نجیر پاست"

"راقمہ مطلوبۂ جانعالم کنیز فاطمہ بیگم"

۸) اس مجموعے میں کئی ایک نام ہمیں ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اب تک جانعالم کے سلسلہ میں نہیں سنے گئے تھے، چنانچہ ان کے منجملہ ایک "نواب وزیر صاحبہ" بھی ہیں جن کا ایک رقعہ موجود ہے۔ جو نقل کیا جاتا ہے۔ یہ خاتون بھی خوب لکھتی ہیں۔

سرورِ خوبانِ جہاں، داورِ محبوبانِ دوران۔ اخترِ آسمانِ کرم حضرتِ جانعالم، زید اللہ نور حسنہ ؛

بیا بیا کہ ترا تنگ درکنار کشم ۞ بہ تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

"داستان تمہارے فراق کی طولانی ہے دریائے اشک کی بار بار طغیانی ہے۔ عجب طرح کی پریشانی ہے۔ چھوٹا کھانا پینا ہے غم کی ایسی اٹھی گھٹا کہ زورِ بدن کا سب گھٹا زمانے کی کیسی ہوا بدلی کہ آفت کی چھائی بدلی، سر پہ تیغ الم دمبدم چمکتی ہے بجلی بلا کی خرمن ہستی پر دمکتی ہے۔ آتش شوق دل میں بھڑکتی ہے جان تن میں پھڑکتی ہے۔ بغیر تمہارے نہیں کل، اشتیاق میں لکھتی ہوں یہ غزل ؏"

مرے گل پیرہن سلطانِ عالم! — مرے غنچہ دہن سلطانِ عالم!
تو ہی ہے خسروِ ملکِ معانی — مرے شیریں سخن سلطانِ عالم!
جدا ہم سے ہوئی فرقت میں تیری — تو اِن جان و تن سلطانِ عالم!
تمہارے ہجر میں ہم نے اٹھائے — بڑے رنج و محن سلطانِ عالم!
ستم سے باغیوں کے شہر چھوڑا — بسایا جا کے بن سلطانِ عالم!
ستارے نے نئی گردش دکھائی — پھرا چرخِ کہن سلطانِ عالم!
ترے پیچھے ہوا جاتا ہے برباد — مرا سب بانکپن سلطانِ عالم!
رہیں یاور تمہارے شش جہت میں — خداوِ پنجتن سلطانِ عالم!
وزیرِ غم زدہ تیری ہے مشتاق — مرے شاہِ زمن سلطانِ عالم!

"۸ا۔ رجب وزیر بیگم"

امراؤ بیگم جانعالم کی ایک محبوب ممتوعہ تھیں، ان کے متعلق محل خانہ شاہی میں جانعالم نے لکھا ہے۔

ایک کسبی رضی الدولہ بہادر کی معرفت ماہ رمضان المبارک میں پسند طبع ہمایوں ہو کر معہ اپنی ماں کے میرے گھر پڑی۔ اور حضور السلطان امراؤ بیگم صاحبہ خطاب سے مخاطب ہوئی اس کا مبلغ دو ہزار روپے ماہانہ مقرر ہوا۔ حقیقت میں ناچ گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، (محل خانہ شاہی ص۔)"

لکھنؤ کے مسکونہ محلات کی حالت زمانہ غدر میں بیان کرتے ہوئے جانعالم نے داروغہ واجد علی کی زبانی اپنی مثنوی حزنِ اختر میں بیان کیا ہے۔

"محل ساتواں وہ جو امراؤ تھا — وہ با خیر و خوبی یہاں پہ رہا"

(مثنوی حزنِ اختر ص۹۹)

انہیں حضور السلطان نواب امراؤ بیگم صاحبہ کا ایک رقعہ اس مجموعہ میں ہے جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"طوطیٔ رنگین بیان، بلبل ہزار داستان مرہمِ زخم درد الم جانعالم! ہمیشہ رہے محبت تمہاری مدت مدید، اور عرصہ بعید ہوا کہ تحریر تمہاری نہیں آئی۔ خبر خیریت کی نہیں پائی۔ ہم نے کئی خط تم کو بھجوائے جواب ایک کا بھی نہ ملا۔ غنچۂ دل نسیم عشرت سے نہ کھلا، بیس روز گزرے کہ ایک خط منشی سرور کے ذریعہ ہم نے بھجوایا اس کا بھی جواب اب تک نہیں آیا۔"

معلوم نہیں یہ کیا سبب ہے۔ تشویش زیادہ مجھکو اب ہے مرا تو غیر حال ہے تم کو کچھ نہیں خیال ہے محبت میں یہ بات نہیں چاہیئے۔ جہاں تک ہو سکے رسمِ الفت کو نبھایئے۔ میں یہ نہ جانتی تھی۔ کہ وہاں جا کے تم مجھکو فراموش کر دو گے۔ اور غم

بخیریت سے بیہوش کردگے، تم کو لازم تھا کہ بہ روز بشارت یا قی نامہ جات سے ہمارا دل شاد کرتے، لیکن اب تو ہفتہ عشرہ میں بھی نہیں یاد کرتے۔

نہیں آتا ہے اب قرار مجھے — تیرے خط کا ہے انتظار مجھے
حال اپنا میں کیا کروں اظہار — بس تو دھیان مجھکو ہے ہر بار
دن کو رہتا ہے اضطراب مجھے — شب کو آتا نہیں ہے خواب مجھے
ہر گھڑی حال غیر ہے جانی! — خاتمہ اب بخیر ہے جانی!
گر ہے گا یہی تمہارا رنگ — اور ہو جائے گا ہمارا رنگ

۱۱ جانعالم کی ایک محل مناجان بھی تھیں جن کے دو رقعے اس مجموعے میں ہیں، چنانچہ ایک رقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

مہر سپہر دلبری، غیرتِ ماہ و مشتری، سرو رِ دلہائے پُر غم سلطان عالم، یکہ جان جانعالم ادام اللہ بقاء کم۔ ابعد۔ رقعہ صحیفہ شریعہ مرقومہ بست و ششم ماہ رمضان پہنچا ہوا تمہارا ہمارے دل و جان سے زیادہ پیارا، ہر شہ جمال یعنی ماہ شوال کو گویا آتش عشق کو بھڑکایا۔ حال تمہاری صحت کا سن کے ہمارے دل نے بڑا مزا اٹھایا۔ سینہ خوشی سے رشک گلشن ہوا۔ گھر ہمارا روشن ہوا۔ یہ حال سن کے گھڑی دو گھڑی تو خوشی کی رہی صورت، پھر زیادہ ہونے لگا غم فرقت، اب خنجر غم دل پر چلتا ہے۔ جان جاتی ہے۔ دم نکلتا ہے۔ اور خدا سے ہر وقت یہ دعا ہے کہ تا صد و سی سال تم کو سلامت رکھے، کیونکہ تمہاری صحت سے ہماری صحت ہے۔ جس طرح حکیم مطلق نے عارضۂ تپ تم سے کیا دور، ہمارا دل ہوا مسرور، اب جامع المتفرقین حجاب فرقت بیچ کے تمہارے درمیان سے اٹھائے اور ہم کو تم سے ملائے کہ دفع ہو یہ رنج و الم پھر ہم تم ہوں باہم فقط۔

مرقومہ یازدہم شوال ۱۲۷۳ھ

۱۲ ایک رقعہ اس مجموعے میں امراؤ محل کا ہے۔ یہ خاتون امراؤ بیگم صاحبہ کے علاوہ ہیں چنانچہ اس رقعہ کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

جان جہاں، سلیمان زمان، سلطان انسان، عیسیٰ ہر امراض الم جانعالم! ہمیشہ رکھے اللہ کمال تمہارا گلستان عشق کا پھول، راحت دلہائے ملول، اختر رخشندۂ برج محبت، گوہر تابندۂ درج مودت ہم کو لکھ جان سے عزیز، یعنی تمہارا مکتوب الفت اسلوب،

بست و ہفتم شعبان کا لکھا ہوا یوسف علی خان بہادر کی معرفت ہمارے خانۂ امید کا روشن کرنے والا ہوا۔ تمام گھر میں اجالا ہوا۔ احوال شوقیہ ظاہر ہوا۔ دل ہمارا اس کے مضامین رنگین سے ماہر ہوا.........."

خدا دور تم سے کرے یہ الم — نہ ہوئے کسی بات کا تم کو غم
حکومت اسی طرح پھر تم کو دے — قیامت تلک ملک قائم رہے
جہاں میں نہ تم کو بھی ہو ملال — محب شاد ہوویں عدو پائمال

۱۳ دو رقعے اس مجموعہ میں نوروزی بیگم کے ہیں جن میں سے ایک تو وہی ہے جو غالباً حور بیگم کا ہے۔ اور جسے ہم نے غدر کی تفصیل کے سلسلہ میں نقل کیا ہے۔ دوسرا رقعہ نوروزی بیگم کا ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ کا لکھا ہوا ہے جسکا ابتدائی حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"مہر سپہر دلبری، غیرت ماہ و مشتری، یوسف جمال عیسیٰ کمال گرو بلبل نو رسہ دستان، شیریں مقال آرام جان و جگر، سلطان عالم بلکہ جانعالم اختر، ادام اللہ بقاکم:

دلم از فراق خون شد تو براہ دیدہ باشی — بہ بہت غبار گشتم ز صبا شنیدہ باشی

عرض ہوا کہ درج وفا کا گوہر اور برج وفا کا اختر، باغ محبت کا شجر، نخل مودت کا ثمر یعنی نامہ نامی، الفت ختامہ گرامی تمہارا شوق وصال سے مملو، راحت روح ہمارا، محبت کا کرتا اشارہ نہ آیا۔ ہمارے خانۂ دل کو کلبۂ احزان بنایا اور بھی کسی سے خبر تمہاری خیریت کی نہیں پائی طبیعت نہایت ہی گھبرائی، بدلی غم کی ہے دل پر چھائی جان لب پر آئی۔

دل بہت بے قرار ہے صاحب! — رات دن انتظار ہے صاحب!

....

یہ نمونے تھے اختر پیا کی پیاری بیگمات کے رقعات کے، اب اختر پیا کے رقعات کا نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔ اس مجموعہ میں صرف (۲) رقعے جانعالم کے ہیں، جو موسومہ ہیں شیدا بیگم، فرخندہ محل فاطمہ بیگم امراؤ محل اور مناجان کے۔ ۱۰ رجب ۱۲۷۳ھ کو شیدا بیگم کے نام جانعالم نے ایک رقعہ لکھا ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

جانِ جانعالم، نواب شیدا بیگم صاحبہ ازاد حسنہا و جمالہا، و دلتشفی۔ نامے تمہارے ایک سب موزون، ایک نثر میں شعر احوال گوناگون آئے۔ انجم الدولہ بہادر نے نویں رجب کو لا کر دکھائے دل شاد ہوا۔ طبیعت میں قوت آئی جان تازہ تن بے جان میں

پائی، سراپا خوب تھا۔ دل کو ہمارے نہایت مرغوب تھا۔ مگر اے جانی! اب ہم وہ نہیں رہے رنج نے حالت تباہ کی اُوٹھے تو نالہ کیا بیٹھے۔ تو آہ کی، خدا وہ دن پھر لائے۔ کہ یہ گُلِ خزاں رسیدہ رونق تازہ پائے۔ کوششوں کا۔ مکانوں کا تم نے سنا ہوگا کہ فضلِ خدا سے ان پر قبضہ ہوا قدرت ہوئی پھر بدستور حالت ہوئی، وہ دن بھی قریب ہے کہ انشاء اللہ تعالے بندہ فتح نصیب ہے

فقط مرقوم دہم رجب ۱۲۷۳ھ راقم جانعالم"

فرخندہ محل کے نام کا ایک رقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

زیب بخش چار بالش محبت، رونق افزائے بساطِ الفت، نواب فرخندہ محل صاحبہ جمال باکمال ہمیشہ روز افزون رہے، محبت نامہ تمہارا بیچ تاریخ ۲۳ رجب کے معرفت منشی صفدر کے آیا۔ کاشف حالات مندرجہ ہوا خبر صحت اثر فرا رہ خاطرِ مضطر ہوئی اس نامے سے بو محبت کی آئی تسکینِ خاطر پریشان نے پائی تم نے لکھا ہے خط آنے سے عید ہوئی۔ جانعالم کی عید تو اس دن ہوگی جس دن ہم تم سے ملیں گے۔ دیکھئے خدا وہ دن کب دکھاتا ہے اور وقت کب آتا ہے۔

"بہ بینم کہ تا کردگار جہان ٭ درین آشکارا چہ دارد نہان"

لازم کہ دعا سے غافل نہ رہو۔ اور نظر اس کے فضل پر رکھو۔ کیا عجب کہ مدت مہاجرت تمام ہوچکی ہو۔ اور زمانۂ سرور و مدت انبساط قریب پہونچی ہو۔ خدا شاہد ہے۔ کہ اب تاب مفارقت کی باقی نہیں رہی۔ محبوب کے مقدمہ میں جو لکھا تھا ہم جانتے تھے۔ تم فہیم ہو خوش ہوگی۔ الحمد للہ ویسا ہی ہوا۔

"مرقوم بست و پنجم رجب ۱۲۷۲ھ"

فاطمہ بیگم کے نام جو محبت نامہ الفت شمامہ لکھا گیا ہے وہ یہ ہے۔

رشکِ بدر، مشتری قدر، زہرہ جمال، مہر مثال، حور نژاد، پری نہاد، گل رو، سمن بو، انیس و ہمدم، خوبیٔ مجسم، نواب فاطمہ بیگم صاحبہ! اسم با مسمےٰ رہو۔ مکتوب محبت اسلوب غرۂ شعبان کو منشی صفدر کی معرفت نشاط بخش غرۂ شوال ہوا۔ دلِ غمزدہ دولت خرمی سے مالا مال ہوا۔ شوقِ وصال دوچند ہوا ذوق بوس و کنار بلائے دلِ دردمند ہوا۔ جامع المتفرقین کہیں اس عذاب سے نکالے مریضان فراق کو شربت وصال سے سنبھالے پھر

اسی طرح ہمارا تمہارا ساتھ ہو ہمارے گلے میں تمہارا اور تمہاری گردن میں ہمارا ہاتھ ہو۔

مرقوم چہارم شہر شعبان ۱۲۷۲ھ " راقم جانعالم"

امراؤ محل کا موسومہ رقعہ بھی مطالعہ کیجئے۔

جانِ جانعالم، بانیٔ جور و ستم، گلرخانِ عالم کے کعبۂ اعلیٰ نواب امراؤ محل صاحبہ! بادۂ حسن لازوال سے سرشار اور عنبر گیسوئے مشکیں تمہارا غیرت دہ چین و تاتار ہے۔ کاہش تن سے غیرتِ ہلال ہوں، صدمۂ مفارقت سے غمگین بدرجۂ کمال ہوں۔ آمد فصل بہار نے نیا رنگ والم دکھایا ہے۔ بادِ صرصرِ آہِ آتشین سے غنچۂ وحشت کھلایا ہے۔ تمہارا بلبلِ گل رخسار یعنی اختر جگر افگار ہوش و حواس سب بھولا ہے۔ کلیجا منہ کو آتا ہے۔ جنون اپنا زور دکھاتا ہے۔ اے مسیحا دل بیمار ہمارا کیا کرے کسی نوع جان زار بغیر شربت وصال تمہارے کے آرام نہ پائے گی۔ جانی! تمہیں بتاؤ مشتاق تمہارا کس طبیب کی دوا کرے۔ اے قلم سینہ چاک ولے خامۂ دیدۂ غمناک تیرا کدہر خیال ہے۔ تحریر داستان فراق محال ہے لکھنا جواب خط کا مطلوب ہے یہ بات دل کو مرغوب ہے۔ دیباچۂ نشاط یعنی خطِ مسرت ارتباط تمہارا ۱۰ شعبان کو انجم الدولہ کی معرفت آیا اس کے مضمون کو اپنے زخم جگر کا مرہم بنایا۔ جب تک حصول مواصلت ہو خدا وکتابت میں غفلت نہ ہو۔

زیادہ شوق ست دبس باقی ہوس' ۲۰ شعبان ۱۲۷۳ھ

"راقم خستہ جگر جانعالم اختر"

مناجان کے نام اشتیاق نامۂ مودت شمامہ جانعالم یوں لکھتے ہیں

جانِ من راحت جان و دل۔ صندل دردِ سرِ مضمحل۔ باعث آبادی شہر عاشقاں۔ بہار ریاض و چمنستان۔ مناجان! تفریح بخش غنچۂ خاطر اختر مضطر ہو۔ خط تمہارا دل سے عزیز جان سے پیارا۔ بست و یکم شہر حال معرفت کنز الدولہ بہادر کے کلید قفل مسرت ہوا۔ منظومات مندرجہ بالا سے دریافت ہر ایک حال ہوا۔ اہل شہر کی بے قراریاں معلوم ہوئیں ان کی ایذائیں سب مفہوم ہوئیں واللہ جانِ جان! ان سے زیادہ بے قرار ہوں۔ گھر چھوڑے ان کے لئے ساکن دیارِ نکبت آثار ہوں۔ آگے جو مقدر زیادہ مسرت ہم آغوشی۔

مرقوم ۲۳ رجب ۱۲۷۲ھ " راقم جانعالم"

واجد علی شاہ کی بادشاہت اگرچہ برائے نام رہی اور پھر آخری عمر "قید فرنگ" میں گزری مگر اس جدت پسند اور نازک مزاج بادشاہ نے "کشور اردو" میں اپنی حکومت قائم کر دی اور اپنا گزو سکہ جاری کر دیا۔ آج بنگال، رنگون اور برما میں جتنے اردو بولنے والے ہیں وہ اسی بادشاہ مغفور کی رعایا ہیں۔ آج جو چہل پہل اردو بازار میں نظر آتی ہے وہ اسی کے نام کا ظہور ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا علی حیدر نظم طباطبائی جیسے عالم اور اردو کے محسن اسی شیارا ج کے ساختہ او پرداختہ ہیں جو اس قیدی رنج و محن کا زندان تھا۔ افسوس ہے کہ میرامن اور سرور جیسوں کے نام اردو کے محسنوں میں لئے جاتے ہیں مگر واجد علی شاہ کا نام جس نے شروع سے آخر تک اردو کی اتنی خدمت کی بھلا دیا گیا ہے۔ ع

اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

عالم خیال میں

آؤ اُن گذری ہوئی ناکامیوں کو بھول جائیں
آؤ مل کر مختصر لمحوں کو کر لیں جاوداں
(رنج و غم کی داستاں) بدنامیوں کو بھول جائیں
آؤ پھر اک بار — پھر اک بار ہو جائیں جواں

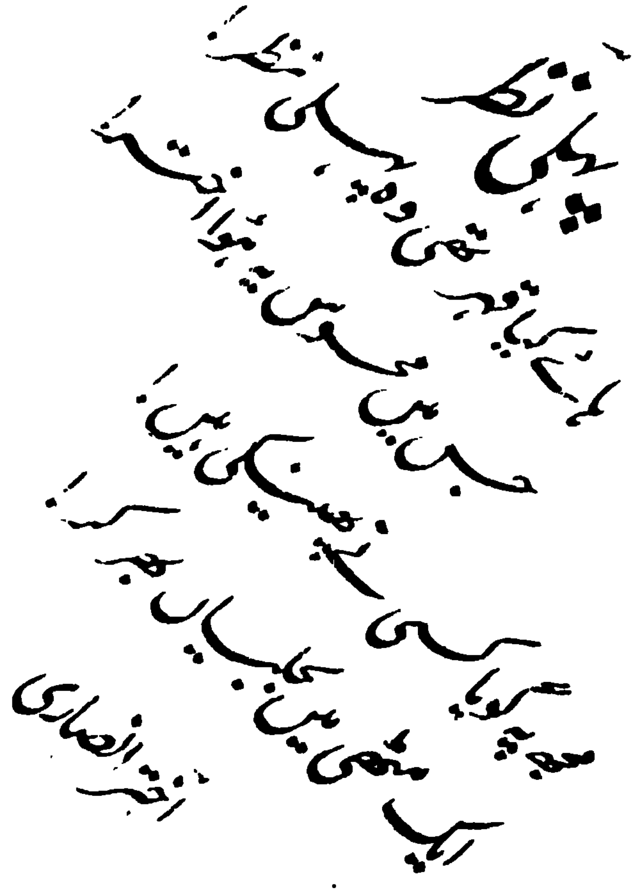
آؤ لوٹیں پھر اُنہی معصوم بوسوں کی بہار
آؤ پھر بھولے ہوئے وعدوں کو کر لیں استوار
زندگی کے دن تو ہونے ہیں یہی بس تین چار
آؤ پھر کر لیں ذرا جی کھول کر پہلا سا پیار

تم مری وارفتگی کی داستاں کو بھول جاؤ
عشق کی رسوائیاں، رسوائیاں ہوتی نہیں
اس زمانے کے زمین و آسماں کو بھول جاؤ
اس جگہ اپنی تمنّائیں جواں ہوتی نہیں

آؤ ہم تم جذب ہو جائیں پرانی یاد میں
اور اُنہی گزرے ہوئے لمحوں کو دہرایا کریں
آؤ پھر آباد ہو جائیں بہار آباد میں
اور اس کھوئی ہوئی دنیا میں کھو جایا کریں
آؤ اُن گزری ہوئی ناکامیوں کو بھول جائیں
آؤ مل کر مختصر لمحوں کو کر لیں جاوداں

حمید عرفانی

تسکین عابدی



سرمایہ دار

بادۂ گلرنگ سے لبریز ہیں جن کے سبُو
جن کے پیمانوں میں رقصاں ہے غریبوں کا لہو

جن کے فانُوسوں میں ہیں مزدور کے سینے کے داغ
آندھیوں میں جل رہے ہیں جن کی نخوت کے چراغ

جن کے باعث مفلسوں پر عرصۂ ہستی ہے تنگ
جن کے چہروں پر ہے مظلوموں کے خوں سے آب و رنگ

مدعائے زندگی جن کا ہے سودائے نمود
بے نواؤں کو پیامِ مرگ ہے جن کا وجود

جو کسی بے کس سے ملتے ہیں بصد کبر و غرور
نشۂ دولت سے ہے جن کے دماغوں میں فتور

جن کی رگ رگ زر کی زنجیروں میں ہے جکڑی ہوئی
زعمِ باطل سے ہیں جن کی گردنیں اکڑی ہوئی

تیرہ ہے جن کے گناہوں سے ضمیرِ کائنات
ڈھونڈتے ہیں ظلمتِ عصیاں میں جو آبِ حیات

فطرتِ انساں بھی ہے جن کی روش سے شرمسار
جن کو پیدا کر کے شرمندہ ہے خود پروردگار

تم کو او مرعوب کر دے ان درندوں کا شکوہ!
اٹھ خدا کا نام لے کر فاقہ مستوں کے گروہ!

حفیظ ہوشیارپوری

فرنگی مُبلّغ دربارِ مغلیہ میں

سولہویں صدی عیسوی بھی ہندوستان کی تاریخ میں گوناگوں اہمیتوں سے خالی نہیں کہنے کو تو ظہیر الدین بابر سلطنت مغلیہ کا بانی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے سر صرف اس امر کا سہرا ہے کہ اس نے مغلوں کی اس تمنا کو جو وہ صدیوں سے اپنے دل میں لئے ہوئے تھے پورا کر دیا۔

چنگیز خاں کے حملے سے لیکر جو ہندوستان پر شمالی مغربی دروں سے ایک آفتِ ناگہانی کی طرح جھپٹا تھا نہ معلوم کتنے لاتعداد حملے مغلوں نے ہندوستان پر کئے لیکن ان کی حقیقت باد صرصر سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ آندھی آتی تھی اور اپنی رو میں جو کچھ تباہ و برباد کر سکتی تھی کر دیتی تھی اور پھر مطلع غبار ہے اس طرح پاک و صاف ہو جاتا تھا کہ اس کا اثر بھی باقی نہ رہتا تھا لیکن آخر میں مغلوں کا حملہ ہندوستان کے لئے ایک روگ اور مستقل خطرہ بن گیا تھا۔ غیاث الدین بلبن کی ساری عمر ان ہی حملوں کی مدافعت میں کٹی۔ علاء الدین خلجی و تغلق کی تمام دوراندیشیاں مغل حملے کے اندیشہ کے نذر ہوگئیں اور آخر میں ابراہیم لودھی نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی خون آشام سرزمین پر ہندوستان کے ہزاروں سورماؤں کی گردنیں کٹوا کر مغلوں کی کم و بیش تین صدیوں کی آرزو کو پورا کر ہی دیا۔ یہ سب کچھ ہوگیا۔ بابر تختِ دہلی پر متمکن بھی ہوگیا۔ لیکن سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد نقش بر آب رہی۔ بھلا ہو جلال الدین اکبر کا جس نے بنیاد کو اس قدر مستحکم کیا کہ سلطنت مغلیہ ۱۵۷۰ء سے ۱۸۵۷ء تک اپنے دورِ انتزاع کو کسی نہ کسی طرح کاٹ لئی اور جب غدر کے بعد زمانے نے کروٹ لی تو اس وقت بھی دہلی میں مغلوں کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

<u>عہدِ اکبری</u> جلال الدین محمد اکبر کا عہد تاریخ مغلیہ کا پہلا باب ہے یہ وہ زمانہ تھا جس میں فرنگستان کے منچلوں کے سر میں ہندوستان کا سودا سمایا انگلستان نے اس میں تقدیم کی اور اس کا ثمر اس کو یہ ملا کہ ۱۸۵۷ء میں وہ تخت مغلیہ کا جانشین ہوگیا۔ فرنگیوں کے ہندوستان کی طرف کھنچنے کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک سبب اکبر کا انسے حسنِ سلوک اور مذاہب سے رواداری بھی ہے۔ اس زمانے میں آگرہ دارالحکومت تھا اور فتح پور سیکری تمام مذاہب کے علما و مبلغین کا مرکز۔ اورنگ زیب کے عہد تک آگرہ کی گہما گہمی کم نہیں ہوئی اور سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ہزارہا نہیں تو صدہا فرنگی بلا امتیاز نسل و قوم بلادِ مشرق و مغرب سے سمٹ کر اکبر آباد در آگرہ میں آباد ہوگئے۔ اس اعتبار سے آگرہ کے فرنگیوں کی تاریخ دنیا کے کسی دوسرے شہر کے فرنگیوں سے کسی طرح کم رومان خیز نہیں۔ ان فرنگیوں کا ذکر ہمارے ملک کی تاریخوں میں شاذ و شاذ ہے۔ لیکن یورپین مورخین کے بعض تذکرے ملیں گے جن سے ثابت ہو سکے گا کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے آگرہ میں کافی یورپین آبادی موجود تھی۔ آگرہ میں اب بھی بے شمار قبریں فرنگیوں کی موجود ہیں۔ مزاروں کی لوحیں بحیثیت مجموعی ایک تذکرہ ہیں۔ ہر لوح سے مرنے والے کی پیدائش بخیر زندگی کا تھوڑا بہت حال معلوم ہوتا ہے ان قبروں کی تعداد ۱۶۰۰ سے ۱۸۰۰ تک ہے۔ مرنے والوں میں انگریز بھی ہیں اور فرانسیسی بھی اطالوی بھی ہیں اور جرمن بھی۔ پرتگالی بھی ہیں اور اسپین کے باشندے بھی۔ اہل ہالینڈ بھی ہیں اور اہل سوئٹزرلینڈ بھی لیکن ان میں خداشناس ہستیوں کے زیادہ نام ملیں گے جو مسیحیت کو سینے سے لگائے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ اور ان کا سات سمندر پار آنے کا مقصد محض تبلیغ مذہب تھا۔ ان سطور میں صرف ان ہی خفتگانِ خاک کے واقعاتِ زندگی پر تبصرہ کیا جائے گا۔ اور بے نوا قسمت آزماؤں کا ذکر کسی دوسری فرصت کے موقع کے لئے چھوڑا جائے گا۔ یار زندہ صحبت باقی!

<u>آگرہ کی فرنگی آبادی</u> جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ بعض یورپین مصنفین کے تذکرے دستیاب ہوتے ہیں جن[1] سے آگرہ کی یورپین

---

[1] Fuhrer: List of Tombs in N.W.P.
Hosten · List of Jesuit missionaries in Moghul



پروفیسر قاضی محمد اسلم



مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں



پنڈت اندر جیت شرما



مرزا عباس بیگ مغل



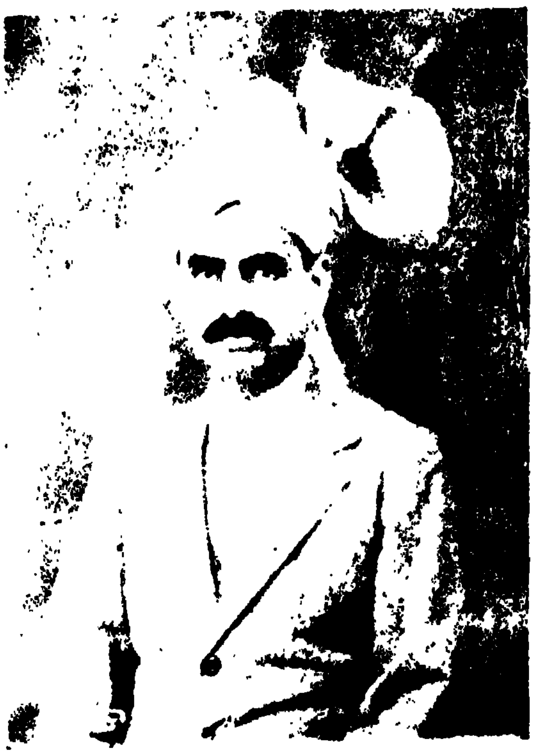
جناب اختر شیرانی



منشی پیارے لال شاکر میرٹھی



سعید احمد صاحب اعجاز



جناب اسد ملتانی

آبادی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے لئے بلنٹ کی تصنیف "مسیحات متحدہ میں مسیحی مزارات اور لوحیں" ہے[1]۔ اس کے علاوہ چند انگریز اور اہل ہالینڈ کے تذکرے بھی ہیں۔ ان سب سے ہم کو بیش قیمت مواد مل سکتا ہے ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکثر فرنگیوں نے ہندوستان میں شادیاں کر لی تھیں اور نام بدل ڈالے تھے اور یہیں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ اختلاط کے بعد ان کے خاندان کا سراغ لگانا بھی آسان نہیں۔ بہر نوع جو فرنگی آگرہ میں بسے تھے ان کی چار ٹکریاں تھیں۔

پہلی ٹکری اہل پرتگال کی تھی۔ یہ سب مبلغین پر مشتمل تھی اور اس کا واحد نصب العین تبلیغ مسیحیت تھا۔ دوسری تیسری اور چوتھی ٹکری انگریز، آرمینیوں اور اہل ہالینڈ کی تھی۔ ان میں اکثر تجار تھے اور بعض ملازمت پیشہ سپاہی اور دستکار تھے۔ ۱۶۵۸ء میں دارا شکوہ کی سپاہ میں مختلف یورپین اقوام کے ۲۰۰ توپچی و گولہ انداز تھے اس واقعے سے اس امر کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں فرنگیوں کی زندگی کیا تھی۔

بہر کیف ہم کو آخر الذکر تین ٹکریوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا موضوع صرف پہلی ٹکری یا پرتگالی مبلغین ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب فتحپور سیکری کا عبادت خانہ تعمیر ہو گیا ہے تو اس میں پرتگال کے مسیحی مبلغین کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ خود شہنشاہ اکبر بہ نفس نفیس اجلال فرماتے تھے۔ اور مسیحی نظریہ کی سماعت کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں رالف فیچ[2] اور نیوبری[3] آگرہ آئے تھے اور ان ہی دونوں کی اطلاع و تحریص دسمبر ۱۶۰۰ء میں انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کا باعث ہوئی تھی۔ سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہت کم فرنگیوں کا آگرہ میں آنا ثابت ہوتا ہے۔ مسیحی مشنریوں کے تذکروں میں ایک ناقہ مست ہنگری اور دوسرے روسی غلاموں کے خاندان کا وجود آگرہ میں ملتا ہے ان کے علاوہ یہ تذکرہ نگار آگرے میں کسی دوسری قوم کے فرنگیوں کے وجود کے قائل نہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ آگرہ میں سولہویں صدی عیسوی کے مسیحیوں کی قبریں بھی تو نہیں ملتیں۔ ممکن ہے کہ قبریں حوادث زمانہ سے اس وقت بھی محفوظ ہوں لیکن ان کی شناخت کرنے والا کون ہے۔ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسیحیوں کی قبریں مسلمانوں کی قبروں سے مشابہ ہوتی تھیں۔ لہذا جب تک ان پر کوئی کتبہ یا لوح نہ ہو تب تک ان کو کسی مسیحی کی قبر کہنا ناممکن ہے۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے مسیحی مبلغین کو اپنا ایک کلیسا تعمیر کرانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ مگر ان کو بسنے کے لئے کوئی اراضی نہیں عطا ہوئی تھی اور یہ تجارت پیشہ فرنگی آگرہ میں چند سال قیام کر کے اپنے وطن کو واپس ہوتے گئے اور انہوں نے اپنی کسی عبادت گاہ کی بنا نہیں کی۔ یہ سب سولہویں صدی عیسوی کا ذکر ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں حالات میں نمایاں تغیر ہو گیا تھا۔

سترھویں صدی مرقومہ بالا تنقیحات کے تصفیہ کے بعد محاکمہ یہ ہے کہ سولھویں صدی عیسوی یا دربار اکبری میں مسیحیوں و نیز مسیحی مبلغین کا وجود خال خال تھا۔ یورپ کے بعض ممالک سے حوصلہ مند تجار آتے تھے اور کچھ دنوں دار الحکومت سے اپنی تجارتی اغراض سے قیام کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کی کوئی بستی یا قیام گاہ نہ تھی۔ مسیحی مبلغین کو بھی شہنشاہ کی طرف سے دعوت دی جاتی تھی۔ لیکن ان کی وابستگی بھی دامن دولت سے استمراری نہ تھی۔ بلکہ عارضی تھی۔ لیکن سترھویں صدی کے اوائل سے ایسے شواہد ملیں گے جو ثابت کر سکیں گے کہ آخر کار فرنگیوں کی آگرہ میں مستقل بستی ہو گئی تھی اور ان کی تعداد روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی۔ سترھویں صدی کی آگرہ میں بے شمار مسیحی قبریں بلکہ تین قبرستان بھی ملیں گے ان میں دو رومن کیتھولک ہیں اور ایک پروٹسٹنٹ۔ ان قبروں پر جو کتبات ہیں وہ اکثر اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور فرنگیوں کی ہندوستانی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ آئیے ذرا گورغریباں کی سیر تو کریں اور سنیں اگر ہم سن سکیں کہ یہ خفتگان خاک اپنی آپ بیتی کیا بیان کرتے ہیں۔

پادری سنتوس کا گرجا آگرہ میں عدالت دیوانی کے قریب ایک گرجا ہے جو سترھویں صدی عیسوی کے ہندوستانی مسیحیوں کی یادگار ہے۔ اس کا نام پادری سنتوس کا گرجا ہے۔ گرجا کے احاطے میں ایک چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جس میں ان گنت اور قبریں ہیں پہلی قبر خواجہ مارتینیپس کی ہے۔ یہ شمالی ہندوستان میں غالباً قدیم ترین مسیحی قبر ہے۔ یہ شخص ارمنی تھا اور جیسا کہ لوح مزار سے ظاہر ہوتا ہے "مسیحی"۔

قبرستان میں ایک طرف صرف پادریوں کی قبریں ہیں اور دوسری طرف "ہمہ شما" کی۔ خواجہ کی تاریخ وفات ۱۶۱۱ء ہے۔ دوسری قبر پادری زخار کی ہے۔ یہ بھی ارمنی تھا اور تبریز سے آیا تھا اس کا سال وفات ۱۶۱۵ء ان کے علاوہ تین قبریں پادریوں کی اور ہیں جن کے سالہائے وفات ۱۶۴۹ء

[1] BLUNT: CHRISTIAN tombs & Monuments in U.P.

[2] Ralph Fitch

[3] Newbury

(۱۶۱۴ء و ۱۶۲۹ء) ہیں۔

ان شواہد سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سب سے پہلے ارمنی آگرہ میں آکر بسے اور ان کی ایک بستی، کلیسا اور قبرستان ہوگیا۔ لیکن چونکہ سترھویں صدی عیسوی میں جن مغربی اقوام نے آگرہ کو اپنا جولانگاہ بنالیا تھا ان کی دوسری رقیب اقوام مثل اہلِ ہالینڈ اور انگریزوں نے ان کا استیصال کردیا۔ تیرنیئر[۲] اور برنیئر کا لب ولہجہ بہت ترش ہے اور وہ ارمنوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شاہجہاں مسیحیوں سے ناراض ہوگیا تھا۔ اور وہ اُن کے ساتھ اپنے اجداد کی رواداری برتنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد شہنشاہی نظریں پھر عاطفانہ پڑنے لگیں تھیں لہٰذا جو ارمنی آگرہ سے مذکورہ بالا وجوہ سے اکھڑ گئے تھے وہ رفتہ رفتہ پھر جم گئے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یورپین اقوام کی رقابت اور شہنشاہی عارضی عتاب سے ارمنوں کو شدید نقصان پہنچا اور ان کی بنیادیں اگر اکھڑی نہیں تو متزلزل ہوکر ضرور رہ گئیں۔

پرتگالی پادری مذکورہ بالا قبور کے علاوہ جتنی قبریں ہیں وہ سب پرتگالیوں کی ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم سطور بالا میں اشارہ کرچکے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں جہاں تک اثرات کا تعلق ہے پرتگالی ہندوستان میں کامران تھے۔ وہ سولھویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں آئے تھے اور عہدِ اکبری میں آگرہ میں ایک کلیسا تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرچکے تھے لیکن یہ گرجا جہانگیر کے دورِ حکومت میں تھا۔ ۱۶۱۵ء سے ۱۶۳۳ء تک کسی پادری کی قبر نہیں ملتی مگر ۱۶۳۳ء سے ۱۶۳۷ء تک سات پادریوں کی قبریں ملتی ہیں۔ ان قبروں سے اس واقعے کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ۱۶۳۲ء میں شاہجہاں نے ہگلی پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کے پرتگالی مقید کرکے پابہ زنجیر دارالسلطنت میں لائے گئے تھے اور اُن کے ساتھ سیاسی قیدیوں کا برتاؤ کیا گیا تھا ان قیدیوں میں پادری گرسیا[۳] اور پادری مینوئل ڈنہایا[۴] بھی تھے جو آخر کار قیدخانے ہی میں مرے۔ ان کی قبروں کی لوحوں پر اُن کا زندان میں مرنا تحریر ہے ان کی وفات ۱۶۳۴ء و ۱۶۳۵ء میں واقع ہوئی تھی۔ بقیہ پانچ قبروں میں ایک قبر ڈی پیرا[۵] کی ہے۔ معلوم نہیں یہ کون پیرا ہے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہ وہی پیرا ہے جس نے اکبر کو مشورہ دیا تھا کہ گوآ سے اور پادریوں کو طلب کیا جائے[۶]۔ اگر یہ وہی شخص ہے تو وہ بہت معمر ہوگا کیونکہ اس کا دربارِ اکبری میں باریاب ہونا ۱۵۷۸ء میں ثابت ہوتا ہے۔ ۱۶۳۲ء میں تو اس کی عمر ۸۰ سے ضرور متجاوز ہوگی۔

دوسری قبر پادری مکاڈو کی ہے۔ اس کی سال وفات غالباً ۱۶۳۶ء ہے۔ نبیری کے نزدیک اس کا اصل نام پادری کورس تھا اور یہ شخص دربارِ مغلیہ میں پرتگال کی سفارت کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اس سے ایک اور امر کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پادریوں سے ملکی مصلحت کی بنا پر سفارت کی خدمات لی جاتی تھیں۔

ایک نکتہ قابلِ غور یہ ہے کہ شہنشاہ شاہجہاں کے عہد کا مورخ عبدالحمید فتح ہگلی کے چارسو قیدیوں کا آگرہ لایا جانا تحریر کرتا ہے لیکن قبرستان میں صرف چند قبریں ملتی ہیں آخر یہ سب کیا ہوئے ان کو زمین کھا گئی یا آسمان! عبدالحمید غیر معتبر نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یا تو منتشر ہوگئے یا کسی دوسرے قبرستان میں جو اس زمانے میں موجود تھا اور اب اس کا وجود نہیں دفن ہوئے۔ پروفیسر تعلقدار کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا قبرستان سے تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک اور مسیحی قبرستان کے آثار ملتے ہیں یہ مقام ایک گاؤں ہے اور شمال مشرق میں واقع ہے۔ کسی کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی ورنہ اگر کوئی شخص تحقیق کرتا تو اس قبرستان میں بھی بہت سے پرتگالی مبلغین کی قبریں دستیاب ہوسکتیں۔ بہرکیف خیال یہ ہے کہ یہ چارسو اسیران ہگلی جن میں اکثر نے زندانِ بلا میں جان دی اس نئے قبرستان میں مدفون ہیں۔

پرتگالی مبلغین کا نصب العین اس بحث کے سلسلے میں ایک نکتہ نہایت دلچسپ ہے یہ تو مسلّم ہی ہے کہ پرتگالی محض تبلیغ کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ یہاں تک تو کوئی دلچسپی نہیں۔ دلچسپی اس امر میں ہے کہ ان کا نصب العین محض ذات واحد یعنی شہنشاہِ جلال الدین محمد اکبر کو مسیحی بنانا تھا۔ اگر فی الحقیقت ان کے مشن کا یہی مدعا تھا تو نہایت افسوس ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی عظیم ترین شخصیت کو مطلق نہ سمجھا۔ ان کا مشن ناکام نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس کو سودا کہئے کہ جنوں یا جہالت؟ بہرکیف

[۳] Father Gracia [۱] BERNIER: Travels in Mogul EMPIRE [۲] Terry: A voyage to East India

[۶] Elliot & Dowson: History of India, as told by its own Historians. [۴] Father Manual Danhaya

[۵] De Pera

کچھ بھی ہو مختصر یہ ہے کہ جب ان کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے میں بالکل مایوسی ہوگئی تو انہوں نے اپنے نصب العین کو بدل دیا اور عہدِ جہانگیر میں کچھ تبلیغ کے پردے میں کچھ تجارت کی آڑ میں انہوں نے دربارِ مغلیہ میں پرتگالی اثرات کو فروغ دینا شروع کر دیا مگر چاہ کندہ را چاہ درپیش۔ انگریزوں اور اہلِ ہالینڈ کی آنکھوں میں وہ برسوں سے خار کی طرح کھٹک رہے تھے جب ان کی تبلیغ بے سود ثابت ہوئی اور شہنشاہ تو درکنار ایک متنفس نے بھی مسیحیت قبول نہ کی تو رقیبوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ ابھی سترھویں صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دارالحکومت سے پرتگالیوں کی بستی اجاڑ دی گئی۔ سب منتشر ہوگئے۔ جدھر جس کے سینگ سمائے اُس نے ادھر کی راہ لی۔ صرف پادری آگرہ میں رہ گئے تھے۔ مگر انہوں نے بھی تبلیغ چھوڑ دی تھی اور جو کچھ کھرچن باقی تھی اس سے زندگی کے دن کاٹتے تھے۔ یہ بیل وہاں بھی بہت زمانے تک نہیں رہی کیونکہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں شاہ پرتگال نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے سے ہندوستانی دارالتبلیغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا۔

یہ ہے عہدِ مغلیہ میں پرتگالیوں کی تبلیغِ مسیحیت کا افسانۂ عبرت خیز۔ وہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کو مسیحی بنانے ہندوستان آئے تھے جب اس مقصد میں ناکامی ہوئی اور پہاڑ نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی تو مسیحیت کی دعوتِ عام دینے لگے لیکن جب یہ صدا بھی بے اثر ہوئی اور کسی ایک ہندوستانی نے ان کی طرف توجہ نہ کی تو تاجر بن گئے لیکن جب تجارت بھی نہ پھلی اور انگریزوں اور ڈچ سے مقابلہ کی ٹھن گئی تو پھر پیر نہ جم سکے اور اس طرح اکھڑے کہ ہندوستان میں سوائے سواحل کے[1] ان کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی۔

یہ صرف دو صدیوں کی داستان ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے معاصر مورخین کے تاریخی تذکروں میں اس کے ٹکڑے پریشاں ملیں گے اور ہم ان کی ترتیب کے لئے آگرہ کے قبرستانوں کی کھوج اور پرتگالیوں کی نادر الوجود یادگاروں کی تلاش کرنا پڑے گی جو ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے بہرکیف ان سطور میں ابتداؔ زمانے کے فراموش کردہ واقعات کو یاد دلانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ کاش یہ سعی مشکور ہو سکے۔

شہنشاہ حسین رضوی

[1] گوا، دمن، دیو۔ پرتگالیوں کے ہندوستانی مقبوضات۔

ملاقات

(آزاد نظم)

دل پہ ہے طاری ہجومِ شوقہائے آتشیں،
آنکھیں سراپا انتظار!
روح میں ارماں لئے،
میں جا رہا ہوں کس طرف!
آج ملنا ہے مجھے اک "شرمگیں محبوب" سے!

~~~

مسکرا اے چاند!
تارو ہنس پڑو!
کائنات! بن عروسِ زندگی!
جام پی، ہاں جام پی میری جوانی کے لئے —— تابندہ ہو!
جام پی ہاں جام پی میری محبت کے لئے —— پائندہ ہو!
آج ہے نوروز میرے عشق کا!
آج ملنا ہے مجھے اک نازنینِ خلد سے!

~~~

رخسار اس کے نرم نرم!
چومنے ہیں مجھ کو آج!
سازِ رنگیں حسن کے،
چھیڑنے ہیں مجھ کو آج!
آج ملنا ہے مجھے اپنی "بہارِ رفتہ" سے!

عظیم قریشی

داستانِ شوق

آکہ میں بھی ہوں ترے دیوانگانِ شوق میں
آکہ پھر تجھ کو بلاتا ہوں زبانِ شوق میں

آکہ پھر ساماں ہم ہیں تیری مشقِ ناز کے
دِل کی دنیا بھی ہے داخل ارمغانِ شوق میں

آکہ تیرے عارضِ گلگوں کی سرخی کے لئے
حسرتوں کا خوں ہے رنگِ ارغوانِ شوق میں

آکہ ہم آغوشِ وحشت ہے مراجوشِ جنوں
گردِ منزل بھی ہے شاملِ کاروانِ شوق میں

آکہ مجھ کو نالۂ غم پر ہے نغموں کا گماں
گوش برآواز پھرتا ہوں جہانِ شوق میں

آکہ چاکِ زخم خنداں ہیں علاجِ درد پر
جان سی شے جارہی ہے امتحانِ شوق میں

آکہ ضبطِ عشق کے ہیں حوصلے ٹوٹے ہوئے
آرزو کی تلخ کامی ہے زبانِ شوق میں

آکہ ہم آہنگِ فطرت غنچۂ اُمید ہو
موسمِ دیوانہ گر ہے گلستانِ شوق میں

آکہ اک عنواں ہی اس میں شادکامی کا نہیں
سینکڑوں محرومیاں ہیں داستانِ شوق میں

آکہ شاید انتہائے عشق کی ہو ابتدا
دم نکل جائے نظر شرحِ بیانِ شوق میں

قیوم نظر

پاربتی

پاربتی گانوں کی لڑکی تھی۔ بڑی ہنس مکھ۔ بڑی چنچل اور بڑی گنونتی۔ گانوں بھر اس کو چاہتا تھا۔ اس کی میٹھی اور بھولی باتیں سب کے دل کو بھاتی تھیں۔ اس کی پیاری صورت سب کو موہتی تھی۔

شمبھو۔ راموجھنّو۔ مُنّو۔ سُندر۔ پلٹو۔ سبھی اس کے دوست تھے۔ ان کے ساتھ پاربتی گانوں کی باری میں جاتی۔ جامن۔ شریفے۔ املی۔ آم۔ پیڑوں سے توڑ کر سب آپس میں بانٹتے کھاتے۔ پاربتی چار کو خوش رکھ کر آپ خوش ہونا پسند کرتی تھی۔

جب کبھی باری کا رکھوالی انہیں دیکھ پاتا اور پکڑنے کے لئے دوڑتا تو پاربتی اپنی ٹولی کے ساتھ چنچل چڑیا کی طرح پھُر سے بھاگتی لیکن جاتے جاتے جامن۔ شریفے۔ آم۔ نارنگی۔ پھینک پھینک کر اس کی مرمت بھی کرتی جاتی۔ رکھوالی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

پاربتی گانوں بھر سے کوئی نہ کوئی ناتہ جوڑے ہوئے تھی۔ موہن دادا۔ سکھو بابا۔ دکھی نانا۔ کلّو موسی۔ پیاری چاچی۔ دینا دادی۔

پاربتی گانوں بھر گھوم آتی۔ سب کے یہاں جاتی لیکن کہیں گھر سے بے فکر ہو کر ٹکتی نہ تھی۔ ہاں کونے میں رکھی ہوئی گڑگڑی اٹھا کر موہن دادا کو دیتی۔ جھنّو دادی کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر لاکر دروازے پر بٹھا دیتی۔ دکھی نانا کی اکیلی سہارا لاٹھی پکڑ کر راستے بھر تُتلی زبان سے تبُر تبُر باتیں کرتی چلتی —— "نانا یہ گڈھا ہے۔ نانا یہ ٹھوکر ہے"۔

ہاں اگر راستے میں شمبھو نے اشارہ کیا تو جھٹ لاٹھی چھوڑ دیا دیتی نانا پکارتے رہ جاتے —— "پاروا ارے پارو!" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتے رہ جاتے۔ پر پاربتی کا کہیں پتہ نہ ہوتا۔

پاربتی جھنّو چاچی کو پوکھری پہنچا آتی۔ کلّو موسی کو پکے آم لاکر دیتی پونا کاکی کے برتن مانجھنے بیٹھ جاتی۔

سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پاربتی کو دیکھتیں اور کہتیں ——
"میری پارو رانی کو خوب چندن سا دولہا ملے"۔ پاربتی کھل کھلا کر ہنستی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی۔

گانوں کی بہو بیٹیاں بھی پاربتی کے لئے انجان نہ تھیں۔ کسی کو بھابی کسی کو مامی۔ اور کسی کو دیدی کہتی تھی۔ پاربتی کبھی ان کے بال سنوارنے بیٹھ جاتی کبھی ان کی عدم موجودگی میں ان کی چیزوں کی دیکھ بھال کر دیتی۔ اور کبھی کبھی ان کی آنکھ بچا کر ڈبیہ میں رکھے ہوئے سیندور کو گرا دیتی۔ ان کی بندی۔ کنگھی سب ایک میں مل جاتی۔ پاربتی چلا کر کہتی —— "بھابی! اپنی چیزیں سنبھالو!" اور وہاں سے بھاگ جاتی۔

وہ آتی کہتی —— "ٹھہرو!" اور آکر اپنی چیزوں کی یہ درگت دیکھ کر پکارتی —— "پارو! پارو!" لیکن وہاں پاربتی کا پتہ نہ ہوتا۔

غرض بھولی اور چنچل پاربتی کے نت کے یہی دھندے تھے۔

. . . .

ایک دن گانوں کا ایک بھکاری اپنی لنگڑی ٹانگ گھسیٹتا ہوا "ایک مٹھی چاول مل جائے بابا" کی صدا لگا رہا تھا۔ پاربتی اس کا منہ چڑھاتی ہوئی اور خود لنگڑا بننے کی نقل کرتی ہوئی کہہ رہی تھی —— "ایک مٹھی ناول مل دائے بابا!" وہ بھکاری سے ایک قدم پیچھے رہ کر اس کی ہر حرکت کی نقل کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے اس کی ٹولی بھی ہنستی کھل کھلاتی ہوئی چل رہی تھی ان میں سے کوئی بھکاری کا ڈنڈا کھینچ کر بھاگتا۔ کوئی اس کے لٹکتے ہوئے پھٹے کپڑے کھینچتا۔ پلٹو پکار کر کہنے لگا —— "بابا رے جاؤ بھیک"

بھکاری کے آنے پر اس کے ہاتھ پر دو چار کنکر اور ڈھیلے رکھ دیئے۔ بھکاری بڑبڑاتا اور کوستا ہوا آگے چلا۔ بچوں کی ٹولی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اس کا بڑبڑانا سننے کے لئے تو اُسے چھیڑتے ہی تھے۔

پاربتی نے مٹک کر کہا —— "اے بوڑھو!"

بھکاری بگڑ کر کہنے لگا —— "تیرا باپ بوڑھو۔ تیری موسی بوڑھو۔ تیری دادی تو بوڑھو . . . !"

نیرؔھو نے بیچ ہی میں بات کاٹ کر کہا —— "پھر تم کون ہو بوڑھو!"

بھکاری اور بھی بگڑ کر کہنے لگا — "پھر بوڑھو۔ بوڑھو! ارے تیرا باپ بوڑھو، تیرا دادا بوڑھو۔ ہم تو جوان پٹھے ہیں۔"

بوڑھے بھکاری کی بات سن کر سب لڑکے کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ لڑکوں کا یہ روز کا کھیل تھا۔ وہ روز اسے چڑاتے۔ اسے دیکھتے ہی "بوڑھو بوڑھو" چلا اٹھتے اور اس کے بدلے میں اس کا جھڑکنا سن کر خوب مگن ہوتے۔

بلٹو بھکاری کے پیچھے پہنچا اور اس کے ڈنڈے کو کھینچا۔ پہلے تو دھوکے سے بھکاری کے ہاتھ سے ڈنڈا پھسل گیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی سنبھل کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ سب لڑکے تالیاں بجا کر کھل کھلا اٹھے۔

بلٹو اپنی واہ واہی دیکھ کر شیخی کے مارے بھکاری سے اور بھی بھڑ گیا۔ اس کھینچا تانی میں ڈنڈا بلٹو کے سر پر جا لگا اور سر پھٹ کر خون بہنے لگا۔ بلٹو رونے لگا۔ بھکاری ہکا بکا ہو گیا۔

پاربتی جھپٹ کر بلٹو کے پاس پہنچ گئی۔ سب لڑکے بھی اس کے پیچھے تھے۔ اس نے بلٹو کے سر پر ہاتھ رکھ کر خون کا بہنا بند کر دیا۔

پاربتی بلٹو کو لے کر اس کے گھر گئی اور وہاں پہنچتے ہی چلا کر کہا — "چاچی جلدی سے جھٹ سے جالا تو لے لو۔"

بلٹو کی ماں دوڑ کر جالا لائی اور اپنے لڑکے کی حالت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ پاربتی نے فوراً زخم میں جالا بھر کر کپڑے سے باندھ دیا۔ یہ گاؤں کی بے داموں کی دوا تھی۔

بلٹو چارپائی پر لیٹا تھا اور پاربتی اس کے سرہانے بیٹھ کر دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"پارو جی جی!" بلٹو نے دھیرے سے پکارا۔

"کیا ہے بلٹو بھیا!" پاربتی نے انتہائی محبت بھرے لہجے میں پوچھا — "اب جی کیسا ہے —؟"

"اچھا ہے" بلٹو نے جواب دیا اور دھیرے سے کہا — "تم میرے پاس سے نہ جانا۔"

"نہ جاؤں گی بلٹو بھیا، تم سوؤ۔"

بلٹو نے آنکھیں بند کر لیں۔ پاربتی سرہانے بیٹھی رہی۔ بلٹو کی ماں نے کہا — "گھر نہ جاؤ گی کیا پارو بیٹی؟ رات ہو رہی ہے۔"

"کیا بلٹو کو چھوڑ کر چلی جاؤں چاچی!"

بلٹو کی ماں چپ ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پاربتی جو کہتی ہے وہی کرتی ہے۔ ماں نے تو کچھ نہ کہا۔ ہاں ان کے نین جھروکے میں پریم کے دیوتا نے تاک جھانک کی۔

پاربتی کی ماں دیر ہوتے دیکھ کر آ پہنچی اور پکارا — "پارو! پارو!"

پاربتی نے بیٹھے ہی بیٹھے جواب دیا — "کیا ہے ماں —!"

"گھر نہ چلو گی؟ کتنی رات ہوتی جا رہی ہے!"

"یہ بھی تو گھر ہی ہے۔ ماں آج یہیں رہوں گی۔"

"پارو رانی کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو گی بہن!" بلٹو کی ماں نے کہا۔

پاربتی کی ماں گھر چلی گئی۔

پاربتی دوسرے دن بلٹو کو ہنستا ہوا دیکھ کر اپنے گھر گئی۔

• • • • •

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ اب پاربتی جوان ہو گئی تھی۔ لیکن اب بھی اس میں اور الھڑ پارو میں زیادہ فرق نہ آنے پایا تھا۔ سب کے کاموں میں ہاتھ بٹانا، بچوں کے ساتھ کھیلنا، پیڑوں میں جھولا ڈال کر چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو اس پر بٹھا کر جھلانا، گاؤں کے بچوں کو چھنّا، منّا، منّی، چھنّی کہہ کر انہیں دلارنا، چمکارنا۔ اب بھی اس کے نت کے دھندے تھے۔ بچوں کو کھلاتے وقت وہ ان کی ماں سی بن جاتی۔

پاربتی گاؤں کے بچوں کی پارو جی جی اور بڑی بوڑھیوں کی بیٹی تھی۔ گھونگھٹ والی نئی نویلیاں اسے پارو رانی کہتی تھیں۔

جس سے پاربتی کی منگنی ہوئی تھی، سنا جاتا تھا بڑا دھنی ہے۔ شہر میں رہتا ہے۔ اس کے گاؤں علاقے ہیں۔ محل سا مکان، نوکر چاکر، موٹر، بگھی سبھی کچھ ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ زر زمین دونوں ہیں۔

یہ سب کچھ تو تھا۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ پارو کا دولھا [illegible] سال کا تھا۔ اور یہ اس کی تیسری شادی تھی۔

بارات بڑی دھوم دھام اور بڑے سج دھج کے ساتھ آئی۔ گھوڑے، ہاتھی، بگھی، موٹریں، طرح طرح کی آتش بازیاں، بھانت بھانت کے باجے گاجے سبھی کچھ تھے۔ گاؤں میں ایسی بارات کبھی نہیں آئی تھی۔ گاؤں والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر برات دیکھ رہے تھے۔ کوئی کہتا — "دھن ہو پارو رانی!" کوئی کہتا — "بڑی بھاگوتی ہے پارو بیٹی!" بڑی بوڑھیاں کہتیں — "پارو بیٹی کے بھاگ کھل گئے۔ اب یہ رانی بنے گی، محل میں رہے گی۔ اس کے نصیب میں ہوا گاڑی پر چڑھنا لکھا ہے۔"

لیکن اس کی ہم سن ہمجولیاں ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں — "بے چاری لٹ گئی۔ ابھاگن کا بھاگ پھوٹ گیا کہ پچپن برس کے بڈھے

پکارے پڑی۔ ارے اس کا کون ٹھکانا۔ جمراج کے دروازے پر کھڑا ہے..."

آج برات کی رخصتی تھی۔ بدنصیب پاربتی آج اپنے پیارے گاؤں اور پیاری سکھی سہیلیوں کو چھوڑ کر ایک انجان دیس کو جا رہی تھی۔

اب گاؤں میں کون دن بھر میں دس بار بابا کہے گا؟ دادی پکارے گا؟ چاچی سے مچلے گا؟ کون کلو موسی کی پھٹی دھوتیاں سئے گا؟ سویرا ہوتے ہی بچوں کی ٹولی آ کر کس کے ہاں جائے گی۔؟

مرد اور عورتیں سبھی دکھی تھے۔ ہاں بے سمجھ بچے دکھی بھی تھے اور سکھی بھی ـــ پاربتی کے لال لال چمکیلے کپڑوں پر چمکدار ستارے لگے ہوئے دیکھ کر سب چلا اٹھے ـــ "پاروجی جی! پاروجی جی!!" اور ہر طرف سے اس کے کپڑوں کو کھینچنے لگے۔

پاربتی نے انہیں مٹھائی دی اور ان کے بھولے ہوئے رخم گالوں کو تھپکی دے کر مسکرا دیا۔ بچے خوش ہو کر کودنے لگے۔ پاربتی سنجیدہ ہو گئی۔

پاربتی کی پالکی گاؤں سے جا رہی تھی۔ دونوں طرف بچوں بوڑھوں اور عورتوں کا ٹھٹ لگا تھا۔ گاؤں بھر کو پاربتی کے جانے کا سوگ تھا۔ سبھی اداس تھے۔

گاؤں کی بہو بیٹیاں دروازوں کے پٹ کھول کر آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے جاتی ہوئی پالکی دیکھ رہی تھیں۔

آج گاؤں کی جان۔ گاؤں کی دولت اور گاؤں کی بہار لٹی جا رہی تھی اس لئے سارا گاؤں آنسو بہا رہا تھا۔

پالکی میں بوڑھے دولہے کے سامنے پاربتی دبکی بیٹھی تھی۔ اس کا سارا چنچل پن۔ ساری شوخی غائب ہو گئی تھی۔ پھر بھی جھروکے سے سب کو دیکھ لیا کرتی تھی۔

غرض پاربتی اپنے رفیق حیات کے ساتھ ٹرین کے ڈبے میں جا بیٹھی۔ لیکن اس کی حسرت بھری نگاہیں گاؤں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

پلیٹ فارم پر گاؤں کے بوڑھے ہاتھ میں گڑگڑی اور لڑکے چڑیوں کے مارنے کے غلیل لئے کھڑے تھے۔ عورتوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک ندی امنڈ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاؤں والوں کی کوئی جان سے پیاری چیز چھنی جا رہی ہو۔

بلٹو بھی اسٹیشن کے پار تار کے کھمبے کے سہارے بت بنا ہوا کھڑا ٹکٹکی لگائے پاربتی کو دیکھ رہا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ عورتیں رو پڑیں۔ بوڑھے دھوتیوں کے چھوروں سے آنکھیں پونچھنے لگے۔ پاربتی بھی سسک رہی تھی۔

بے سمجھ بچے پوچھنے لگے ـــ "اماں! پاروجی جی کہاں جا رہی ہیں؟ دادی پاروجی جی بابا کو مارنے جا رہی ہیں؟ جی جی پاروجی جی جامن توڑنے جا رہی ہیں...؟"

بلٹو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جمنا بہہ رہی تھی۔ پاربتی کو ٹرین بھگائے لئے جا رہی تھی۔ بلٹو چلا اٹھا ـــ "پاروجی جی...!"

پاربتی اپنی چادر کے چھوروں سے آنسو پونچھنے لگی۔

پاربتی دھندلی نظر آنے لگی۔ آخر ٹرین دھیرے دھیرے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے گاؤں والے گاؤں کو لوٹے۔

. . . . . .

اس دن سے گاؤں میں مردنی سی چھا گئی۔ آم کے پیڑوں پر کوئل اب بھی کوکتی۔ کھیتوں میں ہرے بھرے پودے اب بھی لہلہاتے۔ سرسوں اور السی کے نیلے پیلے پھول اب بھی کھلتے۔ لیکن ان میں پہلا سا رنگ ہوتا نہ روپ۔ گائیں چرا کر شام کو لوٹنے والے گوالے اب بھی سہانے گیت گاتے۔ لیکن ان میں اگلا سا رس ہوتا نہ پہلی سی مٹھاس۔

آسی رام نگری

غزل

آہ! اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب ملک کچھ پیام لاتے ہیں؟

جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یارب
ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں

کیا چمن میں پھر کوئی عیسیِٔ بہار آیا
غنچے مسکراتے ہیں پھول کھلکھلاتے ہیں

کچھ بطف دنی ہے آرزوئے دیرینہ
ہم جبھی تو آنکھوں سے اشکِ خوں بہاتے ہیں!

آپ کی جفاؤں سے عذر کا کسے یارا؟
بس یہی قیامت ہے آپ بھول جاتے ہیں

اک غریقِ الفت کو خطرۂ تلاطم کیا
یہی ڈوبنے والے آپ ڈوب جاتے ہیں

جس کو ایک اک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اس تباہ انسان کو آپ آزماتے ہیں؟

دل میں عیشِ رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں؟

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجئے حرماں
آپکی کہانی ہے آپ ہی سناتے ہیں

حرماں خیرآبادی

نغمہ بہار

مرے ندیم ابھی نغمۂ بہار نہ چھیڑ
کہ اس سے شعلۂ غم اور تیز ہوتا ہے
دماغ و دل میں جنوں نیشتر چبھوتا ہے
تو غمکدے میں مسرت فزا ستار نہ چھیڑ
مرے ندیم ابھی نغمۂ بہار نہ چھیڑ

غموں کے سائے میں خوشیاں ہیں محوِ خواب ابھی
خدا کے واسطے رکھدے وہیں رباب ابھی
مرا خیال ہے مجھ کو تو زینہار نہ چھیڑ
مرے ندیم ابھی نغمۂ بہار نہ چھیڑ

اگرچہ میں بھی سمجھتا ہوں آگئی ہے بسنت
مثالِ ابر زمانے پہ چھا گئی ہے بسنت
مگر میں حسرتِ دل کا ہوں سوگوار نہ چھیڑ
مرے ندیم ابھی نغمۂ بہار نہ چھیڑ

دلِ حزیں ہے ابھی چور صدمۂ غم سے
نہیں فراغ اسے حسرتوں کے ماتم سے
وطن کے غم سے ہیں قلب و جگر فگار نہ چھیڑ
مرے ندیم ابھی نغمۂ بہار نہ چھیڑ

تاجور سامری

طب یونانی اور ہندوستان

طب یونانی کو خلق اللہ کی خدمت کرتے ہوئے صدیاں گزر گئیں یونان جو اس کا مولد تھا وہاں وہ اس قدر ترقی یافتہ صورت میں نہ تھی جس قدر عربوں نے اس کو بے کر ترقی دے دی۔ عرب سے فن طب مصر آیا۔ پھر ایران اور ہندوستان۔ سب نے اس کی خدمت کی لیکن ہندوستان میں اس کو فروغ دینے کی جو کوششیں ہوئیں شاید کہیں بھی نہیں ہوئیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں آج بھی یہ فن طب جس درجہ مقبول اور ہر دلعزیز ہے کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں فن طب کو قایم رکھنے اور ترقی دینے کے لئے میرے آباؤ اجداد اور دیگر اطبائے یونان نے سعی بلیغ کی اور جس وقت مغربی تہذیب اور تمدن کا ہندوستان پر حملہ شروع ہوا تو فن طب برابر اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا فن طب کو ہندوستان میں مٹانے کے لئے بہت شدید حملے ہوئے لیکن ہندوستان کے اطبائے یونان نے مدافعت کی۔ ایک تو جو جو اعتراضات اس کے خلاف ہوئے تھے انہوں نے ان کے مدلل جواب دئیے اور دوسری طرف فن طب میں دیگر طبوں سے خوشہ چینی کرکے اسے اور زیادہ مکمل بنا دیا جس کا سلسلہ جاری ہے۔ دیسی طریقہ علاج میں بھی ایک گونہ تبدیلی کی گئی اور فن کیمسٹری کے اصولوں پر ادویات کی شکل تبدیل کرنے اور انہیں سہل الاستعمال بنانے میں ہندوستانی دواخانہ نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اب یہ فن کس منزل پر پہنچ گیا ہے ادویات کی ہیئت کی تبدیلی اور ان کے اثرات کے دیرپا بنانے کے سلسلہ میں کم و بیش ۲۵ سال سے میں بھی حقیر خدمات انجام دے رہا ہوں اور اکثر یونانی ادویات انگریزی ادویات کی طرح پیش کی جا رہی ہیں۔ ادویات کے مستقل اثر کے متعلق شاید زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ حقیقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ مرض کے حقیقی ازالہ کی سعی کے سلسلہ میں یونانی طریقہ علاج کا مرتبہ ایلوپیتھی سے افضل ہے اور اس کے وجوہ میں یہ بحث بہت پرانی ہے کہ یونانی طریقہ علاج زیادہ مفید ہے یا ایلوپیتھک طریقہ علاج۔ اس پر مبسوط بحثیں ہو چکی ہیں لیکن انگریزی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں ایلوپیتھک طریقہ علاج کا جس قدر زور پروپیگنڈا ہوا ہے اور ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد مغربی تہذیب و تمدن اور معاشرت سے جس درجہ مسحور ہوئی ہے اس کا یہ بھی اثر ہے کہ ہر وہ چیز جو مغرب کی ہو قابل ستائش قرار دی جانے لگی ہے۔ اس کی بنا پر آج بھی یہ سوال اس طرح تازہ ہے جس طرح [illegible]

علاج اخلاط کی بنا پر ہوتا ہے یونانی اطبا اخلاط کے توازن کو قایم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے مرض کی بنیاد کو مٹانے کے مساعی ہوتے ہیں اور اس لئے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بیشتر حالات میں شکایت کا فوری ازالہ کرنے کے بجائے مرض کے مکمل ازالہ میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت جو اکثر اوقات نظر انداز ہو جاتی ہے یہ ہے کہ اطبا یونانی کے علاج کی بنیاد تازہ دواؤں اور اکثر صورت میں مفرد دواؤں پر ہے لیکن ایلوپیتھک علاج زیادہ تر جوہروں سے ہوتا ہے۔ اطبا یونانی کا خیال ہے جو حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر حالت میں جوہروں کے ذریعہ علاج مفید نہیں ہوتا۔ اطبا یونانی بھی جوہروں سے علاج کرتے ہیں لیکن ہر حالت میں نہیں۔ ایک اور اہم چیز دیسی ادویات کے سلسلہ میں یہ ہے کہ ملک کے ہر حصہ میں یونانی ادویات اچھی اور تازہ مل جاتی ہیں برخلاف اس کے ملک کے اندرونی حصص میں انگریزی ادویات کا ہر وقت ملنا ناممکن ہے۔ دیہات اور قصبات تو ایک طرف چھوٹے شہروں میں بھی بہی اکثر ایلوپیتھک ادویات نہیں ملتیں۔ اگر برائے بحث تمام حقایق کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایلوپیتھک طریقہ علاج بہتر ہے تو بھی یہ دیکھنا پڑے گا کونسا طریقہ علاج ایسا ہے جو اس وقت خلق اللہ کی زیادہ خدمت کر رہا ہے اور اس کو کسی دوسرے طریقہ علاج سے تبدیل کرنا قابل عمل بھی ہے یا نہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ صدیوں سے یونانی طریقہ علاج خلق خدا کی خدمت کر رہا ہے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں فائدہ پہنچا رہا ہے۔ جہاں تک کسی دوسرے طریقہ علاج کو پہنچنے میں شاید صدیاں لگیں گی اور اگر کوئی معجزہ ایسا ہو جائے کہ کوئی دوسرا طریقہ علاج یونانی طریقہ علاج کی جگہ لے لے تو علاوہ ادویات اور ڈاکٹروں کی فراہمی کی دقت کے ایک سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئے گی کہ ہندوستان کے دیہات کے جاہل باشندے جو توہم پرستی میں آج بھی گرفتار ہیں مدت دراز میں اس کے لئے آمادہ ہوں گے کہ جدید طریقہ علاج کی طرف مائل ہوں ان سب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض ان اسباب کی بنا پر دیسی طریقہ علاج کی حمایت مقصود ہے بلکہ اصلیت تو یہ ہے جسے مجھے وثوق سے کہنے میں بالکل بھی تامل نہیں ہے کہ دیسی طریقہ علاج زیادہ نہیں تو ۹۵ فی صدی امراض میں زیادہ کامیاب ہے۔

(مسیح الملک) محمد جمیل خاں

ننھا پریم!

چند ساعتیں بیٹھی وقت گزار رہی تھیں۔ دوشیزۂ حیات نے سوال کیا۔ "ننھا پریم کیسا پیارا لڑکا ہے؟"

زندگی نے جواب دیا۔ "اگرچہ مجھ سے اس سے عموماً واسطہ رہتا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ میں نے اس کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا!" یہ کہہ کر زندگی نے جمائی سی لی۔

عقل بولی "پریم ننھا لڑکا ہی ہے۔ تو اچھا ہے ۔۔۔ اگر یہ جوانمرد ہوگیا ۔۔۔ اگر یہ جوان مرد ہوگیا ۔۔۔ ..... خدا نہ کرے ......"

عقل نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی اور سننے والوں نے پوری سمجھ لی!

دوشیزۂ حیات نے پوچھا "مگر کیوں! ۔۔۔ مگر کیوں؟" اور جس وقت اس نے یہ پوچھا۔ اسی وقت۔ اس کی نظر دروازے پر پڑی:۔ وہاں ننھا پریم اپنے رنگ برنگ کپڑے پہنے، ایک شوخی کی ادا کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوشیزۂ حیات، عقل سے، اپنے سوال کا جواب سننا بھول گئی اور اس کی نظریں کچھ دیر وہیں جمی رہیں ہے۔ ذرا دیر بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو جہاں پہلے عقل بیٹھی تھی، وہاں ایک شرابی بیٹھا اپنے شغل میں مشغول تھا۔

* * * * * *

کھڑکی میں سے بھینی بھینی ہوا آئی، جو اپنے ساتھ پھولوں کی خوشبو لئے ہوئے تھی، اس کے، اس ہوا کے آنے سے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہے

"آؤ! میرے ساتھ کھیلو!"

باہر پیڑوں کے پتے ہلتے ہوئے، یہ کہتے معلوم ہوتے تھے:۔

"آؤ اور کھیلو!!"

بہار کا موسم تھا۔ بسنت رت اور تمام کھلتی ہوئی چیزیں باری باری کہہ رہی تھیں:۔

"کھیلو بھی، ۔۔۔ آؤ، ہمارے ساتھ کھیلو بھی!!"

ننھے پریم کا ہنستا ہوا روشن چہرہ! ۔۔۔ وہ بھی بول اٹھا "آؤ کھیلیں"!!

دوشیزۂ حیات نے پریم کے ہاتھ (چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ) اپنے ہاتھوں میں تھامے، مسکراتے ہوئے، مست آنکھوں سے کہا "مگر کھیلیں گے ہم کہاں!"

ننھا پریم بولا:۔ "پھلواری میں، اور کہاں!"

دوشیزۂ حیات پھر بولی "لیکن ہم کریں گے کیا!"

ہوا نے چپکے سے کہا "میرے ساتھ سرگوشیاں کرنا!"

اور ننھے پریم نے صرف اتنا کہا "مجھے دیکھتے رہنا!"

اور مسکرا دیا!

پس دوشیزۂ حیات، چونکہ وہ دوشیزہ تھی، ننھے پریم کے ساتھ پھلواڑی میں، کھیلنے چلی گئی۔ ۔۔۔ ننھے پریم نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کا چہرہ ہنستا ہوا تھا، اور روشن!

ہوا نے ادھر ادھر چلتے ہوئے سرگوشی کی ادا سے کہا "کیسی نادان لڑکی ہے!"

اور شاخوں نے، بلکہ اپنے اوپر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو بتایا "نادان، ۔۔۔ بالکل نادان!!"

زندگی بھی بولی:۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا مجھ سے اس سے عموماً واسطہ رہتا ہے!"

لیکن: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عقل نے کچھ نہ کہا ۔۔۔ وہ تو وہاں تھی ہی نہیں، کہیں چلی گئی تھی!!

* * * * *

وقت کی چیونٹیاں، لمحوں کے ذرے اپنے بلوں میں بھرتی رہیں!

* * * * *

نہ جانے کب کی بات ہے، لیکن کبھی کی بات ہے۔ کہ دوشیزۂ حیات اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کھڑکی کے ساتھ والے باغ کو تک رہی تھی، وقت گذار رہی تھی!

بہار کا موسم تھا، بسنت رت اور تمام کھلتی ہوئی چیزیں، باری باری

کہہ رہی تھیں، "آؤ، کھیلیں — آؤ، — کھیلیں، لیکن دوشیزۂ حیات کیونکر جاتی اور کھیلتی ؟ ! جوبن لٹ چکا تھا۔

بھنورا کلی کا رس چوسنے آیا تھا۔ چوسا اور اُڑ گیا :-

دوشیزہ کا دل مرجھا چکا تھا کافی تیر دل پر چل چکے تھے۔ پر نہیں ایک اور تیر ابھی باقی تھا، کہ دل میں چھِدتا تھا :-

دوشیزہ نے، جو کبھی "دوشیزہ" تھی، دیکھا، کہ

اس باغ میں "کوئی دو" آئے،

ہنستے ہنساتے، اچھلتے کودتے، باتیں کرتے چھیڑتے شرماتے، اور ایک دوسرے پر نظریں برساتے۔ — ایک تھا، وہی ننھا پریم، اور ایک تھی کوئی سندری "

ہاں، اس سُندری نے، ننھے پریم کو ننھا ہی رکھا۔ اور آج زندگی کا لطف لے رہی تھی۔

دوشیزۂ حیات کی طرح نہیں، کہ سب کچھ اسی ایک جذبے کے لئے دے ڈالا ! اور اب اکیلی، اُداس بیٹھی آہیں کھینچنے کو زندہ رہ گئی۔ اور انتظار کھینچنے کو، جب تک کہ موت نہ آئے !

دوشیزۂ حیات نے جو کبھی دوشیزہ تھی، ان آہوں میں سے جنہیں کھینچنے کو وہ زندہ رہ گئی تھی۔ ایک آہ کھینچی، اور اپنا یہ المناک انجام دیکھنے کے بعد سوچا۔

"عقل چاہیے" "کسی نے" ہی کہتی تھی، لیکن کہتی سچ تھی !

ہوا، چلمن میں سے سرسراتی ہوئی نکلی :-

" — آہ ! — نادان ! — "

اُس اندھیرے کمرے میں کچھ آہٹ ہوئی :-

دوشیزۂ حیات نے پھر کر دیکھا — عقل آئی کھڑی تھی لیکن اس کے ساتھ پشیمانی بھی تھی ہاتھ تھامے، اور ان دونوں کے پیچھے، تجربہ، بوڑھا بزرگ، اپنی سفید داڑھی۔ لمبی سفید داڑھی کے ساتھ عبا پہنے عصا لئے کھڑا تھا !!!

" " " " "

چند ہستیاں، وقت گزار چکی تھیں، وقت کی چیونٹیاں، لمحوں کے ذرّے بلوں میں بھرتی رہیں ! -

" " " " "

میراجی

غزل

لذتِ آرزو سے عشق اس طرح پائمال تھا
رُوح بھی بے قرار تھی، دل بھی خراب حال تھا

میری متاع بےکسی در خورِ یک نظر نہ تھی
یوسفِ نو خریدہ کا کون شریک حال تھا

وہ میرا ذوق بے خودی وہ تری عشق پروری
ہائے وہ دَور زندگی واہمہ تھا خیال تھا

تجھ سے تھی ابتدا مری تجھ سے تھی انتہا مری
تیرے خیال تک مرا سلسلۂ خیال تھا

برق تجلیات سے جھک نہ سکی مری نظر
شعلۂ حُسن خود مرا آئینہ جمال تھا

اُن کی نظر بدل گئی اُن کی رَوش بدل گئی
پھر بھی کوئی تپیدۂ آرزوئے وصال تھا

میری حکایتِ وفا یاد ہے تجھکو یا نہیں
میں کبھی تیری راہ میں ذرۂ پائمال تھا

عشق متاعِ کیف و نور حُسن غرور و صد غرور
ایک کا ایک سے جدا زاویۂ خیال تھا

خاک نشینیوں نے اور کر دیا مجھ کو سربلند
میرا عروج حاصلِ کشمکش زوال تھا

شورش کائنات بھی پھر نہ اُسے مٹا سکی
جو ترا راز پا سکا ہستیٔ لازوال تھا

اُن کو غرور تھا ظفرؔ اُن سے شکائتیں نہیں
دل نے بھی تو وفا نہ کی اس کا مجھے ملال تھا

سراج الدین ظفر

سفید بال



ہمیشہ کے لئے غائب

سفید بالوں کو سیاہ کرنے کا واحد معقول اور خطرہ سے خالی طریقہ یہی ہے کہ بالوں کو قدرتی طور پر ہمیشہ کے لئے سیاہ کر دیا جائے اور ہنول نے اس امر کو اب ممکن کر دیا ہے۔ انیسی اور ماہر ڈاکٹر گستاؤ نے بے حد تحقیقات اور شب و روز کی محنت کے بعد ہنول دریافت کیا ہے۔

سفید بال جڑوں کی ایک بیماری کے باعث آ گئے ہیں جب وہ کافی طور پر رنگدار مادہ پیدا نہیں کرتیں۔ مادہ کی کمی کو ہنول پورا کر دیتا ہے اور بالوں کی جڑوں کو غذائے مطلوبہ پہنچا کر بالوں کو اپنے قدرتی رنگ پر لے آتا ہے۔

ہنول بالوں کی غذا ہے۔ اور اس کی بنیاد ایک تیل پر ہے یہ خضاب نہیں ہے خضاب نہ صرف آنکھوں اور جلد کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ ان کا اثر محض عارضی ہوتا ہے آپ ہنول استعمال کریں جو بالوں کی سفیدی کا یقینی اور صحیح علاج ہے۔

آپ نتائج سے حیران ہو جائیں گے قیمت فی بوتل پانچ روپے

اپنے دوا فروش یا مندرجہ ذیل پتہ سے طلب کریں۔

HENNOL

سفید بال ہمیشہ کے لئے غائب

پرلین ریسرچ، پوسٹ بکس نمبر ۴۹۳ بمبئی۔



دماغی کام

کرنے میں تھکان کبھی محسوس نہ کریں گے، حافظہ میں بے حد اضافہ ہوگا اور جوانوں کی طرح ہر وقت دماغ تازہ رہے گا

بشرطیکہ اس موسم میں

ہزارہا انسانوں کو نئی زندگی بخشنے والی لاثانی مقوی اکسیر ہیرے اور سونے والے اصلی

سدھ مکردھوج

کا استعمال شروع کر دیں یہ ہر قسم کی عصبی کمزوریوں کا قلع قمع کرنے اور مرد کو صحیح معنوں میں مرد بنانے کے لئے واحد اکسیر ہے اس موسم میں صرف تین ماہ کا مسلسل استعمال آپ کی کایا پلٹ دے گا کوئی بیماری نزدیک نہ آئے گی اور بڑھاپے میں بھی جوانوں جیسی توانائی اور طاقت حاصل کر سکیں گے۔

مرد عورت دونوں کے لئے یکساں مفید ہے

قیمت ۱/۲ ماشہ یعنی ۴۸ خوراک دس روپے۔ سالانہ رعایت کے باعث ۱۳ دسمبر ۱۹۳۹ء تک رعایتی قیمت ساڑھے سات روپے۔ علاوہ محصولڈاک

قائم شدہ ۱۹۰۶ء

اس کا استعمال اس امر کی ضمانت ہے کہ آپ کی اولاد صحت مند ہوگی!

ملنے کا پتہ

آیورویدک فارمیسیوٹیکل کمپنی لمیٹڈ کٹی بازار لاہور